رفتارِ ادب، معیارِ ادب

1983

جدید ادب کا نمائندہ

ماہنامہ

الفاظ

شمارہ ۵ : جنوری ۱۹۸۳ء

مدیر

نسیم درّانی

قیمت فی پرچہ ——— چار روپے

ایک سال کے لئے ——— تیس روپے

پوسٹ بکس نمبر ۷۵۹۶ صدر کراچی ۳

فون: ۲۹۰۸۳۷ ——— ۶۸۰۱۰۶ ——— ۶۸۴۸۸۸

ترتیب

سرورق کی تصویر: کرار نوری

مجتبیٰ حسین

خشک آنکھوں کی شاعری

کرار نوری صاحب سے میری شناسائی ہے ۔ دوستی نہیں ہے میں ان سے بارہا ملا ہوں کئی مشاعروں میں ان کو سنا
ہے مشاعروں میں وہ سپاہیانہ بلکہ جنگجویانہ انداز میں پڑھتے ہیں آواز میں کڑاکا انداز میں داد جھپٹ لینے کی پے در پے
ان آنکھوں میں جلال کے ساتھ شرارت آمیز تبسم کی جھلکیاں ۔ میرے خیال میں مشاعروں میں وہ کامیاب کم، فتح یاب زیادہ
ہیں جب بھی مشاعرے میں انہیں سنا تو مجھے پسند نہیں آئے رواں رواں شعر، رواں رواں اندازِ شعر خوانی بس یہ
ہے کل تک ان کی شاعری کا تھا۔

مگر کل جب میرے کرم فرما حکیم محمود احمد برکاتی صاحب ان کا کلام لے کر میرے غریب خانے پر آئے تو میں پریشانی تشویش
گونہ حیرانی میں پڑ گیا بلکہ مبتلا ہو گیا۔ ۲۷ جنوری [illegible] ڈھائی بجے دن کو مولانا کا میرے مکان کی تلاش میں گلیوں میں پھر
از خرابیٔ بسیار مکان تلاش کر لینا اور علیک سلیک کے بعد کرار نوری صاحب کے کلام پر لکھنے کی فرمائش کرنا کچھ ناقابلِ یقین
ت معلوم ہوئی۔

برکاتی صاحب کی ذات اس بے اعتقاد دور میں بڑی معتبر ہے، وہ طبیب، عالم، علم دوست، اچھے محقق اور مصنف
چکنے چپکنے، مرعوب کرنے اور مرعوب ہونے سے کوسوں دور ہیں بے جا بات کہنے اور سننے سے وہ ہمیشہ بچتے رہے ہیں۔
کرار نوری صاحب کا کلام ان کے ہاتھ میں دیکھ کر میں نے اپنا اور ان کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ میں ان سے ادھر ادھر کی باتیں
رہا۔ مگر دماغ برابر سوچتا رہا کہ مولانا کرار نوری صاحب سے اپنے تعلقات شاید نباہ رہے ہیں ایک بات اور عرض کرتا چ
روز قبل ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں کرار نوری صاحب سے میری سرسری ملاقات ہو چکی تھی جس میں انہوں نے اپ
کی طباعت کا مژدہ سنایا تھا اور مجھ سے لکھنے کیلئے کہا تھا میں نے اخلاقاً حامی بھر لی تھی مگر خیال تھا کہ کرار صاحب کو
گھر سے مکان پر لکھنے کی نوبت آئے گی اب جب برکاتی صاحب ان کے اشعار کے ساتھ آ ہی گئے تو راہ فرار مسدود ہو
انکار کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

غرض مولانا اپنے نرم اور ادب آموز تبسم اور پُرشفقت باتوں کے بعد چلے گئے اور میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں پھر خ
[illegible] کلام چھپ سکے مولانا جس طرح کئی کتابوں کیلئے پیغام کے طور پر لکھ ڈالا ہے سہل انگاری کا ایک

سرورق کی تصویر: کرار نوری

مجتبیٰ حسین

خشک آنکھوں کی شاعری

کرار نوری صاحب سے میری شناسائی ہے۔ دوستی نہیں ہے میں ان سے بارہا ملا ہوں کئی مشاعروں میں ان کو سنا بھی ہے مشاعروں میں وہ سپاہیانہ بلکہ جنگجویانہ انداز میں پڑھتے ہیں آواز میں کڑاکا انداز میں داد جھپٹ لینے کی پے در پے کوشش آنکھوں میں جلال کے ساتھ شرارت آمیز تبسم کی جھلکیاں۔ میرے خیال میں مشاعروں میں وہ کامیاب کم، فتح یاب زیادہ ہے میں نے جب بھی مشاعرے میں انہیں سنا وہ مجھے پسند نہیں آئے رواں رواں شعر، رواں دواں اندازِ شعر خوانی بس یہی تاثر مجھ پر کل تک ان کی شاعری کا تھا۔

مگر کل جب میرے کرمفرما حکیم محمود احمد برکاتی صاحب ان کا کلام لے کر میرے غریب خانے پر آئے تو میں پریشانی تشویش اور ایک گونہ حیرانی میں پڑ گیا بلکہ مبتلا ہو گیا۔ ۲۷ جنوری [illegible] ڈھائی بجے دن کو مولانا کا میرے مکان کی تلاش میں گلیوں میں پھرنا اور بعد از خرابی بسیار مکان تلاش کر لینا اور علیک سلیک کے بعد کرار نوری صاحب کے کلام پر لکھنے کی فرمائش کرنا کچھ ناقابلِ یقین سی بات معلوم ہوئی۔

برکاتی صاحب کی ذات اس بے اعتقاد دور میں بڑی معتبر ہے، وہ طبیب، عالم، علم دوست، اچھے محقق اور مصنف ہیں۔ چمکنے چمکانے، مرعوب کرنے اور مرعوب ہونے سے کوسوں دور ہیں بے جا بات کہنے اور سننے سے وہ ہمیشہ بچتے رہے ہیں اسی لئے کرار نوری صاحب کا کلام ان کے ہاتھ میں دیکھ کر میں نے اپنا اور ان کا از سر نو جائزہ لیا۔ میں ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا مگر دماغ برابر سوچتا رہا کہ مولانا کرار نوری صاحب سے اپنے تعلقات شاید نباہ رہے ہیں ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ دو روز قبل ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں کرار نوری صاحب سے میری سرسری ملاقات ہو چکی تھی جس میں انہوں نے اپنے کلام کی طباعت کا ارادہ سنایا تھا اور مجھ سے لکھنے کیلئے کہا تھا میں نے اخلاقاً ہامی بھری تھی مگر خیال تھا کہ کرار صاحب کو نہ میرا گھر ملے گا نہ ان پر لکھنے کی نوبت آئے گی۔ اب جب برکاتی صاحب ان کے اشعار کے ساتھ آ ہی گئے تو راہِ فرار مسدود ہو چکی تھی۔ انکار کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

پھر مولانا اپنے عزم اور ادب آموز تبسم اور پرشفقت باتوں کے بعد چلے گئے اور میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں پھر خیال [illegible] کلام [illegible] جس طرح کئی کتابوں کے لئے پیغام کے طور پر لکھ ڈالا ہے۔ سہل انگاری کا ایک

نمونہ اور سہی کون کتابوں کو پڑھتا ہے اور کون تمہاری بلائے کے بارے میں سوچتا ہے یہ دور پڑھنے اور سوچنے پر اتنا بھروسہ نہیں کرتا جتنا سننے اور دیکھنے پر ۔ سننے کے لئے تقریبات اور ریڈیو ہے دیکھنے کے لئے ٹی ۔ وی اور شاعر و ادیب کا حلقہ ارادت میداں ۔ اس خیال سے ڈھارس بندھی ۔ مگر لکھنے سے جان چرانا چونکہ عادت بنتی جا رہی ہے اس لئے ذہن پر ایک بوجھ سا محسوس ہونے لگا ۔ شام ہو گیا اور بوجھ بڑھتا گیا ۔ یہاں تک کہ رات آگئی اور طبع بہانہ جو نے ایک اور راہ فرار اختیار کی ابھی کئی دن باقی ہیں ۔ اطمینان سے لکھیں گے جلدی کیا ہے ۔ لیکن یہ نسخہ بھی کارگر نہ ہوا حکیم برکاتی صاحب کا آنا مجھے لکھنے کا حکم دینا رہا بہ ہو کر میں نے کرار نوری صاحب کا مسودۂ کلام بے دلی سے اٹھایا پہلا ہی شعر پڑھا تھا کہ بوجھ کچھ ہلکا ہونے لگا ۔

رہ حیات میں کوئی چراغ ہی نہ ملا — کسی دماغ سے اپنا دماغ ہی نہ ملا ۔

تیز لہجے کا شعر ہے جو تنہائی کے اندھیرے میں چمک اٹھا ہے ۔ بری بات ہو یا اچھی بات ہو کرار نوری صاحب اس میں موجود ہیں ۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے ان سے قریب ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا ۔ ان کے تیور مجھے کبھی نہیں بھلائے ان میں ایک قسم کی جارحیت اور آمادۂ تکرار آدمی کی جھلک مجھے ملتی رہی ہے لہٰذا یہ شعر ان کی شخصیت کے عین مطابق ہوا ۔ پھر جیسے جیسے ان کے اشعار پڑھتا گیا ان کی شخصیت جارح کم اور مظلوم زیادہ معلوم ہونے لگی مظلوم آدمی کمزور نہیں ہوتا وہ جارح سے زیادہ توانا اور زندگی بخش ہوتا ہے اس کی زخم خوردگی ہی اس کے اور دوسروں کے لئے مرہم بنتی ہے ۔ کرار نوری کے اشعار میں زخم و مرہم کا یہ سلسلہ ملتا رہتا ہے ان کے اشعار ان کی زندگی کے تجربات کے ترجمان ہیں شاید ان کے معاصر شعراء میں کم ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے اتنی سچائی کے ساتھ اپنی ترجمانی کی ہو ان کے اشعار کو پڑھ لینا ان سے مل لینا ہے آپ نے اس دور کے کئی شعراء کو پڑھا ہوگا ۔ ان کے کلام میں آپ کو ذات کا فلسفہ ، معاشرے کی ریاکاری پر طنز اور سیاست کی کارفرمائی ملی ہوگی مگر اس شخص سے شاید ملاقات نہیں ہوئی ہوگی جو شعر کہہ رہا ہے کرار نوری صاحب اپنی بات اپنے لہجے میں کہتے ہیں ۔ آئیے ان سے ملیں ۔

برباد کر گئی مرے لہجے کی تمکنت — تھا میرا انکسار بھی پندار کی طرح

مری سرشت میں عنصر مفاہمت کا نہیں — متاع زیست یہی ہے کہ بحث کرتا رہوں

دو میٹھے بول ہم سے فقیروں کا مول ہے — یہ تم بھی جانتے ہو کہ ارزاں نہیں ہیں ہم

ناکامیوں نے اور بھی سرکش بنا دیا — اتنے ہوئے ذلیل کہ خوددار ہو گئے

اے دوست مری تند کلامی سے درگذر — ہیں حرف تیز تو ہوں مگر بے گزند ہوں

اور اب یہ شعر دیکھئے عجیب و غریب شعر ہے ۔

میں وہ اس دور کا موسیٰ ہوں کہ جس کو ماں نے — پاس رکھا نہیں دریا میں بہایا بھی نہیں

میرا خیال ہے کہ یہ چند اشعار کرار نوری صاحب کی ذات و صفات سے آشنا کرنے کے لئے کافی ہیں معلوم نہیں ان اشعار کا آپ پر کیا اثر ہو مگر میں اپنی بات کہتا ہوں مجھے ان اشعار نے ان کی درویشی سے آشنا کیا البتہ درویشوں میں کچھ جلالی درویش بھی ہوتے ہیں کرار نوری صاحب مجھے کچھ اسی قسم کے آدمی معلوم ہوئے یہ اشعار وہی کہہ سکتا ہے جو اپنے کو نقصان پہنچانے کا حوصلہ اور ہمت رکھتا ہو ۔ نئے شعراء نے بہت کھل کر لباس کے اندر بے لباسی کو دکھایا ہے اور پست قدروں کا مذاق اڑایا ہے ۔ مگر کرار نوری صاحب نے کسی کی تذلیل اور تحقیر کر کے اپنی بڑائی نہیں جتائی وہ محض اپنے بارے میں لکھتے ہیں اور جو لکھتے ہیں

اس میں صداقت ہوتی ہے۔

ابھی جو اشعار آپ نے پڑھے ہیں ان میں تلخی تو آپ کو ملی ہوگی مگر المناکی کا کوئی عنصر نہیں ملتا اب چند اور اشعار نیچے یہ اشعار شاعر کی اس شخصیت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں جو اپنے گھر میں بھی تنہائی کی بد دعا لئے کسی طرح زندگی کاٹ رہی ہے زندہ رہنا دکھ ہو یا سکھ ہو یہ الگ بحث ہے مختلف طباع اور مختلف حالات کے ساتھ زندگی کے نظریات بدلتے یا متعین ہوتے رہتے ہیں۔ مگر تنہائی کا عذاب سہتے ہوئے زندہ رہنا ایک ایسی خلا میں آدمی کو پہنچا دیتا ہے جہاں نہ دکھ ہے نہ سکھ ہے صرف "بے آدمیت" ہے "جو کسی کا نہ ہونا" ایک عجیب سا احساس ہے یہ ایک عذاب ہے جس میں کوئی شریک ہو کر آدمی کو نجات نہیں دلا سکتا۔ کرار نوری صاحب کی خوددار، پر تمکنت، مستغنی اور یلغار کرتی ہوئی آواز کے پیچھے مجھے اس "عذاب" میں مبتلا آواز سنائی دینے لگی۔

تنہائیوں کے دائرے یعنی یہاں کے گھر — ہر اک ہے اپنے آپ میں گویا بسا ہوا

ادھر ادھر سفر زندگی تمام کیا — کسی نے بات نہ پوچھی جہاں قیام کیا

مرے ہی لہجے میں بولا ہے گھر کا سناٹا — کچھ اسقدر در و دیوار سے کلام کیا

شہر میں تنہا تھا لیکن کرب تنہائی نہ تھا — گھر سے باہر رہ کے میں اتنا تو سودائی نہ تھا

کوئی ہمسایہ بتا ہی نہ سکی تنہائی — لوگ رہنے کو تو رہتے ہیں مرے گھر کے قریب

خدا کرے در و دیوار کان رکھتے ہوں — زمانہ گذرا ہے روداد غم سناتے ہوئے

نام لے کے کبھی ہم کو بھی پکارے کوئی — گھر کا دروازہ کسی روز تو کھولیں ہم بھی

ہم بھی دن بھر کی کشاکش کے تھکے ہارے ہیں — کوئی گوشہ کہیں مل جائے تو سو لیں ہم بھی

وہ کس امید پہ گھر میں رہے کہ جس گھر میں — نہ آنے والا ہو کوئی نہ جانے والا ہو

رات آئی ہے ہم کدھر جائیں — گھر ہو کوئی تو ہم بھی گھر جائیں

بے گھری اور بے دری پر کرار نوری صاحب نے اتنے اشعار کہے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کو انہوں نے بالکل اسی طرح اپنے لئے مخصوص کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس طرح ریاض خیرآبادی کے یہاں خمریات اور پیارے صاحب رشید کے یہاں پیری کے موضوعات مخصوص ہو گئے ہیں۔

اس موضوع پر دور جدید کے تقریباً ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ ضرور کہا ہے تنہائی اور کوچہ گردی کچھ مقدر سا بن گئی ہے کرار نوری صاحب یہاں تنہا نظر نہیں آتے وہ اس جم غفیر کے ساتھ ہیں جو شاہراہ حیات پر اگرچہ شانہ بشانہ چل رہا ہے مگر تنہا ہے۔ "بے در و دیوار سا اک گھر" بنانے میں وہ سب کے شریک ہیں یہاں وہ فرد نہیں افراد میں تحلیل ہو کر گم ہو جاتے ہیں لیکن ان میں اور دوسروں میں ایک فرق ہے دوسرے موقع اگر مل جائے تو گھر تو کیا محل بنانے میں فوراً مصروف ہو جائیں موقع کا نہ ملنا اکثر و بیشتر ان کی تنہائی کا جواز ہے۔ کرار نوری صاحب کے یہ اشعار بتلاتے ہیں کہ وہ موقع ملنے کے باوجود بھی اس سے فائدہ اٹھانے کے اہل نہیں۔

موقع پرستی غالباً ان کی سرشت میں نہیں ہے ان کے پرتاثیر اور برق بن کر چمک اٹھنے والے اشعار وہی ہیں جن میں عدم مفاہمت کی آواز کبھی گرجتی اور کبھی برستی ہے یہ خشک آنکھوں کی شاعری ہے بڑی سختی کے ساتھ کرار نوری صاحب

نے اپنے دل کو سنبھالا ہے۔ اس شاعری میں جدت طرازی، الفاظ تراشی اور انفرادیت پیدا کرنے کی دوڑ میں سب سے آگے نکل جانے کا کوئی "ہوکا" آپ کو نہ ملے گا نئے شعرا کو پڑھتے پڑھتے وہ جو اشعار کو ایک خاص قسم کی جذباتی رومانی علامتی اور مبہم فضا میں پہنچ کر پسند کرنے کی ہم میں عادت سی پڑ گئی ہے اس کی بنا پر ممکن ہے کرار نوری صاحب ہمیں پسند نہ آئیں مگر کرار نوری صاحب کو ہم پسند کریں یا ناپسند کریں۔ وہ کرار نوری ہی رہنے پر مصر ہیں اور ہمیشہ "وہی" رہیں گے جو ہیں۔ ان میں "پریشاں نظری" کا کوئی "لپکا" نہیں ہے۔

میں جناب محمود احمد برکاتی کا ممنون ہوں کہ ان کی وجہ سے کرار نوری صاحب کے کلام اور کلام کی وساطت سے ان کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے لگا۔ ان کو پڑھ کر ان سے بدگمانی دور ہوگئی۔ البتہ اپنے سے بدگمانی شروع ہوگئی کہ اب تک میں اس کلام سے کیوں دور رہا۔

ان کی شاعری پیچ، اچھی اور بڑی حد تک بے عیب ہے یہ باتیں جس شاعر میں بھی پائی جائیں اسے نظر انداز کرنا اپنی بدذوقی کا اعلان ہے۔

●

احمد علی سیّد

اَنا کا مسافر

ایک شخص نے شاعری کی اور اپنی ہستی کی آسودگی پائی ایک اور شخص نے مال و منصب پر تصرف حاصل کیا اور اپنی تسکین کا سامان بہم پہنچایا ان میں پہلے مرزا غالب تھے اور دوسرے تجمل حسین خان۔ اب ہم پوچھتے ہیں کیا غالبؔ یا تجمل حسین خان کو انتخاب کی آزادی تھی مطلب یہ ہے کہ غالب۔ شاعر نہ بنتے بلکہ تجمل حسین خان جیسے آدمی بن جاتے یا تجمل حسین خان صاحبِ مال و منصب نہ بننے بلکہ غالب جیسے بن جاتے کیا یہ ممکن تھا؟ واقعات شہادت دیتے ہیں کہ غالب با وجود آلام زندگی کے تجمل حسین خان نہ بن سکے اور تجمل حسین خان با وجود نام و نمود کی شدید خواہش کے غالب نہ بن سکے یہ واقعات اپنی جگہ درست سہی مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی بات کا عملی طور پر ظہور پذیر ہونا اس کے منطقی امکان کو ختم نہیں کرتا پھر کیا یہ درست ہے کہ غالب کے اندر کوئی تجمل حسین خان چھپا بیٹھا تھا جو ظاہر نہ ہو سکا یا تجمل حسین خان کے اندر کوئی غالب پنہاں تھا جو پنہاں ہی رہ گیا ان باتوں کا قطعی فیصلہ فطرت انسانی کے بارے میں گہری بصیرت کا تقاضہ کرتا ہے اور فطرت انسانی کے بارے میں گہری بصیرت رکھنے والوں نے کہا ہے کہ انسان بنیادی طور پر یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے طور پر کچھ ہو، وہ باوقعت بننے کی شدید خواہش رکھتا ہے ایک فطری رجحان ہے اور یہ رجحان سب انسانوں میں ہوتا ہے۔ مگر انسان دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو کہ اپنی تخلیقی ہستی میں اپنی آسودگی اور اپنی وقعت تلاش کرتے ہیں دوسرے وہ جو کہ مال و منصب پر قبضہ اور تصرف حاصل کر کے اپنی تسکین کا سامان تلاش کرتے ہیں۔ ایک شاعر چاہتا ہے کہ وہ جو کچھ ہو اپنی تخلیقی ہستی سے ہو اور ایک منصب دار مال و منصب میں اپنی تسکین چاہتا ہے۔ اب ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مرزا غالب اور تجمل حسین خان انسانوں کی دو مختلف قسموں کی نمائندگی کرتے ہیں وہ دونوں اپنی اپنی سرشت میں ایک دوسرے سے الگ ہیں مرزا غالبؔ تجمل حسین خان نہیں بن سکتے اور تجمل حسین خان مرزا غالبؔ نہیں بن سکتے یہ ان دونوں کی حقیقی صورتحال ہے مگر ہمارے زمانے میں تجمل حسین خان بڑی آسانی سے غالب بن جاتے ہیں اور ان کو پیشہ ور گواہ بھی مل جاتے ہیں جو اپنے علم و ایقان کے حوالے سے ان کے غالب ہونے کی بات کرتے ہیں اور کوئی ان سے یہ نہیں پوچھتا کہ تجمل حسین خان غالبؔ کیسے بن سکتے ہیں؟ اس کے برعکس غالبؔ کے بارے میں یہ رویہ عام ہوتا جا رہا ہے کہ

؏ غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔

اور یہ رویہ بھی کہ ؏ "در شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے"۔ اس غلط کاری پر میں واویلا کرنا نہیں چاہتا کیونکہ واویلا

کرنا صرف اپنے مصلحین کا کام ہے اور اس کام کو وہ بخوبی انجام دیتے ہیں میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب شعر و سخن کی بات چلے تو ایک حقیقی شاعر کو شاعر کا مقام دیا جائے اور غیر شاعر کو غیر شاعر کے مقام پر رکھا جائے۔ ورنہ حرف کی صداقت کا اعتبار اٹھ جائے گا۔

ہمارے زمانے میں متعدد شعرا ایسے ہیں جنہوں نے شان بے نیازی سے تجمل حسین خان جیسی زندگی کو ٹھکرا دیا اور آلام و مصائب کے باوجود تخلیقی انداز کی زندگی بسر کی مگر ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی گئی اس بات کی بھی داد نہ دی گئی کہ انہوں نے کس خوش سلیقگی سے تخلیقی انداز کی زندگی نہایت صبر آزما حالات میں بسر کی ہے ان میں ایک نام کرار نوری کا ہے جس نے اند ک و بسیار کے پھیر میں پڑنے کے بجائے ایک تخلیقی زندگی کی ذمہ داری قبول کی کیونکہ ان کی سرشت کا حقیقی رجحان یہی تھا۔ وہ قلندرانہ انداز سے اپنی انا کا سفر طے کرتا آیا ہے ایک تخلیقی زندگی بسر کرنے والے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ غالب کا ہمسر ہو وہ کم درجے کا شاعر ہو سکتا ہے اور کم تر درجے کا بھی۔ بنیادی اور اہم بات یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں تخلیقی، رجحان کی کارفرمائی کا مظاہرہ کیا اگر کوئی شخص شاعر ہونے کا دعویدار ہے مگر اس کی سرشت کا نمایاں ترین اور عمیق ترین رجحان غیر تخلیقی رہا ہے تو آپ اس کے نام کو بلا تامل قلم زد کر سکتے ہیں لیکن جو شخص اپنے تخلیقی رجحان میں اپنی ہستی کی تمام تر معنویت تلاش کرتا رہا ہے تو وہ اقلیم سخن کا معتبر شخص ہے اور اس توجہ کا مستحق ہے کہ آپ اس اقلیم میں اسکی قدر و قیمت متعین کریں اس لئے آئیے کرار نوری کی بات کرتے ہیں۔

کرار نوری کی شاعری ایک ناآسودہ آدمی کی انا کا سفر ہے مگر اسکی ناآسودگی ایسی نہیں جیسی ایک مال و منصب کے آئینہ دار کی ہوتی ہے۔ یہ ناآسودگی ایک شاعرانہ انا کی آسودگی ہے وہ اپنی انا کی تسکین چاہتا ہے مگر یہ تسکین مل کر بھی نہیں ملتی۔ انا کا مسافر اپنا دل ناصبور لئے ہر منزل سے آگے بڑھتا جاتا ہے آخر دنیا پیمانۂ حیات بھر کر رخصت ہو جاتا ہے وہ جو ایک گلہ بان کی حکایت ہے کہ اس نے قوس قزح کو چھونے کی آرزو کی تھی اور اس آرزو کو دل میں لئے وہ آگے بڑھتا گیا تھا مگر شام ہو گئی اور وہ قوس قزح تک نہ پہنچ سکا آخر قوس قزح بھی غائب ہو گئی اور وہ بھی اندھیرے میں غائب ہو گیا یہ حکایت در اصل انا کے مسافر کی حکایت ہے وہ ہر لمحہ بلندی پر ایک منظر بنانے کی دھن میں لگا رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ عرش سے پرے اس کا مکان ہو مگر یہ شکایت کرتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے کہ

؎ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔

انا کے سفر کی یہی انتہا ہوتی ہے لیکن اس طویل سفر میں انا مختلف منزلوں سے گذرتی ہے اور ہر منزل پر اس کا لب و لہجہ غیر محسوس طور پر بدلتا ہے سفر کے آغاز میں انا کی آواز بڑی گھن گرج رکھتی ہے یہ اس کی پہلی منزل کی عمومی شناخت ہے مگر ایسا نہیں ہوتا کہ انا ہمہ وقت گرجتی رہے۔ چڑھتے بادل مسلسل نہیں گرجتے اور ان کی گرج ہمیشہ یکساں رہتی ہے یہ گرج کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے یہی کیفیت انا کی آواز کی ہوتی ہے مگر اس گرج میں ایک قوت ہوتی ہے۔ پھر اس قوت میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگتی ہے اور نامساعد حالات سے ٹکرا کر اس میں ایک طرح کی بیقراری اور بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ انا کے لب و لہجہ میں فرق پیدا ہوتا ہے اور اس کی آواز میں ایک زخمی آواز کی خستگی پیدا ہونے لگتی ہے یہ انا کے سفر کی دوسری منزل ہوتی ہے۔ پھر انا کے دم خم میں زوال آمادگی پیدا ہونے لگتی ہے اور قوت کے اضمحلال کا احساس پیدا ہوتا ہے انا یہ کہنے لگتی ہے کہ آدمی حافظ و سعدی ہوا تو کیا اور عرفی اور نظیری ہوا تو کیا۔ اور "لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم"، اور یہ کہ "دم واپسیں بر سر راہ ہے"! یہ انا کے سفر کی تیسری اور آخری منزل ہوتی ہے۔

ان تینوں منزلوں سے انا کا ہر ایک مسافر گزرتا ہے لیکن یہ بات خاص طور سے ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ وہ انا کی تین مختلف منزلوں کی عمومی خصوصیات ہیں یہ ضروری نہیں کہ دوسری منزل پر کسی انا کی آواز ہمیشہ زخمی ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ تیسری منزل پر پہنچ کر کوئی انا ہمہ وقت نیشی کی رکارٹ لگاتی رہے آدمی کی نفسی کیفیات کو الگ الگ خانوں میں اس طرح نہیں رکھا جاسکتا جس طرح بغیر ذی روح اشیاء کو الگ الگ خانوں میں رکھا جاسکتا ہے ہر منزل پر ایک انا اپنی ترنگ میں قوت کے لمحوں سے دوچار ہوسکتی ہے اسی طرح ہر منزل پر وہ کمزور لمحوں سے بھی دوچار ہوسکتی ہے انا کا سفر بڑی حد تک دریا کے سفر کے مماثل ہوتا ہے شروع میں تیز و تند، درمیان میں نسبتاً نرم اور آخر میں سست رو۔ مگر آدمی دریا کی طرح ہر کر بھی پوری طرح دریا نہیں ہوتا بلکہ اس کے مزاج میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت نمایاں ہوتی رہتی ہے اور اس بدلتی ہوئی کیفیت میں وہ اپنی انا کا سفر طے کرتا ہے اب آپ کرار نوری کی شاعری کا مطالعہ کریں تو اسکی شاعری کا لب و لہجہ شروع میں عموماً تند و تیز ہے۔ وہ کچھ اس طرح کی بات کرتا ہے۔

سیلاب وار اپنی ہی دھن میں ہوں تیز رو　　　چلتا نہیں زمانے کی رفتار دیکھ کر

مگر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمہ وقت اپنی انا کے اظہار میں تند و تیز لب و لہجہ میں آپ کو مخاطب کرتا رہا ہو مگر ایک خاص انداز کا طمطراق آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ مثلاً

کیسے ہے جرأتِ تائیدِ غیب اے نوری　　　مرے خیال کو دنیا میں آئینہ نہ ملا

لیکن رفتہ رفتہ لہجے کا یہ بانکپن اور طمطراق ایک دوسری کیفیت میں بدلتا گیا اس کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ طمطراق و تمکنت اس کی آسودگی کی منزل نہیں بلکہ اس منزل کی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ ہے۔ وہ پھر یوں کہتا ہے۔

برباد کر گئی مرے لہجے کی تمکنت　　　تھا میرا انکسار بھی پندار کی طرح

یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

کیا بات ہے نوری جو ہے اب لہجے میں نرمی　　　تم نرمیِ گفتار کے قائل تو نہیں تھے

اور یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ہم نے لچک نہ کھائی زمانے کی ضرب سے　　　گو حادثاتِ دہر کی زد میں کچل گئے

یہ تیسرا شعر اس منزل کی نشاندھی کر رہا ہے جس کی طرف اسکا سفر جاری ہے۔ آخر وہ منزل بھی آجاتی ہے اور نوری اپنی بات یوں کہتا ہے۔

ایک ایک کر کے ہر اک تاج محل ٹوٹ گیا　　　دل میں ارمان سجا رکھے تھے کیا کیا میں نے

اس منزل پہ نوری کے یہاں شدید تنہائی اور خالی خالی پن کا احساس پیدا ہوتا ہے وہ اپنے اندر ایک خلا پاتا ہے مگر ایک بڑے انا پرست کی طرح وہ اس خلا میں رہنے کی تاب نہیں لاتا وہ انا کا مسافر ہے مگر اتنا بڑا انا کا مسافر نہیں جتنا بڑا غالب تھا۔ بلکہ وہ اس سفر میں یگانہ سے بھی پیچھے رہ جاتا ہے۔ یگانہ کی انا بڑی تہلکہ خیز تھی۔ نوری اپنے دم خم اور بانکپن کے باوجود انا کے سفر میں اس سے کمزور پڑتا ہے یگانہ ایک منفی انا کی گرفت میں ہونے کے باوجود اپنی ذات کے خلا میں رہنے کا کرب برداشت کرتا ہے اور اس کرب سے شاعری پیدا کرتا ہے مگر کرار نوری اس منزل پر اپنی تنہائی کی اذیت سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

کیا جانے دوستی کی ضرورت کو کیا ہوا ۔۔ یوں تو ہے ایک گھر مرے گھر سے ملا ہوا

یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

شہر میں تنہا تھا لیکن کربِ تنہائی نہ تھا گھر سے باہر رہ کے میں اتنا تو سودائی نہ تھا

اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

خدا ہو یا کوئی بت ہو کوئی تو ایسا ہو جو دل کی بات کہے اور دل کی بات سنے

میں نے یگانہ یا غالب کا اوپر جو ذکر کیا ہے اس سے مرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ میں شاعری میں کرار نوری کے کلام کو ان بزرگوں کے کلام کے ساتھ رکھ کر دیکھوں اس قسم کا تقابل ممکن نہیں ہے کیونکہ یگانہ کچھ اور ہیں اور غالب کچھ اور ہیں اور کرار نوری کچھ اور ہیں، غالب و یگانہ کا اپنا اپنا شعری جوہر اتنا منفرد اور بے مثل ہے کہ تقابل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان دونوں بزرگوں نے اردو شاعری کو فکر و خیال کی جن بلندیوں تک پہنچایا ہے وہ ان ہی کا حصہ اور ان ہی کا کام تھا، مگر غالب اور یگانہ کی طرح کرار نوری بھی انا کے مسافر ہیں اور انا کا سفر خواہ وہ کسی فرد کا ہو خاص مرحلوں سے گذرتا ہے اس سفر میں ایک نوع کی بنیادی مماثلت ہوتی ہے اس لئے انا کا ہر مسافر اپنے پیشرو سے کم از کم جہت کی مماثلت ضرور رکھتا ہے۔ اس لئے جب کسی شاعر کے انا کی بات ہوگی تو ذہن غالب اور یگانہ کی انا کے سفر کی طرف ضرور جائیگا۔ کرار نوری چونکہ بنیادی طور پر انا کا مسافر ہے اس لئے سفر کی بات کرتے ہوئے ان ہستیوں کے نام ضرور آئیں گے جنہوں نے اس سے پہلے انا کا سفر طے کیا تھا یہ اور بات ہے کہ ان ہستیوں نے اپنا اپنا سفر اپنی اپنی بے مثل قوت کے ساتھ طے کیا تھا میں نے اس بات کی وضاحت اس لئے کی کہ کرار نوری انا کا مسافر ہونے کے باوجود اپنی شاعری میں کوئی ایسا معنی خیز انحرافی رویّہ پیدا نہ کر سکا جیسا کہ غالب یا یگانہ نے پیدا کیا تھا۔ بلکہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر غالب کی پیروی اپنی بساط کے مطابق کرتا رہا ہے اور کہیں کہیں اس کے یہاں یگانہ کے رنگ کی جھلک نظر آتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے غالب اس کا آئیڈیل ہے اس نے غالب کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور کہیں کہیں اعلیٰ اور بصیرت افروز مضامین بھی موزوں کئے ہیں مگر وہ اپنے خیال کی پرواز میں وہاں نہ پہنچ سکا جہاں وہ عظیم شاعر پہنچا تھا جس نے کہا ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

کرار نوری کی رسائی بس یہاں تک ہے۔

نہیں کوئی ازل کوئی ابد تقویم حرکت میں عوامل خود بخود ہر دم بہم ہوتے ہی رہتے ہیں

اس شعوری یا غیر شعوری پیروی کے باوجود کرار نوری کوئی ایسا پیرو نہیں کہ پیروی میں اپنی انفرادیت سے دست بردار ہو جائے وہ غالب کی زمینوں میں غزلیں کہتا ہے مگر چاہتا ہے کہ صرف اپنی بات کہے وہ جانتا ہے کہ طاقتور لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کرنا آسان نہیں مگر ان پر قبضہ جمانے کی وہ کوشش بھی کرتا ہے وہ اپنی پیروی میں پیش روی کے تیور پیدا کرنا چاہتا ہے اس کوشش میں وہ کامیاب نہیں ہوتا مگر یہ کہے بغیر نہیں رہتا۔

مانا کہ ہم اس دور کا حاصل تو نہیں تھے ناقدریٔ دنیا کے بھی قائل تو نہیں تھے

میں اگر چہ حتمی طور پر اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ نوری نے غالب کی پیروی شعوری طور پر کی ہے یا غیر شعوری طور پر مگر اس کی شاعری کے ذریعہ اسکی ذات تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو زیادہ قرائن اس بات کے ملتے ہیں کہ غیر شعوری طور پر۔

غالب کی انا پسند شخصیت سے وہ متاثر ہوا ہے وہ خود انا پسند ہے اور ایک بڑے انا پسند سے ایک طرح کی مناسبت فطری بات ہے اس بات کو تقویت اس حقیقت سے بھی ملتی ہے کہ ایک انا پسند شخص کسی کا ہو کے نہیں رہتا بلکہ اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ دوسرا اس کا بن جائے وہ کسی اور کا جزوِ ذات نہیں بنتا لیکن یہ کوشش کرتا رہتا ہے کہ دوسرے کو اپنی ذات کا جز بنالے اور یہ ممکن نہ ہو تو پھر اپنے رستے پر گامزن رہے کسی دو طرفہ مفاہمت کا وہ قائل نہیں ہوتا۔ نوری جب یہ کہتا ہے کہ

ع رہِ حیات میں کوئی چراغ ہی نہ ملا کسی دماغ سے اپنا دماغ ہی نہ ملا

تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے کیونکہ ایک انا پسند شخص اپنی سرشت سے کچھ ایسا ہی ہوتا ہے اور اسی طرح کی باتیں کرتا ہے کہ

مری سرشت میں عنصر مفاہمت کا نہیں متاعِ زیست یہی ہے کہ بحث کرتا رہوں

ایک انا پسند انسان ٹوٹ کر عشق نہیں کر سکتا، وہ کسی بت کی یہاں تک پرستش نہیں کر سکتا کہ اسکو سبھوں کی نظر میں خدا بنا دے نہ وہ کسی جانِ آرزو کے لیے خوار ہوتا ہے نہ وہ کسی دیوار کے سائے میں پڑا رہتا ہے اور نہ وہ کسی کی جستجو کرتے ہوئے خود کھو جاتا ہے وہ اس بات کو مانتا ہی نہیں کہ

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن

بلکہ وہ تو ہر وقت اپنی بو دلی دکھانے کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ اسکا محبوب سے کچھ اس قسم کا تعلق ہوتا ہے جیسے ایک شخص کا اپنے سوٹ کے کالر پر لگے ہوئے پھول سے تعلق ہوتا ہے یا ایک طلائی تمغے سے تعلق ہوتا ہے۔ نوری کی شاعری بندۂ جاناں بودن کے جذبے سے یکسر عاری ہے وہ جس پر مرتا ہے اسکو مار رکھتا ہے یہ ممکن نہ ہو تو اس پر کمند ڈالتا رہتا ہے اس تعلق میں بھی وہ اپنی خودی کا اظہار کرتا رہتا ہے خودی کا یہ اظہار شدت اختیار کرتا ہے تو خود نمائی بن جاتا ہے اور بسا اوقات تعلّی کی حد تک پہنچ جاتا ہے وہ محبوب سے بات کرتا ہے تو اس میں بھی اپنی عظمت کے پہلو نکالتا ہے۔ مثلاً

اک تم کہ سو بناؤ کی تم کو ہے احتیاج اک ہم کہ ہم پہ چاک گریباں بھی محترم

لیکن اس ضمن میں بیشتر وہ خیال آفرینی کرتا ہے مثلاً

ان آندھیوں میں نہ جانے کدھر سے آجاؤ میں جا رہا ہوں ہر اک سو دیا جلائے ہوئے

عشق کے بجائے اس کے یہاں انسان دوستی کے جذبات کا اظہار ملتا ہے ایک انا پسند شخص کی انسان دوستی کیا ہوتی ہے؟ اس سوال پر تفصیلی بحث کا یہ مقام نہیں۔ مختصراً یہ عرض ہے کہ انا پسند شخص انسان دوستی کے جذبے میں بھی اپنی انا کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے وہ اس لئے انسان دوستی نہیں کرتا کہ یہ اگرچہ مبہم سہی لیکن ایک بڑا آدرش ہے بلکہ انسان دوستی میں اس کو اپنی عظمت مضمر نظر آتی ہے وہ دوسروں کا غم خوار بن کر خود کو بڑا محسوس کرتا ہے۔ یہ انسان دوستی نوری کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے اور یہ اس لئے قابل قدر ہے کہ ایک انا کے مسافر کے جذبات کی سچی تصویر ہے۔ میں نے اس مضمون میں اس مسئلے پر گفتگو کی ہے جس سے کرار نوری کی شاعری پیدا ہوئی ہے اس کی شاعری اس کی انا کی تسکین ہے مگر انا کی مکمل تسکین ممکن نہیں انا جتنی سیراب ہوتی ہے اتنی ہی تشنہ ہوتی جاتی ہے آخر وہ ذات کے اندر ایسے ہولناک خلاء تک پہنچ جاتی ہے جہاں آدمی اپنے وجود کی عظیم ترین آزمائش سے دوچار ہوتا ہے اس آزمائش میں کرار نوری کے قدم ڈگمگا گئے ہیں مگر ابھی اسکی انا کا سفر باقی ہے اور مزید آزمائش بھی۔ میں نے اسکی

شاعری اور شخصیت میں کارفرما شواہد کی بنا پر اسکو انسانوں کے اس قبیلے میں شمار کیا ہے جو اپنی ہستی ہی سے ہوتے ہیں جو کچھ بھی وہ ہوتے ہیں ہماری شاعری میں اس قبیلے کے سردار غالب تھے میں نے غالب کی سرداری کے احترام کو ملحوظ رکھا ہے مگر اس دور میں جبکہ تجمل حسین خان بلا تامل غالب بن بیٹھتے ہیں میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں کمزوری سے میں نے زیادتی تو نہیں کی آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا غالب کا اتنا احترام واجب تھا یا میں اپنی وضع احتیاط میں کسی غلطی کا مرتکب ہوا ہوں بہر حال میں اس بات سے مطمئن ہوں کہ میں نے حتی الامکان حرف کے اعتبار کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے - پتہ نہیں میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔

●

سحر انصاری

غزل کی تمکنت

کرار نوری اس عہد کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ ان کا پورا نام سید کرار مرزا ہے۔ سید کے ساتھ مرزا ایسا ہی ہے جیسے میرزا ہرگوپال تفتہ۔

کرار نوری غالب کے ایک شاگرد سید آگاہ دہلوی کے پڑپوتے ہیں۔ انہوں نے آگاہ کا ایک قلمی دیوان غالب لائبریری (کراچی) میں محفوظ کرادیا ہے۔ یہ دیوان راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ سید آگاہ کا تذکرہ لسان اور تلامذۂ غالب کے مصنف مالک رام نے بھی کیا ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ نواب روشن الدولہ سید مظفر تھے جو عہد محمد شاہ میں بخشی تھے۔ سر سید کی "آثار الصنادید"، نظامی کی قاموس المشاہیر اور مالک رام کی تلامذۂ غالب میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد آگاہ دہلوی جے پور آگئے تھے۔ اس کے بعد کرار نوری کے دادا تک ان کا خاندان جے پور ہی میں رہا۔ پھر دہلی میں دوبارہ سکونت اختیار کی۔ کرار نوری کے خاندان کے دوسرے بزرگوں میں سید ظہیر دہلوی اور میر مہدی مجروح کے نام ادبی دنیا میں خاصے معروف ہیں۔

کرار نوری اس خاندانی پس منظر کے باوجود ذاتی طور پر بالکل مختلف حالات کی پیداوار ہیں۔ آگاہ کے بعد ان کے خاندان میں شاعری کا ذوق باقی تو رہا لیکن ان کے دادا جو وکیل اور ان کے والد جو ٹھیکیدار تھے، شعر نہیں کہتے تھے۔ گویا خاندانی طور پر آگاہ دہلوی کے بعد کرار نوری کا نام سلسلۂ شاعری کے ضمن میں لیا جاسکتا ہے۔

کرار نوری کلّے ٹھلّے کے آدمی ہیں۔ چہرے مہرے اور قد و قامت سے ہرگز شاعر معلوم نہیں ہوتے۔ یوں لگتا ہے جیسے حسِ لطیف چھو کر بھی نہ گزری ہوگی۔ لیکن کرار نوری ان افراد میں شامل ہیں۔ جو ظاہر اور باطن کو پرکھنے کے رسمی اصولوں کی نفی کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔

یہاں ادب میں جو آپا دھاپی مچی ہوئی ہے وہ اتنی مہلت کسی نقاد کو نہیں دیتی کہ ادیب و شاعر اور اس کی تخلیقات کے ساتھ کچھ وقت بسر کرسکے اور ان کے ظاہری رنگ روپ کے پردے میں جو کچھ چھپا ہوا ہے اس تک پہنچے اور دوسروں کی رہنمائی کرنے کی زحمت اٹھا سکے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ تنقید کا اعتبار اٹھتا جارہا ہے اس کے جواب میں نقاد کہتے ہیں کہ شاعری کا اعتبار اٹھتا جارہا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلّا۔

تو کرار نوری وہ نہیں ہیں جو بظاہر وہ نظر آتے ہیں۔ بظاہر وہ ایک تندخو، جھگڑالو اور درشت مزاج آدمی نظر آتے ہیں۔ لیکن دراصل ان میں خلوص، درد مندی اور انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کا اندازہ ان سے مل کر یا ان کا کلام پڑھ کر ہوتا ہے۔ اس شخصیت کی تعمیر و تشکیل یا شکست و عدم تکمیل میں ان حالات کا دخل ہے جن سے کرار نوری کو گزرنا پڑا ہے۔

کرار نوری کی ابتدائی گھریلو زندگی ایک محروم توجہ بچے (   ) کی طرح بسر ہوئی۔ اگرچہ ان کی والدہ حقیقی تھیں لیکن ان کے عمومی سلوک سے نوری صاحب کو ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ جیسے وہ سوتیلی ماں کے دامن میں پرورش پا رہے ہوں انہیں اپنے والد سے بھی وہ روایتی محبت نہیں ملی جس کی انہیں شدت سے خواہش رہی۔ انہیں وہ تعلیم بھی میسر نہیں آئی جو ان کے ہم سنوں کا حصہ تھی۔ گورکی نے شاہراہوں کو اپنی یونیورسٹی قرار دیا ہے۔ کم و بیش یہی بات کرار نوری پر صادق آتی ہے۔ انہوں نے گھر کی روایتی محافظت و محبت سے محروم ہونے کے بعد زندگی کے تجربات سے براہِ راست ہی اکتسابِ علم کیا۔ ان کی زندگی نشیب و فراز اور گرم و سرد کی ایک طویل داستان ہے تقسیم کے بعد غالباً ۱۹۵۲ء میں وہ محنت مزدوری کر چکے ہیں۔ فلیٹ کلب کیماڑی پر انہوں نے کوئلے چننے کا کام بھی کیا ہے۔ اور وہیں ایک چھجے کے نیچے سو جاتے تھے۔ وہ اس وقت بھی ایک مشہور شاعر تھے۔ مشاعروں میں لے جانے کے لئے لوگ ان کے گھر کا پتہ پوچھتے۔ مگر گھر تو تھا ہی نہیں۔ اس لئے بندر روڈ کے سبحان اللہ ہوٹل پر ملنے کا وعدہ کر لیا کرتے تھے اور واپسی پر فلیٹ کلب کے باہر دروازے پر اتر جاتے یا کسی بھی ہوٹل پر ٹھہر جاتے۔ اور آج اس زندگی کو چھپانے یا نادم ہونے کے بجائے فخر محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے عملی طور پر محنت کشوں کے احساسات سے واقفیت حاصل کی۔ ان کا ایک مصرعہ ہے ؎

دیکھ کے اپنے پاؤں کے چھالے کیا کیا ہم اتراتے ہیں۔

کرار نوری کی زندگی کی یہی تصویر مجھے ان کے قریب لے گئی۔ خود ساختہ ہستیوں میں ایک اپنا جادو ہوتا ہے جو کرار نوری میں بھی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ فلیٹ کلب پر کوئلے چننے گئے۔ لیکن کوئلے چنتے ہی نہیں رہ گئے انہوں نے زندگی میں ایک ایسی ترقی کی مثال قائم کی جو بہت سے مایوس دلوں اور محروم ہستیوں کے لئے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔

اس پس منظر میں کرار نوری ایک ایسی سماجی اکائی نظر آتے ہیں۔ جیسے اس کا حق ابتدا ہی سے نہیں ملا۔ محبت اور شفقت سے محرومی نے خلوص و محبت کا متلاشی بنا دیا۔ بےگھرے پن نے ابتدا میں والدین کے حوالے سے اور بعد میں شریکِ حیات کی نسبت سے ایک مستقل کیفیتِ کرب کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہی حالات ان کی ذہنی اور نفسیاتی افتاد کا اولین محرک ثابت ہوئے اور ان حالات سے پیدا ہونے والے خیالات و محسوسات کے اظہار کا ایک ہی راستہ تھا۔

خود کلامی ـــ جس کا ایک رُوپ شاعری بھی ہے۔ ویسے کرار نوری کی شاعری میں خود کلامی کا حقیقی عنصر بہت بعد میں شامل ہوا۔ کیونکہ شاعر کو اکثر اوقات اپنے عہد کی مروجہ روش سے آغاز کرنا پڑتا ہے اور بالکل انفرادی اظہار تک آتے آتے خاصا حصہ روایتی اور رسمی اظہار کی نذر ہو جاتا ہے۔

کرار نوری نے غزل سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ یوں تو ۱۹۳۰ء میں ایک آدھ غزل کہہ لی تھی۔ مگر ۱۹۳۸ء تک وہ باقاعدہ غزلیں کہنے لگے تھے۔ لیکن مشاعروں میں نہیں جاتے تھے۔ بیشتر لوگ انہیں ہاکی کے کھلاڑی کی حیثیت سے جانتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں جب وہ ملازم ہوئے تو قرول باغ میں قیام رہنے لگا۔ دفتر اور ہاکی گراؤنڈ کے درمیان کہیں شاعری بھی تھی جس کا انہیں ابھی کوئی اندازہ نہ تھا۔ البتہ اس زمانے میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ وہ قریب کے ایک ہوٹل میں بیٹھنے اٹھنے لگے۔ جہاں یارانِ طریقت رات گئے تک محفل آراء رہتے تھے۔ وہیں انور دہلوی اور شمس زبیری معاصر یا حریف کی حیثیت سے ملے لیکن بعد میں ایسے دوست ہوئے کہ آج بھی رکھ رکھاؤ اسی طرح قائم ہے۔

اس زمانے میں اساتذہ دہلی میں بیخود دہلوی، سائل دہلوی، پنڈت امرناتھ ساحر اور وحشی شاہجہاں پوری زیادہ شہرت رکھتے تھے لیکن کرار نوری نے اپنے مزاج کے پیشِ نظر حیدر دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ یہیں کرار نوری کو اطمینان میسر آیا کہ حیدر دہلوی کے روپ میں وہ ایک ایسی شخصیت کی محفلوں میں قربت حاصل کرتے جا رہے ہیں جس کے نزدیک انفرادیت اور انوکھا پن شاعری کے لئے از حد ضروری تھا۔ تاہم کچھ عرصے بعد کرار نوری اس نتیجے پر پہنچے کہ مطالعہ اور غور و فکر پر زیادہ توجہ دینی چاہئے سب سے پہلے وہ ادیب فاضل اور منشی فاضل کی طرف مائل ہوئے۔ پھر "نکات سخن"، جیسی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ اس طرح شاعری کے معائب و محاسن کا اندازہ ہوا اور ذاتی طور پر اپنی شاعری میں احتیاط برتنے لگے کہ جہاں تک ہو سکے کسی کو فنی اعتراض کا موقع نہ ملے۔

یہی وہ دَور تھا جب جذبی، راز مراد آبادی، شکیل بدایونی، اختر الایمان، احمد راہی اور ضمیر اظہر بھی قرول باغ کے اس ہوٹل میں آنے لگے یہ سلسلہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ کرار نوری اس وقت تک مشاعروں سے گریزاں تھے اور مزید مطالعے پر توجہ صرف کرتے رہے۔ اس زمانے میں انہیں "باقیات فانی"، پر رشید احمد صدیقی کا مقدمہ اور یگانہ کی "غالب شکن"، جیسی تحریریں پسند آئیں۔

جوش ملیح آبادی کا مطالعہ دل لگا کر کیا۔ ان کی شاعری بہت پسند آئی یہاں تک کہ ان کا رنگِ سخن بھی شعوری طور پر قبول کر لیا۔ چنانچہ ایک نظم "آنسو"، جب حیدر دہلوی کو سنائی تو انہوں نے کہا کہ "بے وقوف بناتا ہے۔ جوش کی نظم کو اپنی کہہ کر سناتا ہے"،، اس قسم کی باتوں سے حوصلہ افزائی ہوئی کہ کوشش رائیگاں نہیں جا رہی ہے۔

اسی زمانے میں کرار نوری نثر نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ انہوں نے دو تنقیدی مضامین لکھے۔ ایک "جگر سوختہ"، جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ جب جگر فانی کے انداز میں کہتے ہیں تو ان کے کلام کی نوعیت اور رنگ کیسا ہوتا ہے۔ دوسرا مضمون "فانی رنگین" تھا جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ جب فانی، جگر جیسی رنگین کیفیتوں کا اظہار کرتے ہیں تو ان کا اندازِ سخن کیسا ہوتا ہے۔

چوتھی دہائی کا یہ زمانہ مجموعی طور پر ہنگاموں، گہما گہمی اور سیاسی و سماجی بیداری کا زمانہ تھا۔ ایک طرف انگریز کی حکومت کے خلاف ہر قسم کا احتجاج جاری تھا۔ دوسری طرف ترقی پسند تحریک زوروں پر تھی۔ ادب میں سیاسی اور سماجی شعور کا دَر آنا ایک فطری امر تھا۔ اور حالات کے عین مطابق تھا۔ اس وقت شاعری، افسانہ، ناول، اور تنقید میں جو نقطۂ نظر پیش کیا جا رہا تھا وہ پورے عہد کے لئے ایک نئے اندازِ حیات اور طرزِ احساس کی حیثیت رکھتا تھا۔ کرار نوری بھی ان دونوں تحریکوں سے متاثر ہوئے۔ تحریکِ آزادی سے وابستگی ان کی اس وقت کی بعض نظموں میں نمایاں ہے۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات اب تک ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اختر حسین رائے پوری کی "ادب اور انقلاب"، اور اختر انصاری دہلوی کی "افادی ادب"، جیسی کتابوں سے ان کے ([illegible]) میں تبدیلی ہوئی۔ انہیں انسانی مسائل کے بارے میں سائنسی انداز میں زیادہ سے زیادہ جاننے کا شوق ہوا اور یہ انہماک ایک کل وقتی جنون کی صورت اختیار کر گیا۔

جذبی کے علاوہ دہلی میں اس وقت کرار نوری کی ملاقاتیں ڈاکٹر عبادت بریلوی، میراجی اور غلام عباس سے بھی ہوتی تھیں۔ گویا وہ اپنے عہد کے ترقی پسند اور غیر ترقی پسند ادبی رجحانات سے براہِ راست واقف تھے۔

اس ماحول نے کرار نوری کے ادبی شعور کو ایک خاص سطح بخشی۔ اس پورے ذہنی اور شعری سفر میں ایک بات بہت اہم ہے کہ کرار نوری کا رجحان اس وقت کے رومانی طرزِ احساس کی طرف کبھی نہیں رہا۔ شاید اسی لئے انہیں اختر شیرانی، مجاز، فیض اور راشد سے کوئی خاص رغبت نہیں رہی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے آزادیٔ وطن کی تحریک زور پکڑ گئی۔ وہ محفلیں برہم ہوگئیں۔ آگ اور خون کا دریا امنڈ آیا۔ فسادات کا سارا قیامت خیز منظر ان کی نگاہوں میں آج تک محفوظ ہے۔ اس وقت فرقہ وارانہ جنون اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ ہر طرف وحشت اور بربریت کا دَور دَورہ تھا۔ کرار نوری بھی تن کے کپڑوں سے پاکستان چلے آئے، اور سارا اثاثہ وہیں چھوڑ دیا تھا۔

پاکستان آنے کے بعد کرار نوری کو فوری طور پر جن تجربات سے گزرنا پڑا۔ وہ شاعری کا ایک شدید محرک ثابت ہوئے ان کا احتجاجی اور تنقیدی لہجہ ان کی اس وقت کی شاعری میں نمایاں ہے ابتدا میں ان کا قیام کراچی میں رہا پھر وہ راولپنڈی چلے گئے۔ شروع میں عدم کے ساتھ پیمانہ بکف طلوع ہونے کی روایت چلی پھر کراچی آکر یہ انتہا کو پہنچ گئی۔ تاہم اس زمانے میں بھی ان کے قطعات اور اشعار شراب کی تعریف نہیں بلکہ مذمت ہی سے لبریز تھے۔ جب انہیں احساس ہوا کہ اب شراب کو وہ نہیں بلکہ شراب انہیں پی رہی ہے تو یہ خیال آیا کہ اب دو ہی راستے ہیں۔ شراب کے زیرِ اثر خودکشی یا ترکِ مے نوشی چنانچہ انہوں نے موخرالذکر سے رشتہ استوار کیا۔ اور اس طرح تائب ہوئے کہ آنکھ کے سرخ ڈوروں کو بھی چھپاتے ہیں کہ کسی کو شبہ یا مغالطہ نہ ہو جائے۔

کرار نوری کے یہاں احساسِ تنہائی ایک فطری عنصر کی حیثیت سے ابتدا ہی سے موجود ہے۔ اس پس منظر میں یہ اندازہ کرنا بہت آسان ہے کہ نوری نے تنہائی اور اس کے متعلقات کا اظہار جدید بننے کے شوق میں نہیں کیا ہے بلکہ وہی ان کی حقیقی اور ذاتی زندگی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کرار نوری اس احساسِ تنہائی کو اپنی قلندری، بے نیازی اور شراب نوشی کے پردے میں چھپاتے رہے لیکن ترکِ شراب کے بعد تنہائی اور داخلی زندگی کے سناٹے نے انہیں بہت ستایا۔

گھر، شریکِ حیات کی آرزو اور زندگی کے سکون کی تمنا کرار نوری میں شروع ہی سے تھی لیکن حالات کی بے راہ روی اور فطری بے عملی راستے کی رکاوٹوں میں اضافہ کرتی رہی۔ گھر اور شریکِ حیات کی تمنا کا عکس ہر دَور کی شاعری میں رہا۔ چنانچہ باقاعدہ آغازِ شراب سے پہلے کی کشمکش اور نفسیاتی کیفیات نے ۱۹۵۴ء میں اُن سے "شریکِ حیات" جیسی نظم لکھوائی۔

یہی وہ دَور ہے جسے کرار نوری کی شاعری کا اہم موڑ کہنا چاہیئے۔ اور یہیں سے میری تمام تحریر یا در خود ان کی شاعری کا جواز مہیا ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب میں ہمیں کسی فرد کی زندگی کے نشیب و فراز سے صرف اسی وقت دلچسپی ہوتی ہے جب اس کی جزوی صورتِ حال تک پہنچنے میں مدد ملے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کرار نوری کے ذریعے ہمیں اس کے فن کی تفہیم اور انسانی تہذیب ... ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی ہے۔ اس دَور [illegible]

[illegible]

میں خود نوشت کی سی حقیقت پسندانہ رمزیت پیدا ہو گئی ہے۔ گھر کی تنہائی کا احساس اور اس کے سماجی و نفسیاتی عوامل ان کے یہاں عجیب
رنگوں میں ظاہر ہوئے ہیں:

شہر میں تنہا تھا لیکن کربِ تنہائی نہ تھا — گھر کے باہر رہ کے میں اتنا تو سودائی نہ تھا
جیسے نادیدہ کوئی چاند اُتر آئے گا — ایک بستر کہ ہے خالی مرے بستر کے قریب

ہر ایک صبح دل میں یہی ہوک اُٹھتی ہے — ہمیں بھی ناز سے کوئی جگانے والا ہو
وہ کس اُمید پہ گھر میں رہے کہ جس گھر میں — نہ آنے والا ہو کوئی نہ جانے والا ہو
ہمارے شہر میں کیا کیا سجے سجائے ہیں گھر — ہمارے گھر کو بھی کوئی سجانے والا ہو

یہ وہ شاعری ہے جو اپنے تجربات کی سچائی کے ساتھ اپنا ڈکشن اور لہجہ خود لے کر آئی ہے۔ حسرت موہانی کے یہاں بھی "وہ
ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے،، سے غزل میں ایک نیا دریچہ وا ہوا تھا۔
مغرب میں تنہائی کے جس تجربے کو شاعری کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس کی نوعیت اور محرکات اس تنہائی سے بالکل مختلف ہیں جس سے ہمیں
واسطہ ہے یا جس کا اظہار کرار نوری کی غزل میں ہوا ہے کرار نوری نے تنہائی کو ذات کی بیماری میں تبدیل نہیں کر دیا جس کے بعد خلائق سے کنارہ کشی
کرکے بیزاری اور امتلائی زندگی (NAUSEATING LIFE) میں پناہ ڈھونڈنی پڑتی ہے۔ کرار نوری کی تنہائی زندگی
کی ضرورتوں سے بھاگنے کی تنہائی نہیں ہے بلکہ زندگی کی ضرورتوں کے احساس کو شدید کرنے والی تنہائی ہے۔ اس میں انسان
مابعد الطبیعیاتی یا تجریدی رفاقت کا نہیں بلکہ گوشت پوست کی سماجی رفاقت کا طالب ہوتا ہے۔ کرار نوری کی تنہائی حقیقی ہے
اسی لئے وہ اس فیشن سے دور رہے جسے آج کی شاعری میں بڑے شد و مد سے پیش کیا جا رہا ہے۔
ادب کی سماجی تعبیر و تشریح پر ناک بھوں چڑھانے والوں کے لئے کرار نوری کی شاعری اور افتادِ طبع ایک دلچسپ
اور انوکھی صورتِ حال کی نشان دہی کرتی ہے۔ کرار نوری کے سماجی شعور نے انہیں زندگی سے عہدہ برآ ہونے اور فرد
کی شکست و ریخت کے تجربے کو قبول کرنے کا ایک پیرایہ سمجھایا ہے جبکہ سماجی شعور کے منکرین کے لئے ہر قسم کے عوارضِ نفسی د
ذہنی رہ جاتے ہیں اور وہ اسی کو فلسفہ بنا کر پیش کرنے لگتے ہیں۔
اس ابتدائی تربیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ کرار نوری انسان دوستی اور وسیع المشربی کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل
ہوئے۔ مختلف فرقوں اور مذاہب کے مطالعے کا موقع ملا۔ اسی ضمن میں علم سلسلۂ حیات سے ان کی نظری اور عملی دلچسپی قائم ہوئی جس سے
جدید تمدن کے سائنسی اور عمرانی پہلوؤں پر بھی سوچنے کا موقع ملا۔
شاید یہی وجہ ہے کہ اگرچہ کرار نوری کے پاس جدید علوم کی اسناد نہیں ہیں۔ لیکن ان کی غزل میں بعض ایسے
موضوعات و مضامین در آئے ہیں۔ جو بغیر اس شغف کے ممکن نہیں جو کرار نوری کو خود فکر سے ہے،
مرے ہر سانس سے پیدا عدم ہوتے ہی رہتے ہیں
وجود اپنے تغیر سے عدم تخلیق کرتا ہے
کس قدر دلچسپ بات ہے کہ ہائیڈگر کا فلسفہ تو پڑھیں اور لوگ اور یہ شعر کہیں کرار نوری!

بے ہودہ گردشِ کدہ سکوں، سبب ہے وہ حرکت کا ظہور — اس سے ہٹ کر کوئی معیار مجھے یاد نہیں

دیکھا جو غور سے تو میں تنہا نظر پڑا — ہستی ہر ایک قدرِ انسانی سے کٹ گئی

جنوں کی لمحہ شگافی سے صدیاں پھوٹ پڑیں — اب ان کا ایک نیا اقتصار باقی ہے

ہم اپنا لمحۂ ہستی ابد بنا لائے — نئے ازل کا مگر انتظار باقی ہے

بے محل آج ہے ہر سمت خیالوں کی اڑان، — کسی پرواز سے ملتا نہیں پرواز کا رنگ

سائنس اور جدید زندگی کی ہر آن متغیر کیفیات کا احساس شعر کی زبان میں کس طرح سمٹتا ہے ایک خیال کی صورت گری ٹھیک سے ہو نہیں پاتی کہ ایک نیا خیال صفحۂ تحقیق پہ جگمگانے لگتا ہے۔

اس سحر اس شام سے باہر نکلنا چاہیئے — اے شعورِ زندگی پہلو بدلنا چاہیئے،

کتنی باتیں ہمیں سچی سی نظر آتی ہیں — اور ہر بات میں ایک کھوٹ ملا ہوتا ہے

یہ دُنیا ہے، یہاں کا جو ہے افسانہ، یہیں تک ہے — ہمارا اس کے ہنگاموں سے یارانہ یہیں تک ہے

میں اک حقیقتِ جاوید کی تمنا ہوں — مرے وجود کا نوری عدم تو کیا ہو گا

اس مرحلے پر میں نے یہی چاہا ہے کہ کرار نوری کی غزل کی اس جہت پر توجہ دوں جو حیرت انگیز طور پر اپنے عہد کی صداقتوں اور دانش ورانہ زاویوں کا پرتو لیئے ہوئے ہے۔ شاعری وہبی اور وجدانی چیز ہے لیکن اس میں شاعر کے ذہن اور شعور کی محنت اور اکتساب سے کیا رنگ پیدا ہوتا ہے اس کے مطالعے میں کرار نوری کی غزل کے یہ زاویے ضرور ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

کرار نوری کی غزل کے مضامین میں خاصا تنوع ہے۔ خود احتسابی، انسان دوستی، مطالعۂ کائنات، انفرادی اور اجتماعی نفسیات کی جھلکیاں، کھلی اور در پردہ سیاست کے خلاف ردِ عمل، زندگی سے پیار، تنہائی اور سناٹا، رفاقت کی خواہش، طبقاتی زندگی کی کشمکش، رجائیت اور جمالیات ایسے عنوانات ہیں جن کے تحت کرار نوری کے اشعار کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ اور صحیح معنوں میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس شاعر نے اپنی غزل کو کن امکانات سے ہمکنار کیا ہے۔

غزل کے ضمن میں کرار نوری کی لفظیات بھی مخصوص ہے۔ وہ اپنے تیکھے، قدرے طنزیہ اور تمکنت آمیز لہجے کی مناسبت سے لفظ منتخب کرتے ہیں۔

اکثر الفاظ غزل کی روایتی فضا سے مختلف ہیں۔ دہلی سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ محاورہ بندی اور زبان کی چاشنی پر جان دینے والوں میں نہیں۔ وہ اپنے انداز میں بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواہ اس میں الفاظ غیر روایتی ہوں اور خواہ مضمون کی وسعت کی وجہ سے مصرعہ ڈھیلا ہی کیوں نہ رہ جائے۔ کرار نوری کا لہجہ ان کی غزل میں ایک انفرادی رنگ اختیار کر چکا ہے ان کا شعر دور سے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ کرار نوری کا ہے۔ لہجے کی یہ انفرادیت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

ان کا لہجہ محرومی، بے بسی اور تنہائی کے عالم میں بھی تیکھا رہتا ہے۔ ان کے لہجے میں رجائیت ہے۔ وہ مایوسی یا شکن کے لہجے میں گفتگو نہیں کرتے۔ وہ اس کی شدت اور کاٹ کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا جانتے ہیں۔

اپنے لہجے کی تمکنت کے لئے
میں نے الفاظ روند ڈالے ہیں

کرار نوری کی غزل کے مزاج کا اندازہ مشاعروں اور چیدہ چیدہ اشعار سے نہیں ہو سکتا۔ انکی غزل کا ایک جامع انتخاب ہی پوری کیفیت کا احاطہ کر سکتا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ان کی غزلوں کا ایک جامع انتخاب منظر عام پر آرہا ہے۔ آخر میں کرار نوری کے چند ایسے اشعار پیش کرنا چاہوں گا جو مجھے پسند ہیں۔ یا جن سے میرے مطالعے کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

پہلے ہی سے برہم کن محفل تھی طبیعت
ماحول مگر ہم سے خفا اور بھی نکلا،

کتنی آسان ہے احسان فراموشی بھی
کتنا دشوار ہے شرمندۂ احساں ہونا

مجھ کو تباہ دیکھ کے وہ اس طرح ہنسا
جیسے وہ خود بھی دل میں بہت ہو دکھا ہوا

میرے ہی لہجے میں بولا ہے گھر کا سناٹا
کچھ اس قدر در و دیوار سے کلام کیا

پی کے کم، نشہ بڑھایا گیا گیا،
ہم نے غربت کو چھپایا گیا گیا

ہمارے چہرے کی ویرانیاں تو روئیں گی
جو خشک ہو بھی گئی چشم نم تو کیا ہو گا

برباد کر گئی میرے لہجے کی تمکنت
تھا میرا عرض شوق بھی پندار کی طرح

اعتراف اپنی خطاؤں کا میں کرتا ہی چلوں　　جانے کس کس کو ملے میری سزا میرے بعد

لرز اٹھا ابھی دیوانگی کی رہ جو گزری تھی　　کہ اکثر راستوں پہ میں نے دیوانے بھی دیکھے ہیں

چونکا ہے آج یوں تیرا دیوانہ خواب میں　　جیسے کہ مل گیا کوئی ویرانہ خواب میں

حُسن غمزے سے چُھپا، عشق فراموش ہُوا　　ایسے حالات میں کیا شعر بھی سچا نہ کہوں

ایسا نہ ہو کہ آپ پریشان دکھائی دیں　　اتنا مرے لئے کبھی سوچا نہ کیجیے

مَیں تو اکثر اُداس رہتا ہوں　　آپ کو لوگ کیوں بُلا لائے

مانا کہ ہم اس دَور کا حاصل تو نہیں تھے　　ناقدریٔ دُنیا کے بھی قابل تو نہیں تھے

کرّار نوری

تصوّر آپ کا گو کم رہا ہے آنکھوں میں
مگر جو آیا تو بہم رہا ہے آنکھوں میں

جو ایک لحظہ کبھی اُن کو دیکھ آیا ہوں
تو ساعتوں وہی عالم رہا ہے آنکھوں میں

عجب طرح کی متانت سے آج ٹوٹ گیا
وہ ایک ربط جو باہم رہا ہے آنکھوں میں

تھا آفتاب درخشاں جو میرے سینے میں
مثالِ گریۂ شبنم رہا ہے آنکھوں میں

یہ اعتراف ہے دیکھے ہیں اور بھی خوش رو
تمہاری طرح کوئی کم رہا ہے آنکھوں میں

ابھی سے آپ تو نظریں بچا رہے ہیں حضور
ابھی تو نقشِ نظر جم رہا ہے آنکھوں میں

بڑے خلوص سے تیری طرف جو اُٹھی تھی
اُسی نگاہ کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

نظر جھکائے ہوئے دیکھتا ہوں ہر جانب
دل و نگاہ کا محرم رہا ہے آنکھوں میں

اب اُس اشارے کا مفہوم کون سمجھائے
جو اپنے آپ ہی مبہم رہا ہے آنکھوں میں

ہزار بار اُنہیں دیکھ کر بھی اے نوریؔ
ہزار بار کا دم خم رہا ہے آنکھوں میں

تغیرات کہ جو حادثات کرتے ہیں
ہم اُن کو شاملِ کارِ حیات کرتے ہیں

وہ بیر خواب جو اوروں کے واقعات ابھی ہیں
تپش میں دن کی بسر اپنی رات کرتے ہیں

رہِ وفا کی تھکن سے کبھی ہوا محسوس
کہ ہاتھ پاؤں مرے مجھ سے بات کرتے ہیں

کبھی کسی سے تعلق کبھی کسی سے گریز
عجب خیال میں ہم دن کو رات کرتے ہیں

مرے خیال جو مجھ سے بچھڑ گئے نوریؔ
نہ جانے ذہن میں کس کے ثبات کرتے ہیں

کرار نوری

ہر طرف تذکرۂ جرم و سزا ہوتا ہے
آج ہم سمجھے کہ بندہ بھی خدا ہوتا ہے

جیسے رہتے ہوں کسی شخص کی جاگیر میں ہم
دل میں رہ رہ کے یہ احساس سا کیا ہوتا ہے

ہمنشیں غور نہ کر بات کو محسوس تو کر
اس چپی جس میں کوئی خطرہ چھپا ہوتا ہے

اب یہاں پر بھی چلی آئیں دلوں کی باتیں
میرے چپ رہنے سے حالات میں کیا ہوتا ہے

مختلف سمتوں پہ روشن ہیں بہانوں کے چراغ
اور ہر راہ پہ اک جال بچھا ہوتا ہے

اپنے احساس میں اے واعظ تسلیم و رضا
رند پیمانہ بکف ہو تو خدا ہوتا ہے

کتنی باتیں ہمیں سچی سی نظر آتی ہیں
انہی باتوں میں مگر کھوٹ ملا ہوتا ہے

کتنا پیارا ہے وہ۔ نوری مرا وقتی دشمن
میری بے راہ روی پر جو خفا ہوتا ہے

کہیں کیا کہ غیرتِ عشق کو نہیں آرزو کی مجال تک
غم زندگی میں الجھ گئے تو نہ آیا تیرا خیال تک

مجھے طعنۂ غم زندگی تری سمت سے تو قبول ہے
مگر اس کی زد سے نہ بچ سکا ترا اپنا حسن و جمال تک

تری آرزو پہ رہی نظر تو ہر اک سے میں نے کی درگزر
اسی مصلحت میں بچھڑ گیا مری زندگی کا جلال تک

ترے کیف نازِ جواں نے جب مجھے بے نیاز بنا دیا
کبھی تو بھی اب جو کہیں ملے تو نہ آئے لب پہ سوال تک

ترا حسن راز کی شکل میں مرے دل میں اب بھی ہے جلوہ گر
جو کہیں بتانا بھی چاہوں میں تو نہ آئے کوئی مثال تک

کرّار نوری

مجھ میں اُلجھا ہُوا فنکار مجھے یاد نہیں
ذہن میں کیسی تھی پیکار مجھے یاد نہیں

میں ہُوا کیسے گنہگار مجھے یاد نہیں
کب چھنے جبّہ و دستار مجھے یاد نہیں

ایک سایہ تھا کہ ہر وقت پڑا رہتا تھا
جانے کس کی تھی وہ دیوار مجھے یاد نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ میں نے بھی بنائے تھے نقوش
تھا کبھی مجھ میں بھی فنکار مجھے یاد نہیں

یاد اتنا تو ہے دیکھا تھا کبھی حسنِ مراد
جنبشِ چشمِ طرحدار مجھے یاد نہیں

خواب ہی خواب نظر آتے رہے ہیں مجھ کو
میں رہا ہوں کبھی بیدار مجھے یاد نہیں

جانے اعصاب زدہ ہوں کہ میں آسیب زدہ
میں ہُوا کیسے دل افگار مجھے یاد نہیں

ایک ٹوٹی ہوئی انگڑائی کی صورت ہے خیال
پہلے کیا تھے مرے افکار مجھے یاد نہیں

کچھ عجب لگتی ہیں یہ حسن و وفا کی باتیں
کب ہوا کوئی وفادار مجھے یاد نہیں

کتنے ہی قصّے انہیں یاد دلائے میں نے
وہ یہ کہتے رہے ہر بار مجھے یاد نہیں

ہو وہ گردش کہ سکوں سب ہے وہ حرکت کا ظہور
اس سے ہٹ کے کوئی معیار مجھے یاد نہیں

ایک جیسا تو ہمیشہ سے نہیں ہوں نوری
بدلی ہو وقت نے رفتار مجھے یاد نہیں

فن کی اور ذات کی پیکار نے سونے نہ دیا
دل میں جاگے ہوئے فنکار نے سونے نہ دیا

ہر طرف تپتی ہوئی دھوپ مرے ساتھ گئی
زیرِ سایہ کسی دیوار نے سونے نہ دیا

میرے ہمسائے میں شاید ہے کوئی مجھ جیسا
ہے جو چرچا کسی بیمار نے سونے نہ دیا

کل مرے شہر میں اک ظلم کچھ ایسا بھی ہوا
رات بھر غیرتِ فنکار نے سونے نہ دیا

جاگتے رہنے کا آرام تو کیا ہم کو کبھی
چین سے شدّتِ افکار نے سونے نہ دیا

کل کچھ اس طرح سرِ بزم مری بات گری
کسی پہلو مرے پندار نے سونے نہ دیا

ایک دھڑکا سا لگا تھا کہ سحر دم کیا ہو
سر پہ لٹکی ہوئی تلوار نے سونے نہ دیا

کرّار نوری

لگن یہ ہے کہ جو کچھ ہے مجھے معلوم ہو جائے
کہ میری ذات میں پیدا مرا مفہوم ہو جائے

ترے کہنے سے لب تک آئی باتیں روک لوں اے دل
تو کیا خاموش رہنا ہی مرا مقسوم ہو جائے

کسی بارے میں کچھ بھی سوچنا ہے کرب کی منزل
مگر جو شخص غور و فکر سے محروم ہو جائے

میں روحِ عصر بن کر بات اپنی کہہ تو دوں لیکن
زمیں کا راز کھل جائے فضا مسموم ہو جائے

کوئی پہچان لے خود کو کبھی جو ذات میں اپنی
تو گھبرا کر نظر میں اپنی ہی معدوم ہو جائے

مجھے کچھ بھولی بسری باتیں اکثر یاد آتی ہیں
اگر کہہ دوں تو ہر اک لفظ بے مفہوم ہو جائے

میں عکسِ وقت بن کر آئینہ صورت ابھر آیا
حقیقت اپنی جو دیکھے وہی مغموم ہو جائے

میں خود کو مان لوں شاعر مگر اک شرط یہ بھی ہے
کوئی بھی اک ادا اس کی اگر منظوم ہو جائے

ہر اک الزام ممکن ہے تو پھر اس دور میں نوری
در و دیوار پر جو کچھ ہے وہ مرقوم ہو جائے

اُس نے صورت جو دکھائی ہم کو
پھر کوئی شکل نہ بھائی ہم کو

رات پھر ایک خیال آیا تھا
رات پھر نیند نہ آئی ہم کو

پھر اُسی کوچے میں آ نکلے ہیں
دل نے غیرت بھی دلائی ہم کو

بات کہنے کا تو یارا ہی نہیں
بات سُننا بھی نہ آئی ہم کو

گو محبّت بھی ہے اُس سے لیکن
اُس کی ہر بات نہ بھائی ہم کو

میکدے میں بھی کوئی دوست نہ تھا
جانے کس کس نے پلائی ہم کو

دل کے ہر تار میں نغمے گونجے
کِس نے آواز سُنائی ہم کو

کتنی دلچسپ ہے دُنیا نوری
ہاں مگر راس نہ آئی ہم کو

کرار نوری

میں سو رہا تھا نیند اچانک اُچٹ گئی
سایہ سمٹ گیا ہے کہ دیوار ہٹ گئی

اب کیا کہوں کہ تجھ سے شکایت ہے کیا مجھے
گردِ ملال تیرے تبسم سے چھٹ گئی

گردش ہے دائرے کی پھر آغاز کے قریب
پھر فکر اتصال کے حصّوں میں بٹ گئی

وہ بات ہی تو کہنے کے قابل تھی میرے پاس
جو بات گفتگو کے تسلسل سے کٹ گئی

قامت کو ڈھونڈتا ہوں میں سایہ بنا ہوا
میں وہ نہیں ہوں یا مری پرچھائیں گھٹ گئی

ماضی کو ساتھ لے کے جو دیکھا ہے آئینہ
ذہنی مشاہدے سے کثافت سمٹ گئی

دیکھا جو غور سے تو میں تنہا نظر پڑا
ہستی ہر ایک قیدِ اضافی سے کٹ گئی

تنہا روی سے چھٹ سکا جو بیگانگی کا خوف
گھبرا کے حبِّ ذات انا سے چمٹ گئی

نوری وہ ماورا ہو تصور کہ نفی کیا
رد کر کے سب نگاہ زمیں پر پلٹ گئی

شکستہ لہجے میں اپنے کہے کو دہراؤں
کوئی تو ایسا ہو جس سے کہ میں بھی گھبراؤں

نہ جستجو ہے نہ منزل نہ راستہ کوئی
خیال و خواب سے کب تک میں دل کو بہلاؤں

لگن بھی ایسی لگن ہے کہ جو ہے نامعلوم
کسے تلاش کروں میں کدھر چلا جاؤں

کوئی تو میرے شب و روز پر نظر رکھے
کبھی تو اپنے تغافل کی میں سزا پاؤں

میں خود سوال کروں اور خود جواب بھی دوں
پھر اس جواب پہ میں دل ہی دل میں پچھتاؤں

کوئی تو پرسشِ بے جا کرے کبھی مجھ سے
جواب دیتے ہوئے خود بخود میں گھبراؤں

کرّار نوری

اُس کو تو صرف اپنی اکائی کی فکر ہے
ہم وہ کہ ہم کو ساری خدائی کی فکر ہے

خوشبو تو اپنے کربِ نمو میں ہے مبتلا
رنگت کو اپنی جلوہ نمائی کی فکر ہے

ہم نے تو نیک و بد کا تصوّر بدل دیا
کچھ ہیں جنھیں بُرائی بھلائی کی فکر ہے

اب تک میں اپنی ذات کے بیگانہ پن میں ہوں
ہر لمحہ مجھ کو اپنی صفائی کی فکر ہے

دشتِ نمو میں فطرتِ خود رو کے ساتھ ہوں
اِس قیدِ بے سفر سے رہائی کی فکر ہے

تحسینِ ناشناس میں شاید ہوں مبتلا
ہر گام مجھ کو خود سے رسائی کی فکر ہے

حسرت ہے خود سے دُور نکل جاؤں میں کہیں
خوشبو کو اپنے گل سے جدائی کی فکر ہے

گل کی تو کربِ ذات سے رنگت بدل گئی
بلبل کو اپنی نغمہ سرائی کی فکر ہے

نکلا تھا خود کو ڈھونڈنے نوری نظر پڑا
حسنِ دوئی کو اپنی اکائی کی فکر ہے

کچھ سوچ کے اظہارِ خیالات نہ کرنا
ہر بات کو سُننا وہ ترا بات نہ کرنا

ممکن ہے حقیقت میں تمہیں اپنا سمجھ لیں
اس درجہ غریبوں کی مدارات نہ کرنا

پیمانہ بکف جب ہو جوانی کی حکایت
اِس باب میں سنجیدہ سوالات نہ کرنا

اک بار توجہ سے کوئی بات تو سُن لو
پھر چاہے کبھی ہم سے ملاقات نہ کرنا

ہے فرقِ مراتب کے لیے سارا زمانہ
میخانے میں توہینِ مساوات نہ کرنا

آسان ہے جاں دینا کسی بات پہ نوری
دشوار ہے اظہارِ خیالات نہ کرنا

کہسار نوری

سائے میں آگیا جو کسی کے تو کیا ہوا
میں بھی تھا ایک عمر کا یارو تھکا ہوا

وہ شخص تو گزر بھی گیا دیکھتا ہوا
اے میرے ہم نگاہ مگر تجھ کو کیا ہوا

کیا جانے دوستی کی ضرورت کو کیا ہوا
یوں تو ہے ایک گھر مرے گھر سے ملا ہوا

تنہائیوں کے دائرے یعنی یہاں کے گھر
ہر اک ہے اپنے آپ میں گویا بسا ہوا

مدت کے بعد آج وہ کچھ اس طرح ملا
جیسے کہ مدتوں کا ہو وہ بھی دکھا ہوا

اکثر ترے خیال میں خود سے بچھڑ گیا
شاید ہو کوئی مجھ سا ہی مجھ میں چھپا ہوا

نوری وہ کون ہے جسے دیکھا نہیں کبھی
دل میں ہے میرے پھر بھی تمنا بنا ہوا

تمہاری یاد سے دل بن گیا بدن میں چراغ
کہ دل میں ایسے ہو جیسے ہو کوئی بن میں چراغ

نہ جانے کیوں مرے لہجے سے لو نکلتی ہے
جلا دیئے نہ ہوں غم نے لب و دہن میں چراغ

توقعات کی محفل سجائے بیٹھا ہوں
کبھی تو آ کے جلا دو اس انجمن میں چراغ

قبا ہے تنگ ہے جلوہ فروز تابش حسن
خطوط جسم کے روشن ہیں پیرہن میں چراغ

زہے وفا کہ اب ان کو بھی مانتا ہے محبت پر
مری وفا سے جلے ان کے بانکپن میں چراغ

مجھے ہر ایک سے شکوہ مجھے ہر ایک سے پیار
مرے چلن سے جلیں گے ہر اک چلن میں چراغ

کرار نوری

سپاس میں ہوں کبھی دور ناسپاس میں ہوں
ابھی وجود میں ہوں اور ابھی قیاس میں ہوں

نہ جانے کس کو خدا مانوں میں گھبرا کر
ہر ایک گام جو اک خوفِ بے اساس میں ہوں

یہ میرا سایہ بھی میرا نظر نہیں آتا
وہ کون شخص ہے جس شخص کے لباس میں ہوں

تو داستانِ مہ و سال میں نہ ڈھونڈ مجھے
میں ایک لمحہ ہوں اور اپنے اقتباس میں ہوں

لچک کے ٹوٹ گئے میرے سارے ردّ و قبول
سوال یہ بھی ہے کیا اپنے میں حواس میں ہوں

مری سنو، مجھے دیکھو، نہ مجھ سے گھبراؤ
میں روحِ عصر ہوں اور اپنے التماس میں ہوں

یہ کیسا آئینہ ہے کچھ نظر نہیں آتا
دوئی کے پھیر میں ہوں ذہنی انعکاس میں ہوں

مجھے جو دیکھا تو نوری بھی ہنس پڑا مجھ پر
کیسے بتاؤں کہ اس عہد کے لباس میں ہوں

جینا دشوار نہیں بلکہ سزا ہو جاتا
میں تجھے یاد نہ رہتا تو فنا ہو جاتا

منکرِ سجدۂ آدم نے بچایا ہم کو
ورنہ ہر شخص زمانے میں خدا ہو جاتا

میں جدھر دیکھتا اُس سمت نکلتا سورج
ایک سجدہ ترے دامن پہ ادا ہو جاتا

بند خوشبو کی طرح بیٹھا ہوں محوِ جلوہ
میں تری زلف کو چھوتا تو صبا ہو جاتا

کون ہوتا مری خوشیوں میں برابر کا شریک
آپ ہی اپنے تبسم کی سزا ہو جاتا

تم نے اچھا کیا دیکھا نہ دوبارہ مجھ کو
مجھ سے ہر شخص زمانے میں خفا ہو جاتا

فکرِ نو کا ترجمان

شمارہ ۴۵

جنوری ۱۹۸۳ء کے اواخر میں شائع ہو رہا ہے
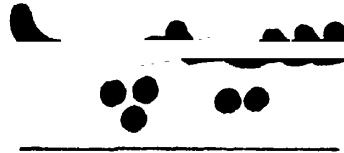
ہر بار پرانے اور نئے ناموں کے ساتھ معیاری اور اچھی تحریریں پیش کرتا ہے

تازہ شمارہ اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیے

ضخامت : ۳۰۰ صفحات

قیمت : ۱۵ روپے

منیجر سیپ، پوسٹ بکس ۳۲۲۴، کراچی ۲۸

سیپ شمارہ ۴۵ کی تحریریں

افسانے، ۱۴

• رضیہ فصیح احمد • کلام حیدری • میرزا ریاض • جوگندر پال • رحمٰن شاہ عزیز • رشید امجد
• مشرف احمد • احمد جاوید • سلطان جمیل نسیم • مرزا حامد بیگ • فردوس حیدر • قدسیہ انصاری
• علی امام نقوی • رفعت کیانی

شخصیت، ۱

• جوش، کچھ یادیں کچھ باتیں ـــ سید مقصود زاہدی

مضامین، ۶

• قمر جمیل • فتح محمد ملک • محب عارفی • مستنصر حسین تارڑ • نجیب جمال

غزلیں، ۱۱۱

• فراق گورکھپوری • رئیس فروغ • شان الحق حقی • شمس زبیری • فارغ بخاری • احمد ہمدانی
• صبا اکبرآبادی • انجم اعظمی • جمیل ملک • محسن احسان • شاہد عشقی • نکہت بریلوی
• قمر نظامی • ساقی امروہوی • رفعت سلطان • افسر ماہ پوری • جمیل عظیم آبادی • جعفر شیرازی
• ندا فاضلی • شبنم مناروی • مظہر امام • انور حسن صدیقی • کیف انصاری • ع س سلام
• رام ریاض • احمد رئیس • سلیم کوثر • صابر وسیم • شاہدہ تبسم • شوکت ہاشمی
• خواجہ رضی حیدر • گلزار بخاری • تاجدار عادل • محمد فیروز شاہ • سیما احمد • لطیف ساحل
• احمد شریف • جان کاشمیری • ن م دانش • عنبر زیدی • صفدر صدیق رضی • رفعت ظفر
• اختر ہوشیار پوری • رفعت القاسمی • جمال احسانی

نظمیں، ۶۴

• فارغ بخاری • زہرا نگاہ • احمد ظفر • انجم اعظمی • شاہد عشقی • سرشار صدیقی
• قمر جمیل • افسر ماہ پوری • ادیب سہیل • اظہر قادری • حسن اکبر کمال • پروین شاکر
• شاہین • انور زاہدی • جمیل عظیم آبادی • شاہدہ تبسم • احسن سلیم • ماہ طلعت زاہدی
• نجم الحسن عطا • احمد فاخر • ن م دانش • شاہین ملک • شفیق احمد شفیق

تبصرے، ۵۵

• حسن اکبر کمال • مشرف احمد • اشتیاق طالب • صابر وسیم

رحمٰن شاہ عزیز

جھل مل کرتا خرگوش

فٹ پاتھ سے ایک قدم آگے رکھتے ہوئے اور ایک ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے چیخ کر کہا۔ "ون ٹو تھری گو!" اور ڈاگ ریس اسٹارٹ کر دی پھر فوراً ہاتھ نیچے گرا کر اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر لوہے کے مضبوط ٹریفک سگنل کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور تیز رفتار ٹریفک کے ٹھاٹھیں مارتے دریا کا منظر دیکھنے میں محو گیا ان گنت رنگ برنگی موٹریں آگے پیچھے دوڑتی بھاگتی پہلو بہ پہلو رکتی سنبھلتی، ایک دوسری سے بچتی بچاتی، لال پیلی بتیاں جھپکاتی اور آگے بڑھنے کی کوشش میں ہارن بجاتی شارعِ فیصل پر رواں تھیں

جب ٹریفک سگنل کی نارنجی روشنی سامنے آتی تو وہ ٹکٹکی لگائے اسے دیکھتا رہا، جیسے ہی وہ بند ہوئی اور ریڈ لائٹ سامنے آئی اس نے پھرتی سے ہاتھ اوپر اٹھا کر زور سے کہا "اپ۔ پہلا راؤنڈ ختم"

تمام ٹریفک ایکدم رک چکی تھی

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور شہر کی اس پختہ، کشادہ، چمکتی ہوئی گرانڈیل سڑک پر دور تک متوازی قطاروں میں ایک دوسری کے پیچھے کھڑی، بھاپ سے ہانپتی کانپتی، انجنوں کے شور سے لرزتی، کڑھتی، غراتی اور بتیاں جھلملاتی موٹروں کے اس قافلہ پر نگاہ دوڑاتی جس میں چمکتی ہوئی صاف شفاف پرائیوٹ کاریں، کھڑ کھڑ کرتے موٹر رکشہ، کالی پیلی ٹیکسیاں اودھم مچاتے ٹرک، مسافروں سے لدی پھندی بسیں، ٹیڈی اور منی بسیں ویگن اور اسکوٹر تھے۔

اس کے تحت الشعور میں ایسٹ لندن کا وہ ریس کورس تھا جہاں وہ اتوار کے اتوار مارگریٹ کے ساتھ ڈاگ ریس دیکھنے جایا کرتا تھا۔ جہاں خود کار ٹکٹکی سے بندھا ہوا نقلی خرگوش آگے آگے دوڑایا جاتا تھا اور شکاری کتے خرگوش کو اصلی سمجھ کر پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے دوڑتے تھے تماشائی اپنے اپنے پسندیدہ کتے کو للکار کر آگے بڑھنے پر اکساتے تھے کم آن! ہینری! کم آن فریڈرک! ولیم، بونا پارٹ، ہلاکو خان، چنگیز خان! وہ فقط ہُش ہُش کیا کرتا تھا، ہُش ہلاکو! ہُش چنگیز خان۔

"وہ۔ وہ دیکھو خرگوش!" اس نے کھمبے پر لگی ہوئی لائٹوں کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے ان راہ گیروں کو بتایا جو فٹ پاتھ

پر اُس کے قریب سے گزر رہے تھے "خرگوش خود کار کھٹکی سے بندھا ہوا ہے" اس نے کہا۔ اب اس کی سبز دُم کا اشارہ پاتے ہی ریس پھر اسٹارٹ ہوگی

راہ گیر اُسے دیکھ دیکھ کر ہنستے ہوئے گزر گئے۔

"خرگوش کا پیٹ زر و جواہر سے بھرا ہے" وہ بتا رہا تھا۔ "کتے ہمیشہ اُس کے پیچھے دوڑتے ہیں مگر خرگوش کبھی کسی کے ہاتھ نہیں آتا اور ریس یہاں ختم نہیں ہوتی کراچی سے آگے قاہرہ، استنبول، پیرس، لندن، نیویارک، پھر اُس سے بھی آگے اور آگے۔ دور خلاؤں تک ڈاگ ریس جاری ہے۔"

"وَن۔ ٹو۔ تھری۔ گو!" وہ چلایا۔ گرین لائٹ کے آتے ہی ٹریفک رواں ہو چکی تھی شش شش کہہ کر وہ ہاتھ کے اشارے سے گاڑیوں کو کتوں کی طرح ایک دوسری سے آگے بڑھنے پر اکسانے لگا۔

بھاگتی ہوئی گاڑیوں میں سے کئی مرد اور عورتیں اُسے حیرت سے تکتے ہوئے گزر گئے بعض نے اُسے دیکھتے ہی قہقہہ لگایا۔ مسافروں سے بھری ہوئی بس میں سے کچھ آوارہ مزاج نوجوانوں نے کلکاریاں ماریں بعض ننھے مُنّے شریر بچے لنگور بوزنوں کی طرح کار کے شیشوں میں سے جھانکتے، تالیاں بجاتے اور اُس کا منہ چڑاتے ہوئے گزر گئے ایک ننھی سی بچی بول اٹھی "انکل فریڈی! . . . . . ہے نہ ممی؟"

ہاں۔ ہاں ممی نے کار کا شیشہ بند کرتے ہوئے کہا۔ بچارے فریدی صاحب، چچا فریدی سے انکل فریڈی ہو گئے!"

"پُوئر فیلو!" شوہر نے گاڑی کو تیز رفتار کرتے ہوئے تائید کی۔

"اوہ شش شش کے بچے!" ٹریفک کانسٹیبل ایک قدم چبوترے سے نیچے رکھتے ہوئے چلایا۔ "جاتا ہے۔ یا؟"

"آل رائٹ سر!" اُس نے کہا اور اگلے چوراہے کی طرف چل دیا۔

"کچھ کچھ کریک ہے۔" پاس ہی کھڑے ہوئے سارجنٹ نے اپنی شہادت کی انگلی کا پیچ کس کنپٹی پر گھماتے ہوئے کانسٹیبل کو بتایا "پر آدمی برا نہیں"۔

"آدمی برا نہیں؟ سالے نے ڈھونگ رچا رکھا ہے"

"دیکھو نا یار . . . ایجوکیٹیڈ آدمی ہے۔"

"ایجوکیٹیڈ تو ہے . . . . اور انکل فریڈی کا لقب بھی اسے اُن پڑھی لکھی چھوکریوں ہی نے دیا ہے جن کی یہ سرپرستی کرتا ہے۔"

"یا وہ جو اس کی سرپرستی کرتا ہے۔"

"بات ایک ہی ہے . . . ہاں۔ اچھا۔ اور وہ چھوکرا جسے اس نے شنتی بنا رکھا ہے؟ وہ اخبار والا چھوکرا!" کانسٹیبل نے ہاتھ سے ٹریفک کا اشارہ دیتے ہوئے پہلو بدل کر اور معنی خیز نظروں سے سارجنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "چھوکرے کا نام سن کر چپ کیوں ہو گئے اُستاد؟" سارجنٹ نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وسل منہ میں رکھ کر زور سے بجائی اور پھر اُس گاڑی کی طرف چل دیا جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہوتا نظر آ رہا تھا

انکل فریڈی میٹروپول اور کلب روڈ کے چوراہے کی جانب جا نکلا پیچھے سے ایک پرانی سی فوکس ویگن اُس کے

میں برابر پہنچ کر رکی

"اوہ ہیلو۔ انکل فریڈی! کار میں بیٹھی ہوئی دو لڑکیوں میں سے ایک نے کہا۔

"ڈیئر اولڈ انکل فریڈی" دوسری بولی

"او ہیلو۔ فرنی ... ہیلو بےبی ڈارلنگ! انکل نے دونوں کو مسخرے پن سے جواب دیا دونوں پاکستانی لڑکیاں صاف عمدہ انگریزی میں باتیں کر رہی تھیں۔ فریڈی صاحب ان کے ساتھ لندن کے ٹھیٹ کاکنی لہجے میں باتیں کرنے لگے

"کاروبار کیسا ہے؟" انکل نے پوچھا

"سو۔ سو۔ لڑکیوں نے جواب دیا لیکن انکل وہ نادرہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے آپ کئی دنوں سے اس کے پاس گئے نہیں۔ بچاری کا حال پتلا ہے آجکل آپ مزید جا کر اس سے ملئے پلیز! بچاری پور نادرہ ... اور اس کی دو بلوئی سی بچیاں ... کبھی تو کھانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا ان کے پاس۔"

میں دیکھ لوں گا ان کو انہیں۔ ڈونٹ وری"

سو لانگ انکل ... سو لانگ بےبی ڈارلنگ ... ٹاٹا ... بائی بائی ... کار اسٹارٹ ہوئی وہ دونوں ہاتھ ہلاتی ہوئی ہوا ہو گئیں

وہ شہر کے معروف ترین چوراہے پر پہنچ کر رکا پھر ریسٹوراں کے باہر کی طرف بنے ہوئے پختہ ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا جیب میں سے ایک ٹیڑھا میڑھا سگریٹ نکال کر اس نے سلگایا اور چو طرفہ ٹریفک کی یلغار دیکھنے میں محو ہو گیا پاس ہی نیوز پیپر ہاکر نے ڈھیروں اخبار فٹ پاتھ پر پھیلا رکھے تھے کئی لونڈے ان کو جمع کرکے بھاگتے ہوئے آئے اور اخبار لے کے بیچنے کے لئے موٹروں کی طرف بھاگ نکلے اس کی نگاہیں ان جمع کردہ ہستی کو تلاش کرنے لگیں اخبار فروشوں کے ساتھ ساتھ گداگرنیوں اور بھک منگوں کا وہ گروہ تھا جو ٹریفک کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے اشاروں کے درمیانی وقفوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر ماہر تھا ادھر ریڈ سگنل کو دیکھ کر گاڑیاں رکیں ادھر یہ ایک ایک کرکے ان پر ٹوٹ پڑے گاڑی چلانے والے کے لئے وہ نفسیاتی لمحہ .... کہیں گاڑی چلانے میں غلطی نہ ہو جائے کہیں یہ آدمی نیچے نہ آ جائے۔ کسی سے ٹکر نہ ہو جائے وہ اشارہ ہوا ہی چاہتا ہے جلدی سے جیبیں ٹٹولو ... ارے اریز گاری نہیں ہے! ... کیا ہے! نوٹ؟ کون سا؟ ایک، پانچ دس کا! .... لاؤ دے دو جو بھی ہے ... چلو دے دو بچارے کا بھلا ہو گا ... کانسٹیبل گھور رہا ہے ... وہ بس ہوا چاہتی ہے .... اشارہ کھلنے والا ہے ... ہٹو آگے سے! ... چلو ....

یکایک اس کی نگاہ ہستی پر پڑی وہ چوراہے کے دوسری طرف اس گرین کار والی خاتون کے ہاتھ میں اخبار تھما رہا تھا جو تقریباً ہر روز اس سے وہ چار میگزین عادتاً خرید لیتی ہے چند انوکھی وضع کے مرد بھی ہستی سے خاص طور پر اخبار خریدنا پسند کرتے ہیں وہ ایک سولہ سترہ برس کا نازک اندام سا چھوکرا ہے انکل فریڈی سوچ رہا تھا۔

سگریٹ کا آخری کش لے کر بچا ہوا ٹکڑا اس نے فٹ پاتھ پر پھینکا اور پھر اسے پاؤں تلے کچل دیا۔ اس وقت اچانک اسے نادرہ کا خیال آیا۔

نادرہ سے اس نے لڑکپن میں عشق کیا تھا لیکن وہ غریب ماں باپ کا بیٹا تھا نادرہ کے باپ نے بیٹی کی شادی ایک بگڑے ہوئے امیر زادے سے کر دی وہ دل شکستہ، اداس اور غمگین، انتہائی مایوسی کے عالم میں گھر بار چھوڑ کر مختلف شہروں

کی خاک چھانتا ہوا آخر کار انگلستان جا پہنچا۔ وہاں اس نے محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کی۔

لندن میں اس کی ملاقات مارگریٹ سے ہوئی اس نے مارگریٹ سے دل لگایا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اسے پتہ چلا کہ مارگریٹ لندن کی ایک منجھی ہوئی اور جہاں دیدہ قسم کی پراس تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ گھوڑ دوڑ اور کتوں کی دوڑ میں، خاص خاص قسم کے ہوٹلوں میں اور مشکوک و مکروہ مقاصد کی پارٹیوں میں لے جاتی اور مارگریٹ نے اسے بجائے شوہر بنانے کے اپنے ایک مخصوص مطلب کے کارندے کے طور پر رکھا وہاں سے وہ رفتہ رفتہ لندن کے زیر سطح معاشرے میں پہنچ گیا جہاں وہ ہم جنسیت شراب نوشی اور منشیات کے استعمال کا عادی ہو گیا

پھر جب وہ وطن واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے جب ستی سے اس کی دوستی ہوئی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ نوخیز پاکستانی لڑکا لندن کے منفی لوازم سے کسی طرح پیچھے نہیں ابھی دنوں میں اچانک اس کی ملاقات بچھڑی ہوئی نادرہ سے ہوئی اسے دیکھ کر وہ سکتے میں آگیا نمائشی سج دھج سے بنی سنوری نادرہ اپنی نئی ہیئت میں اسے مارگریٹ کی ہم پلہ معلوم ہوئی۔ نادرہ اور ستی کے علاوہ اسے یہ دیکھ کر اور بھی افسوس ہوا کہ اہل وطن کا ایک مخصوص طبقہ نئی طرز زندگی کے فریب میں مبتلا ہو کر محض اس مقام کی طرف گامزن ہے جہاں مغرب کی گم گشتہ نسلیں سربہ گریباں ہیں!

اس نے دوسرا سگریٹ سلگانے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ اک شور بلند ہوا نعرے لگاتا ہجوم چوراہے کی سمت آگے بڑھ رہا تھا پے در پے دھماکے ہوئے ہجوم پر گولی چلی۔ بھاگو" کسی نے کہا چوراہے میں کھڑی ہوئی موٹروں پر سنگباری شروع ہو گئی سہ رنگا خرگوش دیکھتے ہی دیکھتے روپوش ہو گیا۔ موٹریں آناً فاناً غائب ہو گئیں اخبار فروش لڑکے لڑکیاں اور گداگروں کا ٹولہ پلک جھپکتے میں زمین دوز ہو گیا پرائیوٹ گاڑیوں کی جگہ سرکاری جیپیں۔ ٹرک اور بکتر بند گاڑیاں آکر کھڑی ہو گئیں ہر طرف مسلح ہیلمٹ پوش باوردی سپاہی نظر آنے لگے۔ ستی کسی کونے میں سے نکل کر بھاگتا ہوا آیا اب یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔ اس نے کہا پھر جیب میں سے کچھ نوٹ اور نقدی نکال کر انکل کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے وہ بولا۔ اس وقت آپ جائیں میں پھر رات کو کسی وقت ملوں گا۔ اور وہ بھاگ کر ایک طرف کو نکل گیا۔

تقریباً آدھی رات کے وقت انکل فریدی چوتھی منزل کے اس بوسیدہ کمرے میں داخل ہوا جس میں نادرہ رہتی تھی۔ اس کا شوہر مدت ہوئی اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا کونے کی میز پر موم بتی جل رہی تھی اسے معلوم تھا کہ گیس اور بجلی کا بل ادا نہیں ہو سکا اس لئے کمرہ اندھیرے گھر میں اور کچن سرد خانے میں تبدیل ہو چکا ہے نادرہ موم بتی کی مدھم لو میں بیٹھی رو رہی تھی یا رو رو کر تھک چکی تھی اس کے قریب ہی پلنگ کے کونے پر بیٹھتے ہوئے اور کچھ روپے اس کے آگے میز پر رکھتے ہوئے وہ بولا یہ اپنے خرچ کے لئے رکھ لو اس وقت کا کھانا بھی میں لے آیا ہوں کچن میں رکھ دیا ہے نادرہ نے اپنے چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے بغیر دھیمی اور سسکتی ہوئی آواز میں اس کا شکریہ ادا کیا پھر دفعتاً خاموشی طاری ہو گئی خاموشی کے اس لمحہ میں اس کی نگاہ موم بتی پر گئی اس نے دیکھا کہ ایک پتنگا شعلے کے گرد متواتر طواف کر رہا ہے چند لمحے وہ اسے دیکھتا رہا پھر جھٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اسے پتنگے اور موم بتی کے اس دلگداز منظر سے کراہت اور بے زاری کا احساس ہوا اس نے اپنے دل میں ایک نامعلوم سی کسک محسوس کی وہ چند قدم چل کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا نادرہ اور ستی کے ساتھ اس کے تعلقات اک محض تاجرانہ نوعیت کے ہیں اس نے سوچا "انجن" پٹڑی پر سے اتر چکا ہے وہ اب پٹڑی پر سے دوڑتی ہوئی ریل گاڑیوں کو دور سے دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا ستی اپنی دی ہوئی رقم کا معاوضہ وصول کرنے کے لئے پتہ نہیں کس وقت آکر نادرہ کے بستر میں گھس جائیگا۔ اس نے سرد آہ بھری اور کھڑکی سے ٹیک لگا کر اونگھنے لگا دیر تک وہ اپنی

کھڑا دیکھتا رہا، جب اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا باہر پھیکی پھیکی سی چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی مگر سناٹا چھایا ہوا تھا یکایک کئی سائرن ایک ساتھ بج اُٹھے مسجدوں میں بے وقت کی اذانیں گونجنے لگیں اُس نے دیکھا کہ مردے قبروں میں سے نکل کر میدان میں آ گئے شہر کے لوگ اپنے جسموں پر کفن لپیٹے منور چوراہوں اور جگمگاتی شاہراہوں سے منہ موڑ کر نیم تاریک گلی کوچوں میں سے ہوتے ہوئے میدان میں جمع ہو گئے پھر وہ سب کے سب خاموشی سے کاروں کی صورت مردوں کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے مردے بے آواز قدموں سے آگے آگے چلتے ہوئے اور پیچھے کفن پوش مخلوق کا ہجوم علی الترتیب اہل جاہ وزراء ان کے اہلکار، کارندے ملازمت پیشہ افراد، کاروباری آدمی، تاجر، دوکاندار، مزدور، محنت کش، چھکڑوں اور ریڑھیوں والے اخبار فروش، بھک منگوں کا ٹولہ اور عزت و ناموس کے بیوپاری ۔ دائیں بائیں کفن پوش مسلح پہرے دار سب کے سب خاموش۔ بے آواز قدموں سے گم شدہ منزل کی تلاش میں ان دیکھے چٹیل میدان اور لق و دق صحراؤں کی جانب رواں دواں

یہ پراسرار سفر رات بھر جاری رہا ۔

پھر شب نے کروٹ بدلی اور رفتہ رفتہ مغرب کی سمت سے روشنی نمودار ہوئی سورج مشرق سے طلوع ہوا اور روشنی کی کرن مغرب سے پھوٹی ۔ یکایک مغرب کے تعبّد گھروں میں صبح کی گھنٹیاں بج اٹھیں اس کے ساتھ ہی ساری دنیا میں سحر ہو گئی کفن پوشوں کا کارواں چلتے چلتے یکایک رکا انہوں نے کان لگا کر سنا گھنٹیوں میں سے متواتر ایک ہی مترنم آواز آ رہی تھی نیویارک، واشنگٹن ۔ نیویارک واشنگٹن ۔ کفن پوشوں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر فوراً گھروں کو لوٹ آئے کفن اتار کر انہوں نے ایک طرف رکھ دیئے اور سج بن کر سڑکوں پر آ گئے دولتمند اپنی نئی نفیس موٹر کاروں میں کارندے اور اہل کار بسوں ٹیکسیوں اور اسکوٹروں پر درمیان میں آگے پیچھے بھک منگوں کا گروہ اخبار فروشوں کی ٹولیاں اور عزت و ناموس کے کاروباری مرد اور عورتیں، ان کی آہیں، ان کی سسکیاں ۔ دولت کا جھلملاتا محور گردش ان کے سامنے تھا۔

وہ فٹ پاتھ سے ایک قدم آگے بڑھ کر چلایا "ون ۔ ٹو ۔ تھری ۔ گو!" اس نے ڈاگ ریس اسٹارٹ کر دی ۔

●

اپنے عہد کی بہترین اور نمائندہ تحریروں کے ساتھ شائع ہو کر
اب ہر وقت ہر بک اسٹال پر دستیاب ہے
سیپ

کلیم رحمانی

سورج کی صلیب

"اچھی شاعری بنیادی طور پر علامتی ہوتی ہے" یہ غیر سنجیدہ جملہ وزیر آغا جیسے سنجیدہ آدمی کے قلم سے نکلا ہے۔ سورج کی صلیب کے پیش لفظ میں وزیر آغا کا یہ اظہار قاری کے لئے باعث حیرت ہے اور علامتی شاعری کی بے جا تعریف۔ مجھے یقین ہے کہ اگر خود وزیر آغا علامتی شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو انہیں کسی بھی جدید شاعر کی تخلیق بہتر تو کجا اچھی ملے گی۔ جدید شعراء کی تخلیقات کو اگر نظروں کے سامنے رکھا جائے تو ان کی شاعری ان کی ذات کے اندھیرے میں گھومتی نظر آئیگی۔ یہ خرابی ان کے یہاں اس لئے ہوتی ہے کہ انہیں معاشرے میں تبدیلیوں کا علم نہیں ہوتا ہے۔ انہیں اپنے ذاتی مسائل اور داخلیت کو بھی صحیح طور پر پیش کرنے کا سلیقہ نہیں آتا ہے۔ اگر انہیں معاشرے کی تبدیلیوں کا علم ہے بھی تو ان پر اپنے ماحول کا خوف اس قدر طاری ہے کہ اس کا برملا اظہار ان کے بس میں نہیں ہے انہوں نے اپنے آپ کو تنقید سے بچانے کے لئے علامتوں کا سہارا لیا ہے صرف یہی نہیں بلکہ تنقید، قید و بند اور ماحول کا خوف کچھ اس طرح ان پر طاری ہوا ہے کہ وہ معاشرے سے الگ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا رشتہ کائنات سے ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ انہوں نے خود کو اپنی ذات کے خول میں مقید کر لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شعری تخلیقات میں فنی پختگی، استعارے اور تشبیہات کی چاشنی، تخیل کی بلند پروازی اور مضمون آفرینی کا شائبہ دور دور تک نہیں دکھائی دیتا ہے۔ انکی شعری تخلیقات میں تنہائی کی اذیت نے کھردرا پن پیدا کیا ہے اور اکھڑی اکھڑی فضا، غیر مانوس اور بے ربط الفاظ، گنجلک خیالات، اپنی تہذیب و تمدن کے منافی علامتوں اور ابہام کا سیلاب شعری لطافتوں کی دیوار کو توڑتا ہوا ان کی ذات کو لے ڈوبا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے میں وزیر آغا کی رائے کو اہم مان بھی لوں تو قدیم شعراء اور موجودہ زمانے کے شعراء کو جن میں علامہ اقبال، مجاز، ساحر لدھیانوی، فراق گورکھپوری، ناصر کاظمی، رسا چغتائی، سلیم احمد اور احمد فراز وغیرہ کو کیا حیثیت دوں جن کی شعری کاوشیں اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں اور جن کی تخلیقات میں علامتیں نہیں ہیں۔

میں سورج کی صلیب پر بات کرنا چاہتا تھا لیکن بات ہو گئی ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے پر۔ چلئے اچھا ہوا۔ ان ہی کی رائے کو آئینہ بنا کر سورج کی صلیب کو دیکھا جائے۔ میں صبا اکرام کے اس شعری مجموعہ کے چند اشعار اور نظموں کے چند بند سے بات شروع کرتا ہوں

تھے جس کی کھوج میں سب وہ شکار تھی چڑیا\
مگر نہ بن میں نہ دریا کے پار تھی چڑیا...!

کئی دنوں سے تھا اک شور سانپ کا گھر میں
لٹکتے پنجرے میں کچھ بے قرار تھی چڑیا!

بسیرا دور تھا نزدیک شام کی بیلا ...!
تھکے تھکے سے پروں پر سوار تھی چڑیا

قریب ہی تھا کھڑا ننھا سا اک بالک
کھلا ہوا تھا وہ پنجرہ فرار تھی چڑیا!

بچے کھڑے سڑک پہ صبا دیکھتے رہے
دو منزلے کی چھت پر گری جا کے وہ پتنگ

میں نے ایک بار اپنے مضمون "علامت نگاری کا نیا دور" میں لکھا تھا کہ علامت نگاروں کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ ہمیں ماضی کے اس دور میں داخل کر دیا ہے جہاں دادی اماں بچوں کو طوطا مینا اور چڑیا چڑے کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ صبا اکرام کے یہ اشعار میرے بیان کو یقین کا درجہ دیتے ہیں اور اس سوچ کو مستحکم بناتے ہیں کہ علامت نگاروں میں یہ صلاحیت پوری شدت کے ساتھ موجود ہے کہ وہ بچوں کے لئے نظمیں اور کہانیاں بہت ہی خوبصورت انداز میں لکھ سکتے ہیں لیکن تخلیقی استعداد کے لحاظ سے یہ لوگ بانجھ پن کا شکار ہیں۔

پیالی رکھ دو ذرا دیر نیم کے نیچے!
کہ گرم چائے سے سرخی لب دھلے نہ کہیں

چکھو گے اگر پیاس بڑھائیگا یہ پانی!!
پانی تمہیں ہرگز نہ صبا دیگا یہ پانی ــــ!

پہنچے گا سرابوں کا وہاں بھیس بدل کر!!
صحرا میں بھی ہر لمحہ صدا دیگا یہ پانی ــــ!

مجھ کو شوقِ شہادت دے
اس کے ہاتھ میں خنجر لکھ!!

اچھی شاعری کے لئے بے حد ضروری ہے کہ شاعر کو الفاظ کے صحیح معنی اور اس کے استعمال کا صحیح طریقہ معلوم ہو۔ اگر وہ اس سے ناآشنا ہوگا تو اس کے اشعار میں نہ شدت ہوگی اور نہ کیفیت۔ شدت، کیفیت اور معنویت شاعری کا وہ حُسن ہے جو اسے نثر سے افضل بنائے رکھتا ہے اور اپنے تاثر کے سبب انسان کے ذہن و دل کو اپنی گرفت میں فوراً لے لیتا ہے۔ اس روشنی میں ان اشعار کو دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورج کی صلیب کا شاعر شعوری طور پر اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو اشعار کے ابلاغ کو پوری طرح اجاگر بھی نہیں کر پاتا ہے یعنی شاعر عجز بیان کا شکار ہے۔ پہلے شعر کو دیکھیں:-

پیالی رکھ دو ذرا دیر پنکھے کے نیچے۔!
کہ گرم چائے سے سرخیِ لب دُھلے نہ کہیں

چائے کی پیالی کو پنکھے کے نیچے اس لئے رکھنے کا مشورہ دیا جارہا ہے کہ اس کی گرمی سردی میں تبدیل ہو جائے اور لب کی سرخی کو نقصان نہ پہنچے لیکن شاعر کی یہ منطق سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ سرد چائے لب کی سرخی کو دُھلنے سے کیسے تھام رکھ سکتی ہے۔ جبکہ اس کی خاصیت وہی ہے جو گرم چائے کی ہے۔ پانی گرم ہو یا سرد ہر صورت میں مصنوعی رنگ کو مٹا دیتا ہے۔ اگر لب کی سرخی قدرتی ہے تو گرمی اس رنگت کو دوبالا کر دے گی۔ مٹائیگی نہیں کیونکہ مناسب گرمی سے رنگ نکھرتا ہے ضائع نہیں ہوتا ہے۔ دوسرا شعر:-

چکھو گے اگر پیاس بڑھائیگا یہ پانی
پانی تمہیں ہرگز نہ ضیا دیگا یہ پانی!!

پہلا مصرعہ اپنے اندر حقیقت کی ایک سچی تصویر چھپائے ہوئے ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ آدمی کی تمنا تکمیل کے باوجود تشنہ رہتی ہے اور اس کی طلب میں شدت ہو جاتی ہے۔ اب دوسرے مصرعے پر غور کیجئے تو یہ بے ربط دکھائے دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر پہلا مصرعہ کہنے کے بعد بے یقینی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آرہی تھی کہ دوسرا مصرعہ کس طور کہا جائے کہ پہلے مصرعہ سے ربط پیدا ہو جائے۔ جب اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تو اس نے ایک غیر مناسب مصرعہ جوڑ دیا جو قاری کے لئے الجھن کا سبب بن گیا اور شعر نے اپنی معنویت کھو دی۔ تیسرا شعر:-

پہنچے گا سرابوں کا یہاں بھیس بدل کر
صحرا میں بھی ہر لمحہ صدا دیگا یہ پانی!!!

اس شعر میں نہ کوئی جدت ہے اور نہ اچھوتا پن۔ پرانی حقیقت کو شعری جامہ میں لانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ گرتے اور بہتے ہوئے پانی میں آواز ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل ہے کہ صحرا میں پیاس کی شدت آنکھوں کے سامنے پانی کا سراب پیش کرتی ہے لیکن یہ سراب بغیر کسی آواز کے آنکھوں کو دھوکہ دیتا رہتا ہے اور آدمی اس کی طلب میں ادھر سے ادھر بھاگتا رہتا ہے۔ یہ بات آج تک کسی کے تجربے میں نہیں آئی ہے کہ صحرا میں پانی کا سراب آواز دیتا ہے۔ پتہ نہیں شاعر کس جذبے سے متاثر ہو کر یہ شعر کہہ گیا ہے۔ چوتھا شعر:-

مجھ کو شوقِ شہادت دے
اس کے ہاتھ میں خنجر لکھ!

شہادت کا ایک الگ مفہوم اور درجہ ہے۔ جب تک کوئی اس مرحلے سے نہ گزرے ہم اسے شہید نہیں کہہ سکتے ہیں۔ ایسا کسی بھی زمانے میں نہیں ہوا ہے کہ کوئی اپنے آپ کو قتل کروادے اور شہید کہلانے لگے۔ یہ تھی شہادت کی ایک موٹی سی بات جو میں نے بتلائی ہے۔ اب آئیے اس شعر کی فنی خرابی کی طرف توجہ دیں جو بہت ہی عام سی ہے۔ جس کا خیال تو مشق شاعر بھی رکھتا ہے لیکن صبا اکرام کے یہاں یہ غلطی شعوری ہے کیونکہ اس قسم کی خامیاں ہر جدت پسند کے یہاں روا ہے۔ اپنے لئے جائز اور شان کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ علامت نگاروں کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ شعر کی فنی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شعر کی ردیف اور قافیئے غزل میں اس طرح ابھریں کہ وہ شعر کا ایک لازمی حصہ بن جائیں اور اپنے مفہوم کو صاف صاف واضح کریں۔ اس شعر کی ردیف "لکھ" پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس لفظ کو شعر میں زبردستی استعمال کیا گیا ہے جس سے شعر کا مفہوم اپنی حقیقت کھو چکا ہے اور اپنے اوپر کئے گئے ظلم کا نوحہ خواں ہے۔ اگر شاعر ردیف کی جگہ "دے" باندھ دیتا تو شعر قابل توجہ ہو جاتا۔

ان اشعار کی روشنی میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کہ "اچھی شاعری بنیادی طور پر علامتی ہوتی ہے" قابلِ قبول نہیں ہے۔ اب آئیے ذرا شمس الرحمان فاروقی کی رائے کو دیکھیں۔ ان کو یقین ہے کہ صبا اکرام نے عمر میں اپنے سے بڑے معاصرین کا اثر ضرور لیا ہے لیکن اسے کسی کا مقلد نہیں کہہ سکتے۔ میرا خیال ہے کہ اس مجموعہ کو پڑھے بغیر ہی شمس الرحمان فاروقی نے اپنی رائے دیدی ہے۔ میری نظر میں ان کی رائے خود متزلزل ہے۔ اثر لینا اور مقلد نہ ہونا متضاد ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ کوئی کسی کا اثر قبول کرے اور اس کے بتائے ہوئے اصول کو نہ اپنائے۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ ابن فلاں پر ابن فلاں کا اثر ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ابن فلاں نے ابن فلاں کی ساری اچھائیوں اور خرابیوں کو اپنا لیا ہے اور اس کے بتائے ہوئے قاعدے کو اپنی تحریر، تقریر اور خیال میں لاتا ہے۔ یہی تمام خصوصیتیں صبا اکرام کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ اس لئے صبا اکرام اپنے معاصرین کا مقلد ہے۔ میں یہ بات کسی ثبوت کے بغیر نہیں کہہ رہا ہوں، میرے پاس اس کا پورا جواز موجود ہے۔

علامت نگار مندرجہ ذیل باتوں پر یقین رکھتے ہیں اور ان کے طبقے کا ہر فرد ان باتوں کو اپناتا چلا آتا ہے۔ (۱) مبہم باتیں کرنا (۲) گنجلک خیال پیش کرنا (۳) بے ربط اور نامناسب الفاظ اور جملے لکھنا (۴) ردیف اور قافیئے غلط طور پر استعمال کرنا (۵) اپنے ملک اور فضا سے بے زار رہنا (۶) غیر قوموں کی شخصیتوں اور اشیاء کو علامت کے طور پر استعمال کرنا (۷) یاسیت کی باتیں کرنا اور زندگی کو بے کار شے بتانا (۸) جنس کو بھدے طور پر اجاگر کرنا۔

میں ان باتوں کی دلیل میں علامت نگاروں کی تخلیقات کو پیش کر سکتا تھا لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے صرف صبا اکرام کے اشعار پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان اشعار کو پڑھیئے:

مثلِ شجر اُگے گی اس آنگن میں شام کو
پتوں کی طرح گھر میں بکھر جائیگی یہ رات

رات کا تصور شاعر کے ذہن میں صاف نہیں ہے۔ کون سی رات بکھر جائیگی؟ اندھیری رات یا منور رات۔ ابہام کا پردہ

اس شعر میں اس قدر دبیز ہے کہ معنی خبط ہو جاتا ہے ۔ شاعر کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ رات بکھرتی نہیں ہے پھیلتی ہے ۔ "اب الجھن دیکھا" کے ان مصرعوں کو پڑھیئے ۔

یہاں میں دُور سے
ان سرمئی لہروں کے پیچھے بھاگ کر
آیا تھا
لیکن اب مرے تلووں کو
چکنی کائی کی
یہ مخملی نرمی بھی چبھتی ہے

ان مصرعوں میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ۔ شاعر اپنے ماحول سے بدظن ہے ۔ یہاں کی آرام دہ فضا اور سکوت بھی اسے بے چین کئے ہوئے ہے ۔ یہ رویہ صرف صبا اکرام کے یہاں نہیں ہے بلکہ ان معاصرین کے یہاں بھی ہے جن کو صبا نے اپنایا ہے اب اس کی نظمیں "قاتل" اور "سمندر کا اگلا ہوا جھاگ" دیکھئے ۔

میری آنکھوں کی تاریک الماری کے
گرد آلود خانوں میں رکھے ہوئے
چند بے نور تارے
کہ جن کے لئے
کالے حرفوں کے جنگل میں بھٹکا کیا
جسم کے خون کو
وقت کی جیبھ پر
میں نے ٹپکایا ۔ جن کے لئے
آج انہیں
اپنے ہاتھوں میں لینے سے
میں ڈر رہا ہوں
کہ ایسا کیا تو
میرا دل
مجھے مرے اپنے ہی خوابوں کا
قاتل کہے گا (قاتل)

پیاس کے
گہرے دریاؤں کے بیچ

میں اک جزیرے میں بیٹھا
خود اپنی ہی آنکھوں کا
صدیوں سے ہوں منتظر
ایک دن
روانہ کیا تھا
بہتے پانیوں میں کہیں
آنکھیں مری بہہ گئی ہیں
کہ مرا مقدر
سمندر کا اُگلا ہوا جھاگ ہے۔

ان نظموں کا کیا مقصد ہے۔ کن جذبوں سے شاعر متاثر ہوا ہے۔ وہ کیا سمجھانا چاہ رہا ہے۔ کچھ بھی عیاں نہیں ہے۔ گنجلک خیال کا ایک دریا ہے جو قاری کے ذہن کو بھی شاعر کی آنکھوں کی طرح بے سمت راہوں پر بہا کر لے جاتا ہے ان اشعار کو پڑھیے جن میں یاسیت ہی یاسیت ہے۔

پھینک دیگا یہ جہاں اخبار کی صورت ہمیں
دیکھنا اک روز کہ گزرا ہوا کل ہو گئے ــ!

ہر پل جو کاٹتی ہے مجھے دھار ہی تو ہے!
اکرام اپنی سانس بھی تلوار ہی تو ہے ــ!

زندگی کو بے کار شے گردانا علامت نگاروں کے زریں اصولوں میں سے ایک ہے۔ صبا اکرام کا یہ شعر دیکھئے جس سے اس کے مکتب فکر کی ترجمانی ہوتی ہے۔

ردی کے بھاؤ بیچنے نکلے ہوئے ہیں لوگ
یہ زندگی پڑھا ہوا اخبار ہی تو ہے ــ!

ہو سکتا ہے کہ جدت پسند میری اس بات کے جواب میں قدیم شعراء کے کچھ اشعار پیش کر دیں جن میں یاسیت کا عنصر موجود ہو لیکن میں انہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان قدیم شعراء نے زندگی کو صرف ایک زاویئے یعنی یاسیت سے ہی نہیں دیکھا ہے بلکہ انہوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو ابھارا ہے۔ ان کے یہاں زندگی ایک طرف غم سے عبارت ہے تو دوسری طرف خوشیوں کا بے کراں سمندر بھی ہے۔ لیکن جدت پسندوں کے یہاں زندگی صرف اور صرف غم کا گہوارہ ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسے شعراء زندگی سے اس قدر بے زار اور خوف زدہ ہوئے کہ کسی نے خودکشی کر لی اور کسی نے اپنی لاش کو جلانے کی وصیت کر دی۔

حائل رہیں گے بیچ میں ملبوس کب تلک
ملنے کی آرزو ہے تو دیوار توڑ دیجئے!

میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ جدّت پسندوں نے فیشن کے طور پر جنس کو بھدے طریقے سے ادب کا موضوع بنایا ہے اور اس قدر بے باک ہو گئے ہیں کہ تہذیب کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے جس کی زندہ مثال صبا اکرام کا یہ شعر ہے۔ ان لوگوں کو شاید معلوم ہی نہیں ہے کہ انسانی پیدائش کے بعد ہی سے ملنے کی آرزو اور دوستی کا جذبہ ہر فرد میں موجود ہے لیکن اس کی بنیاد کبھی بھی کپڑے سے بے نیازی نہیں رہی ہے۔ پھر ملنے کا جذبہ ماں بیٹے، بھائی بہن اور عزیز و اقارب میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات کسی کے تجربے اور مشاہدے میں نہیں آئی ہے کہ ماں بیٹے اور بھائی بہن ایک دوسرے سے ملنے کی تمنا میں کپڑے سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔
زن و شو بھی ملنے کی خواہش میں اتنے بے باک نہیں ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں شائستگی کا یہ عالم ہے کہ لوگ اپنی بیویوں سے بھی رات کی تنہائی میں اشارے کنائے سے ملتے ہیں۔ لیکن علامت نگار ان چیزوں سے بے نیاز ہے۔ اس کے یہاں جنسی عریانی اور گندگی کا اظہار عینِ فنکاری ہے اور رشتے کے تقدس کا خیال نہ رکھنا ہی ایمان ہے جس کا اظہار صبا اکرام اس طرح کرتا ہے۔

سب رشتے ناطے جھوٹ ہیں
ماں اور بیٹی کچھ بھی نہیں
چہروں کا سارا کھیل ہے
چہرے کو تم بھی ڈھانک لو
چہرے کو ہم بھی ڈھانک لیں

نام نہاد جدّت پسندوں کے اشعار اور افسانے پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی تہذیب و تمدن سے ناآشنا ہیں اور دوسروں کی روایات کا ان پر اس قدر اثر ہے کہ اپنی روایات کے سلسلے میں احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ ان کی تخلیقات کے مطالعہ کے بعد یہ چیز ابھر کر آتی ہے کہ وہ دوسری قوموں کی تہذیب و تمدن کے مبلغ ہیں اس لئے ان کے اشیاء اور شخصیتوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ صبا اکرام بھی ان چیزوں کا پابند ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) شیشے کو دیکھوں
تو ماتھے پہ مرے یہ کالک نہ ہو
رام کی نیچی نظریں اٹھیں
اور چھپا کے حسین پھول
مجھ پہ نچھاور کریں
میں میں وہ سیتا نہیں ہوں
جسے صرف اک بار
اس امتحاں سے گزرنا پڑا تھا۔

کہ میرا ہرن تو
اس طرح ہر روز ہوگا
کہ ہر صبح راون سے
ہر رات اگنی پرکشا مقدر میرا
(۳) اگر میں لوٹنا چاہوں تو رستے میں
وہی دھندلی ہتھیلی کی لکیریں ہیں
وہی لچھمن کی ریکھا ہے

اک جوگی اور پیڑ کا رشتہ کل بھی تھا سو آج بھی ہے
جیون سایہ پیپل کا اور درد صبا اک گوتم ہے!

ان اشعار اور مصرعوں کی روشنی میں جو میں نے صبا اکرام کے مجموعہ "سورج کی صلیب" سے لئے ہیں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وزیر آغا اور شمس الرحمان فاروقی کی رائیں اپنے ہم خیال حلقے کے ایک فرد کی پشت پناہی تو کر سکتی ہیں لیکن صداقت کو جھوٹ میں بدل کر قاری کو گمراہ نہیں کر سکتی ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود صبا اکرام کے یہاں کچھ اچھے اشعار ہیں جو غیر مبہم ہیں اور اپنی معنویت کو اپنی تمام تر سلاست اور لطافت کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔ اس مجموعے کی نظموں میں دوسری خاص قابل ذکر بات "دوسری ہجرت" کا وہ کرب ہے جس کی یاد اب تک دلوں کو گرما رہی ہے۔
چند اشعار اور مصرعے ملاحظہ فرمائیں

ہم جدھر چل پڑے
راستے جھلملائے
مگر منزلیں
اور نہ کوئی پتہ منزلوں کا کہیں
سرمئی راستے
آج پھر ختم پر آگئے

احساس خود فریبی ہے کس درجہ کامراں
ہم خود سے کہہ رہے ہیں کہ جھوٹے ہیں آئینے

فرصت کہاں کہ لے کوئی غیروں سے انتقام
خود سے ہی دشمنی میں اب الجھے ہوئے ہیں لوگ

طاہر آفریدی

بات کا زخم

شادی کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ دلہن کا جوڑا اور زیورات دلہن کے گھر پہنچا دیئے گئے تھے۔ اور آج رات دلہن والوں کے گھر مہندی کی رسم تھی۔ دولھا نواب خاں کے گھر پر بھی لڑکیاں اور عورتیں جمع ہو چکی تھیں۔ اور شادی کے گیت گا رہی تھیں۔

دور اور قریب کے سب رشتہ دار، دوست احباب آ چکے تھے۔ گھر میں عورتوں اور بچوں نے ایک شور مچا رکھا تھا۔ حجرے میں جوان اور بزرگ چارپائیوں پر پڑے ہوئے تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے۔ ساتھ ہی رُباب اور گھڑے کے ساز اور انار گل کی آواز سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قدرت نے انار گل کے گلے میں وہ رس بھرا تھا کہ اس کا گانا سنتے ہی دل و دماغ پر ایک نشہ سا طاری ہوتا اور سُننے والے کے دل سے تھوڑی دیر کے لئے تمام غم اور دُکھ مٹا دیتا تھا۔ وہ جب رحمان بابا کا کلام یا نورالدین استاد کا چاربیت گاتا تو بزرگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے اور جوانوں کو خود پر قابو پانا مشکل ہو جاتا۔ انار گل جتنا اچھا گاتا اتنا ہی اچھا وہ رُباب بھی بجاتا تھا۔ دُور دُور سے لوگ اس کا رباب اور گانا سننے کے لئے آتے تھے، اور آج تو خاص طور پر محفل سننے کے قابل تھی۔

نواب خاں انار گل کا جگری دوست تھا اور اپنے جگری دوست کی شادی میں اگر وہ رُباب نہ بجاتا اور گانا نہ سناتا تو پھر اس کے نزدیک حصولِ فن بے مقصد تھا۔ یہ شادی گاؤں کی اور شادیوں سے مختلف تھی۔ نواب خان کے ماں باپ اپنے بیٹے کی شادی پر اپنے سارے ارمان پورے کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے دلہن کے گھر دوپہر کا اور اپنے یہاں شام کے کھانے کا مکمل بندوبست کیا تھا۔ صبح، اذان ہونے سے پہلے دیگوں کے نیچے آگ جلا دی گئی تھی تاکہ سورج نکلنے سے پہلے چاول تیار ہو جائیں۔

دلہن کے ہاتھ پیروں پر مہندی اپنا رنگ جما چکی تھی، اور جب سورج طلوع ہونے لگا تو دلہن کی سہیلیاں اس کا سنگھار کرنے لگیں۔ دُولہا کے ہاں صبح ہوتے ہی آس پاس کے لوگ آنے لگے۔ خوشی کے اظہار میں فائر ہونے لگے۔ باراتی نئے نئے کپڑے پہنے اونچے اونچے شملوں والی پگڑیاں باندھے، رائفل اور بندوق کاندھوں پر لٹکائے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ بڑے حجرے کے چاروں طرف چارپائیاں ڈال دی گئیں۔ لوگ آتے اور بیٹھ جاتے۔ حُجرے کے بڑے میدان میں ڈھول سُرنا اور ناچنے والے دریاں بچھائے بیٹھے تھے۔ جب سب لوگ جمع ہو چکے تب ایک بزرگ نے اُٹھ کر ڈھول سُرنا بجانے والوں سے کہا "کیا تم لوگوں نے ہاتھ پیر پر مہندی لگائی ہے؟ یہ کوئی ماتم تو نہیں۔ اٹھو اور ایک ہنگامہ برپا کر دو۔ ڈھول اور سُرنا بجاؤ کہ آس پاس پہاڑ بھی گونج اٹھیں"!

وہ سب تو تیار بیٹھے تھے، حکم ملتے ہی ڈھول بجانے لگے۔ ناچنے والے خوبصورت لڑکے ڈھول کی آواز پر پھرکی کی طرح گھومنے لگے، اور

بوڑھوں اور جوانوں کے سروں سے صدقے ہونے والے نوٹ وصول کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد نواب خان بوسکی کی سفید قمیص اور سفید لٹھے کی شلوار پہنے، سر پہ اصل زری والا کلاہ اور شہدی لنگی باندھے رائفل ہاتھ میں لئے بڑی شان سے حجرے میں آگیا۔

گاؤں کا حجام مسجد سے قرآن شریف ایک چادر میں لپیٹ کر لایا اور حجرے کے باہر دروازے کے پاس اس طرح کھڑا ہوگیا کہ ہر گزرنے والا جھک کر قرآن شریف کے نیچے سے گزر جاتا۔

بڑے راستے پر ایک بوڑھی عورت نے اس مخصوص جھاڑی کی ٹہنیاں توڑ کر جلادیں جو ایسے موقعوں پر نظر بد سے بچانے کے لئے جلائی جاتی ہیں۔ ناچنے والے خوبصورت لڑکے سرخ اور لمبے پشواز پہنے ناچ رہے تھے۔ بارات جب گاؤں سے باہر آنے لگی تو نوجوانوں نے اپنی رائفلوں کو کندھوں سے اتار کر کارتوس بھر لئے۔ بزرگ بارات کے چاروں طرف پھیل کر سارے باراتیوں کی نگرانی کرنے لگے ایسے موقعوں پر سب سے زیادہ ذمہ داری ان بزرگوں ہی کے کندھوں پر آجاتی ہے۔ ایسی شادیوں میں دوست دشمن سب آتے ہیں مبادا کوئی غلط حرکت کر بیٹھے یا کسی کی گولی سے کوئی زخمی ہوجائے۔ وہ ہر جوان اور نوعمر لڑکے پر جو پوری طرح رائفل چلانا نہیں جانتا، نظر رکھے۔ بڑی تیزی سے کبھی آگے کبھی پیچھے آتے جاتے تھے۔ وہ کسی سے کہتے گولی خیال سے چلانا، کسی سے کہتے، لڑکے! رائفل سنبھال کے رکھو۔ بارات کے آخر میں چونکہ عورتیں اور لڑکیاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا بہت سے نوجوان کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح پیچھے ہی رہیں۔ مگر یہ بزرگ جو گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ ان کو ڈانٹ کر آگے آگے چلنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

جوان دیوہیکل پہاڑیوں پر اپنی اپنی رائفلوں سے نشانہ بازی کرتے تھے۔ ڈھول سرنا پورے زور سے بجتے تھے اور ناچنے والے لڑکے بارات کے آگے آگے ناچتے چلے جاتے تھے۔ پیچھے عورتیں اور لڑکیاں بھی اپنے دستور کے مطابق ڈھولک بجاتی اور گاتی ہوئی چل رہی تھیں۔

دوپہر کا کھانا دلہن کے گاؤں میں تیار تھا۔ بڑے بڑے تھالوں میں کھچڑی جس کے بیچ میں اصلی گھی سے بھرا مٹی کا کٹورا رکھا تھا باراتیوں کے سامنے لاکر رکھی جاتی۔ ایک تھال کے گرد چار چار چھ چھ باراتی جمع تھے اور کھا رہے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد بڑی پہاڑی کی چوٹی کے پاس ایک مخصوص جگہ پر مٹی کا شکار رکھا گیا۔ پھر ایک خدمت گار نے آکر بھرے حجرے میں چیلنج کے انداز میں کہا "جس کسی کو اپنے نشانے پر ناز ہو وہ آکر ثابت کرے کہ وہ اچھا نشانہ باز ہے"۔ یہ خدمت گار ایسے موقعوں پر کچھ اس طرح کے فقرے کہتے ہیں اور نوجوانوں کو تاؤ دلاتے ہیں کہ جب تک نشانہ نہ لگے وہ گولیاں چلاتے رہیں۔ یہاں کے رواج میں نشانہ بھی ایک شرط کے طور پر رکھا جاتا ہے کہ جب تک نشانہ خطا ہوتا رہے گا دلہن کی ڈولی نہیں اٹھائی جائے گی اور جب کافی دیر تک نشانے پر گولی نہیں لگتی تو بارات کی شریر لڑکیاں کسی سے کہلا بھیجتی ہیں کہ اگر نوجوان نشانہ بازی میں ناکام ہوگئے ہیں تو رائفلیں ہمیں دیدیں۔ اور پھر تو جوان اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرسکتے، اور جوش میں آکر کارتوسوں کی بھری پیٹیاں خالی کردیتے ہیں۔

خدمت گار کے کہنے پر ہر باراتی حجرے سے باہر آکر نشانے پر گولیاں چلاتا رہا۔ دلہن کا چھوٹا بھائی شہزادگل بھی آکر کھڑا ہوگیا۔ اس کی عمر دس بارہ سال تھی اور وہ بمشکل رائفل پکڑ سکتا۔ مگر وہ ضد کر رہا تھا کہ وہ بھی نشانہ پر گولی چلائے گا۔ پھر اس کی ضد پر کسی نے اس کو کارتوس بھر کر رائفل پکڑادی اور اس نے گولی چلادی۔ باراتیوں نے اس کا دل رکھنے کے لئے شاباش دی کہ بہت اچھا فائر کیا ہے۔ شہزادگل خوش خوش وہاں سے ہٹ کر اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں مشغول ہوگیا اور اپنے ساتھیوں کو بڑے فخر سے بتانے لگا کہ اس نے کس طرح گولی چلائی، بالکل بڑے خان کی طرح۔

اس کے ساتھیوں کو شہزاد گل کی برتری اچھی نہیں لگی۔
کسی نے کہا "تم کیا بڑے خان کی طرح گولی چلاؤ گے۔ وہ تو ایک ہی گولی میں اپنے دشمن کا خاتمہ کر دیتا ہے۔"
شہزاد گل نے سینہ تان کر کہا "میں بھی ایک ہی گولی میں دشمن کو ختم کر سکتا ہوں میں بھی تو پختون ہوں۔"
دوسرے نے طنزاً کہا "ہاں پختون تو ہو۔ مگر ایسے بے شرم کہ اپنی بہن کی شادی میں بھی گولیاں چلاتے ہو۔"
چونکہ یہاں کے دستور کے مطابق لڑکی والے مرد کسی خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔ لہذا یہ طعنہ شہزاد گل کو برا لگا اور وہ لڑکے کے ساتھ الجھ پڑا۔ اس نے اس لڑکے کو ایک تھپڑ مارا۔ پھر اس لڑکے نے جواب میں ایک ایسی بات کہہ دی کہ شہزاد گل کا دوبارہ اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سرخ انگارہ بن گیا۔ اور اس لڑکے سے مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ کر حجرے میں چلا آیا
نشانہ بازی کر کے سب لوگ پھر حجرے میں آ کر بیٹھ گئے۔
چند دوست نواب خان کو حجرے سے مسجد میں مولوی صاحب کے پاس لے گئے اور پھر تھوڑی دیر بعد مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔ باراتی نواب خان کے والد کو مبارکباد دیتے، اور خدمت گار، نائی ان سے اپنا محنتانہ وصول کرنے جمع ہو گئے۔ ادھر دلہن کو بھی رخصتی کے لئے تیار کر لیا گیا اور اسے ڈولی میں بٹھا کر اوپر سے سرخ شالیں اور پھولوں کی چادر ڈال دی گئی۔ دو کہاروں نے ڈولی اٹھا کر اس گھر کی طرف سے رخ پھیر لیا جس کے آنگن میں آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے دلہن نے اپنا بچپن کھویا تھا۔
ڈھول سرنا والے ڈھول سرنا بجاتے اور ناچنے والے ناچتے ہوئے بارات کے ساتھ چلنے لگے۔
شہزاد گل قریب آ کر اپنے باپ کے چہرے کو دیکھنے لگا جو بیٹی کی شادی پر خوش تو تھا مگر اس کی رخصتی پر چہرے سے کچھ اداسی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر اپنے باپ کے چہرے پر زرد سائے لرزتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر وہاں سے سیدھا نواب خان کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا "مجھے ایک کارتوس بھر کر رائفل دیدو۔"
کسی نے اس کو ٹوکا بھی مگر نواب خان نے ہنس کر رائفل میں کارتوس بھر کر اسے دیدی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے ایک فائر ہوا اور نواب خان دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ کر گرنے لگا۔ اس کی سفید بوسکی کی قمیص پر جیتا جیتا لہو سرخ پھول بناتا ہوا دامن تک پھیل گیا۔ مشہدی پگڑی اور اصلی زری کا کلاہ زمین پر گر کر خاک آلود ہو گئے۔
رائفلیں خاموش ہو گئیں۔ ڈھول سرنا پر سکوت مرگ طاری ہو گیا۔ ناچنے والے لڑکوں کے سر ساکت ہو گئے۔
نواب خان کی ماں سر پر خاک ڈالتی نواب خان کے گرم خون میں ڈوبے ہوئے لاشے پر گر پڑی۔
نواب خان کا باپ بت بنا رہ گیا اور باراتی سر جھکائے جنازے کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔
وہ سب سمجھ رہے تھے کہ شہزاد گل سے اتفاقاً گولی چل گئی ہے
مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکا کہ شہزاد گل نے جان بوجھ کر نواب خان کو گولی ماری ہے۔
اس لڑکے کو بھی پتہ نہ چلا جو شہزاد گل کے ساتھ لڑ پڑا تھا اور جس نے شہزاد گل سے کہا تھا۔
"اتنے بہادر ہو تو خود جا کر نواب خان کو کچھ کہو جو تمہاری بہن کو اپنی بیوی بنا کر اپنے ساتھ ڈولی میں سارے لوگوں کے درمیان اپنے گھر لے جا رہا ہے۔"

●

سیپ

علی حیدر ملک

علامتی افسانہ، کمزوریاں اور جعلسازیاں

علامتی افسانہ خالص علامتی نہیں ــــ یہ بہت ساری چیزوں مثلاً اشارہ کنایہ، رمز، ایمائیت، تجریت، پیکر تراشی، تمثیل، تجریدیہ اور استعارہ وغیرہ کا مرکب یا مجموعہ ہے۔ اب اسے آپ ہمارے قومی ملاوٹی کردار کا شاخسانہ سمجھیں یا مجبوری کہ ہم بیشتر صورتوں میں اسی مرکب مجموعے کو ہی علامتی افسانے سے موسوم کرتے ہیں۔ مجبوری میں نے اس لئے کہا ہے۔ کہ پیکر تراشی، رمزیت، تمثیل، تجریدیہ اور استعارہ وغیرہ کی تعریف جاننے اور ان کے باہمی فرق کو ماننے کے باوجود فنی نمونوں میں عملاً ان کے درمیان حد فاصل کھینچنا بعض اوقات مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا ہے۔ خیر جو بھی ہو اتنی بات یقینی ہے۔ کہ یہ افسانہ روائتی افسانے سے یکسر مختلف ہے۔ اور نئے افسانے کا مقدر بھی یہی ہے۔

علامتی افسانہ نئے افسانے کا مقدر ضرور ہے لیکن یہ سمجھنا کہ یہی اردو افسانے کی کل کائنات ہے۔ یا محض یہی افسانے کی واحد مستقل اور ناقابل تغیر صورت ہے۔ نہ صرف یہ کہ غلط بلکہ کم نگہی کی دلیل ہے۔ جو لوگ یہ باور کرانے اور تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ علامتی افسانے کے نادان دوست ہیں۔ اور یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ کہ نادان دوست دانا دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے علامتی افسانہ نگاروں کو ان نادان دوستوں کو پہچاننا اور ان کی گمراہ کن باتوں سے لاتعلقی کا برملا اظہار کرنا چاہیئے۔

جیسے کل کا افسانہ آج نہیں رہا۔ ویسے ہی آج کا افسانہ شاید کل نہیں رہے گا۔ اس بات سے کبیدہ خاطر یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے۔ کہ اچھے افسانے لکھے جائیں تاکہ آنے والا وقت اسے فراموش نہ کر سکے۔ محض دوسروں کی نفی یا نعرہ بازی کسی کو زندہ نہیں رکھ سکتی ــ کہ کل بھی اس نے کسی کو زندہ نہیں رکھا تھا۔ مجنوں پر سنگ اٹھانے والوں کو اپنا سر بھی یاد آنا چاہیئے جنہیں اپنا سر یاد نہیں آتا ان کے بارے میں شبہہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان کے شانوں پر شاید سر ہیں ہی نہیں۔ اس بات پر بھی بار بار زور دینے کی ضرورت ہے۔ کہ علامتی افسانہ اردو افسانے کے تاریخی تسلسل کا ایک حصہ اور اسی کا ایک مرحلہ ہے۔ اگر اسے جذباتیت پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ جس طرح نسلی اعتبار سے ہم اپنے آباؤ اجداد کی اولاد ہیں۔ اسی طرح ادبی لحاظ سے بھی ہم اپنے بزرگ افسانہ نگاروں کی اولادیں ہیں۔ یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں رہ گئی کہ ہمارے ادبی اسلاف کوئی اور نہیں یہی پریم چند، منٹو، بیدی، غلام عباس، عصمت، قرۃ العین اور شوکت صدیقی وغیرہ ہیں۔ جو لوگ اس بات کو ماننے سے انکاری ہیں۔ وہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اپنا شجرہ نسب بھی لوگوں سے چھپاتے ہیں اور اپنا شجرہ نسب کون لوگ چھپاتے ہیں۔ اس سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

جس طرح اولاد میں باپ کا خون شامل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح آج کے افسانے میں بھی ماقبل کے افسانے کا خون شامل ہے۔ پھر بھی آج کا افسانہ ماقبل کے افسانے سے مختلف ہے کہ ہر گو ہر سر ہوتی کا سے مختلف تو ہوتا ہی ہے۔

ہر تحریک یا رجحان کے ساتھ کچھ بدعتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں کہ علامتی افسانہ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ اس کا مطالعہ ہمیں بتایا ہے۔ کہ ہمارے بعض لکھنے والے علامتوں میں معنویت پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ انہوں نے علامتیں تو پیش کر دیں۔ لیکن علامتوں کے درمیان سے افسانہ کہیں غائب ہو گیا۔ "اشعارے" میں شامل انور سجاد کی کئی کہانیاں اس کی واضح مثالیں ہیں۔ لیکن انور سجاد کی یہ مجبوری قابل فہم ہے۔ کہ وہ مصور بھی ہیں۔ اور مصوری کے بعض اسالیب کو افسانے میں برتنے میں جہاں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ وہاں بعض جگہوں پہ انہیں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان کے بارے میں بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی یہ کہانیاں تجربے کی نذر ہو گئیں۔ اس سلسلے کی دوسری مثال انور عظیم کی ہے۔ انور عظیم ایک باشعور اور زرخیز ذہن کے مالک۔ افسانہ نگار ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ کہ ایک زمانے میں کرشن چندر ان کے دل و دماغ پہ چھایا رہا۔ اور اب جب کہ وہ جدید یا علامتی افسانے کی راہ پہ گامزن ہوئے ہیں۔ تو بھی اکثر ٹھوکریں کھاتے اور لڑکھڑاتے نظر آتے ہیں۔ علامتی افسانے میں ایک اور طرح کی خرابی ہمارے افسانہ نگاروں کی بے صبری اور بے احتیاطی سے پیدا ہوئی ہے۔ یا شاید ان کے اس خوف سے کہ قاری ان کا مدعا نہیں سمجھ رہا ہے۔ اس قسم کی ایک مثال اسد محمد خان کے فورک لفٹ ۲۵۲ سے دی جا سکتی ہے یہ اسد محمد خاں کا ایک عمدہ افسانہ ہے جس کی کہانی یہ ہے۔ کہ ایک فورک لفٹ خراب ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف لوگوں سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ ایک شخص سے سوال کیا جاتا ہے "یہ بتایئے کہ اسٹینڈ زیادہ سختی سے رگڑ کھا رہا ہے تو کیا اس میں زیادہ آواز ہو گی۔ اور ہلکی رگڑ کھا رہا ہے۔ تو کیسی آواز ہو گی۔؟" وہ شخص جواب دیتا ہے "جی ہاں اگر ہلکی رگڑ کھا رہا ہے۔ تو معمولی آواز ہو گی۔ جو ہو سکتا ہے۔ کہ پکڑ میں نہ آئے مگر تاریخ اتنی ہلکی آوازوں کو بھی سن لیتی ہے" صاف ظاہر ہے۔ کہ جوابی مکالمے کا آخری فقرہ کہانی کے CONTEXT میں بالکل بے محل ہے اور اس کے مجموعی تاثر کو بری طرح مجروح کر ڈالتا ہے۔

یہ تو چند اچھے لکھنے والوں کی بعض کوتاہیوں اور لغزشوں کا معاملہ تھا۔ ایک اور طرح کا گھپلا جو زیادہ سنگین ہے۔ ان لوگوں نے پیدا کیا ہے جو سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ یا شامل ہونے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔ آپ پھر یہ پوچھیں گے یہ لوگ کون ہیں۔؟ — جی ہاں ہمارے نقادوں کی تو اپنی اپنی مصلحتیں اور مجبوریاں ہیں۔ لہٰذا یہ ناخوشگوار فریضہ بھی اس آشفتہ سر کو ہی انجام دینا ہو گا۔ تو سنیئے کہ اس قسم کے لوگوں میں نمایاں نام محمد عمر میمن اور چوہدری محمد نعیم کے ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ان لوگوں نے افسانے کے نام پہ جو کچھ لکھا ہے۔ وہ سراسر جعلی اور اکتسابی ہے۔ ان کی شہرت سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں۔ کہ یہ ننانوے اعشاریہ نو فیصد ان کے تعلقات عامہ کی مرہون منت ہے۔ یہاں برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ علامتی افسانے کے سلسلے میں زیادہ گھپلے ہندوستان میں ہوئے ہیں۔ پاکستان میں اس کی صورت نسبتاً سنبھلی ہوئی رہی ہے۔ افسانے سے متعلق کوئی بھی آدمی یہ گواہی دے گا کہ پاکستان میں اس قدر مصنوعی اور اوٹ پٹانگ چیزیں شائع نہیں ہوئیں۔ جس قدر کہ ہندوستان میں اور نہ یہاں کھرے کھوٹے کے درمیان تمیز کرنے میں زیادہ دیر لگی۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ پاکستان میں علامتی افسانے کا ردعمل اتنا شدید نہیں ہوا۔ جتنا کہ ہندوستان میں نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اور باتوں کے علاوہ ان غلط کاریوں کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ وہاں ہر چھوٹے بڑے ادبی مرکز کے لکھنے والوں نے اپنے لئے رسالے نکال لئے اور ان میں بلا امتیاز اچھی بری تحریریں دھڑلے سے چھاپنے لگے حتیٰ کہ پاکستان کے کئی جعلسازوں اور نقالوں کے افسانہ نگار ہونے کی اطلاع بھی ہمیں انہی کے ذریعے ملی پاکستان کے بیشتر رسالے چونکہ ایسے ہاتھوں میں تھے۔ جن میں ادبی سوجھ بوجھ زیادہ تھی۔ اور ان رسالوں کی اپنی ایک ادبی ساکھ اور روایت بھی موجود تھی۔ اس لئے ان کے صفحات پر مداریوں کی بے ہنگم حرکتوں کے لئے گنجائش نہ نکل سکی۔

جعلی، نقلی اور محض تجربے کے شوق فضول والی تحریروں سے قطع نظر علامتی افسانے میں عمومی طور پر کچھ دیگر کمزوریاں اور خرابیاں

بھی پیدا ہوئیں۔ ان کمزوریوں یا خرابیوں میں سب سے نمایاں کمزوری یا خرابی کہانی پن یا افسانویت کا فقدان ہے۔ کہانی پن یا افسانویت سے میری مراد واقعات کا منطقی تسلسل یا مربوط پلاٹ ہرگز نہیں ہے۔ کیونکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ واقعاتی تسلسل یا مربوط پلاٹ کے باوجود ہو سکتا ہے کہ افسانہ میں افسانویت نہ پائی جائے۔

تکنیک کی تبدیلیاں اور ہیئت کے تجربے اچھی چیزیں ہیں۔ لیکن یہ بات فراموش نہیں کی جانی چاہیئے کہ یہ تبدیلیاں اور تجربے افسانے کی حد کے اندر ہوں۔ اس کے باہر نہیں۔ اور افسانے کی آخری حد افسانویت ہے۔ افسانویت کیا ہے۔ یہ بتانے کے لئے میں شعریت کی مثال دینے کی بجائے آدمی کی مثال دوں گا۔ جس طرح آدمی کی شکل وصورت، قد وقامت اور رنگ ڈھنگ میں ہزاروں اختلاف کے باوجود کبھی کسی کو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اور نہ وہ اسے کسی اور مخلوق سے خلط ملط کرتا ہے۔ اسی طرح ہر قسم کی تبدیلیوں اور تجربوں کے باوجود افسانے کو افسانہ رہنا چاہیئے جس کی پہلی اور آخری پہچان افسانویت ہے۔ افسانے پر کسی اور چیز کا گمان ہونا اس کے لئے کوئی نیک فال نہیں ہے۔ ایک دوسرا گمراہ کن رجحان علامتی افسانے میں فلسفہ طرازی کا نظر آتا ہے۔ فلسفہ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں۔ اور نہ اسے افسانے میں پیش کرنا کوئی ایسی معیوب بات ہے۔ لیکن اس کا مقصد قاری پر فلسفے کی دھونس جمانا یا افسانے کے عیب پر پردہ ڈالنا نہیں ہونا چاہیئے۔ افسانہ نگار کا بنیادی مقصد افسانہ لکھنا ہوتا ہے۔ اور وہ اسی کے ذریعے اپنے ہر طرح کے خیالات وتجربات نیز جذبات واحساسات کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن بنیادی مقصد افسانے لکھنے کے علاوہ کچھ اور قرار پا گیا تو یہ افسانے کی کوئی خدمت نہیں ہوگی۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اردو افسانہ نگاروں میں سے کسی کا کوئی اپنا فلسفہ بھی نہیں ہے۔ برٹنڈرسل، کالن ولسن اور سارتر اپنے اپنے فلسفے کے حوالے سے اس صدی کی عظیم ہستیاں ہیں۔ ان حضرات نے افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں۔ لیکن یاد رکھیئے کہ ہیمنگوے، برٹنڈرسل سے کافکا، کالن ولسن سے یہاں تک کہ کامیو، سارتر سے بہ حیثیت فکشن رائٹر کہیں آگے کہیں بڑے ہیں۔ اب یہ ہم پر ہے کہ ہم میں سے کون افسانہ نگار رہنا چاہتا ہے۔ اور کون فلسفیوں کا دم چھلا بننا پسند کرتا ہے۔

یہ بات بہرحال طے ہے کہ افسانے کی تاریخ افسانہ نگاروں کو یاد رکھے گی۔ فلسفہ بگھارنے والوں کو نہیں۔

●

نسیم درانی (ایڈیٹر، پبلشر) نے انجمن پریس (پرنٹر) سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "الفاظ" بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸ سے شائع کیا
(اشاعت: جنوری ۱۹۸۳ء)

سیپ
نسلِ نو کا ترجمان
ہر بار پرانے اور نئے ناموں کے ساتھ معیاری
اور اچھی تحریریں پیش کرتا ہے
تازہ شمارہ آج ہی خریدیئے
مدیر
نسیم درانی
پوسٹ بکس نمبر ۳۲۲۴ ، کراچی
فون: ۶۸۰۱۰۶
سیپ

کاستس مونتس
اصغر ندیم سید

جارحیت

یہ یقین کرنا مشکل ہے
کہ کرینیا[1] انھیں یہاں تک لایا
یہ یقین کرنا مشکل ہے
کہ سمندر جسے ہم نے شدت سے چاہا
انھیں یہاں تک لایا
ادھر دیکھو !
اس تصویر میں ہم کیسے ہنس رہے ہیں
اور تم جانتے ہو اسے کھینچے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا
کیا تمھیں یاد ہے ہم کس طرح ہنسا کرتے تھے
کرینیا کے کڑوے سمندر
ہم وہ تمام اشعار واپس لیتے ہیں
جو ہم نے تمھارے لئے لکھے ہیں

کاروواس[2] ۱۹۷۴ء

اس سال یہاں کے لیموں برآمد نہ کرو
ان کا رس اٹھارہ سالہ لڑکوں کا خون ہے
ان کا رس اٹھارہ سالہ لڑکوں کی فصل بہار ہے
سوچو !
انھیں ابدیت کی خاطر کہاں ذخیرہ کیا جائے
سوچو !
انھیں ابدیت کی خاطر کیسے ذخیرہ کیا جائے

---

[1] سمندر [2] جگہ کا نام

نجم الحسن عطا

سُکھ دِیا

اس سمے اہلِ دل
آسمانوں کے نیچے اُبھرنے کو ہیں
مگر اب تلک ثروتوں کی حسیں بارشوں میں نہاتے ہوئے
عیش کی کشتیوں میں خراماں
جزیروں کی جانب
وہ چٹان دل جا رہے ہیں
جنہیں اب تلک کوئی طوفان ساگر کا ٹکرا کے گزرا نہیں
تم جو محبس میں برسوں ستم کا نشانہ بنے
اور کامنی رُوپ فطرت کے روپوں سے محروم ہو
تمہاری یہ حسرت بھری روحیں دیمک لگے شہرِ بے داد میں
تڑپتی ہیں آزاد جھونکوں کے اک لمس کو
مگر صبر کی پیلی پتھر سِلوں پر دُکھوں کی صلیبیں ہیں لٹکی ہوئی
دیوتا سوریا نیل آکاش کے
مغربی گھاٹیوں میں کہیں جا کے چھُپ
پہاڑی گلو قرمزی
ڈوبتی ترچھی ترچھی شعاعوں کو اپنے بدن میں سمو لو
درختوں کی شاخو ہری
زرد مدقوق بجھتی ہوئی روشنی کے سمندر کی گہرائی میں ڈوب جاؤ

نیلے سمندر ذرا کھول دے اپنی آنکھیں
اُٹھو اور فتنے جگاؤ
مری بستیاں جاگ اُٹھیں
اندھیروں کے پردوں کو پھاڑیں
الاؤ جگائیں دلوں کے مکاں میں
بجلیاں اور طوفان لائیں
بارشوں کا سجل دیوتا
اہلِ دل سے گریزاں نہیں
کامرانی کی جو بانسری لے کے راہوں پہ بیٹھا ہوا منتظر
سُروں کی زباں میں الاپے
کہ ست بدھ کو جاری رکھو
نہ جب تک کہ ہر گاؤں کے ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں پہ جلنے لگے
سُکھ دیا!

تنویر انجم

ادھوری ساعتوں کا دکھ

اک کنول ندی کی دھیمی لہر میں بہتا ہوا
ایک خوشبو جنگلوں میں دیر سے پھیلی ہوئی
مَیں نے دیکھا
میں نے سمجھا
ساری لہریں ایک سی ہیں
سارے جنگل ایک سے
چاہوں تو میں اس کنول کو پانیوں سے چھین لوں
چاہوں تو میں خوشبوؤں کو چوم لوں
یہ نیند میری نیند ہے ان موسموں کا فرق کیا
سب جنگلوں میں پیڑ ہیں، سب وادیاں گلزار ہیں
سب پھول میرے ساتھ ہیں ان راستوں کا فرق کیا
پھر وہ تنہا پھول میرے ہاتھ سے بکھرا ہوا
خوشبوؤں کے جھنڈ وہ آفاق کو جاتے ہوئے
اور وہ آنکھیں کہ جن میں بادلوں کے عکس تک اترے نہیں
اور وہ دو ہونٹ جن میں بتیوں کے خواب بھی جاگے نہیں۔

ایک بے آباد گھر ہے
ایک بے آباد دل
اور میں ندی کنارے
پھول کے بکھرے ہوئے پتّوں کو بیٹھی جوڑتی
سوچتی ہوں
پانیوں میں پہلے سے اب کیوں کنول کھلتے نہیں
خوشبوئیں کیوں جنگلوں میں دیر سے پھیلتی نہیں۔

فیصلے

رُک گئے پھر آنکھ میں آنسو کہیں
آج بھی غم کا بھرم باقی رہا
جگمگاتے ہوٹلوں میں ناچتی ہے، روشنی
جانے کی ان پیالوں میں کھُل رہی ہے زندگی
آج بھی سب روح کی کڑواہٹیں
زہر ہو کر خون کی ٹھنڈک میں شامل ہو گئیں
سرد ہونٹوں پر مرے الفاظ جم کر رُک گئے
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں
دُور تک کچھ بھی نہیں
جگمگاتی روشنی میں ناچتے پیروں کی جنبش سوچتی ہے
لوٹ آئے گا کوئی
جب کبھی لوٹ آئے گا کوئی
میں بھی اپنی روح کی سب کھڑکیوں کو بند کر کے
دیر تک ہنستی رہوں گی
دیر تک روتی رہوں گی۔

جم اسن عطا

سُکھ دیا

اس سمے اہلِ دل
آسمانوں کے نیچے اُبھرنے کو ہیں
مگر اب تلک ثروتوں کی حسیں بارشوں میں نہاتے ہوئے
عیش کی کشتیوں میں خراماں
جزیروں کی جانب
وہ جیالے دل جا رہے ہیں
جنہیں اب تلک کوئی طوفان ساگر کا ٹکرا کے گزرا نہیں
تم جو محبس میں برسوں ستم کا نشانہ بنے
اور کامنی رُوپ فطرت کے روپوں سے محروم ہو
تمہاری یہ حسرت بھری روحیں دیمک لگے شہرِ بے داد میں
تڑپتی ہیں آزاد جھونکوں کے اک لمس کو
مگر صبر کی پیلی پتھر سلوں پر دکھوں کی صلیبیں ہیں لٹکی ہوئی
دیوتا سوریا نیل آکاش کے
مغربی گھاٹیوں میں کہیں جا کے چھپ
یہ پہاڑی گلو قرمزی
ڈوبتی ترچھی ترچھی شعاعوں کو اپنے بدن میں سمو لو
درختوں کی شاخو ہری
زرد مدقوق بجھتی ہوئی روشنی کے سمندر کی گہرائی میں ڈوب جاؤ

نیلے سمندر ذرا کھول دے اپنی آنکھیں
اُٹھو اور فتنے جگاؤ
مری بستیاں جاگ اُٹھیں
اندھیروں کے پردوں کو پھاڑیں
الاؤ جگائیں دلوں کے مکاں میں
بجلیاں اور طوفان لائیں
بارشوں کا سجل دیوتا
اہلِ دل سے گریزاں نہیں
کامرانی کی جو بانسری لے کے راہوں پہ بیٹھا ہوا منتظر
سُروں کی زباں میں الاپے
کہ ست بدھ کو جاری رکھو
نہ جب تک کہ ہر گاؤں کے ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں پہ جلنے لگے
سُکھ دیا !

تنویر انجم

ادھوری ساعتوں کا دُکھ

اک کنول ندی کی دھیمی لہر میں بہتا ہوا
ایک خوشبو جنگلوں میں دیر سے پھیلی ہوئی
مَیں نے دیکھا
میں نے سمجھا
ساری لہریں ایک سی ہیں
سارے جنگل ایک سے
چاہوں تو میں اس کنول کو پانیوں سے چھین لوں
چاہوں تو میں خوشبوؤں کو چوم لوں
یہ نیند میری نیند ہے ان موسموں کا فرق کیا
سب جنگلوں میں پیڑ ہیں، سب وادیاں گلزار ہیں
سب پھول میرے ساتھ ہیں ان راستوں کا فرق کیا
پھر وہ تنہا پھول میرے ہاتھ سے بکھرا ہوا
خوشبوؤں کے جھنڈ وہ آفاق کو جاتے ہوئے
اور وہ آنکھیں کہ جن میں بادلوں کے عکس تک اترے نہیں
اور وہ دو ہونٹ جن میں بتیوں کے خواب بھی جاگے نہیں۔

ایک بے آباد گھر ہے
ایک بے آباد دل
اور میں ندی کنارے
پھول کے بکھرے ہوئے پتوں کو بیٹھی جوڑتی
سوچتی ہوں
پانیوں میں پہلے سے اب کیوں کنول کھلتے نہیں
خوشبوئیں کیوں جنگلوں میں دیر سے پھیلتی نہیں۔

فیصلے

رُک گئے پھر آنکھ میں آنسو کہیں
آج بھی غم کا بھرم باقی رہا
جگمگاتے ہوٹلوں میں ناچتی ہے، روشنی
جانے کی ان پیالوں میں گھل رہی ہے زندگی
آج بھی سب روح کی کڑواہٹیں
زہر ہو کر خون کی ٹھنڈک میں شامل ہو گئیں
سرد ہونٹوں پر مرے الفاظ جم کر رُک گئے
کچھ نہیں، کچھ بھی نہیں
دُور تک کچھ بھی نہیں
جگمگاتی روشنی میں ناچتے پیروں کی جنبش سوچتی ہے
لوٹ آئے گا کوئی
جب کبھی لوٹ آئے گا کوئی
میں بھی اپنی روح کی سب کھڑکیوں کو بند کر کے
دیر تک ہنستی رہوں گی
دیر تک روتی رہوں گی۔

ن۔م۔ دانش

عذابوں کا سورج

عذابوں کا سورج سوا نیزے پر ہے
اذیت سے گہری تپش سے
یہ جسم اور جاں روح سب جل رہے ہیں
مصائب کے گہرے گھیرے سے بادل نے
بستی کو گھیرا ہوا ہے
دکھوں کا اُجالا گھروں کا مقدر ہے
تنہائی،
محفل کی زینت ہے
ہنگامہ،
سناٹے میں جیختا ہے
سیاہ دھوپ نے
زندہ جسموں کو مرجھا دیا ہے
ہر اک چہرہ ہے
مقتل ہے
نادیدہ اُمیدوں کا
آرزوؤں کا
آنکھیں ہیں!
ٹوٹے ہوئے سارے خوابوں کے اُجڑے سے کھنڈر
چہرہ شکستوں کا انبار ہے
جس میں گہری خراشیں ہیں
مایوسیوں کی
یہ روح
دشت ویران ہے
جس میں تنہائیوں کا
وہ تنہا مسافر
اکیلا—
اور اندر کے سناٹوں کو ساتھ لے کر
مسلسل ہی محوِ سفر ہے
مگر کوئی منزل نہیں ہے
عذابوں کا سورج سوا نیزے پر ہے

٥

روشنی مرگئی ہے
نہ سورج نہ تارے
نہ شمع نہ جگنو
مکاں سارے خالی
مکیں کے مقدر میں آنسو
نہ بجلی، نہ شعلہ
نہ رنگ اور خوشبو

ہوا جب چلے تو مکانوں کے دیوار و در بولتے ہیں
حجر اور شجر چیختے ہیں

ماہ طلعت زاہدی

اِک پرندہ سرِ دیوار بھی باقی نہ رہا
اب تو پرواز کا دیدار بھی باقی نہ رہا

حبس ایسا تھا کہ سانسے میں سُلگ اُٹھے گُلاب
لُو چلی ایسی کہ گلزار بھی باقی نہ رہا

لوگ دم سادھ گئے خوف نے گھیرا ایسے
کوئی مرنے کا خطاوار بھی باقی نہ رہا

حادثہ کیا ہُوا پھیلے ہُوئے سنّاٹے میں
لفظ سے رشتۂ اظہار بھی باقی نہ رہا

کیسی ویرانی ہے خود موت بھی کترا کے چلی
کوئی اندیشۂ بے کار بھی باقی نہ رہا

جاں سِسکتی رہی خواہش کے بیابانوں میں
کسی اُمّید کا چھتنار بھی باقی نہ رہا

ایک وحشت ہی متاعِ غمِ جاناں نکلی
لُطفِ دلداریٔ غم خوار بھی باقی نہ رہا

دل بھی یادوں کی کڑی دُھوپ میں کُملا سا گیا
شوقِ ہر لحظہ کا آزار بھی باقی نہ رہا

اپنے گھر کا دروازہ بھی بند ملا،
میں نے ہوا کا ہاتھ تھام کے دیکھ لیا

نیج میں کتنے جُگنوں کا پھیلاؤ اُترا
میں نے پلک جھپک کر اُس کو دیکھا تھا

دید کا جادو دُوری سے کب ٹوٹ سکا
آنکھوں کا اِک پٹ اندر بھی کُھلتا تھا

خواب میں صدیاں بیتیں پھر بھی آنکھوں نے
خوابوں کی چوکھٹ پر سب کچھ دان کیا

تنہائی کا کرب تھا اُس کے چہرے پر
جس کی آنکھوں میں چاہت کا سپنا تھا

پھُول منڈیروں پر مہکے، پنچھی چہکے
دِل سا شہر کہ پھر بھی غیر آباد رہا

رستہ کس سے پوچھے سورج ڈوب چُکا
بستی نئی ہے اور مُسافر دِل تنہا

دِل ہی مُسافر، دِل بستی، دِل ہی رستہ
دِل کی اُنگلی تھام کے دِل نے سفر کیا

عارف شفیق

کیا مقدمہ چلے عدالت میں
شہر کا شہر ہے حراست میں

بعد مدت کے دیکھ کر مجھ کو
پڑ گیا آئینہ بھی حیرت میں

سچ ہے محتاج کب گواہی کا
تم نہ بولو میری وکالت میں

کتنے حقدار در سے لوٹ گئے
کوئی مصروف تھا عبادت میں

مجھ کو سچ بولنے سے مت روکو
یہ تو شامل ہے میری فطرت میں

مجھ میں کوئی تو آ بسے عارف
کب سے تنہا ہوں اس عمارت میں

کبھی کبھی تو وہ باتیں عجیب کہتا ہے
امیرِ شہر بھی خود کو غریب کہتا ہے

اتر گیا ہے رگوں میں بھی زہرِ سچائی
کفن خرید لوں میرا طبیب کہتا ہے

میں حق کی راہ سے پہنچا ہوں جس بلندی پر
جو کور چشم ہے اس کو صلیب کہتا ہے

یہ دھوپ چھاؤں کے منظر کو کیا کہو گے تم
میرا رقیب بھی مجھ کو حبیب کہتا ہے

پیمبروں کو بھی تنہائیوں نے گھیرا تھا
تو خود کو کس لئے پھر بدنصیب کہتا ہے

خموش بیٹھا ہے منبر پہ آج وہ عارف
زمانہ جس کو بلا کا خطیب کہتا ہے

پنہاں

سایہ سنہری شام کا جب بام و در پہ تھا
مصروف شوخیوں میں وہ اس وقت گھر پہ تھا

واں کو تو کوئی دیکھ نہ سکتا تھا اس لئے
الزام سارا صرف مری چشم تر پہ تھا

کھویا رہا وہ اپنے خیالوں میں رات دن
ہر وقت میرے ساتھ بظاہر جو گھر پہ تھا

تاریکیوں میں ڈوب چکی تھی شکستہ شام
تنہا اداس ایک پرندہ شجر پہ تھا

اپنا سا مجھ کو لگتا تھا ہر ایک شخص یاں
پردا مرے خلوص کا میری نظر پہ تھا

مجھ کو شریک اپنے دکھوں میں نہ کر سکا
راہ فرار ذات میں تنہا سفر پہ تھا

خوں بن کے اب تو میری رگوں میں اتر گیا
اک موسم بہار جو زخم ہنر پہ تھا

غم حیات کوئی چال چل نہ جائے کہیں
خوشی ملے تو مرا دم نکل نہ جائے کہیں

بھڑک اٹھا ہے کچھ اس طرح سے چراغ اب کے
ہوا کا ہاتھ مجھے ڈر ہے جل نہ جائے کہیں

میں سوچتی ہوں مرا ہر نفس تجھے سوچے
میں چاہتی ہوں مرا ایک پل نہ جائے کہیں

دیا جلا تو ہے دل کا مگر خیال رہے
مزاج اس کا ہوا سا بدل نہ جائے کہیں

مرا وہ غم جو ہمیشہ سے دل میں ہے پنہاں
وہ آج شعر کے سانچے میں ڈھل نہ جائے کہیں

کھلا ہے پھول نیلے پانیوں میں
کوئی ہنستا ہو جیسے آنسوؤں میں

یقیں آنے پہ تجھ سے آملیں گے
ابھی تو دل گھرا ہے وسوسوں میں

نجانے اس برس کیا حال ہوگا
شکستہ ہوگیا گھر بارشوں میں

نگاہیں آسماں پہ جم گئی تھیں
کوئی چہرہ چھپا ہے بادلوں میں

سمندر دُور تک لہرا رہا ہے
چراغاں ہو رہا ہے کشتیوں میں

بچھڑتے وقت دل نے راز کھولا
کہ شامل تھا وہ میری خواہشوں میں

سمجھتے ہیں بڑا لمبا سفر ہے
مگر سب گھومتے ہیں دائروں میں

خزاں رنجیدگی سے دیکھتی ہے
کھلے ہیں پھول کتنے کیاریوں میں

کسے معلوم زیرِ آب کیا ہے
چھپے ہیں کیسے موتی سیپیوں میں

نظر اب تک اسی کو ڈھونڈتی ہے
ستارہ کھو گیا ہے گردشوں میں

چلو سیما اُسے خود ہی منا لیں
بھلا رکھا ہی کیا ہے رنجشوں میں

مجھے وہ سچ کی بھلا اور کیا سزا دیں گے
یہی کہ زہر مجھے بھی کبھی پلا دیں گے

خود اپنے تن پہ سجا کر لباس کانٹوں کا
گلاب ہم ترے پیروں تلے بچھا دیں گے

یہ کھیل ہم نے فقط ہارنے کو کھیلا ہے
تری انا کے لئے ہم تجھے جتا دیں گے

وہ ہونٹ جن کے مقدّر میں پیاس لکھّی ہو
ہماری تشنہ لبی کا خراج کیا دیں گے

بس اتنا سوچ کے ہم نے سفر روا رکھّا
یہ راستے ہمیں اک دن کہیں ملا دیں گے

کمک کہیں سے عطا ہو مجھے مرے معبود
کہ خواہشوں کے یہ لشکر مجھے ہرا دیں گے

ہمارا کیا ہے اگر موسموں کا جی چاہے
تو ساتھ پھول کے ہر زخم بھی کھلا دیں گے

چراغِ جاں ترے آنے تلک فروزاں ہے
پھر اس کے بعد تو ہم روشنی بجھا دیں گے
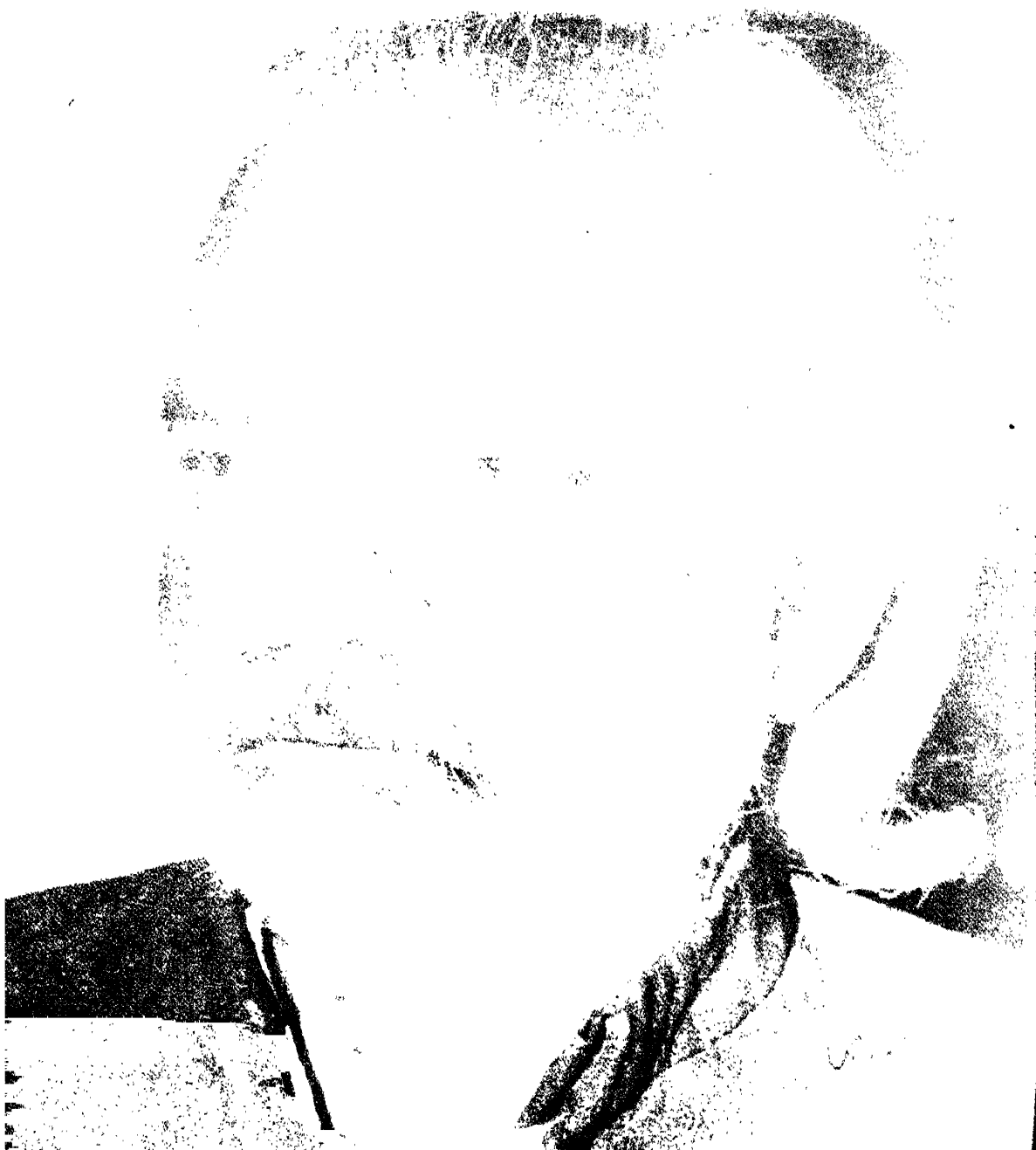
ماہنامہ

...اور آج بھی...
ولز
گولڈ فلیک
کنگ سائز فلٹر
20
WILLS
GOLD FLAKE
KING SIZE FILTER
GOLD FLAKE
20
ناقابلِ فراموش

Lahmina
لحمینا
لحمیات (پروٹینز) کی کمی کو پورا کرنے
کے لئے ایک مکمّل غذائی ٹانک
روزمرہ کی تھکا دینے والی مصروفیات اور ناقص غذا کے
سبب لوگ عام طور پر وقت سے پہلے ذہنی اور جسمانی ضعف کا شکار ہو جاتے ہیں۔
صحت مند اور توانا رہنے کے لیے لازمی ہے کہ جسم کو ضرورت کے مطابق
لحمیات (پروٹینز) کاربوہائیڈریٹس اور دیگر اہم غذائی اجزا بہم پہنچائے جائیں۔
لحمینا چنیدہ جڑی بوٹیوں، پروٹینز اور کاربوہائیڈریٹس کا ایک
نہایت مفید و متوازن مرکب ہے جو غذائی کمی کو دور کر کے آپ کو زندگی کے
اعمال و وظائف پورا کرنے کی صلاحیت بخشتا ہے۔
لحمینا کے ساتھ صبح یا صبح و شام ایک ایک ہمدرد کا استعمال آپ کو
مزید عصبی توانائی اور حسبِ خواہش مزید طاقت فراہم کرے گا۔
لحمینا
Lahmina
لحمینا ـ برائے اسٹیمنا
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
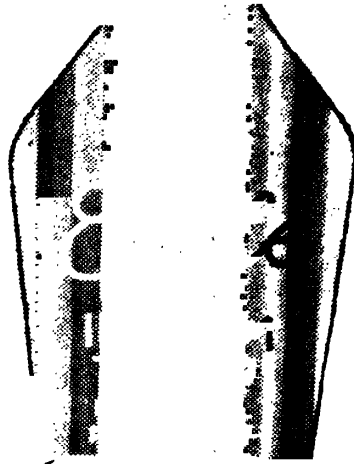
EAGLE
EAGLE IRIDIUM
وہ قلم جس کی کارکردگی
سے ہر کوئی مطمئن
ایگل
ایک عالمگیر قلم
A PRODUCT OF
AZAD FRIENDS & CO LTD.
AFC-2/74
Crescent

جدید ادب کا نمائندہ

ماہنامہ

الفاظ

شمارہ : فروری ۱۹۸۳ء

مدیر

جمیل اختر

قیمت فی پرچہ ——— چار روپے

ایک سال کے لئے ——— تیس روپے

پوسٹ بکس نمبر ۷۵۹۶ صدر کراچی ۳

فون : ۲۹۰۸۳۷ — ۶۸۰۱۰۲ — ۶۸۴۸۸۸

ترتیب

سرورق کی تصویر ـــــ رسا چغتائی

احمد ہمدانی

جدید طرزِ احساس کا شاعر

شاعری لفظوں کی سحر کاری اور احساسِ حسن کی سرشاری کے مابین اک نقطۂ اتصال ہے۔ ہم جس دنیا میں سانس لیتے ہیں وہاں ہر چیز اعتبار سے عاری ہے۔ یہاں جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا۔ یہاں کی ہر چیز اور ہر خیال گذراں اور یہاں کا ہر رشتہ اور ہر تعلق تغیر ساماں ہے چیز خیال اور تعلق سے قطع نظر ہم خود بھی ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں جس سے خود ہمارے وجود کی پہچان ہماری نظروں میں معتبر نہیں رہتی اور یہ تمام عالم شکوک و شبہات کا تپتا ہوا صحرا بن جاتا ہے۔ جہاں ہر لمحہ فنا کی بادِ سموم کے تیز جھکڑ چل رہے ہوں ایسے میں ہم کیا بات کہیں۔ جو لمحہ موجود سے آئندہ لمحہ تک اپنا اعتبار برقرار رکھتے ہوئے سفر کر سکے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہر دور کے شعراء الجھے نظر آتے ہیں کچھ تو اس الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں اور کچھ اس الجھن ہی میں سے اعتبار کی راہ تلاش کر لیتے ہیں اردو شاعری میں منجملہ دوسرے شعراء کے میرؔ اور غالبؔ دو ایسے شاعر ہیں جن کا راہِ اعتبار پر سفر خاص طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ راستہ کیسے تلاش کیا ؟ شاید اس سوال کا جواب شعری تخلیق کے عمل کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکے۔

میر صاحب کا وہ واقعہ کہ انہوں نے اپنے کمرے کی اس کھڑکی کا کبھی احساس تک نہ کیا جو باغ کی طرف کھلتی تھی بظاہر ایک منفی رویہ کا آئینہ دار ہے لیکن ہم جب اس منفی رویہ کو میر صاحب کے عمل تخلیق کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ منفی رویہ منفی اثباتیت (NAGATIVE POSITIVENESS) کی قابلِ رشک صلاحیت بن جاتا ہے اور شاید یہ اس طرح ہوتا ہے کہ میر صاحب اطراف میں بکھری ہوئی اشیاء و مناظر کا حسن سمیٹ کر اپنے اندر جذب کر لیتے تھے اور اس عمل تجاذب سے ان کی اپنی ایک حسن کی دنیا تعمیر ہو جاتی تھی حسن کی یہ دنیا خارج سے ماخوذ ضرور تھی لیکن شاعر نے اسے کچھ اس طرح اپنایا تھا کہ اس کے حسن میں دوامیت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور اس کی اس کیفیت سے سرشار ہو کر میر صاحب کہہ اٹھے تھے۔

چلتے ہو تو چمن کو چلئے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

اب یہ چمن جس کا ذکر میر صاحب نے اس شعر میں کیا ہے وہ اس باغ سے مختلف ہے جو ان کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ اس چمن کا حسن دائمی ہے اس کے پات ہمیشہ ہرے اور اس کے پھول ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ حسن کی یہ دنیا شاعر کا تخلیقی سرمایہ ہے۔ حسن کی اس دنیا میں بے ثباتی کے جھکڑ شک اور بے یقینی کی گرد اڑاتے نظر نہیں آتے شاید یہی وجہ ہے کہ اس فضا میں لکھے ہوئے شعر زمانے کی دھول میں

اٹ کر معدوم نہیں ہوتے غالبؔ نے بھی اس عمل کو اپنا کر کثافت سے لطافت کا جلوہ پیدا کیا ہے۔

کثافت سے لطافت کا جلوہ پیدا کرنے کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ اپنے اطراف حسن کی ایک دنیا تعمیر کی جائے اور دوسرہ یہ ہے کہ جہانِ صورت سے گذر کر جہانِ معنی سے رشتہ جوڑا جائے ہماری شاعری میں تصوف کی مثال دوسرے طریقہ کی مثال ہے جدید تصوف کی روایت سے بے بہرہ ہے چنانچہ بیشتر شعرا پہلی ہی صورت پر اکتفا کرتے ہیں لیکن رسا چغتائی نے تصوف کی روایت کو پیش رکھتے ہوئے جدید طرز احساس کا اظہار کیا ہے ان کی یہی خصوصیت انہیں دوسرے شعراء سے الگ کرتی ہے ان کے یہ چند اشعار دیکھیے

رشتۂ جسم و جاں بھی ہوتا ہے — ٹوٹنے کا گماں بھی ہوتا ہے
اس توہم کے کارخانے میں — کارِ شیشہ گراں بھی ہوتا ہے
ہم سے عزلت نشیں بھی ہوتے ہیں — عرصۂ لامکاں بھی ہوتا ہے
ہم بھی ہوتے ہیں اس کی محفل میں — رقصِ سیارگاں بھی ہوتا ہے
جوئے آبِ رواں بھی ہوتی ہے — عکسِ سرو رواں بھی ہوتا ہے
لوگ مل کر بچھڑ بھی جاتے ہیں — اور یہ ناگہاں بھی ہوتا ہے

یہ پوری غزل اپنے آہنگ سے ایک مسلسل سفر کی کیفیت ابھارتی ہے اس تسلسل میں کہیں کوئی جھٹکا محسوس نہیں ہوتا کہیں (GAPE) نہیں آتا۔ ہر شعر میں مختلف بات کہی گئی ہے لیکن غزل کے مجموعی آہنگ نے ایک نہ ٹوٹنے والا ربط پیدا کر کے پوری غزل اکائی بنا دیا ہے۔ توہم کا کارخانہ، عرصۂ لامکاں اس کی محفل وغیرہ ایسے اشعار ہیں جن سے تصوف کی روایت کا احساس بہ آسانی جا سکتا ہے۔

رسا کی نئی غزلیں بالعموم تسلسل اور ربطِ خفی کی تصویریں ہیں جو زمانے کی تغیر سامانی میں ثبات کا احساس اجاگر کرتی

رخ گھٹا کا ہے سمندر کی طرف — اور نظر سب کی مرے گھر کی طرف
جن پہ بیٹھے تھے لوگ خالی سیپیاں — دیکھئے کیا دیدۂ تر کی طرف
منتقل ہر دانۂ گندم ہوا — کھیت سے اپنے مقدر کی طرف
ایک لمحہ کا سفر ہے زندگی — اپنے پس منظر سے منظر کی طرف

ہے لیکن اجنبی ایسا نہیں ہے — وہ چہرہ جو ابھی دیکھا نہیں ہے
بہر صورت ہے ہر صورت اضافی — نظر آتا ہے جو ویسا نہیں ہے
محبت میں رسا کھویا ہی کیا تھا — جو یہ کہتے کہ کچھ پایا نہیں ہے

جسے ہم واہمہ سمجھے ہوئے ہیں — وہ سایہ بھی تری دیوار کا ہے
ہوا نے تاک رکھا ہے شجر کو — پرندہ شاخ پر بیٹھا ہوا ہے
مکاں سرگوشیوں سے گونجتے ہیں — اندھیرا روزنوں سے جھانکتا ہے
در و دیوار چپ سادھے ہوئے ہیں — فقط اک عالمِ ہو بولتا ہے

گذر کس کا ہوا ہے جو ابھی تک | دو عالم آئینہ بردار سا ہے
یہ دنیا مٹ گئی ہوتی کبھی کی | مگر اک نام ایسا آ گیا ہے

اس تسلسل اور ربط کے ساتھ انہوں نے کچھ غزلوں میں اپنے نواسے کے حوالے سے زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے نواسہ کا یہ حوالہ صرف ان کے قریب کے لوگ ہی پہچان سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسے واقعہ کے طور پر کہیں نہیں لکھا ہے اس کے برعکس واقعہ کے حسی ردعمل کو شعر کی صورت دی ہے۔

میرے قصے سنایا کرتا ہے | میرے بچوں کو پیڑ کا سایہ
جہاں تم ہو وہاں سایہ ہے میرا | جہاں میں ہوں وہاں سایہ نہیں ہے
سر دامان صحرا کھل رہا ہے | مگر وہ پھول جو میرا نہیں ہے
دیکھتا ہے گلوب کے اطراف | پاؤں رکھ کر گلوب پر بچہ
میرا اک چھوٹا سا گھر ہے | گھر کے اندر ایک شجر ہے
ایک شجر ہے جس کا سایہ | ننگے پاؤں ننگے سر ہے
میرے بچے پھول سے بچے | کن شاخوں پر میرا سر ہے

یا یہ نظم ــــــ

میرے پیروں میں ننھے منے پیار کی اک زنجیر پڑی ہے
گویا اک تصویر کھڑی ہے
گھر سے باہر جاؤں تو محسوس کروں میں
کہ زنجیر بڑی ہے
گھر میں لوٹ کے آؤں تو محسوس کروں میں
کہ زنجیر کڑی ہے

منے تیرا پیار بڑا ہے
پیار کا اظہار بڑا ہے
اور میں تیرے پیار کے آگے ننھا منا سا لگتا ہوں
تیرا منہ تکتا ہوں

یہ اور ایسے ہی دوسرے اشعار جو نانا اور نواسے کے تعلق سے ابھرتے ہیں مگر پوری زندگی پر پھیل کر زندگی کی تفہیم پیدا کرتے ہیں ایک ایسی تفہیم جو سراسر ستی ہے اور اب آخر میں چند شعر سنیئے جن میں جدید طرز احساس کا اظہار تازہ تر استعاروں اور تمثیلوں کے ذریعہ کیا گیا ہے۔

دن ڈھلا شام ہو گئی | کوئی آنسو نہ دیا
دل پریشان ہے کیوں | چاند تھا ڈوب گیا
گھر میں دھونی رمائے بیٹھا ہوں | اپنے چہرہ پہ اپنی خاک ملے
جانے کیوں ساحل سمندر پر | بجھنے لگتا ہے دل چراغ جلے

توانائی کی
انتھک
مسلسل تلاش
قومی ترقی و توسیع کے بے شمار نئے منصوبوں پر
پاکستان تیز رفتاری سے گامزن ہے۔
ترقی کی اس رفتار کو قائم رکھنے کے لئے
ملک کو زیادہ سے زیادہ توانائی کی ضرورت ہے
آئل اینڈ گیس ڈویلپمنٹ کارپوریشن
قدرتی ذخائر سے مالا مال زمینِ وطن سے
توانائی کی تلاش و فراہمی میں سرگرمِ عمل ہے
تپتے ہوئے صحراؤں میں
ہم دن رات، اپنی ترقی کی بنیادی قوت،
توانائی کی تلاش کر رہے ہیں۔
OGDC
آئل اینڈ گیس
ڈیویلپمنٹ
کارپوریشن
ہمارا عہد — تیل میں خود کفیل پاکستان

سلیم احمد

میر کی طرف سفر

رسا کے پہلے مجموعہ کلام ریختہ پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ غالب ہمارے معاشرے کا پہلا آؤٹ سائڈر تھا اور رسا آخری۔ میرے اس جملے پر کراچی کے جدید ادیبوں کے حلقہ میں بڑی چہ مگوئیاں ہوئیں انہیں اعتراض تھا کہ ایک روایت پسند غزل گو شیروانی پوش انسان اور تصوف پسند شخص اتنا جدید کیسے ہوسکتا ہے کہ OUT SIDER ہونے کا شرف حاصل کرے ان کے نزدیک آؤٹ سائڈر ہونا ایک ایسا شرف ہے جس کے لئے کم از کم سارترا ور کامیو کا قاری ہونا لازمی ہے اور جب تک وہ وجودیت کی دوچار اصطلاحوں کو رٹ کر دہرا نہ سکے اس وقت تک اس منصب پر فائز نہیں ہوسکتا اب بات یہ ہے کہ روایتی غزل گو تو میں بھی ہوں اور رسا کی طرح شیروانی پوش بھی مرید البتہ کسی کا نہیں ہوں۔ لیکن تصوف کا نام میں بھی لیتا ہوں۔ رسا اور مجھ میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ کہ میں نے وجودیت کے بارے میں بھی دو چار کتابیں پڑھی ہیں بہرحال میں نے رسا کو آؤٹ سائڈر کہہ کر انہیں کوٹ پتلون پہنانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ صرف یہ بتایا تھا کہ معاشرے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جن کے لئے معاشرہ ان کا گھر ہوتا ہے وہ بھی بالکل اسی طرح سوچتے اور محسوس کرتے ہیں جس طرح معاشرہ سوچتا اور محسوس کرتا ہے معاشرے سے ان کا تعلق وہی ہوتا ہے جو مچھلی کا پانی سے دونوں کی اقدار اور معیارات ایک ہوتے ہیں معاشرہ انہیں قبول کرتا ہے اور وہ معاشرے کو۔ ہماری پرانی اصطلاح میں ایسے لوگوں کو دنیا دار کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے باطن میں معاشرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ اور معاشرہ کی خارجہ وضع سے کٹ کر اپنی داخلیت میں سفر کرتے ہیں وہ باطنی طور پر معاشرہ سے بے گانہ ہوجاتے ہیں اور معاشرہ ان سے روایتی معاشرہ میں ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو جوگی سنیاسی بیراگی اور ترک دنیا کرنے والے بنتے ہیں۔

آؤٹ سائڈر ایک جدید سماجی مظہر ہے۔ مگر حقیقی طور پر ان ہی سنیاسیوں اور بیراگیوں کے قبیلہ کا ایک حصہ ہے جو اپنے باطن معاشرے کو مسترد کردیتے ہیں اور اپنی ذات کے بل پر نئی اقدار کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں غالب ہمارے معاشرے میں پہلا آدمی تھا جس نے اپنی انفرادیت کے بل پر نہ صرف معاشرہ بلکہ پورے عالم خارجی کو مسترد کرنا چاہا اور اعلان کیا کہ

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو   آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

اور

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال   حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

غالب کے بعد ہمارے معاشرے میں فرد کی معاشرہ سے مغائرت اور علیحدگی ایک نئی روایت بن گئی ہے۔ رسا کی زندگی ایک درویش کی زندگی ہے وہ رندی کے مرحلوں سے گذر چکا ہے اور اس کی زندگی میں ایک ایسا تیاگ پایا جاتا ہے کہ مجتبیٰ حسین کو یہ لکھنا پڑا کہ آپ جوگی ہیں تو پھر شہر میں کیوں آئے ہیں۔

رسا کے پہلے مجموعہ کلام میں رسا ہمیں ایک ایسے فرد کی حیثیت سے نظر آتا ہے جس نے معاشرہ، اس کی اقدار اس کے مسائل
الگ کر لیا ہو۔ اور خود اپنے طور پر حسن کی تلاش میں ہو چنانچہ اس مجموعہ میں حساس اور خوبصورت لفظوں کی شاعری ملتی ہے لیکن اقد
مسائل کی پرچھائیاں تک نہیں پڑتیں۔ فرید جاوید بھی اسی طرح معاشرے سے الگ ہو کر حسن کی تلاش میں تھا۔ تاہم رسا کے ریختہ
خوش نہیں تھا اور اپنے اندر اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ رسا معاشرہ سے الگ ہو کر شاعری کی اہم ذمہ داریوں سے الگ ہو گیا ہے ریختہ
دس شعر ایسے تھے۔ جن کی خوبصورتی سے میں انکار نہیں کر سکتا لیکن ملی شاعری میں جس عمل دخل کو دیکھنا ضروری سمجھتا ہوں اس کا رسا
سراغ بھی نہیں ملتا۔ اب رسا نے ریختہ کے بعد جو شاعری کی ہے اس میں وہ اپنے سفر کی ایک منزل طے کرنے کے بعد دوسرے مرحلے
ہو گیا ہے۔ یہ زندگی کی قبولیت کا مرحلہ ہے اب اسے پتہ چلا ہے کہ حسن خیر و صداقت سے الگ ہو کر کوئی چیز نہیں ہے چنانچہ اس کی
میں زندگی داخل ہونے لگی ہے اور وہ اصلی زندگی کے مسائل کو اپنی شاعرانہ حساسیت کا جز بنانے لگا ہے رسا کی شاعری کا یہ
کی شاعری کے لئے ایک نیک فال ہے اب اس کے اشعار صرف لفظی حسن یا جذبہ کی برانگیختگی کی پیداوار نہیں معلوم ہوتے اب ا
ایک فکری عنصر بھی پیدا ہو گیا ہے۔ وہ اپنے اردگرد جو زندگی دیکھ رہا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش بھی کر رہا ہے اور یہ بھی چاہتا
زندگی کے تجربے کو اس کے پورے آب و رنگ کے ساتھ اپنی شاعری میں سمو سکے۔

اصل میں مجھے تسلیم کر لینا چاہیئے کہ میں صرف جذبہ کی شاعری کو قدرے شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں اور جب تک جذ
کی اقدار و مسائل کو اپنے اندر حل نہ کرے مجھے اس سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ رسا کی نئی غزلیں مجھے ایک نئے امکان کا پتہ دیتی ؛
وہ صرف اپنے جذبہ سے کام نہیں لیتا تھوڑا بہت دماغ بھی اس میں ڈال دیتا ہے۔ رسا کی شاعری میں یہ عنصر بھی بڑھتا رہا تو اس
کی وسعت، گہرائی اور پختگی میں بھی اضافہ ہو جائے گا اور شاعر کی توانائی بس یہی لیکن اس میں ایک خطرہ بھی ہے مجھے ڈر ہے کہ وہ بہت
شاعری کے ابتدائی پرستاروں سے محروم نہ ہو جائے۔ رسا بنیادی طور پر ایک مخلص درد مند اور سچا آدمی ہے اور یہی اقدار اس
کو تصنع، سخن سازی اور نمائش پسندی سے محفوظ رکھتی ہیں۔ اس کا شعر سن کر آپ بے ساختہ طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ا
آدمی کا شعر ہے۔ جس نے اپنے تجربے اور زندگی سے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور اس میں کسی کھوٹ کی آمیزش نہیں کی۔ وہ روایتی غ
حسن کاری اور اس کے علامات و رموز کی نزاکتوں سے بہت گہرائی میں واقف ہے اور اپنی شاعری میں ان سے کام لینا جانتا۔
کی یہ قوت جب زندگی کے نئے تجربہ سے ملتی ہے تو ایسے اشعار جنم لیتے ہیں جن میں غزل کا حسن حقائق سے ہمہ آمیز ہوتا ہوا محسوس

اردو غزل میں میر پرستی کا ایک چکر چلا ہوا ہے جس شاعر کو دیکھیئے وہ میر کے چراغ سے چراغ جلانے کا دعویدار رہے ا
بعد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ رسا کے بارے میں بھی کچھ لوگوں نے میر کا حوالہ دیا ہے اور صرف اس بنا پر کہ وہ میر کو احساس کا شا
میں حالانکہ میر وہ شاعر ہے جس کے بارے میں فراق نے کہا ہے کہ " اس کا دماغ اس کے دل میں حل ہو گیا ہے " اور میر کا دما
تھا یہ دیکھنے کیلئے میر کی تصویر ہی کو دیکھ لینا کافی ہے۔ غالب اور میر میں فرق یہ ہے کہ غالب کا دماغ الگ ہے۔ اور دل الگ ہے لیکن
میں دماغ اور دل کا فاصلہ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ فکر کی شاعری اور جذبہ و احساس کی شاعری الگ الگ ہو جاتی ہے اور اس کے ایک
جگر پیدا ہوتے ہیں جو جذبہ کو دماغ سے بالکل الگ کر دیتے ہیں۔

رسا کی وہ ابتدائی شاعری جس پر لوگوں کو میر پرستی کا گمان ہوا میر کی نہیں جگر کی دین تھی اور ہمارے بہت سے
کے شاعر جو میر کا نام لیتے ہیں دراصل جگر اسکول ہی کے شاعر ہیں یا زیادہ سے زیادہ اختر شیرانی تک پہنچتے ہیں۔ رسا اب اس منزل
نکل آیا ہے۔ اور اس کی شاعری کو اب ہم حقیقی معنوں میں میر کی طرف سفر کرتے دیکھ سکتے ہیں۔

شاہد عشقی

اور رسا گھر ابھی نہیں آیا

میر و غالب اردو شاعری کی ایسی گنگا جمنا ہیں جن سے اردو شاعری کا دوآبہ ابد تک سیراب رہے گا۔ میر کی وارفتگی، بیخودگی اور بے خودی غالب تک پہنچتے پہنچتے خودداری، انا آگہی اور آشوب آگہی کی بہت سی منزلیں سر کر گئی۔

میر اور غالب کے ادوار میں بظاہر زیادہ فصل نہیں تھا لیکن معاشرتی ڈھانچہ خاصا بدل گیا تھا میر کے عہد میں مغلیہ سلطنت کا جاگیرداری نظام اپنے انحطاط کو پہنچ چکا تھا۔ جبکہ غالب کی زندگی میں نئے صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا ہو رہی تھی۔ غالب کی شاعری کی تہہ داری اور ابہام دراصل اسی نئے نظام کے پس منظر کو واضح کرتے ہیں۔

فراق سے ناصر کاظمی تک اور ناصر کاظمی سے رسا چغتائی تک کا سفر اس گنگا جمنی دوآبہ کی توسیع ہے اس توسیع شدہ دوآبہ میں بہت سے سنگم آتے ہیں جہاں جذبہ کی سچائیوں کے ساتھ آگہی اور بصیرت کی دریافت کردہ حقیقتوں میں ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ رسا چغتائی بھی میر و میرزا کے اس دوآبہ کا سنگم ہے۔ وہ میر کا معتقد ہے اور ایسا معتقد کہ میر کے معاملہ میں غالب کے محتاط رویہ پر بھی طنز کرنے سے نہیں چوکتا۔

میر جی سے اگر ارادت ہے
قول ناسخ کی کیا ضرورت ہے

لیکن اس کے اطراف جو مسائل بکھرے ہوئے ہیں بلکہ الجھے ہوئے ہیں ان کا حل میر کی راست روی یا سادہ مزاجی کے بس میں نہیں اس لئے وہ مرزا کے ادراک و شعور کی رہنمائی میں اپنا شعری سفر جاری رکھنے پر مجبور ہے۔

انسان اور انسان کے رشتے، انسان اور خدا کا تعلق، کائنات اور تخلیق کائنات کے مباحث، وسیع کائنات کے پس منظر میں انسان کی ہئیت کا تعین، انسان کی تنہائی کا کرب، معاشرتی اور معاشی تبدیلیاں اور انسان پر ان کے اثرات یہ اور ان جیسے ان گنت مباحث رسا کی شاعری کا موضوع ہیں۔ یہ سب موضوعات غالب کے وقت سے اردو غزل کے روایتی، مدھر اور دھیمے سروں کو بلند آہنگ بلکہ اکثر بے آہنگ بنائے ہوئے ہیں۔

جیسے جیسے مسائل الجھتے جا رہے ہیں غزل کا آہنگ بھی بدلتا جا رہا ہے۔ شروع شروع میں اس پر غزل کی عصمت کے محافظوں نے بڑا شور مچایا۔ مگر بقول حالی ۔ ؎

غلُ تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہیں ۔

موضوع کے ساتھ اسلوب و اظہار کا رشتہ جسم و جان کا رشتہ ہوتا ہے اور دونوں ہی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں
آجکل کی نمائندہ غزل فوری داد سمیٹنے والی مشاعرہ کی غزل نہیں رہی کہیں الفاظ و خیال کی کڑیوں کو حذف کر کے کہیں کنایوں، اش
اور علامتوں کے استعمال سے کہیں نیم رخ یا بے چہرہ ابہام کی کیفیت پیدا کر کے آج کے پیچیدہ اور الجھے معاشرے کو سمجھنے اور سمجھانے
کوشش کی جا رہی ہے ۔ رسا کی شاعری بھی ایسی ہی ایک کوشش ہے کہیں وہ میر سے اپنی الجھنیں بیان کر کے رہنمائی حاصل کرتا ہے ۔

زندگی کس شجر کا سایہ ہے — موت کس دشت کی مسافت ہے
آگ میں کیا گل معانی ہے — خاک میں کیا نمو کی صورت ہے
کیا پسِ پردۂ توہم ہے — کیا سرِ پردہ حقیقت ہے
اس کہانی کا مرکزی کردار — آدمی ہے کہ آدمیت ہے
کاٹتا ہوں پہاڑ سے دن رات — مسئلہ عشق ہے کہ اجرت ہے
پھر محبت کا فلسفہ کیا ہے — یہ اگر سب لہو کی وحشت ہے

اور پھر خود ہی میر کی طرف سے جواب بھی دیتا ہے ۔

میر بولے سنو رسا مرزا — عشق تو آج بھی صداقت ہے
اس جہان بلند و پست کے بیچ — کچھ اگر ہے تو اپنا قامت ہے

اور کہیں دل میں اٹھتے ہوئے ان گنت سوالوں کو بے کم و کاست حرف و شعر کا قالب عطا کر دیتا ہے کیونکہ اس
میں انسان کے عیب و ہنر کے اس سے معتبر اور سچے گواہ کوئی اور نہیں ۔

تمام رشتۂ عیب و ہنر سے لکھے ہیں
یہ میرے حرف یہ میرے گواہ سچے ہیں

ان کا یہ استفہامیہ انداز جس میں کراں تا کراں اور ازل تا ابد پھیلے ہوئے مسائل کو سمجھنے کی ایک سعی ملتی ہے اسے میر
یا مرزا سے زیادہ قریب لے آتی ہے ۔

شام ہوتے ہی لوٹ آتے ہیں — طائران شجر شجر کیوں کر
سانس لیتی ہے زندگی کیسے — راہ چلتی ہے رہگزر کیوں کر
حرف آواز بن گئے کیسے — حرف لکھنا ہوا ہنر کیوں کر
جنگ کیسی ہوا سے ہے حباب کے — بے سپر ہو گئے شجر کیوں کر

یا جیسے —

یہ کون رخشِ ہوا پہ سوار آیا ہے — پسِ غبار یہ کیا آئینے سے رکھے ہیں
یہ روز کس کے تعاقب میں گھر سے چلتا ہوں — یہ وزنت نئے چہرے کہاں سے آتے ہیں
زمیں کو میری گواہی میں کون لایا ہے — زمیں کے ہاتھ میں کس نے چراغ رکھے ہیں

فطرت کے وسیع کینوس پر بکھری ہوئی ان گنت چیزوں میں، کہیں ظاہری اور کہیں باطنی طور پر حیرت ناک تشابہات و تضادات ملتے ہیں ادیب اور شاعر کی قوت مشاہدہ اور قوت متخیلہ جب ان کی نشاندہی کرتی ہے تو قاری ایک عجیب مسرت آمیز حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے اردو شعر و ادب میں ایسے PARADOCES کی کامیاب ترین مثالیں شاعری میں غالب کے یہاں ملتی ہیں رسا بھی اس معنی میں غالب کا معنوی شاگرد نظر آتا ہے۔

کہیں دیوار کے رشتے ملیں گے　　کہیں دیوار کا جھگڑا ملے گا
آسرے پر شام کے مرتا ہے دن بھر آدمی　　اور سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ ڈھل جاتی ہے شام
زندگی اور اس قدر مصروف　　آدمی اور اس قدر تنہا
حرفِ تازہ ورق ورق لکھوں　　دل کی سادہ کتاب بھی دیکھوں

میر و مرزا کے قبیلے اردو شاعری کے سب سے اعلیٰ النسب قبیلے ہیں رسا نے دونوں ہی سے رشتہ جوڑا ہے رسا کی شاعری کا افق اگر ایک طرف میر کی اتباع میں، جذبہ کی سچائی اور احساس کی گرمی سے روشن ہے تو دوسری طرف غالب کی طرح اس کی شاعری کے در و بام پر فکر و فلسفہ کی پرچھائیاں دیدہ وروں کو فریب نظر میں مبتلا رکھتی ہیں غالب کے آخری دور شاعری میں فکر و اسلوب میں ایک حیرت ناک توازن نظر آتا ہے جس کے بھرپور ابلاغ کے لئے غالب کی ترکیب سادگی و پرکاری سے زیادہ موزوں اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی سادگی و پرکاری کی ایسی مثالیں رسا کے زیر نظر مجموعے میں کم نہیں۔ ایک غزل کے چند شعر سنیئے۔

وہ بھی کچھ خود سے الگ تھا جیسے　　اپنے سائے سے جدا تھا میں بھی
وہ بھی تھا اک ورق سادہ کتاب　　حرفِ بے صوت و صدا تھا میں بھی
صورتِ شاخِ ثمر دار تھا وہ　　صورتِ دستِ صبا تھا میں بھی
پھول کھلنے کا عجب موسم تھا　　آئینہ دیکھ رہا تھا میں بھی

رسا کی فکر کا دائرہ بھی غالب کی طرح متناہی اور بے کراں ہے تقریباً تمام مابعد الطبیعاتی مسائل ان کے دائرہ فکر میں شامل ہیں کہیں وہ وحدۃ الوجود کے پے چاک میں گرفتار ہے کہیں کائنات اور خالق کائنات کا تعلق موضوع شعر ہے اور کہیں ذات و صفات کی گتھیاں سلجھائی جا رہی ہیں۔

ہر چیز سے ماورا خدا ہے　　دنیا کا عجیب سلسلہ ہے
کیا آئے نظر کہ راستوں میں　　صدیوں کا غبار اڑ رہا ہے
کچھ تو واضح نہ تھی تری صورت　　اور کچھ آئینہ مکدر تھا
عکس اپنے وجود سے پہلے　　جلوہ شیشہ گر میں آئے گا
اک جہاں آباد ہے زیر زمیں　　ہے طلسم حسرت تعمیر کیا

آفاقی اور مابعد الطبیعاتی موضوعات سے نیچے اتر کر جب رسا زندگی کے حقائق کا معاشی معاشرتی یا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتا ہے تو ان کی باتیں اس کے قاری کو چھوتی ہوئی گذر جاتی ہیں اور کوئی بھی ذہین شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دینے والے رفاقتوں کی بھیک　　مانگتے ہیں رفاقتوں کا صلہ
خیر تو ہے کہ آج اس گھر سے　　کوئی پتھر ابھی نہیں آیا
کھڑکیاں بے سبب نہیں ہوتیں　　تاکتے جھانکتے رہا کیجے

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہیں ۔

موضوع کے ساتھ اسلوب و اظہار کا رشتہ جسم وجان کا رشتہ ہوتا ہے اور دونوں ہی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں چ
آجکل کی نمائندہ غزل نوری داد سمیٹنے والی شاعرہ کی غزل نہیں رہی کہیں الفاظ و خیال کی کڑیوں کو حذف کر کے کہیں کنایوں، استعارہ
اور علامتوں کے استعمال سے کہیں نیم رخ یا بے چہرہ ابہام کی کیفیت پیدا کر کے آج کے پیچیدہ اور الجھے معاشرے کو سمجھنے اور سمجھانے کی
کوشش کی جارہی ہے۔ رسا کی شاعری بھی ایسی ہی ایک کوشش ہے کہیں وہ میر سے اپنی الجھنیں بیان کر کے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔

زندگی کس شجر کا سایہ ہے — موت کس دشت کی مسافت ہے
آگ میں کیا گل معانی ہے — خاک میں کیا نمو کی صورت ہے
کیا پسِ پردۂ توہم ہے — کیا سرِ پردہ حقیقت ہے
اس کہانی کا مرکزی کردار — آدمی ہے کہ آدمیت ہے
کاٹتا ہوں پہاڑ سے دن رات — مسئلہ عشق ہے کہ اجرت ہے
پھر محبت کا فلسفہ کیا ہے — یہ اگر سب لہو کی وحشت ہے

اور پھر خود ہی میر کی طرف سے جواب بھی دیتا ہے۔

میر بولے سنو رسا مرزا — عشق تو آج بھی صداقت ہے
اس جہان بلند و پست کے بیچ — کچھ اگر ہے تو اپنا قامت ہے

اور کہیں دل میں اٹھتے ہوئے ان گنت سوالوں کو بے کم و کاست حرف و شعر کا قالب عطا کر دیتا ہے کیونکہ اس کے خیال
میں انسان کے عیب و ہنر کے اس سے معتبر اور سچے گواہ کوئی اور نہیں۔

تمام رشتۂ عیب و ہنر سے لکھے ہیں
یہ میرے حرف یہ میرے گواہ سچے ہیں

ان کا یہ استفہامیہ انداز جس میں کراں تا کراں اور ازل تا ابد پھیلے ہوئے مسائل کو سمجھنے کی ایک سعی ملتی ہے اسے میر کے مقا
بلے میں مرزا سے زیادہ قریب لے آتی ہے۔

شام ہوتے ہی لوٹ آتے ہیں — طائران شجر شجر کیوں کر
سانس لیتی ہے زندگی کیسے — راہ چلتی ہے رہگزر کیوں کر
حرف آواز بن گئے کیسے — حرف لکھنا ہوا ہنر کیوں کر
جنگ کیسی ہوا سے حباب کے — بے سپر ہو گئے شجر کیوں کر

یا جیسے —

یہ کون رخشِ ہوا پر سوار آیا ہے — پسِ غبار یہ کیا آئینے سے رکھے ہیں
بہ روز کس کے تعاقب میں گھر سے جاتا ہوں — یہ وزنت نئے چہرے کہاں سے آتے ہیں
زمیں کو میری گواہی میں کون لایا ہے — زمیں کے ہاتھ میں کس نے چراغ رکھے ہیں

فطرت کے وسیع کینوس پر بکھری ہوئی ان گنت چیزوں میں، کہیں ظاہری اور کہیں باطنی طور پر حیرت ناک تشابہات و تضادات ملتے ہیں ادیب اور شاعر کی قوت مشاہدہ اور قوت متخیلہ جب ان کی نشاندہی کرتی ہے تو قاری ایک عجیب مسرّت آمیز حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے اردو شعر و ادب میں ایسے PARADOCES کی کامیاب ترین مثالیں شاعری میں غالبؔ کے یہاں ملتی ہیں رسؔا بھی اس معنی میں غالبؔ کا معنوی شاگرد نظر آتا ہے۔

کہیں دیوار کے رشتے ملیں گے
کہیں دیوار کا جھگڑا ملے گا

آسرے پر شام کے رہتا ہے دن بھر آدمی
اور سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ ڈھل جاتی ہے شام

زندگی اور اس قدر مصروف
آدمی اور اس قدر تنہا

حرفِ تازہ ورق ورق لکھوں
دل کی سادہ کتاب بھی دیکھوں

میرؔ و مرزاؔ کے قبیلے اردو شاعری کے سب سے اعلیٰ النسب قبیلے ہیں رسؔا نے دونوں ہی سے رشتہ جوڑا ہے رسؔا کی شاعری کا افق اگر ایک طرف میرؔ کی اتباع میں، جذبہ کی سچائی اور احساس کی گرمی سے روشن ہے تو دوسری طرف غالبؔ کی طرح اس کی شاعری کے در و بام پر فکر و فلسفہ کی پرچھائیاں دیدہ وروں کو فریب نظر میں مبتلا رکھتی ہیں غالبؔ کے آخری دور شاعری میں فکر و اسلوب میں ایک حیرت ناک توازن نظر آتا ہے جس کے بھرپور ابلاغ کے لئے غالبؔ کی ترکیب سادگی و پرکاری سے زیادہ موزوں اور کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی سادگی و پرکاری کی ایسی مثالیں رسؔا کے زیر نظر مجموعے میں کم نہیں۔ ایک غزل کے چند شعر سنیئے۔

وہ بھی کچھ خود سے الگ تھا جیسے
اپنے سائے سے جدا تھا میں بھی

وہ بھی تھا اک ورق سادہ کتاب
حرفِ بے صوت و صدا تھا میں بھی

صورتِ شاخِ ثمر دار تھا وہ
صورتِ دستِ صبا تھا میں بھی

پھول کھلنے کا عجب موسم تھا
آئینہ دیکھ رہا تھا میں بھی

رسؔا کی فکر کا دائرہ بھی غالبؔ کی طرح متناہی اور بے کراں ہے تقریباً تمام مابعد الطبیعاتی مسائل ان کے دائرہ فکر میں شامل ہیں کہیں وہ وحدۃ الوجود کے پیچاک میں گرفتار ہے کہیں کائنات اور خالق کائنات کا تعلق موضوع شعر ہے اور کہیں ذات و صفات کی گتھیاں سلجھائی جارہی ہیں۔

ہر چیز سے ماورا خدا ہے
دنیا کا عجیب سلسلہ ہے

کیا آئے نظر کہ راستوں میں
صدیوں کا غبار اڑ رہا ہے

کچھ تو واضح نہ تھی تری صورت
اور کچھ آئینہ مکدر تھا

عکس اپنے وجود سے پہلے
جلد شیشہ گر میں آئے گا

اک جہاں آباد ہے زیرِ زمیں
ہے طلسمِ حسرتِ تعمیر کیا

آفاقی اور مابعد الطبیعاتی موضوعات سے نیچے اتر کر جب رسؔا زندگی کے حقائق کا معاشی معاشرتی یا نفسیاتی تجزیہ پیش کرتا ہے تو ان کی باتیں اس کے قاری کو چھوتی ہوئی گذر جاتی ہیں اور کوئی بھی ذہین شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

دینے والے رفاقتوں کی بھیک
مانگتے ہیں رفاقتوں کا صلہ

خیر تو ہے کہ آج اس گھر سے
کوئی پتھر ابھی نہیں آیا

کھڑکیاں بے سبب نہیں ہونگی
تاکتے جھانکتے رہا کیجے

ناسپاسان علم سے سر پر　　پگڑیاں باندھتے رہا کیجئے

اس کو تشویش داستاں میں تھی　　اور لکنت مری زبان میں تھی

بہر صورت ہے ہر صورت اضافی　　نظر آتا ہے جو ویسا نہیں ہے

مثنوی مولانا روم ہو یا سعدی کی گلستان بوستاں یا عالمی ادب کا کوئی بھی بڑا ادب پارہ ان سب میں آدمی کو آدمی ہی سمجھا گیا اور روح وبدن کے تذکرے کے وقت ان ادب پاروں میں کبھی کوئی حد فاصل قائم نہیں کی گئی لیکن دور انحطاط نے آدمی کو دو حصوں تقسیم کر دیا چنانچہ اردو شعر و ادب میں جسم و جنس کی باتیں لذت اندوزی اور ابتذال کے دائرہ میں شمار کی جانے لگیں اور ادب کے ثقہ لوگ پر ناک بھوں چڑھانے لگے حسرت موہانی کی شاعری اس غلط تقسیم کے خلاف احتجاج کی صورت میں سامنے آئی اور نئی غزل کے لئے ایک نئی ثابت ہوئی اور بعد میں تو فراق نے جسمانی خطوط اور بدن کے دائروں کو جمالیات کی وہ آفاقی بلندیاں عطا کیں کہ جسم و جنس کے موضوعات کا درجہ حاصل کر گئے رسا نے ایسے موضوعات کو اشاروں اور علامتوں کے سہارے فراق کی طرح بڑی شاعرانہ لطافت سے برتا ہے ۔

جوئے آب رواں تری بانہیں　　تری انگڑائی موڑ دریا کا

پینگیں لیتا ہوا بدن اس کا　　اور دیوار درمیان میں تھی

میں ہلاک خدنگ قامت تھا　　ایک قوس قزح کمان میں تھی

سانپ لپٹے ہوئے تھے شاخوں سے　　اک عجب ہر گلستان میں تھی

رسا پر اپنے پہلے مضمون میں جو شاید رسا پر سب سے پہلا مضمون بھی تھا میں نے اسے روایتی کہانیوں کے چوتھے کھونٹ جانے والے سے تعبیر کیا تھا جو اپنے گھر کا راستہ بھول جاتا ہے اور اگر کبھی مڑ کر دیکھتا ہے تو پتھر کا ہو جاتا ہے جو زندگی بھر ایک بے نام مسافت طے کرتا ہے جو گھر کی آسائشوں کو ترک کر کے، وحشت دل کے ہاتھوں، بگولوں کی طرح صحرا صحرا گھومتا رہتا ہے ۔

نکل کر سایۂ ابر رواں سے　　رہے ہم مدتوں بے سائباں سے

اس مسافر کا مسلک انسانیت کا مسلک ہوتا ہے اور اس کا پیغام محبت کا عظیم پیغام ہوتا ہے ملک و قوم اور مذہب و ملت کے روایتی حدود سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اسے پوری طرح کبھی نہیں سمجھا جاتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذہنی سفر میں اس کا کوئی شریک نہیں یہی اس کا دکھ ہوتا ہے اور یہی اس کی کہانی کا المیہ انجام اسے کبھی سرمد کی طرح قتل کر دیا جاتا ہے کبھی منصور کی طرح دار پر چڑھا دیا جاتا ہے کبھی سقراط کی طرح زہر پینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے مختصر یہ کہ اس کی روش روش عام سے الگ ہوتی ہے اور وہ قبیلے میں رہ کر بھی قبیلے سے جدا رہتا ہے ۔

عجب میرا قبیلہ ہے کہ جس میں　　کوئی میرے قبیلے کا نہیں ہے

عشق کا کاروبار کل وقتی کاروبار ہے اور دل کا سودا زندگی کا سودا ہے اس عشق کی جمہوریت میں ہر دل زدہ درویش شہزادہ ہے اور جاں سے گذرنے والا شہریار ہے کج کلاہ رسا بھی ایک ایسی ہی منزل کی تلاش میں ایک عمر سے سرگرداں ہے اس بے نام مسافت اور بے سمت سفر میں اس شعلہ جاں اس کا رہنما ہے یہی اس کا زاد راہ ہے ۔

لو دیئے کی نگاہ میں رکھنا　　جانے کس سمت راستہ لے جائے

اسے گھر سے چلے اتنی مدت گذر چکی ہے کہ زندگی کی شام ہو گئی ہے لیکن منزل تو اب بھی دور ہے سفر پر جانے والے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں، گھر لوٹ بھی آتے ہیں لیکن رسا کا سفر ابھی جاری ہے اور شاید اس کے گھر کا دروازہ ہمیشہ اس کے انتظار میں کھلا ہی رہے ۔

لوٹ آئے طیور آوارہ　　اور رسا گھر کبھی نہیں آیا

قمر جمیل

گُل کو پیغمبرِ شب کہتا ہوں

گل کو پیغمبر شب کہتا ہوں ____

"میری روشنی اور انار کے درختوں میں تنزاتوں کے چاقو چمکتے ہیں
اور سر بریدہ چاند ہے جو اس پہاڑی کا پہلا پیغمبر ہے"
(پہاڑی کی آخری شام)

میں نے اپنی اس نظم سے بالکل الگ کیفیت میں رسا کا یہ مصرعہ سنا، یوں لگا جیسے انسان خواب سے زیادہ بھی کچھ دیکھ سکتا ہے۔ رسا کا یہ مصرعہ مجھے بہت پسند آیا اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس مصرعہ میں بڑا خوبصورت ابہام ہے: رسا تیقنات کا شاعر ہے۔ وہ اپنی بات واضح انداز سے کہنا جانتا ہے، لیکن بیان کی وضاحت اور شفاف کیفیتوں کے باوجود رسا کے اس مصرعہ کے ابہام میں امپسن جیسے نقاد کے لئے بڑی خوبصورتیاں بڑی شاعرانہ باتیں موجود ہیں۔ مثلاً یہی کہ جیسے شاعرانہ علم کی رات سامنے آجائے۔ جیسے شاعری کے وجدان سے نئے اُفق اُبھرنا چاہتے ہوں۔ امپسن کے لئے ایسے ابہام منطقی انتشار سے جنم لینے والی شاعرانہ فضا کا دوسرا نام ہیں۔ سادہ بیان اور منطقی اظہار سے جتنا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے اس طرح کا ابہام اور بڑھتا جاتا ہے بعض اوقات دو یا دو سے زیادہ معانی گھل مل جاتے ہیں یا دو بے تعلق معانی اچانک ایک ساتھ جنم لیتے ہیں یا پھر متبادل معانی شاعر کی پیچیدہ ذہنی حالت کا اظہار کرتے ہیں۔ امپسن نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ بعض اوقات شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ یا تو متضاد بات ہوتی ہے یا بے تعلق ہوتی ہے اور پھر شاعر اس میں تعلق پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس ابہام کا مطلب شاید یہ بتائیں کہ شاعر اپنے خیال کو شعر کہنے کے دوران پوری طرح دریافت نہیں کر سکا۔ لیکن ان سب باتوں سے الگ شاعری کا تعلق بہرحال زبان سے ہوتا ہے اور شاعر اُس کے خیال میں صرف اپنے جذباتی خیالات ہی کی وجہ سے شاعر نہیں ہوتا بلکہ ابہام پیدا کرنے کے اُن مختلف طریقوں کے باعث ہوتا ہے جن کے ذریعے وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ابہام کر دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں ابہام ہی شاعری کی روح ہے ____ یہ واقعہ اپنی جگہ ہو یا نہ ہو کم از کم رسا کے اس خوبصورت مصرعے کی داد امپسن کے حوالے سے ضرور دی جا سکتی ہے۔ میں جان بوجھ کر سرریلسٹوں کا حوالہ اس سلسلے میں نہیں دینا چاہتا کیونکہ رسا شاعری میں لاشعور پر نہیں اپنے وجدان پر یقین رکھتا ہے۔ اس کا وجدان اس پر داخلیت کے دروازے کھول دیتا ہے، اسی لئے اُسے گل بھی پیغمبر شب لگتا ہے: اس مصرعہ سے آپ کو رسا کی نفسیاتی

تاریخ کا سراغ نہیں ملے گا نفسیاتی تاریخ کا سراغ ان لوگوں کی شاعری سے مل سکتا ہے جو شاعری نہیں کرتے شاعرانہ گفتگو کرتے ہیں
اسے شاعری سمجھتے ہیں۔ رسا اپنے آپ میں ڈوب جاتا ہے اپنے آپ میں گم ہو جاتا ہے اپنی تزک باری نہیں لکھتا۔ یہ کام اپنے عہد کے نظم گو حضرات کیلئے
دیتا ہے۔ رسا کی شاعری میں ایک پراسراریت گھومتی رہتی ہے ——— ایک نادیدہ زنجیر ہمہ گیری اس کے ساتھ چلتی رہتی ہے۔
رقص سیارگاں دیکھتا ہے، نغمہ ساریاں سنتا ہے اور سوچتا ہے ؎

یا ابھی بادباں نہیں کھولے یا سمندر ابھی نہیں آیا

اس کی شاعری کا موضوع ——— زندگی کے سادہ تجربات سے شروع ہوتا ہے مگر یہ سادہ تجربات، باریک نازک
اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے خیالات میں احساسات کی تیز روشنی دوڑنے لگتی ہے ——— رسا کی داخلی
اس کی سلطنت ہے: مگر اس کی شاعری اس سلطنت کی سفیر بھی ہے اور خارجی دنیا کو اپنی سلطنت میں پناہ بھی دیتی۔
اس کے اچھے اشعار میں اس کے احساسات کا پھیلا ہوا رنج ملتا ہے؛ جب جی پر آ ہی بنتی ہے۔ وہ شعر کہتا ہے: یہی نغمہ
سچائی اس کے کلام کا ایک ایسا پہلو ہے جس میں اس کی شاعری جنم لیتی ہے: رسا میں اس کی شخصیت بھی زندہ ہے اور اس
کی شاعری بھی ——— اطہر نفیس کی شاعری میں اس کا شخص بولتا ہے فریدہ جاوید کی شاعری میں اس کا شاعر بولتا ہے اور رسا چغتائی
کی شاعری میں کبھی شخص اور شاعر ہم آواز ہو جاتے ہیں اور کبھی شخص اور شاعر ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ایک دوسرے
سے برسر پیکار ہوتے ہیں ——— ایک دوسرے سے لڑتے ہیں گتھم گتھا ہوتے ہیں اور کبھی اس طرح ملے جلے ہوتے ہیں کہ ا
کا پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے۔ ادب کے جمہوریئے میں شخص اور شاعر کی آواز ہم آوازی ایک منفرد عمل ہے، اس کا شخص اس کی
شاعری میں آپ کو اپنے اصلی چہرے کے ساتھ ملے گا۔ رنگے ہوئے چہرے کے ساتھ نہیں۔ مانوس مگر حیرت زدہ کر دینے والا ——— شخص
اور شاعر کے درمیان یہ جنگ یہ میل یہ ملاپ ذاتی زندگی اور GENOTYPE کے رویوں کے درمیان جنگ یا امن کی علامت ہوتی
ہے۔ ابہام کے سلسلے میں میں نے ابھی امپسن کا ذکر کیا تھا، لیکن یہ کہنا بھول گیا تھا کہ بعض اوقات رسا کے یہاں یہ ابہام ذاتی
زندگی اور GENOTYPE کے مکالمے کے زیادہ ایمائی زیادہ استعاراتی اور زیادہ پیچیدہ ہونے کے باعث پیدا ہوا ہے۔
بظاہر یوں لگتا ہے جیسے بس رسا مصرعہ اٹھاتا جاتا ہے۔ رسا بس لفظوں اور ترکیبوں سے کھیلتا ہے۔
لیکن ہمیں حقیقت کو کسی اور طرح بھی دیکھنا چاہیئے۔ یعنی کہیں کہیں ایسا نہیں ہوتا۔ لفظوں کی تکرار اس کے ہاں شخص
اور GENOTYPE کا مکالمہ ہوتی ہے اور جب یہ شخص شاعر کو چھوڑ جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ؎

وہ جو اک شخص میرے ساتھ چلا تھا گھر سے راہ میں چھوڑ گیا ہے مجھے تنہا کیسا

ابہام کے سلسلے میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رسا تیقنات کا شاعر ہے، اس کی شخصیت رمز آشنا ہے اور یہی رمزیہ
انداز اس کی شاعری کی روح ہے کولرج نے لکھا ہے کہ پرانی زبانیں شاعری کے لئے زیادہ موزوں تھیں اس لئے کہ ان میں یہ صلاحیت تھی
کہ نمایاں خیالات کو نہایت وضاحت سے ظاہر کر دیں اور دوسرے خیالات کو اس طرح ظاہر کرتی تھیں کہ یہ خیالات واضح نہیں ہو پاتے
تھے خود اس کا جملہ سنیئے۔

THEY EXPRESSED ONLY PROMINENT IDEAS WITH CLERNESS THE OTHERS BUT DARKLY

کولرج کہتا ہے کہ شاعری سے ہم اس وقت لطف اندوز ہوتے ہیں جب ہم کوئی چیز عمومی طور پر سمجھتے ہوں۔ مکمل طور پر نہیں
یہ پہلو ذرا رسا کی شاعری میں ملاحظہ کیجیے۔

زندگی کا سفر کٹا تنہا　　اک کہانی سی رہگذر نے کہی

سننے آئے تھے قصۂ مجنوں　　اب جو دیکھا تو واقعہ نکلا

جن آنکھوں سے مجھے تم دیکھتے ہو　　میں اُن آنکھوں سے دنیا دیکھتا ہوں

تیرے آنے کا انتظار رہا　　عمر بھر موسم بہار رہا

پھول کھلنے کا عجب موسم تھا　　آئینہ دیکھ رہا تھا میں بھی

گل کو پیغمبرِ شب کہتا ہوں　　شب سے مفہوم خزاں ہے میرا

رسا کی شاعری کی یہ رمزیت بہت جاندار بہت خوبصورت ہے مگر یہ بہت زیادتی ہوگی۔ اگر میں یہ نہ کہوں کہ رسا کی شاعری ایک زمانے میں روایتی لفظوں کی بیمار بھی رہی ہے۔ اگر اس زمانے میں ان پامال ترکیبوں اور لفظوں کے باوجود کہیں شاعری آگئی ہے تو یہ شاعری اس کے احساس کی منّت کش ہے لفظوں کی نہیں۔ اس زمانے میں اس کے احساس پر بیان کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے لیکن اس زمانے میں بھی وہ روایتی اور غیر روایتی دونوں انداز میں شعر کہہ رہا تھا۔ میرؔ، غالبؔ یگانہؔ، فراقؔ، اور جگرؔ ان سب کی پرچھائیاں اس کی شاعری میں نظر آتی ہیں، لیکن ان شاعروں سے اس نے بہت کچھ سیکھا بھی۔ میرؔ کی زمین میں اُس نے کتنا خوبصورت شعر کہا ہے

میرؔ نے کہا تھا ؎　　صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی　　کیا پتنگے نے التماس کیا

رسا کہتا ہے ؎　　زندگی اک کتاب ہے جس سے　　جس نے جتنا بھی اقتباس کیا

آپ حیرت کریں گے کہ ناصر کاظمی، فریبِ جادید اور رسا چغتائی جیسے غزل کے اچھے شاعروں پر روایتی لفظوں کا کتنا بوجھ رہا ہے۔ کولرج نے کہا ہے کہ بعض اوقات مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اس طرح کے لفظوں کی ایک فہرست یعنی ان لفظوں اور ترکیبوں کی فہرست جو بار بار دہرائے جاتے ہیں اور جو بہت زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور جنہیں شاعری کی دنیا سے باہر نکال دیا ہو۔ عدالتوں اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے لٹکا دی جائیں تاکہ اُن سے شاعروں کو فائدہ پہنچے اور عوام کا وقت اُن کے مطالعے سے بچ سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ رسا چغتائی اپنے ہم عصروں کی طرح موتی کی لڑیوں کی بجائے ماش کی بڑیاں ہاتھ میں لے کر نہیں اترا تا، ماش کی بڑیوں سے میری مراد ظفر اقبال، محمد علوی اور دوسرے نوجوانوں کی شاعری نہیں ہے جو بہرحال نیا شعر کہنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رسا جب اپنا شعر کہتا ہے تو اس روایت کے جھٹپٹے سے باہر آجاتا ہے ؎

کل یونہی تیرا تذکرہ نکلا　　پھر جو یادوں کا سلسلہ نکلا

میں نہ تھا اور وہ گھر آیا تھا　　ہائے کیا خواب نظر آیا تھا

الفاظ کراچی

میں نے سوچا تھا اس اجنبی شہر میں زندگی چلتے پھرتے گزر جائیگی
یہ مگر کیا خبر تھی تعاقب میں ہے ایک نادیدہ زنجیر ہمسائیگی

کون دل کی زبان سمجھتا ہے
دل مگر یہ کہاں سمجھتا ہے

لوٹ آئے طیور آوارہ
اور رسا گھر ابھی نہیں آیا

عجب میرا قبیلہ ہے کہ جس میں
کوئی میرے قبیلے کا نہیں ہے

رسا کی شاعری میں صنعتِ تضاد ہے۔ استعارے بھی زیادہ ہیں اور تشبیہیں کم، اس لئے کہ رسا کی شاعری معلوم حقیقتوں کے بارے میں ہے۔ معلوم حقیقتوں کے اظہار میں تشبیہوں سے زیادہ استعارے اثر انگیز ہوتے ہیں۔ رسا سے آپ بھی ملے ہیں میں بھی ملا ہوں ممکن ہے ۔ آپ کی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ بہرحال رسا نے جو اپنا پورٹریٹ بنایا ہے اس میں پس منظر، ایک گلی کی دیوار کے سامنے ایک منحنی سا شخص نظر آتا ہے، اُس کا رنگ گندمی ہے، ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور آنکھوں میں نمی۔ اُس کی باتوں میں زندگی کی ایک لہر ہے۔ کچھ دنوں سے اس گلی میں آکر رہنے لگا ہے وہ کہتا ہے تم جسے ڈھونڈ رہے ہو یہ وہ شخص نہیں ہے، وہ شخص نہ جانے کہاں چلا گیا۔

رسا نے اس پورٹریٹ میں دراصل اپنی تصویر کے ساتھ ساتھ زندگی کی تبدیلی اور تیز رفتاری کی تصویر کھینچی ہے۔ رسا کی زندگی بھی ہندوستان سے یہاں تک تبدیلیوں کی ایک تصویر ہے ایسا لگتا ہے اس کی شاعری کا آغاز محبت سے ہوا ہے۔ یہ محبت بہت گہری، بلند ثابت نہیں ہوئی۔ یہ تجربہ بہت ٹریجک بھی ثابت نہیں ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس تجربہ کا سایہ اس کی شاعری پر پڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

جب پہلی بار رسا نے اسے دیکھا۔ وہ دریا میں نہا رہی تھی۔ جہاں پانی ہلکا تھا۔ وہ اپنے سرہانے پتھر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ پانی اُس کے جسم پر ہر طرف آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا لیکن یہ پانی۔ یہ دریا، بارش، پھوار، بادل، گھاٹ اور کنول۔

حسن اک چاندنی کا دریا ہے
اور ہر نقش اک کنول جیسے

چھوٹی بحروں میں رسا کا دل خوب لگتا ہے۔ یہ اُس کے مزاج کی مشرقیت ہے۔ عسکری صاحب نے لکھا ہے کہ چھوٹی بحر میں اچھا شعر نکالنا ہمارے ہاں کمال کی دلیل سمجھا گیا ہے۔ چھوٹی بحریں ابتدائی جذبات کی شدت کے اظہار کے لئے موزوں ہوتی ہیں۔ چھوٹی بحروں میں جذبات کی تمالزی اور قدرے پیچیدہ شکلیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایسی باتیں جنہیں تفصیل سے بیان کریں تو تجربہ باقی ہی نہیں رہتا۔ شکوہ و شکایت اور واسوخت والی ذہنیت بھی چھوٹی بحروں کو راس آتی ہے۔ چھوٹی بحروں میں خود بینی اور خود نمائی کو بھی موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ تجربہ کا تجزیہ پیش کرنے کے لئے بھی چھوٹی بحریں مناسب ہوتی ہیں عسکری صاحب نے یہ سب باتیں کہی ہیں مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ چھوٹی بحروں کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کی مشرقیت ہے۔ اس کا اندازہ جاپان کی ہائیکو سے بھی ہوتا ہے۔ چھوٹے سے کینوس پر اتنے زیادہ TONES اور اتنے زیادہ N-UANCES ایران کی شاعری اور ہماری غزل میں ملتے ہیں۔ چینیوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ شاعری میں لفظوں کو آنکھ اور کان کے ساتھ ساتھ انگلیوں پر بھی تولتے ہیں۔ رسا، فریبعا وبید، ناصر کاظمی، اور وہاں سے آتش اور میر تک ہمارے شاعر شاعری میں لفظوں کو اپنی روح پر رکھ کر تولتے ہیں۔ رسا کی شاعری رسالوی بھی ہے: وہ لہر بھی جو اسیج رنگ اور پراسراریت سے تعلق رکھتی ہے اور وہ لہر بھی جو فطرت کو اپنا

رعنائیتی ہے۔ اُس کی شاعری کی رومانوی فضا نے ایک لڑکی کی محبت میں آنکھ کھولی اور پھر یہی شاعری، یہی زندگی اسے کراچی جیسے بےحسی شہر کے بیچ لے آئی۔ یہاں پہلے پہل اُس نے درختوں کے سایوں میں بھی دھڑکتے ہوئے دلوں کی آواز سنی۔ لیکن زندگی کی معنویت بہت جلد تصوف کے اُن دیکھے راستوں پر سفر کر چلی گئی جہاں :-

رشتۂ جسم و جاں بھی ہوتا ہے — ٹوٹنے کا گماں بھی ہوتا ہے

ہم سے عزلت نشین بھی ہوتے ہیں — عرصۂ لامکاں بھی ہوتا ہے

ہم بھی ہوتے ہیں اس کی محفل میں — رقصِ سیارگاں بھی ہوتا ہے

بادِ صحرائے جاں بھی ہوتی ہے — نغمہ ساربان بھی ہوتا ہے

پھول کھلتے بھی ہیں سرِ مژگاں — چاندنی کا سماں بھی ہوتا ہے

لوگ مل کر بچھڑ بھی جاتے ہیں — اور یہ ناگہاں بھی ہوتا ہے

اس غزل میں آپ نے دیکھا کہ رسا نے مجاز سے حقیقت تک اپنے سفر کی روداد کس طرح بیان کر دی۔ ایک امرِ واقعہ بیان کس تیقن سے کر دیا۔ لیکن یہ سارا عمل شاعری ہی میں ہوا۔ غالب نے کہا تھا۔

میناشکستۂ دمِ گلفام ریختہ — محوم ہنوز در گل و ریحان شناختن

میں ابھی چھوٹی بحروں کا ذکر کر رہا تھا۔ سترہویں صدی کے ایک جاپانی شاعر نے پندرہ سترہ SYLLABLES پر مشتمل ایک مختصر سی نظم لکھی ہے۔ وہ ہائیکو یہ ہے۔

YOKU MEREBA

NAZUNA HANA SEKU

KAKINA KANA

یعنی: جب میں توجہ سے دیکھتا ہوں تو میں نازونہ کو کھلا ہوا دیکھتا ہوں۔ جھاڑیوں کی دیوار کے پاس نازونہ۔ ایک جنگلی پھول دیوار کے پاس کھلا ہوا ہے۔ اس مختصر سی نظم میں اس جنگلی پھول کو کھلا ہوا دیکھ کر باشو (BASHU) کی جو کیفیت ہوئی ہے اُسے باشو نے صرف ایک لفظ KANA سے ادا کیا ہے KANA اسمائے صفات میں سے جاپانی زبان کا ایک ایسا لفظ ہے جو غم، خوشی، تعریف اور حیرت سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے انگریزی زبان میں استعجابیہ نشان۔ صرف اس ایک استعجابیہ لفظ میں باشو نے اَن گنت احساسات کا اظہار کر دیا ہے۔ رسا کی شاعری کی روح بھی یہی رمزیت ہے جس کا اظہار باشو نے ایک لفظ KANA سے کیا ہے۔

ٹھہریئے! رخصت ہونے سے پہلے میں آپ کا تعارف رسّا سے کروا دوں۔
رسّا۔ سید ابوالعلا ابوالعلائی سلسلے کے ایک بزرگ عارفی صاحب سے بیعت ہے۔ والد کا نام مرزا محمود علی بیگ او
خود اس کا نام مرزا محتشم علی بیگ ہے۔ یگانہ کی طرح یہ بھی چنگیزی ہے۔ مگر لہجہ میں کڑواپن نہیں۔ سوائی۔ مادھو پور کا رہنے
والا شخص۔ چاروں طرف پہاڑ اور بیچ میں اس کا قصبہ تھا۔ آج بھی اس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں اور بیچ میں اس کا قصبہ ہے! اس
کی شاعری اس قصبے سے طلوع ہونے والے غم زدہ چاند کی طرح ہے جس کے سامنے ایک بیکراں رات ہے۔ شاعرانہ علم کی بیکراں رات؛ جو
اس کے دکھوں کے داغ چاند کے داغوں کی طرح چمکتے ہیں اور یہ چمکنے ہی نہیں۔ ہمارے آس پاس گھومنے لگتے ہیں! او
اندھیروں میں شاعری کی نئی روشنی جنم لیتی ہے۔ شاعری کی نئی روشنی رسّا چغتائی کے چہرے پر بھی پڑ رہی ہے۔

ریختہ!

وہ ریختہ جو رسّا چغتائی کا کلام ہے۔
ہمارے شہر کے ایک پیغمبرِ شب کا صحیفہ!

عبیداللہ علیم

اتنا آساں نہیں غزل کہنا

ہوئے رسا نہ ہوئے مرزا معتشم علی بیگ
وگرنہ ہوتے تجمل حسین خاں کی طرح

میں اس شعر کو رسا کی سوانح حیات کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ رسا چغتائی میرا پیش رو ہے مگر میرا یار بھی ہے میں اس کی زندگی کے ورق ورق جانتا ہوں اور اسے اپنے یار سے زیادہ شاعر مانتا ہوں اور شاعر میرے ایمان میں ایک حالت، ایک کیفیت اور ایک وجدان کا نام ہے۔ جس کے بناؤ میں کتاب کم اور حیات زیادہ کارفرما ہوتی ہے اور زندگی اسے پڑھانے بھی آتی ہے اور اس سے پڑھنے بھی۔ کہتے ہیں الشعرا تلامیذ الرحمٰن رسا کو دیکھ کر اور پڑھ کر اس صداقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

اپنا حافظ اللہ ہوں تو ادھر سیڑھیوں کے اوپر میکدے میں ایک چراغ روشن ہے اور ایک پیاس ہے جو زندگی کو تلچھٹ تک پی جانے کی آرزومند ہے۔ جام بھرتا ہے جام خالی ہو جاتا ہے مگر زندگی کہتی ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

پھر ایسا ہوا کہ وہ پیاسا آدمی جام الٹ کے سیڑھیاں اتر آیا اور کہا کہ ہنسنا تہذیب ہے، جلنا تقدیر ہے، روشنی شمع کی خود گلوگیر ہے۔ اور اپنے طلسم خانۂ ذات میں وہ زینے اترنے لگا جہاں سے آواز آئی۔ اب سحر آئے گی۔ اب سحر آئے گی۔ وہ ایک خانقاہ میں تھا۔ میری چندری رنگدو نظام الدین۔

ترے نزدیک آ کر سوچتا ہوں
میں زندہ تھا کہ اب زندہ ہوا ہوں

تم زندہ تھے، تم زندہ ہو، تم زندہ رہو گے، مرشد نے ڈھارس دی اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ قلب روشن کے لئے در اجابت کب وا نہیں ہوتا۔ سفر کی گواہی راستے دیتے ہیں یا چلنے والے کے پاؤں۔ رسا کا سفر ایک شاعر کا سفر ہے۔ ایک رند کا سفر ہے ایک صوفی کا سفر ہے مگر شاعر اس کا استعارۂ اعلیٰ ہے۔ وہ زندگی کو اس کی کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ دیکھنے کا تمنائی ہے۔ نام معتشم علی بیگ ہے لیکن میر کا فقیر ہے اس کے اشعار کے لئے کہا جا سکتا ہے۔

پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتے ہیں

غالب بھی تو مرزا تھے اور میر کے معتقد تھے۔ مگر انہیں دعویٰ تھا کہ۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

رسا کہتا ہے۔

دور گیا تلوار کے فن کا فن سخن کی بات کریں اب
آپ مغل ہیں مرزا صاحب جوہر تو دکھلانا ہو گا

اسے مغل ہونے پر ناز ضرور ہے۔

مگر یہ مغل زادہ سرکاری درباری نہیں ہے اور تجمل حسین خان بننے سے پرہیزی۔ پھر آدمی شریف اتنا کہ دوسروں کو اس کام سے روکا بھی نہیں۔

رسا بڑا عجیب و غریب شاعر ہے نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ کلرکی اور پیشکاری میں عمر بتا دی نوکری سدا کچی رہی۔ جب پکی ہوئی تو بیچارہ شاعر ریٹائر ہو گیا۔ اب حریت میں پروف ریڈر ہے وہ بھی اس لئے کہ اخبار کا ایڈیٹر پڑھا لکھا بھی تھا اور شاعر بھی۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ ابھی شاعر کے معنی معاشرے پہ کھلے نہیں۔ معاشرے پہ تو جیسے تیسے کھل رہے ہوں حکومتوں پر نہیں کھلے۔ اگر شاعری شاعر کی روح کا جبر نہ ہو اور اظہار اس کی فطری مجبوری نہ ہو تو ساری عمر کی رائیگانی سے بہتر یہ ہے کہ پانچ دس سال آدمی ہاکی کرکٹ کھیلنے کی ریاضت کرے تو خود بھی اعزاز پائے اور قوم بھی سربلند ہو۔ شاعر اور پھر رسا جیسے شاعر پہ کیا بات ہو کہ ابھی ہمیں کھیلوں سے فرصت نہیں ٹانگوں سے نکلیں تو ذہن تک آئیں۔ مگر ذہن تک کیوں آئیں کہ ذہن سوچتا ہے۔

کچھ خانماں برباد تو سائے میں کھڑے ہیں — اس دور کے انسان سے یہ پیڑ بڑے ہیں۔
چیونٹی کی طرح رینگتے لمحوں کو نہ دیکھو — لے ہم سفر رات ہے اور کوس کڑے ہیں
پتھر ہیں تو رستے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے — رہرو ہیں تو کیوں صورت دیوار کھڑے ہیں
میں ہیچ مداں، ہیچ سخن، ہیچ عبارت — کہتا ہوں تو کہتے ہیں کہ الفاظ بڑے ہیں
تاریخ بتائے گی کہ ہم اہل قلم ہی — آزادیٔ انساں کے لئے جنگ لڑے ہیں

تلوار کی جنگ سے خیال کی جنگ کہیں بھاری ہے۔ لڑنے والے لڑتے ہیں اور یہ جنگ جیتتے بھی ہیں مگر اس میں زندگی ہارنا پڑتی ہے۔ ادب و آرٹ آج کی دنیا میں ایک یتیم بچے کی مانند ہیں جس پر ترس تو سبھی کھاتے ہیں مگر اپنے گھر میں جگہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ آپ شاعر ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ آپ پینٹر ہیں اور کیا کرتے ہیں آپ گانے والے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ مگر اور کسی سے کوئی نہیں پوچھتا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ بڑے گھر اور لمبی کاریں زندگی کی فضیلت بن چکی ہیں، خوشامد، چاپلوسی اور چارسو بیسی حکمت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں ایسے میں وہ آواز جو زندگی جگاتی ہے اور زندگی سکھاتی ہے در و دیوار کی ویرانی میں رو رہی ہے۔

شہر میں جائیں تو لوگوں کا ہجوم — اور گھر جائیں تو سناٹا ملے
افلاس کی تہمت سے گذر کیوں نہیں جاتے — مرنا ہے جب اک روز تو مر کیوں نہیں جاتے
ہم کون رسا آپ سے یہ پوچھنے والے — جاتے ہیں جدھر لوگ ادھر کیوں نہیں جاتے
رکتے نہیں جب پاؤں زمیں پر تو فضا میں — ذروں کی طرح لوگ بکھر کیوں نہیں جاتے

رسا چغتائی تم ادھر کیسے جا سکتے ہو۔ تمہارے کاندھے پر تمہارا بوجھ ہے۔ یعنی شاعر کا بوجھ۔ اور یہ بوجھ تو تمہیں خود ہی اٹھانا ہے۔

تمہارا ساتھی ناصر کاظمی بھی یہ کہتے ہوئے مرگیا۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر　　اداسی بال کھولے سو رہی ہے

پیارے صاحب! تمہارے شعر تمہارے نہیں سب کے ہیں۔ کون سی محفل تم سے خالی ہے۔ ہر جگہ تمہارا نام رسا چغتائی ہے تم آج کی شاعری کی سربلند آواز ہو۔ میرا حافظہ تمہارے اشعار سے منور ہے جہاں سے میں تمہیں دیکھتا ہوں ایسا لگتا ہے جیسے زندگی تمہارے پاس آکر خود بولنے لگتی ہے زندگی نے پک پلک جہت جہت تم سے باتیں کی ہیں اور تم وہاں بھی ہو جہاں سرمستیاں اور رعنائیاں ہیں اور وہاں بھی ہو جہاں اداسیاں اور تنہائیاں ہیں اِدھر سے دیکھتا ہوں تو تم اُدھر سے نکل جاتے ہو اور اُدھر سے دیکھتا ہوں تو تم اِدھر سے نکل جاتے ہو سچ ہے کہ شاعر زندگی کا نام ہے اور زندگی کہیں بند نہیں۔

میں جھوٹا تو دنیا جھوٹی　　میرا یہ ایمان ہے سائیں
پاس اپنے اک جان ہے سائیں　　باقی یہ دیوان ہے سائیں

جان جب لفظوں میں آجائے تو میرے پیارے بھائی دیوان کیوں نہ باقی رہے اور اب تم دل کی خانقاہ کے کئی زینے اتر چکے ہو۔ تم پر نئی بہاریں اور نئے موسم آرہے ہیں اور سب بہاریں اور سارے موسم تمہاری بنیادی سچائی کا پھل ہیں۔ کہاں کا میکدہ اور کہاں کی خانقاہ۔

جہاں تم ہو وہاں سایہ ہے میرا　　جہاں میں ہوں وہاں سایہ نہیں ہے
عجب میرا قبیلہ ہے کہ جس میں　　کوئی میرے قبیلے کا نہیں ہے

تمہاری آواز پھیلاؤ کی آواز ہے۔ میرؔ کے چرنوں میں بیٹھ کے لکھنے والے کی آواز ——

بلائے جاں ہے غالبؔ اسکی ہر بات　　عبارت کیا اشارت کیا، ادا کیا

مجھے ہمیشہ محسوس ہوا کہ غالب کا یہ شعر میرؔ کے لئے ہے۔ تمہاری شعری بوطیقہ میں میرؔ کا بڑا حصّہ ہے۔ سو تم بھی اس شعر کا لطف اٹھاؤ کہ یہ داد تمہیں بھی جاتی ہے۔

عارضوں کو ترے کنول کہنا　　اتنا آساں نہیں غزل کہنا
ہم خرابا تیوں سے پھر ملنا　　اس خرابے کی راہ چل پرسوں
رہنا ہر دم بجھا بجھا سا کچھ　　ہو گیا دل کا مشغلہ سا کچھ
ایسا اجڑا صنم کدہ دل کا　　ہو گیا خانہ خدا سا کچھ

تم نے غزل سے خرابے کو آباد کرنے میں زندگی لگادی اور خود برباد ہو گئے۔ مگر تمہاری بربادی سے کیا ہوتا ہے تم جیسے ہزاروں قربان غزل کی آبرو رکھنے والے تاجوروں میں تمہارا نام لکھا ہی جائے گا۔ کیا یہ بات تمہارے مرزا محتشم علی بیگ کو مطمئن نہیں کرتی۔ اللہ تمہیں سلامت رکھے اور اس کم بخت غزل کو بھی جو تمہارے خون سے نہال ہو کر چہروں پہ چہرے بنائے جارہی ہے۔

لاکھ پھولوں پہ پہرے بٹھاتے رہو لاکھ اونچی فصیلیں اٹھاتے رہو
جائے گی سوئے گلزار جب بھی صبا اپنی آوازِ زنجیر پا جائے گی

حسن اکبر کمال

مادھوپور کا جادو

پیارے صاحب نے کہا:

کون دل کی زباں سمجھتا ہے　　دل مگر یہ کہاں سمجھتا ہے

اور میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مرزا رسا چغتائی یعنی ہمارے اور آپ میں سے بہت سے لوگوں کے پیارے صاحب کا دل یہ سمجھ لیتا تو پھر وہ ایسی طلسماتی اثر رکھنے والی اور دل کی زبانی زندگی کی کہانی سنانے والی شاعری کیسے کرتے؟ پھر تو وہ کوئی بھی عام شاعر ہوتے، رسا چغتائی نہ ہوتے ——— مگر وہ رسا چغتائی ہیں، ایک صاحبِ طرز غزل گو رسا چغتائی۔ جو ہماری اردو غزل کی روایت میں اپنا ایک خاص رنگ، لہجہ اور دنیا لے کر شامل ہوئے اور کس شان سے شامل ہوئے کہ کاروانِ غزل گویاں میں ہمسفروں اور اپنے بعد شامل ہونے والوں کے لئے ایک مثال بنے ۔۔ مثال بنے گدازِ جاں کی، سلیقۂ بیاں کی اور خودداریٔ سخنوراں کی! انھوں نے زندگی کے بے شمار شب و روز عرضِ ہنر کی نذر کئے اور ستائش تک کی پروا نہ کی۔ صِلے کا تو خیر اِس معاشرے میں کیا ذکر!

پیارے صاحب کہتے ہیں:

اپنی تو عمر ساری عرضِ ہنر میں گزری　　شامِ فراق کیسی، روزِ وصال کیسا

ہجر و وصال اور لمحاتی مسرت و ملال سے بلند اور بے نیاز ہو کر جو شخص صرف عرضِ ہنر کا ہو رہے بھلا اس پر شعر کی دیوی کیوں مہربان نہ ہوگی! چنانچہ شاعری مرزا رسا چغتائی پر مہربان ہوئی اور ایسی ہوئی کہ انھیں نہال کر دیا۔ انھوں نے کیسے کیسے شعر اردو غزل کو دیئے اور صاحبو، یہ خیال رہے کہ جو لفظ ابھی انھوں نے لکھے نہیں ہیں اُن کے لہو میں گردش کر رہے ہیں۔ اور یہ لفظ ابھی پیارے صاحب کو لکھنے ہیں ——— : تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

میں جب "ریختہ" یا "زنجیرِ ہمسائیگی" پڑھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک ایسے شخص کے ساتھ نادیدہ قریوں سے گذر رہا ہوں اور نئے راستوں پر سفر کر رہا ہوں جو اِن سے پہلے بھی گذر چکا ہے اور جیسے اُس کے لئے یہ قریے، یہ راستے مانوس ہونے کے باوجود بھی نئے نئے ہیں، اُس رہ گذر کی طرح جو بقول فراق نئی نئی سی ہے حالانکہ

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے

سو میں عجیب اور نئے پن کی خوبصورتی کے حامل ان قریوں سے گذرتا ہوں لیکن مرزا رسا چغتائی کی ہمسفری کا کرشمہ یہ ہے کہ مجھے کبھی اِس

نئے پن کے پس منظر سے ایک مانوس منظر جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہی رسا چغتائی کی غزل کا نمایاں ترین پہلو ہے کہ وہ ہمیں زندگی کے بے کنار صحرا میں کسی حدی خواں کے دل گداز، شیریں، نرم اور پُرکشش آہنگ کا گرفتار بنا کے آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اُن کی شاعری کے MAGIC CASEMENT سے زندگی کی پُراسراریت کا نظارہ کر سکیں۔

میں رسا چغتائی کی شاعری کو پسند کرتا ہوں اور میں نے اُن کی غزل سے کچھ سیکھا بھی ہے۔ ممکن ہے یہ بات پیارے صاحب سے کسی اور جونیئر یا سینئر شاعر نے بھی کہی ہو۔ ہو سکتا ہے کسی نے تنہائی میں یہ اعتراف کیا ہو اور پھر اپنے الفاظ کو DISOWN کر دیا ہو، جیسی کہ رسم اِن دنوں چلی ہے۔ مگر میں تنہائی میں محض رسا چغتائی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ میں تو آپ کے سامنے عرض کر رہا ہوں کہ میں نے مرزا رسا چغتائی کی غزل سے سیکھا بھی ہے۔ سو پیارے صاحب مطمئن رہیئے کہ آپ کے جواں سال اور جونیئر ہم عصر آپ کا احترام کرنے اور آپ سے محبت کرنے میں مستقل مزاج ہیں اور ہر مصلحت سے بے نیاز بھی!

تو صاحبو، مادھو پور سے لفظ و بیان کا ایک جادوگر آیا اور شعر و سخن کی بستی میں اپنی سادگی، انسان دوستی اور خوش کلامی کی بدولت چاہا اور سراہا جانے لگا۔ رسا چغتائی کی شخصیت اور مزاج کا اُن کی شاعری پر گہرا اثر ہے۔ لفظیات اور لہجے دونوں سے یہ اثر جھلکتا ہے۔ اُن کی غزل اُن کے مزاج کی طرح سادگی کا نمونہ ہے۔ اُن کے لہجے میں بلند آہنگی، تلخی یا احتجاج نہیں ہے۔ اس کا سبب بھی یہی ہے کہ رسا چغتائی کے مزاج اور رویّے سے ان چیزوں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ رسا چغتائی مصلحت پرست ہیں نہ ایسے چالاک کہ فیشن یا ضرورت کے طور پر احتجاجی انداز اور تلخ لہجہ اختیار کر لیں۔ اُن کے زمانۂ شعر گوئی میں سے گزشتہ بیس بائیس ایسے گزرے ہیں جب بعض شعراء نے ملک کے سیاسی اور سماجی حالات پر احتجاج آمیز ردِ عمل ظاہر کیا۔ اور اس کے نتیجے میں انھیں فوری اور ملک گیر شہرت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن خیال رہے کہ اس قسم کے احتجاجی ادب کی مقبولیت فضا بدلتے ہی اور احتجاج کا سبب باقی نہ رہنے کے ساتھ ہی کم یا ختم ہو جاتی ہے۔ گویا وقتی صورتِ حال کے بجائے زندگی کی عمومی اور اَبدی صداقتوں کا شعور اور اُن کی عکاسی فن کو زندگی عطا کرتی ہے۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُن حالات میں بھی رسا چغتائی نے توازن اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور آج بھی اُن کے مزاج اور لہجے کا دھیماپن اور نگاہ کی صداقت شناسی برقرار ہے۔ انھوں نے ہمیشہ سیلِ حالات کے وقتی اور سطحی خروش کو نظر انداز کر کے تہہ تک پہنچنا اور شائستہ سنجیدگی کے ساتھ ردِ عمل ظاہر کرنا پسند کیا ـــــ ایسا ردِ عمل جو زندگی کی صداقتوں کے عرفان اور انسان کے فطری محسوسات کی عکاسی کا حامل تھا۔ یہ فن میں اُن کا رویّہ ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی رویّہ رسا چغتائی نے اپنے تمام معاملات میں انسان، معاشرے اور زندگی کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ زندگی اب سوائی مادھو پور کی سنہری صبحوں، سانولی شاموں اور روپہلی چاندنی راتوں کا حسن فراموش کر چکی ہے۔ اب زندگی مشین کی تال اور پیسے کی جھنکار پر رقص کر رہی ہے۔ اُن کے گرد قدریں تیزی سے بدل رہی ہیں، ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ زندگی برق رفتاری سے رنگ بدل رہی ہے۔

آنکھ جھپکوں تو رُت بدل جائے کیسے اپنے مشاہدات لکھوں

رسا چغتائی بے خبر نہیں ہیں کہ آدمی اپنے انسانی اوصاف اور قدروں سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔ پیڑ زمین چھوڑ رہے ہیں، رشتے ناطے اپنی اہمیت، مفہوم اور وقعت سے محروم ہو چکے ہیں۔ خلوص اور وضعداری جیسی چیزیں دنیا سے اُٹھ گئیں۔ فرد کا فرد سے اور قبیلے والوں کا قبیلے سے واسطہ ہی اب کیا رہ گیا ہے؟ ایسے میں جب پیارے صاحب اپنے خاص دلگداز لہجے میں یوں کہیں تو کیا وہ ہم سب کی ترجمانی نہیں کر رہے؟

عجب میرا قبیلہ ہے کہ جس میں کوئی میرے قبیلے کا نہیں ہے

یا پھر :

کچھ خانماں برباد تو سائے میں کھڑے ہیں　　اس دور کے انسان سے یہ پیڑ بڑے ہیں

ن سایہ دار پیڑوں کو اس دور کے بے فیض انسان پر ترجیح دے کر رسا چغتائی اِس احساس کا اظہار کرتے ہیں کہ دراصل
سانوں میں انسانی اوصاف کے قحط نے ہی انھیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھیں اور اُن پیارے چہروں کو
ھونڈیں، آواز دیں جن سے خلوص، محبت، عزتِ نفس اور انسان دوستی کی روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔

نگاہیں ڈھونڈتی ہیں رفتگاں کو

لیکن ایک بات عرض کر دوں۔ کہیں یہ نہ سمجھیے گا کہ رسا چغتائی اِس دور کے انسان سے بیزار ہو چکے ہیں یا موجودہ دور
ی زندگی کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی قدرت سے محروم ہیں اور اسی لئے شاکی ہیں اور شاید ماضی پرست بھی! نہیں صاحب! وہ تو
ندگی اور انسانیت کے عاشقوں میں ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ عشق کرنے والا ناز اُٹھاتا ہے تو شکوہ بھی زبان پر لاتا ہے۔ رسا چغتائی
ر انسانی رویّے یا زندگی پر تنقید کرتے ہیں تو یہ اُن کا حق اور سماجی ذمہ داری ہے۔ یہ بے شک اُن کا حق ہے کہ زندگی اور معاشرے کو زیادہ
پرسکون، زیادہ خوبصورت اور زیادہ پُر وقار دیکھنے کی آرزو سے اپنی شاعری اور ہمارے دلوں کو روشن رکھیں ـــــ لیکن یہ اُن کی آرزو
ہے اُن کا اختیار نہیں ہے۔ بس یہی المیہ ہے جو اُن سے ایسے زندہ شعر لکھواتا ہے

تیرے آنے کا انتظار رہا　　عمر بھر موسم بہار رہا

ہجر کا عام ملال انگیز تجربہ نہیں ہے اور محض ایسے زخم کی کسک کا اظہار بھی نہیں ہے، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھرتا جاتا ہے۔
ور اپنی خلش کم کرتا جاتا ہے۔ اور ہاں مرزا رسا چغتائی کو کسی شخص کا انتظار بھی نہیں ہے۔ کیونکہ شخص کو تو وہ سوائی مادھوپور
ں چھوڑ آئے ہیں، دراصل ایک اور رسا چغتائی کو خود سے الگ کر کے اُن گلیوں میں بھٹکنے کو چھوڑ آئے جہاں ایک لڑکا اب بھی گھومتا رہتا ہے
ور جس البیلی بستی کے ایک مکان میں اب بھی پیارے صاحب کی تصویر ہے :

میری تصویر جس مکان میں ہے

نہیں صاحب! اُن کو تو ایک ایسی سنہری صبح کا انتظار ہے جو اُن کے خوابوں کی تعبیر بن کر آئے اور نوعِ انسان کے لئے سلامتی، خیر،
حبت اور توقیر کے تحفے لائے۔ اسی انتظار کی بدولت پیارے صاحب کے شب و روز بہارِ شمائل ہو گئے۔ ذرا سوچئے تو کہ ہم میں سے
کتنے لوگ ہیں جن کو اس انتظار کی بھی توفیق ہے؟ سزا کی طرح گزرنے والی زندگی کو موسمِ گل محسوس کرنا تو بہت بعد کا مرحلہ ہے مگر دیکھیے
ن منچلے زادے نے کیا عجب کرامت کی کہ ایک عمر انتظارِ بہار کی نذر کر دی اور آنے والوں کو بتا دیا کہ محبت کو بوریا بستر بنا کر عرضِ ہنر
ں کیسے عمر بِتائی جاتی ہے۔ خدا مرزا رسا اور اُن کی دل آویز غزل کو سلامت رکھے اور خوش رکھے کہ یہ دونوں ہمارے عہد کے شاعروں
ور شاعری کا وقار ہیں، اعتبار ہیں۔

رسا چغتائی

کہاں جاتے ہیں آگے شہرِ جاں سے
یہ بل کھاتے ہوئے رستے یہاں سے

انھیں بنتے بگڑتے دائروں میں
وہ چہرہ کھو گیا ہے درمیاں سے

زمیں اپنی کہانی کہہ رہی ہے
الگ اندیشۂ سود و زیاں سے

اُٹھا لایا ہوں سارے خواب اپنے
تری یادوں کے بوسیدہ مکاں سے

سمندر پار خوابوں کے جزیرے
یہ ساحل پر پرندے نیم جاں سے

یہ شیشے کی طرح ٹوٹے ہوئے لوگ
یہ سر پر پتھروں کے سائباں سے

میں اپنے گھر کی چھت پر سو رہا ہوں
کہ باتیں کر رہا ہوں آسماں سے

وہاں اب خواب گاہیں بن گئی ہیں
اُٹھے تھے آبدیدہ ہم جہاں سے

وہ اِن آنکھوں کی محرابوں میں ہر شب
ستارے ٹانک جاتا ہے کہاں سے

نئے ملبوس میں پیڑوں کے سائے
ابھی نکلے ہیں ایوانِ خزاں سے

رسا اُس آئینۂ روز و شب میں
دمکتے ہیں کنول فانوسِ جاں سے

(نئی غزل)

رسا چغتائی

عمر گزری رہگزر کے آس پاس
رقص کرتے اس نظر کے آس پاس

زلف کھلتی ہے تو اٹھتا ہے دھواں
آبشارِ چشمِ تر کے آس پاس

ایک صورت آشنا سائے کی دھوپ
پڑ رہی ہے بام و در کے آس پاس

کوندتی ہیں بجلیاں برسات میں
طائرِ بے بال و پر کے آس پاس

رات بھر آوارہ پتے اور ہوا
رقص کرتے ہیں شجر کے آس پاس

چھوڑ آیا ہوں متاعِ جاں کہیں
غالباً اس رہگزر کے آس پاس

بال بکھرائے یہ بوڑھی چاندنی
ڈھونڈتی ہے کیا کھنڈر کے آس پاس

اس گلی میں ایک لڑکا آج بھی
گھومتا رہتا ہے گھر کے آس پاس

کیسے پُر اسرار چہرے تھے رسا
خواب گاہِ شیشہ گر کے آس پاس

تیر جیسے کمان کے آگے
موت کڑیل جوان کے آگے

چلتے چلتے زمین رک سی گئی
ناگہاں اک مکان کے آگے

ہم بھی اپنا مجسمہ رکھ آئے
رات اندھی چٹان کے آگے

ناگ کو ڈس لیا سپیرن نے
غیض میں اپنی آن کے آگے

بادشاہ اور فقیر دونوں تھے
شہر میں اک دکان کے آگے

طشتِ جاں میں سجا کے رکھنا تھا
حرفِ دل مہمان کے آگے

کون کہتا رسا خدا لگتی
ایسے کافر گمان کے آگے

(دو غزلیں)

رسا چغتائی

رُخ گھٹا کا ہے سمندر کی طرف
اور نظر سب کی مرے گھر کی طرف

چُن رہے تھے لوگ خالی سیپیاں
دیکھتے کیا دیدۂ تر کی طرف

ایک لڑکا باغ کی دیوار پر
ایک بوڑھا ہاتھ پتّھر کی طرف

دو کبوتر رات کے ایوان میں
دو ستارے ایک بستر کی طرف

رقص میں ہے آج طاؤسِ خیال
بڑھ رہا ہے عکس ساغر کی طرف

منتقل ہر دانۂ گندم ہوا
کھیت سے اپنے مقدّر کی طرف

دیکھتے ہیں لوگ کس موسم کے خواب
آئینے رکھ کر سمندر کی طرف

کھینچ رکھا ہے اُسی دیوار نے
دائرہ اک اور باہر کی طرف

ہم نے بھی آباد کنجِ دل کیا
راہ میں سرو و صنوبر کی طرف

اُن لبوں کو لکھ دیا ہوگا گلاب
دھیان ہوگا مصرعۂ تر کی طرف

ایک لمحے کا سفر ہے زندگی
اپنے پس منظر سے منظر کی طرف

ہم نے کس شہرِ سخن آباد میں
گھر بنایا میرؔ کے گھر کی طرف

مہرباں ہو فن کی دیوی تو رسا
چل کے آتی ہے سخنور کی طرف

(انتخاب)

رسا چغتائی

محبّت خبط ہے یا وسوسہ ہے
مگر یہ واقعہ اپنی جگہ ہے

جسے ہم واہمہ سمجھے ہوئے ہیں
وہ سایہ بھی تری دیوار کا ہے

ہوا نے تاک رکھّا ہے شجر کو
پرندہ شاخ پر بیٹھا ہوا ہے

مکاں سرگوشیوں سے گونجتے ہیں
اندھیرا روزنوں سے جھانکتا ہے

در و دیوار چُپ سادھے ہوئے ہیں
فقط اِک عالمِ ہُو بولتا ہے

مری آنکھوں پہ عینک دوسری ہے
کہ یہ تصویر کا رُخ دُوسرا ہے

سُنا ہے ڈوبنے والے نے پہلے
کسی کا نام ساحل پر لکھا ہے

گزر کس کا ہوا ہے جو ابھی تک
وہ عالم آئینہ بردار سا ہے

یہ دُنیا مِٹ گئی ہوتی کبھی کی
مگر اِک نام ایسا آ گیا ہے

اُس کو تشویش داستاں میں تھی
اور لُکنت مری زباں میں تھی
ایک لپکا سا دھڑکنوں میں تھا
ایک وحشت سی جسم و جاں میں تھی
ایک کوندا سا آنسوؤں میں تھا
ایک کھڑکی سی آسماں میں تھی
اُس کے شوکیس میں کھلونے تھے
نیند پلکوں کے سائباں میں تھی
پینگیں لیتا ہوا بدن اُس کا
اور دیوار درمیاں میں تھی
میں ہلاکِ خدنگِ قامت تھا
اک توسِ قزح کماں میں تھی
سانپ لپٹے ہوئے تھے شاخوں سے
اک عجب لہر گلستاں میں تھی
ایک بستی سوائے ماد ھو پور
حلقہ ہائے پری وشاں میں تھی
چاند کے ہاتھ میں کٹورا تھا
چاندنی دستِ خاکداں میں تھی
میں ابھی تک اُسی مکاں میں ہوں
میری تصویر جس مکاں میں تھی
اور اب اِک خلیج حائل ہے
پہلے دیوار درمیاں میں تھی

رسا چغتائی

سر اُٹھاتا ہے چراغِ دل تو جل جاتی ہے شام
کھینچتا ہوں دامنِ دل تو نکل جاتی ہے شام

غازۂ رُخسار کی صورت مہک اُٹھتی ہے دھوپ
دیکھ کر کنجِ لبِ جاناں مچل جاتی ہے شام

روز در آتا ہے کوئی روزنِ دیوار سے
یا مرے کمرے کی تصویریں بدل جاتی ہے شام

ایک سایہ سا اُبھرتا ہے فضا میں اور پھر
شہر کی آوارہ سڑکوں پر نکل جاتی ہے شام

آسرے پر شام کے مرتا ہے دن بھر آدمی
اور سنبھلنے بھی نہیں پاتا کہ ڈھل جاتی ہے شام

ڈھیر کر جاتی ہے مجھ کو اور پھر اُس ڈھیر میں
رکھ کے کچھ چنگاریاں آگے نکل جاتی ہے شام

یہ سنہرے کھیت دریا، شہر، جنگل، وادیاں
ایک پل میں سینکڑوں منظر بدل جاتی ہے شام

راکھ ہو جاتا ہے سورج آپ اپنی آگ میں
اور چوبِ خشک کی مانند جل جاتی ہے شام

تتلیوں کے پیچھے پیچھے جیسے بچّے کا خیال
دُور بستی سے کسی جانب نکل جاتی ہے شام

شہر کراچی یاد ہے تجھ کو تیرے شب بیداروں میں
مرزا رسا چغتائی بھی تھا یار رہا ما یاروں میں

اِن گلیوں اِن بازاروں کی نوکِ پلک کے متوالے
کیسے کیسے لوگ تھے جن کے نام چھپے اخباروں میں

کس پہ کتابِ دل اُتری اور کس نے اسمِ عشق پڑھا
کس نے یہاں بسرام کیا اِن حرف و صوت کے غاروں میں

نوکِ سناں کی صورت دیکھے رات کو ہنستے تارے بھی
رات کو ہنستے چاند بھی دیکھا تیرے پہرے داروں میں

اِس بستی کے پس منظر میں دُور تلک دیواریں ہیں
اور کسی نے چُن رکھے ہیں چہرے اِن دیواروں میں

اور طنابِ خیمۂ شب کو کھینچ کے باندھو لفظوں سے
اور گھٹن کو موسم لکھو شاہوں کے درباروں میں

رسا چغتائی

کچھ نہ کچھ سوچتے رہا کیجے
آسماں دیکھتے رہا کیجے

چار دیواریِ عناصر میں
کودتے پھاندتے رہا کیجے

اس تحیّر کے قید خانے میں
اُنگلیاں کاٹتے رہا کیجے

کھڑکیاں بے سبب نہیں ہوتیں
تاکتے جھانکتے رہا کیجے

راستے خواب بھی دکھاتے ہیں
نیند میں جاگتے رہا کیجے

فصل ایسی نہیں جوانی کی
دیکھتے بھالتے رہا کیجے

آئینے بے جہت نہیں ہوتے
عکس پہچانتے رہا کیجے

زندگی اس طرح نہیں کٹتی
وقت اندازتے رہا کیجے

کچھ نہیں اور تو ستاروں کی
چال ہی بھانپتے رہا کیجے

گھر میں بیٹھے ہوئے لکیریں سی
فرش پر کھینچتے رہا کیجے

ناسپاسانِ علم کے سر پر
پگڑیاں باندھتے رہا کیجے

روز آ کر گلے سے لگتے ہیں
خواب پھر بھی نئے سے لگتے ہیں

زندگی فلسفہ سا لگتی ہے
آپ جب سوچنے سے لگتے ہیں

چال اپنی جگہ ستاروں کے
دیکھنے میں بھلے سے لگتے ہیں

شہر سایہ زدہ سا لگتا ہے
راستے اژدھے سے لگتے ہیں

سوچیے تو خیال کے اطراف
آئینے گھومنے سے لگتے ہیں

اِک طرف کائنات کے اسرار
ہاتھ باندھے ہوئے سے لگتے ہیں

وقت آموختہ سا لگتا ہے
اور ہم بھولنے سے لگتے ہیں

اور اب اس غزل سرائی میں
روز و شب قافیے سے لگتے ہیں

اُن ستارہ نژاد آنکھوں میں
اپنے ہی رتجگے سے لگتے ہیں

اِن دنوں شہرِ جاں میں آئے ہوئے
یاد کے طائفے سے لگتے ہیں

شعر ہم نے سُنے رساؔ تیرے
واقعی آن کہے سے لگتے ہیں

رسا چغتائی

اپنی بے چہرگی میں پتھر تھا
آئینہ بخت میں سکندر تھا

رات بے جادۂ ستارہ تھی
چاند بے حجلۂ پیمبر تھا

سرگزشتِ ہوا میں لکھا ہے
آسماں ریت کا سمندر تھا

کس کی تصنیف ہے کتابِ دل
کون تالیف پر مقرر تھا

کچھ تو واضح نہ تھی تری صورت
اور کچھ آئینہ مکدر تھا

وہ نظر خضرِ راہِ مقتل تھی
اُس سے آگے مرا مقدر تھا

رات آغوشِ دیدۂ تر میں
عکسِ آغوشِ دیدۂ تر تھا

یہ قدم اُس گلی کے لگتے ہیں
جس گلی میں کبھی مرا گھر تھا

رنگ اُس کے ہیں جو چُرا لے جائے
نیند اُس کی ہے جو اُڑا لے جائے

زُلف اُس کی ہے جو اُسے چھُو لے
بات اُس کی ہے جو بنا لے جائے

تیغ اُس کی ہے شاخِ گُل اُس کی
جو اُسے کھینچتا ہوا لے جائے

اُس سے کہنا کہ کیا نہیں اُس پاس
پھر بھی دُرویش کی دُعا لے جائے

خواب ایسا کہ دیکھتے رہیے
یاد ایسی کہ حافظہ لے جائے

زخم ہو تو کوئی دکھا آئے
تیر ہو تو کوئی اُٹھا لے جائے

قرض ہو تو کوئی ادا کر دے
ہاتھ ہو تو کوئی چھُڑا لے جائے

لَو دیئے کی نگاہ میں رکھنا
جانے کس سمت راستہ لے جائے

خاک ہونا ہی جب مقدر ہے
اب جہاں چشمِ سرمہ سا لے جائے

رسا چغتائی

چاندنی رات اور لب دریا
ڈھونڈتا ہے مجھے مرا سایہ
اس نے رکھا ہمیں شب آوارہ
ہم نے مصروف چاند کو رکھا
سوچتا ہوں کھڑا ہوا چھت پر
چاند کس زاویے سے نکلے گا
گاہے گاہے دریچۂ گل سے
تاکنے جھانکنے لگی ہے صبا
اس کو دیکھا ہے بارہا لیکن
آج دیکھا ہے خواب اَن دیکھا
اس خرابے کی سمت آتے ہوئے
کس کو دیکھا ہے راستے کے سوا
میرے قصے سُنایا کرتا ہے
میرے بچوّں کو پیڑ کا سایہ
آخرِ شب ہے اور ایسے میں
میرے لب پر کوئی دعا نہ گلہ
یا کبھی حادثاتِ بے معنی
یا کبھی بات بات پر گریہ
خاک اُڑنے لگی ہے آنکھوں میں
نیند کرنے لگا ہے سناّٹا

لوگ مصروف ہو گئے کتنے
شہر ویران ہو گیا کیسا
دینے والے رفاقتوں کی بھیک
مانگتے ہیں رفاقتوں کا صلہ
چھپ کے بیٹھا ہوں قرضخواہوں سے
کر رہا ہوں حساب دنیا کا
پیش اس کے چلی نہ عیاّری
رہ گیا شجرۂ نسب رکھا
جوئے آبِ رواں تری یا نہیں
تیری انگڑائی موڑ دریا کا
بیچ لگنے لگی دکانِ دل
کیسا گاہک دکان میں آیا
کس قدر خود فریب ہوں میں بھی
کس قدر دل فریب ہے دنیا
ایک چہرے کے ہیں یہ سب چہرے
اور کسی سے کوئی نہیں ملتا
دیکھتا ہے گلوب کے اطراف
پاؤں رکھ کر گلوب پر بچہّ

سیپ شمارہ ۴۵ کی تحریریں

افسانے، ۱۴

• رضیہ فصیح احمد • کلام حیدری • میرزا ریاض • جوگندر پال • رحمٰن شاہ عزیز • رشید امجد
• مشرف احمد • احمد جاوید • سلطان جمیل نسیم • مرزا حامد بیگ • فردوس حیدر • قدسیہ انصاری
• علی امام نقوی • رفعت کیانی

شخصیت، ۱

• جوشؔ، کچھ یادیں کچھ باتیں ـــ سید مقصود زاہدی

مضامین، ۶

• قمر جمیل • فتح محمد ملک • محب عارفی • مستنصر حسین تارڑ • نجیب جمال • جمیل اختر

غزلیں، ۱۱۱

• فراق گورکھپوری • رئیس فروغ • شان الحق حقی • شمس زبیری • فارغ بخاری • احمد ہمدانی
• صبا اکبر آبادی • انجم اعظمی • جمیل ملک • محسن احسان • شاہد عشقی • نکہت بریلوی
• ثمر نظامی • ساقی امروہوی • رفعت سلطان • افسر ماہ پوری • جمیل عظیم آبادی • جعفر شیرازی
• ندا فاضلی • شبنم مناروی • مظہر امام • انور حسین صدیقی • کیف انصاری • ع س سلام
• رام ریاض • احمد رئیس • سلیم کوثر • صابر وسیم • شاہدہ تبسم • شوکت ہاشمی
• خواجہ رضی حیدر • گلزار بخاری • تاجدار عادل • محمد فیروز شاہ • سیما احمد • لطیف ساحل
• احمد شریف • جان کاشمیری • ن۔م۔ دانش • عنبر زیدی • صفدر صدیق رضی • رفعت ظفر
• اختر ہوشیارپوری • رفعت القاسمی • جمال احسانی

نظمیں، ۶۴

• فارغ بخاری • زہرا نگاہ • احمد ظفر • انجم اعظمی • شاہد عشقی • سرشار صدیقی
• قمر جمیل • افسر ماہ پوری • ادیب سہیل • اطہر قادری • حسن اکبر کمال • پروین شاکر
• شاہین • انور زاہدی • جمیل عظیم آبادی • شاہدہ تبسم • احسن سلیم • ماہ طلعت زاہدی
• نجم الحسن عطا • احمد فاخر • ن۔م۔ دانش • شاہین ملک • شفیق احمد شفیق • رضیہ انوار رضی

تبصرے، ۵۵

• حسن اکبر کمال • مشرف احمد • اشتیاق طالب • صابر وسیم • علی حیدر ملک • نسیم نیشو فوز

آثم میرزا

سہتی مراد

مراد کے ہاتھ میں بڑھیا قسم کے سگار کا ڈبہ اور وہسکی کی چمکدار لیبل والی بوتل دیکھ کر مسٹر بی۔ ایم کیڈو والہانہ انداز میں اس سے بغلگیر ہو گیا تھا۔ شاہسوار نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے مبارک باد دی۔ اور اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ "مسٹر مراد! ایک ہفتہ ہوا یورپ کی سیاحت سے واپس آئے ہیں ہر محفل میں آپ کا ذکر سن کر یہ آپ سے ملنے کے لئے بے قرار ہو گئے تھے۔" مسٹر کیڈو نے متبسم لہجہ میں کہا "میرے نصیب۔ میں اس نوجوان کی آمد اپنے لئے باعث مسرت سمجھتا ہوں۔"

وہ تینوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ مسٹر کیڈو نے ملازم کو کولڈ ڈرنک لانے کو کہا۔ اور شاہسوار کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھ کر بولا "تم۔ بڑے کام کے آدمی ثابت ہوتے ہو۔ ایک دن تم اس خدمت کا بہترین صلہ پاؤ گے۔" وہ لائٹر سے سگار سلگانے لگا۔ مراد نے عقیدت مندانہ لہجہ میں کہا: "یوں تو زندگی میں بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑا ہے۔ لیکن آپ کی شخصیت میں جو کشش محسوس کی ہے۔ وہ اور کہیں پر حاصل نہ ہو سکی۔" شاہسوار نے لقمہ دیا۔ "واقعی! ۔ میں ان کی تائید کرتا ہوں بعض لوگوں کے ساتھ برسوں رہنے کے باوجود ہم اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ اور بعض دفعہ کسی کو دیکھ کر پہلی ہی ملاقات میں یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہمارا صدیوں سے ساتھ چلا آ رہا ہو۔"

"بے شک!" مراد نے ہونٹوں کے تبسم کو چہرے پر مسکراہٹ بناتے ہوئے کہا۔ "میں بھی یہی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ انکل کیڈو۔ اس نام میں کسی انفرادیت ہے۔ کتنا وقار ہے۔ کیسی اپنائیت ہے۔" مسٹر کیڈو سگار کا دھواں چھوڑ کر بولا۔ "تمہاری باتوں میں معقولیت ہے۔ تمہاری قدر شناسی کی داد دیتا ہوں۔ اب کیا پروگرام ہے" شاہسوار نے ملازم کو قریب آتے دیکھ کر کہا۔ "انکل۔ اس کولڈ ڈرنک سے پیاس نہ بجھے گی۔ مسٹر مراد کا یہاں چند دن کا قیام ہے۔ اور آپ کی ماہانہ دعوت کو تین دن باقی ہیں امید ہے انہیں بھی مدعو کیا جائے گا۔"

"کیوں نہیں۔ ایسے نوجوان تو پارٹی کی رونق کو دوبالا کرتے ہیں۔ میری طرف سے تم دونوں کو دعوت ہے۔ ضرور تشریف لائیں۔ ایسی پارٹی کو آپ کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ! اب اجازت دیں۔ ایک دو ضروری کام سرانجام دینے ہیں۔" دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسٹر کیڈو نے پھر تاکید کی۔ "پرسوں شام کو ضرور تشریف لائیں۔ میں خاص طور پر انتظار کروں گا۔"

کوٹھی سے باہر آ کر مراد نے حیرت زدہ لہجہ میں کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے مجھے نہ پہچانا ہو۔ وہ تو ہم دونوں ہی کا دشمن تھا۔ مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ یہ جو میری پیشانی پر دائیں طرف زخم کا نشان ہے۔ یہ تو اسی کی غلیل کی کارستانی ہے۔ اور۔ اب یوں تپاک سے ملا ہے۔ جیسے

سے پہلے اس نے کبھی مجھے دیکھا تک نہ ہو" شاہسوار نے قہقہہ لگایا۔ اور اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا "تم تو تر، بدھو ہو۔ آئینہ میں اپنا حلیہ دیکھا ہے نا۔ تم وہ نہیں ہو۔ جسے انکل ایک لمحہ کے لئے برداشت نہ کر سکتا تھا۔ تم نے بہترین سوٹ زیب تن کر رکھا ہے۔ تم نے سگار اور دہسکی کا تحفہ پیش کیا ہے۔ ایسے حالات میں اگر اس نے پہچان بھی لیا ہو۔ تو یہ ظاہر نہیں کر سکتا۔ اب معاملہ عشق کا نہیں بلکہ بزنس کا ہے۔ کیا سمجھے!"

"کچھ بھی نہیں۔ میں ڈرتا ہوں۔ کہ ہمارے خلاف پھر کوئی سازش نہ تیار کرے۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس فطرت کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ ماضی سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ تو ہر ماہ اپنے ہاں پارٹی کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ بھی اس کے بزنس ہی کا ایک حصہ ہے۔"

"پھر بھی احتیاط لازمی ہے۔"

"تم اس وہم کو دل سے نکال دو۔ تم نہیں جانتے۔ کہ پارٹی کے اخراجات دوسرے برداشت کرتے ہیں۔ اور شہوری اس کی ہو جاتی ہے۔ پارٹی میں شامل ہونے کی فیس پچاس روپے ہے۔ مہمانوں کی تعداد بیس سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔ کھانا سب کھا کر ہی آتے ہیں۔ آرکسٹرا کا کرایہ کتنا بنتا ہوگا۔ اور دو دلوں کو ملانے میں جو یہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا کمیشن یہ الگ وصول کر لیتا ہے۔ اس کے تو وارے نیارے ہیں۔"

"کاش! میں اس کے بزنس کے متعلق پہلے جان چکا ہوتا! اور آج جدائی کے کرب ناک لمحوں کی گرفت میں نہ آسکتا۔!"

"بہرحال اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ جذباتی بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"تم جانتے ہو۔ معاشی طور پر پوزیشن کمزور ہے۔ اگرچہ بہت بڑے زمیندار کا بیٹا ہوں۔ لیکن اپنے حصہ کی زمین کو بہت پہلے سے فروخت کر چکا ہوں۔"

اس کی فکر مت کرو۔ تمہارے ذاتی اخراجات کی ذمہ داری میں قبول کر چکا ہوں۔ اور ستارہ ڈرائی کلینر کا مالک شوکت وعدہ کر چکا ہے کہ لباس کے معاملہ میں وہ پورا تعاون کرے گا۔ باقی کیا رہ گیا ہے!"

"میں کس منہ سے تم لوگوں کا شکریہ ادا کروں تم میرے دوست بھی ہو اور گورو بھی۔ اگر بس چلے۔ تو کان چھدوا کر مندراں پہن کر اس کے در کے سامنے دھونی رما کر بیٹھ جاؤں۔ مگر۔ اس مشینی دور میں یہ سوانگ کچھ جچے گا نہیں"

"تم زیادہ غور و فکر مت کیا کرو۔ ورنہ سر پہ گنج پیدا ہو جائے گا۔ اور تم ہمارے بغیر اٹھ بیٹھ بھی نہ سکو گے۔ خیر جانے دو اس بحث کو۔ مٹی ڈالو۔ بھوک تو لگی ہوگی!"

"تم نے بھوک کا احساس دلا کر سوچ کا رخ موڑ دیا ہے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر مراد اپنے کمرہ میں آ کر لیٹ گیا۔ کئی رنگین ہیولے در و دیوار پر رقصاں ہو گئے تھے۔ کئی کھلے ہوئے پھول مرجھا گئے تھے اجارہ دار خود اپنے ہاتھوں۔ بڑی گھنی ٹہنیاں کاٹ رہے تھے۔ نین دن ختم ہونے ہی کو نہ آتے تھے۔ انتظار کے لمحے طویل بن گئے تھے۔ ان کی سوئیوں میں درد کی پرچھائیں لرز رہی تھی۔ شوکت نے ڈرائی کلینر کے لئے آئے ہوئے ایک بہترین سوٹ کا انتخاب کیا تھا۔ نقلی ہیروں کی دو انگوٹھیاں شاہسوار نے مہیا کر دی تھیں۔ مراد جب میک اپ کے بعد آئینہ کے سامنے کھڑا ہوا۔ تو اپنا سراپا اسے اجنبی لگا۔ اپنی ہی نظر لگ جانے کے احتمال سے اس نے نظریں جھکا لیں شاہسوار اسے یقین دلا رہا تھا کہ سب رئیس زادوں میں اس کی شخصیت انفرادیت کی حامل ہوگی۔ وہ حسنہ کو اپنا گرویدہ بنانے میں ضرور کامیابی حاصل کرے گا۔

مراد مسرت اور خوف کے ملے جلے اثرات کے ساتھ جب شاہسوار کے ہمراہ پارٹی میں شامل ہوا۔ تو وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے الف لیلیٰ ماحول میں آ گیا ہو۔ اس کے اردگرد رنگوں اور خوشبوؤں کے نشیلے دائرے ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہے تھے۔ مسٹر ب ایم کیڈو کے پرتپاک خیر مقدم نے مراد کی ہمت بندھا دی۔ اس کے نئے تحفے کی مسٹر کیڈو نے مسرورانہ انداز میں تعریف کی۔ اور اس کا تعارف دوسرے اراکین سے کرانے لگا۔ مراد کے اندر چھپا ہوا خوف۔ سنگ میل

بن کر منزلِ مراد کی نشان دہی کرنے لگا تھا۔ نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اس کی شریانوں کو گدگدا رہا تھا۔ حسنہ کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھ کر اس کے لہجہ کی شگفتگی میں اضافہ ہو گیا۔ چند لمحوں کا مصافحہ صدیوں کی تشنگی کا مداوا بن گیا تھا۔

شاہسوار نے مسٹر کیڈو کے کان میں سرگوشی کی "سر۔ حسنہ اور مراد کی پارٹنر شپ کیسی رہے گی؟"

"خوب!" مسٹر کیڈو کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔ حسنہ مسٹر کیڈو کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ مراد اور شاہسوار دوسرے صوفے پر بیٹھے تھے۔ مسٹر کیڈو نے دھیمے لہجہ میں حسنہ سے کہا "مسٹر مراد۔ مردانہ وجاہت کا خوبصورت ماڈل ہے۔ کئی ایک دوشیزاؤں نے اشاروں کنایوں میں اس کا پارٹنر بننے کی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ مگر۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ یہ تمہارا پارٹنر بنے۔"

"سچ!۔ مگر۔ آفتاب!"

"وہ ہرجائی آدمی ہے۔ تم جانتی ہو۔ وہ پہلے کتنی عورتوں کا دل توڑ چکا ہے۔"

"اب تو اس کی طبیعت میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہو چکا ہے۔"

"یہ تمہارے بھولپن کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اس کے کردار میں ابھی تک کوئی فرق نہیں پڑا" حسنہ عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ آرکسٹرا میٹھی دھن بجانے لگا۔ حسین جوڑے اپنی اپنی میزوں پر جھومتے ہوئے جذبات کی گرہیں ڈھیلی کرنے لگے۔ سازوں کی لے بلند ہوتے لگی۔ حسنہ کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ رقص کے دائرے پھیلنے لگے۔ آفتاب ابھی تک نہ آیا تھا۔ مسٹر کیڈو نے سرگوشی کی "حسنہ ڈارلنگ۔ اپنے انکل کی بات پر یقین کرو۔ آفتاب کو کوئی دوسرا شکار مل گیا ہوگا۔"

"شکار!"

"ہاں۔ وہ تم جیسی دوشیزاؤں کو شکار ہی سمجھتا ہے۔ اس طرف دیکھو۔ مسٹر مراد کیسی چاہت سے تم پر نظریں مرکوز کئے ہوئے ہے۔ اس کا دل مت توڑو۔"

آفتاب دوسرا راؤنڈ کے اختتام پر بھی نہ آیا تھا۔ آرکسٹرا نئی شوخ دھن بجانے لگا۔ مراد کی نظریں حسنہ کی نظروں سے متصادم ہوئیں۔ ستارے جھلملانے لگے۔ پھول مسکرانے لگے۔ دونوں ایک ساتھ اٹھے بازو میں بازو ڈالے وہ چکنے فلور پر آگئے۔ جذبات میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ رقص کے دائروں میں دیوانگی تھرتھرا رہی تھی۔ مراد اپنی کامیابی پر خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔ اپنے بہت قریب سے حسنہ کا جائزہ لیا۔ وہ ایک معمولی خدوخال کی دوشیزہ تھی۔ میک اپ نے اس کے نقوش کو جاذبِ نظر بنا دیا تھا۔ اور کوئی ایسی بات نہ تھی۔ جو پیار میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کا موجب بن سکتی تھی۔ لیکن مراد پھر بھی خود کو بے انتہا خوش بخت پا رہا تھا۔ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے۔ سانس کو سانس میں الجھائے مراد مبالغہ آمیز الفاظ میں جب حسنہ کی تعریفوں کے انبار لگانے لگا۔ تو آفتاب کا تصور حسنہ کے ذہن سے اپنا آخری نقش بھی مٹا چکا تھا۔ ٹھہرے ہوئے لہجہ میں حسنہ کی ہر ادا کو مبالغہ کی زنجیروں میں جکڑتے ہوئے مراد محسوس کر رہا تھا کہ وہ منزلِ مراد کی فصیل کے سامنے پہنچ گیا ہے۔ اب صرف بڑا پھاٹک کھلنے کی دیر ہے۔ پھر وہ فاتحانہ انداز میں اندر داخل ہوگا۔ اور اس کے سر پر تاج رکھ دیا جائے گا۔

جب تیسرا راؤنڈ ختم ہوا۔ تو وہ دونوں الگ میز پر آگئے۔ مسٹر کیڈو اپنی فنی مہارت پہ نازاں ہو رہا تھا۔ اور شاہسوار آنے والے لمحوں کے تصور سے جھوم سا رہا تھا۔ رخصت ہوتے وقت حسنہ نے وعدہ لیا۔ کہ مراد اس سے ملتا رہے گا۔ وہ اس کے لہجہ کی شیرینی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اپنی تعریفوں کے انبار میں سے جھانکتے ہوئے مراد نے پہلے تو بہانہ بنایا۔ کہ چند دنوں کے قیام میں مصروفیت بے حد ہے۔ شاید وقت نہ مل سکے۔ مگر جب حسنہ نے بہت مجبور کیا۔ تو اس نے وعدہ کر لیا۔ تیر نشانے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس معاملے میں شوکت بھی بے حد سمجھدار ثابت ہوا تھا۔ [illegible] شاہسوار [illegible] [illegible] سے [illegible] شوق سے شروع کر دیا تھا۔ [illegible] کر لیا تھا۔ کہ وہ صرف حسنہ کی خوشنودی کی خاطر اخراجات سے ہاتھ کھینچے رہا ہے۔ ورنہ وہ کبھی گوارا نہیں کرتا۔ کہ اپنے محبوب پہ بوجھ ثابت ہو۔ روز نئے پروگرام بنتے۔ مراد مختلف رسائل کا مطالعہ کر کے نئے نئے حسین فقرے حفظ کرتا۔ حسنہ کی تعریف میں بعض شوکت الفاظ کا

جام و مینا اپنی وقعت کھو بیٹھتے تھے۔ تفریح گاہوں - دونوں بازوؤں میں بازو ڈالے پیار کو ارتقائی راستوں سے روشناس کرانے لگتے۔ سیرگاہوں میں ایک دوسرے کے قریب تر ہو کر۔ یوں راز و نیاز میں محو ہو جاتے جیسے اس زمین پر یہی دو جاندار باقی بچے ہوں - مراد آہستہ آہستہ اس کے گھریلو حالات سے واقف ہو رہا تھا۔ اسس امارت کے نشیب و فراز میں جھانک رہا تھا - ایک ہفتہ کے بعد اس نے حسنہ پر اتنا قابو حاصل کر لیا تھا۔ کہ وہ اس کی کوئی بات رد نہ کر سکتی تھی - وہ جان چکا تھا کہ اس کا بڑا بھائی افضال انتہائی تنگ دل اور خالص کاروباری آدمی ہے۔ اس پر دولت میں اضافہ کرنے کا خبط سوار رہتا ہے - پیار اور خلوص اسکے نزدیک بے معنی الفاظ ہیں۔ اس کی بیوی نازنین بے حد حسین اور نازک اندام عورت ہوتے کے باوجود بھی افضال کے دل میں پیار کی قندیل روشن کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی - یہ شادی بھی کاروباری نوعیت کی حامل تھی۔ افضال جب کسی پارٹی میں شامل ہوتا۔ اور وہاں اپنے جیسے کاروباری آدمیوں میں کوشش کرتا کہ اس کی بیوی ان سب سے حسین ترین ہو۔ اور ہر کوئی اس کے گرد دیوانہ وار رقص کرنے لگے۔ لیکن جو اس کے علاوہ اور کسی کو لفٹ نہ دے - اسکے مقصد کے لئے اس نے اپنے کئی کارندوں کو تلاش پر لگا دیا تھا۔ آخر کار - نازنین اسکے معیار پر پوری اتری - نازنین کو یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ لیکن یہ رشتہ اس کے ماں باپ کے وقار میں ہزار گنا اضافہ کا سبب بن گیا تھا - نازنین بہت تڑپی - پھڑپھڑائی - منت سماجت سے کام لیا۔ مگر اس کی کوئی پیش نہ چلی - اور اسے بیگم افضال بننے سے کوئی نہ بچا سکا - مسٹر وکیڈ و اس رشتہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پیش پیش تھا۔ سیٹھ افضال سے نازنین کا تعارف بھی اسی نے کرایا تھا۔ اس وقت نازنین کو وہم تک نہ ہو سکا تھا کہ اس کے خلاف سازش تیار کی جا رہی ہے - بیگم افضال بن کر قید قید تنہائی کے دن گزار رہی تھی - مسٹر کیڈو سے اسے سخت نفرت تھی۔ افضال نے کڑی پابندی عائد کر رکھی تھی - اس کا حکم تھا۔ کہ نازنین اکیلی کوٹھی سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی - کوئی اس سے ملاقات نہیں کر سکتا۔ حسنہ کے دوست بھی کوٹھی میں داخل نہیں ہو سکتے - وہ کوٹھی پر کسی پارٹی کا اہتمام بھی نہیں کر سکتی - حسنہ کاروبار میں اپنے بھائی کی برابر کی شریک تھی۔ لسے اپنے مشاغل جاری رکھنے کی پوری آزادی تھی - لیکن افضال کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی اس نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ نازنین سے بھی رسمی طور پر ملاقات ہوتی تھی - اس کے حالات پر توجہ دینے کی اس کے پاس فرصت ہی نہ تھی - اور نازنین بے بسی اور بے کسی کے عالم میں سوائے سسکیاں بھرنے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی -

ایک نشیلی رات کو رقص گاہ میں آرکسٹرا کی دھن پر قدم اٹھاتے ہوئے مراد نے سرگوشی کی - " ڈارلنگ! میری بات پر خفا مت ہونا۔ فرض کرو - نازنین کی جگہ تم ہوتیں - اور زبردستی تمہیں مجھ سے جدا کر کے پنجرے میں بند کر دیا جاتا تو اس وقت تمہاری کیا حالت ہوتی!"

"آں - ں - ں -" حسنہ نشہ کی گہرائی سے ابھر کر سطح پر آ گئی تھی - "یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی ہے؟"

"میں - آج ایک ایسے آدمی سے ملا ہوں - جو خود کو نازنین کے بغیر ادھورا سمجھتا ہے - نازنین - جس کی زندگی کا حسن ہے - اس کے بغیر وہ یوں دن گزار رہا ہے - جیسے سولی پر لٹکا ہو -"

"سچ!"

"ڈارلنگ! جس طرح تم میری زندگی کی بہار ہو - میرے سانسوں کا توازن ہو - میری دھڑکنوں کا تسلسل ہو - میرے پیار کی بلندی ہو - اسی طرح نازنین بھی کسی کی آرزوؤں کا مرکز ہے - کاش! اس پر یہ ظلم نہ ہوتا"

"تم نے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے - میں نے کبھی اسے اس زاویہ سے دیکھا تک نہیں - میں تو سمجھتی تھی - کہ وہ دنیا کی ایک نہایت خوش نصیب عورت ہے"

"کاش! تم نے اس کے اندر جھانک کر دیکھا ہوتا!"

رقص کا دور ختم ہوا - تو وہ اپنی میز پر آنے کی بجائے باہر لان میں آ گئے - وہ یوں قدم اٹھا رہے تھے - جیسے غمناک گیت کے بول ان کی روحوں کے نوحے بنا رہے ہوں - چاندنی کی اجلی چادر پر ان کے سائے بکھر رہے تھے - ایک تنہا گوشے میں بیٹھ کر مراد نے گہرا ٹوٹا ہوا سانس بھرا - "زندگی میں آج مجھے اتنا اداس ہوا ہوں"

"میں نے بھی درد کی کرچیوں کو اپنے اندر تڑپتے ہوئے محسوس کیا ہے"۔

"آج غیر ارادی طور پر ہی میں لنچ کے بعد دوپہر فیسٹیول ہال میں پہنچ گیا تھا۔ تم جانتی ہو۔ ہماری ادبی سوسائٹی کے تفریحی پروگرام وہیں پر ہوتے ہیں۔ آج وہاں "ہماری ثقافت" کے موضوع پر سِس کاؤنٹ والا کا دوسرا لیکچر تھا۔ مجھے ایسے کسی پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مگر اپنے ایک دوست کے مجبور کرنے پر مجھے وہاں ٹھہرنا پڑا۔"

"مجھے بھی دعوت نامہ ملا تھا۔ مگر میں وقت ضائع نہ کرنا چاہتی تھی"۔

"لیکچر بڑا دلچسپ تھا۔ خاص طور پر ہیر رانجھا کی کہانی میں سہتی کا کردار بڑا جاندار تھا۔ یقین کرو میری آنکھوں میں تمہارا سراپا گھومتا رہا تھا"۔

"واقعی! ۔ سہتی کا کیا مطلب ہے؟"

"سہتی ہیر کی نند کا نام ہے۔ بالکل یہی کہانی تمہارے ہاں دہرائی جارہی ہے"۔

"کیا مطلب! ہیر اور سہتی!! عجیب نام ہیں!!"

"ہاں میرے لئے بھی عجیب ہی تھے۔ مگر نازنین کے پرستار کی زبوں حالی کی وجہ سے اب یہ نام عجیب نہیں رہے۔ بلکہ ان میں گہری اپنائیت محسوس ہورہی ہے"۔

"ذرا تفصیل سے بات کرو۔ شاید اس کے مفہوم تک پہنچ سکوں"۔

"ہیر کی شادی زبردستی سہتی کے بھائی کیڑے سے کردی گئی تھی۔ اور ہیر کو دل و جان سے چاہنے والا رانجھا۔ در در کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ پھر اسے ایک پہنچا ہوا گورو مل گیا۔ اور رانجھا اس کا چیلا بن گیا۔ کیا میری بات سمجھ میں آرہی ہے"۔

"تم سناتے جاؤ کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے"۔

"رانجھا۔ ہیر کے سسرال میں آگیا گاؤں سے باہر ڈیرا جما لیا۔ حاجت مند آتے۔ اور مراد پاکر شادیانے بجاتے لوٹ جاتے۔ رانجھا خیرات مانگنے گاؤں میں آیا۔ تو سہتی سے سامنا ہوگیا۔ پہلے ترش روئی۔ تلخی پیدا ہوئی۔ پھر سمجھوتہ ہوگیا۔ سہتی جس مرد پر فریفتہ تھی اس کا نام مراد تھا"۔

"مراد! ۔ سچ!۔ یعنی ۔ مراد!! ۔"۔

"ہاں ۔ مراد ۔ اس لئے تو یہ کہانی۔ میری اور تمہاری کہانی ہے۔ تم اگرچہ حسنہ ہو۔ لیکن میں تمہیں اب سہتی کی جگہ پا رہا ہوں۔ اس نے اپنے کردار کی پختگی سے جو رفعت حاصل کی تھی۔ میں تمہیں بھی اسی مقام پر دیکھنے کا آرزومند ہوں"۔

"پھر کیا ہوا؟"

"ہیر کو بھی معلوم ہوگیا کہ رانجھا جوگی کے بھیس میں اس کے قریب آگیا ہے۔ سہتی سے اس کا تڑپنا دیکھا نہ گیا۔ اس نے رانجھے سے وعدہ لیا کہ وہ اسے مراد سے ملادے۔ تو وہ ہیر کو اس کے حوالے کردے گی"۔

"اچھا ۔! یہ تو واقعی ہی ہماری ہی کہانی ہے"۔

"ایک منصوبہ بنایا گیا۔ سہتی نے واویلا مچادیا کہ ہیر کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ اور اس کا علاج جوگی کے پاس ہے۔ جوگی کو بلایا گیا۔ ایک الگ کمرہ میں دو چاہنے والے اکائی بن گئے۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ پہرے پر سہتی موجود تھی۔ اس کا مراد جوگی کے ڈیرے پر اسے مل گیا تھا۔ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ گھر والوں کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ رانجھا اپنی ہیر کو لے کر ایک طرف روانہ ہوگیا۔ اور سہتی اپنے مراد کے سینے سے لگ گئی" مراد خاموش ہو کر اس کہانی کے اثرات حسنہ کے چہرے پر ابھرتے ہوئے دیکھنے لگا تھا۔ اس نے حسنہ کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر جذباتی لہجہ میں کہا" یہ کہانی ہر دور میں دہرائی جاتی ہے۔ نام بدل جاتے ہیں۔ لیکن کردار وہی رہتے ہیں۔ خاص طور پر سہتی کا کردار ہمیشہ نمایاں ہوتا ہے"۔

حسنہ نے آنکھیں بند کرکے کمر کرسی کی پشت پر ٹکادی۔ وہ تھکے تھکے سانس لے رہی تھی۔ مراد نے کرسی اس کے اور قریب کھسکائی اور اس پر جھک کر رندھے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔ "کیا تم ۔ دو چاہنے والوں کے ملاپ کی خاطر سہتی کا کردار ادا نہ کروگی؟ ۔ کیا میرے پیار کو انمول بنانے

خاطر اپنے ظالم بھائی کے مقابلے پر نہ آؤ گی؟"

حسنہ کی سانسوں میں انتشار پیدا ہو رہا تھا۔ آنکھیں نیم وا کر کے اس نے مراد کی طرف دیکھا۔ اور اسے اپنے بازوؤں کے حلقہ میں لے لیا۔ " تمہاری خاطر میں ہر قربانی کے لئے تیار ہوں "۔

مجھے یقین تھا کہ میرا ساتھ دو گی۔ اس کہانی کے مرکزی کردار بن کر ہم یورپ کی سیاحت پر روانہ ہو جائیں گے۔ ہنی مون کے لئے پیرس کی فضا بے حد موزوں رہے گی "۔ وہ دیر تک اسی حالت میں بیٹھے رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انھوں نے وقت کی رفتار پر قابو پا لیا ہے۔ اور پھول یونہی کھلے رہیں گے۔ اور چاندنی یونہی مسکراتی رہے گی "۔

رخصت ہوتے وقت حسنہ نے پُر درد لہجہ میں کہا۔" مراد! ۔ تم نے زندگی کے سارے زاویے میرے سامنے عریاں کر دیئے ہیں۔ میں تو صرف ایک ہی منظر میں ڈوب کر رہ گئی تھی۔ صبح دس بجے ہوٹل لالہ زار میں تمہارا انتظار کروں گی "۔

میں ضرور آؤں گا۔ کل کا دن بہت اہم ہوگا۔ نیا سورج نوید مسرت بن کر طلوع ہوگا" رات بھر وہ دعائیں مانگتا رہا تھا۔ مگر حسنہ۔ سہتی کا کردار ادا کرنے کی خاطر ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر ملے۔ اور اس کی ساری ہمدردیاں نازنین کے لئے وقف ہو کر رہ جائیں، صبح وہ وقت سے پہلے ہی ہوٹل لالہ زار میں پہنچ گیا تھا۔ حسنہ اندر داخل ہوئی۔ تو مراد مضطربانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ حسنہ نے اس کے پہلو میں بیٹھ کر پُرعزم لہجہ میں کہا۔" میں نے بہت غور و فکر کے بعد فیصلہ کر لیا ہے کہ ہر خطرہ مول لے کر نازنین کو اپنے بھائی کی قید سے رہائی دلا کر رہوں گی "۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تم ایک جہاندیدہ اور حساس خاتون ہو۔ دوسروں کی خوشیوں کی خاطر تم یقیناً ہر قربانی دے سکتی ہو"۔

" اس کے لئے اب کوئی لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے "۔

"پوری کہانی تم نے سن لی ہے۔ اور نجات کا طریقہ بھی معلوم ہو چکا ہے "۔

"کونسا طریقہ؟ "۔

"یہی۔ کہ سانپ کے ڈسنے کا بہانہ بنا کر اسے فوری علاج کے لئے کوٹھی سے باہر لایا جائے۔ اس کے بعد اسے ایئرپورٹ تک چھوڑنے کا کام میں سرانجام دونگا"

" واقعی۔ یہی طریقہ آزمانا چاہیئے "۔

"میں ان دولوں کے لئے سیٹ بک کرالوں گا۔ لیکن "

"لیکن کیا؟ "

" بات یہ ہے۔ کہ راجھا اس قابل نہیں۔ کہ کراچی تک کا ٹکٹ خرید سکے۔ اور نہ ہی مستقبل کو سنوارنے کے لئے ان کے پاس کوئی سرمایہ ہے "۔

" میں اس کا انتظام کئے دیتی ہوں" اس نے پرس میں سے چیک بک نکالی" کتنی رقم درکار ہوگی! "

" تمہارے پاس اتنا سرمایہ ہے۔ کہ بیس تیس ہزار سے کوئی فرق نہ پڑے گا۔ لیکن اس رقم سے انھیں زندگی گزارنے میں کافی مدد ملے گی"

تیس ہزار کا چیک اسے پکڑا کر حسنہ نے کہا" رات کو بھائی جان نگھر پر نہ تھے۔ کہیں ٹور پر گئے ہونگے۔ شاید آج بھی نہ آسکیں۔ شام کا وقت موزوں رہے گا"

"بہت بہتر۔ میں بڑے چوراہے پر انتظار کروں گا۔ خدا ہمیں اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے "

چیک کیش کروا کر اس نے کراچی کے لئے دو سیٹیں بک کرائیں۔ اور بے چینی سے سورج کے غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پروگرام کے مطابق شاہسوار پہلے سے ایئرپورٹ پر پہنچ گیا تھا۔ مسٹر کیڈی کی خدمت میں پانچ ہزار کا تحفہ بطور رشوت پیش کر کے شاہسوار نے اسے اپنا پروگرام بتانے کی بجائے اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ افضال کی بجائے حسنہ کا ساتھ دے گا۔ اسے افضال کے انتقام سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ مسٹر کیڈی کے نزدیک یہ کام معمولی نوعیت کا حامل تھا۔ مراد نے حسنہ کو جو نئی سوچ بخشی تھی۔ جو نئی جرأت دلائی تھی۔ جو نئے عظم کی چنگاریاں اس کے اندر پھیلا دی تھیں۔ ان کی بدولت مراد کو حسنہ کی کامیابی

کا سو فیصد یقین تھا۔ حسنہ نے واقعی ایک ماہر شکاری کی مانند جال پھینکا تھا۔ اور سارے ملازم اس میں گرفتار ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی تحکمانہ
انداز میں ہر نوکر کو الگ الگ کام پر کوٹھی سے باہر بھیج دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ مری میں چند ہفتے قیام کے لئے اسے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ سب چیزیں ا
خریدنی چاہئیں۔ ہر ملازم کو ایک کی بجائے دس روپے دیئے تھے۔ جب ماحول سازگار ہوا۔ تو اس نے نازنین کو اپنے منصوبے کی پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اس کے چہرے پر
ابھرنے والے حیرت اور خوشی کے ملے جلے اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے حکم دیا کہ زیورات اور قیمتی جوڑے اس کے کمرے میں اسی وقت پہنچا دیئے جائیں۔ اور تمام
اداکاری ایسی ہونی چاہیئے کہ کسی کو اس کے نقلی ہونے کا شبہ تک نہ ہو سکے۔ نازنین کے کپڑوں کے جوڑے اور زیورات حسنہ نے اپنے سوٹ کیس میں بند کر دیئے تھے۔ اس نے کسی
کو شبہ نہ ہونے دیا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ تو نازنین لان میں ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے یکدم چیخ پڑی۔ حسنہ موقع کی منتظر تھی۔ ملازم گھبرا گئے۔ سب سے پہلے حسنہ ہی اس
کے پاس پہنچی تھی۔ نوکر قریب آ گئے۔ تو حسنہ بدحواس سی ہو کر بول پڑی۔ "بھابھی کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔" وہ تیزی سے کوٹھی میں داخل ہو
گئی۔ چند منٹ بعد باہر نکل کر وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ڈاکٹر بے حد مصروف ہے۔ اس نے بھابھی کو وہیں پر لے آنے کے لئے کہا ہے۔ تم بانہوں کا سہارا دے کر اسے اٹھا لو"
خوف آمیز ہچکچاہٹ کے باوجود انھوں نے نازنین کو کانچ کے برتن کی مانند اٹھا لیا۔ حسنہ نے کاریڈور کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اسے میری کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا
دو۔" ملازموں کو اگرچہ افضال نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ کہ نازنین کوٹھی سے باہر قدم نہ رکھے۔ مگر اب معاملہ دوسرا تھا۔ وہ سب اپنا اہم فریضہ بھول گئے تھے۔ حسنہ نے
کار اسٹارٹ کی۔ اور اسے تیز رفتاری سے بڑی سڑک پر لے آئی۔ کار نے موڑ کاٹا اور نازنین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چوراہے پر مراد منتظر تھا۔ حسنہ نیچے اتری اور مراد نے
جگہ لے لی۔ حسنہ نے کہا۔ "میں ہوٹل لالہ زار میں انتظار کروں گی۔" کار اسٹارٹ کر کے مراد نے نظروں کا زاویہ بدل کر کہا۔ "کسی کو امید نہ تھی کہ ہمارا یوں ملاپ ہوگا۔ رانجھے کو
مراد بننا پڑے گا۔ اس مشینی دور میں۔ رانجھے کی جدوجہد کا معیار بھی بدل گیا ہے۔ اب ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ کار حسنہ کو ایئرپورٹ پر مل جائے گی۔ اور اس
وقت ہم بہت دور جا چکے ہونگے۔" نازنین نے وارفتگی کے عالم میں اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیئے تھے۔

محمدؐ منشا یاد

سورج پہ دستک

سورج پہ دستک
شائستہ حبیب کی نظموں کا مجموعہ
چھوٹی چھوٹی خوبصورت
نثری اور شعری نظمیں
آزاد اور خود مختار
اپنے پاؤں پر کھڑی
کھلی فضاؤں میں سانس لیتی ہوئی
جیسے چھوٹی چھوٹی رنگ برنگ مچھلیاں
تازہ اور شفاف پانی میں تیرتی ہوں
یا جیسے خوشبودار ہوائیں
رنگین پروں والی تتلیاں
محو رقص ہوں
یا جیسے خود رو پودوں میں رنگ برنگ پھول لہلہاتے ہوں
مجھے یہ تو آزاد اور خود مختار
اپنے پاؤں پر کھڑی نظمیں اچھی لگیں
ان کے گلے میں روایتوں کے طوق نہیں ہیں
وہ تکنیکی سانچوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہیں
ان کے پاؤں عروض کی بیڑیوں سے آزاد ہیں
اور ان کی فضا میں کھلے پن کا احساس ہوتا ہے

جیسے پھاگن چیت کی چاندنی میں ہوتا ہے
جیسے بیساکھ کی صبح میں ہوتا ہے
(جیسے احمد فراز کے لئے گھر کا Rear لان)
ان میں سرسوں اور کپاس کے کھیت ہیں ۔ چاندنی ہے ۔ تتلیاں ہیں ۔ بادل ہیں اور درختوں کی شاخوں پر بیٹھی فاختائیں
سگریٹ پیتی چڑیاں ہیں ۔
مجھے یہ نظمیں اچھی لگیں ۔
کیونکہ انہوں نے مجھے اداس کیا
اداسی میری روح کا من بھاتا کھاجا ہے
میں خوشی اور اداسی کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھ سکتا ۔
جب میں خوش ہوتا ہوں
تو اداسی مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے
اور جب میں اداسی میں گھِر جاتا ہوں
تو میرے اندر خوشی کی ٹارچ سی جلنے بجھنے لگتی ہے ۔
مگر مجھے موت سے بے حد خوف آتا ہے ۔ اور
اور شائستہ اسے اپنی قرار دیتی ہے "موت میری سکھی ۔ میرے ہی سنگ آنگن میں کھیلی بڑھی"
اور مجھے رونا نہایت مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے ۔
شائستہ رونے کو عزیز جانتی ہے ۔ اور کہتی ہے "آؤ مل کر روئیں"
مگر جب وہ گزرے ہوئے لمحوں کو آواز دیتی ہے
اور پوچھتی ہے کون تھا وہ ؟
تو اس کی آواز اداسی پھیلاتی ہے
"دُور دُور سے دیکھ کے وہ مسکاتا تھا"
نرم سفید چمکتی کرنوں کا پیکر
میں جب بھی اس کے نرم ملائم جسم کو چھوتی تھی
وہ ہوا کے جھونکے کے مانند
کہیں دل کے آنگن میں اک دستک سی دیتا تھا
کل وہ میرے ہاتھ سے گر کر چکنا چور رہا"
یا جب وہ کہتی ہے
اداسی لہر لہر ۔ دھوپ کی طرح سے
چھتوں سے اتری

صفحوں میں بھری اور دہلیز پہ آکر بیٹھ گئی
آتے جاتے لوگوں کے دلوں پر
موم کے قطروں کی طرح گرنے لگی
تو مجھے اُداسی نظر آنے لگتی ہے ـــ سیڑھیاں اترتی چڑھتی ـ دہلیز پر پھسکڑا مار کر بیٹھی ہوئی
سیاہ ماتمی لباس پہنے
بال بکھرائے ـــ پھونڑی ڈالے

میرے اندر بہت سے
پر کٹے کبوتر حسرت سے اپنے ہم جنسوں کی اڑانیں دیکھنے لگتے ہیں ـ
گونگی اور بے زبان کوئلوں کی نہ سنی جانے والی کوکیں مجھے اداس کر دیتی ہیں
شائستہ کہتی ہے
"دھند اور سردی کی گود میں کانپتی صبح
اکیلی راتوں اور بھیگے لمحوں کے گیت
اور بے چاری جان
اتنے قرض کون اتارے گا
دل پتہ پتہ ہو کر سارے آنگن میں ہوا کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے
اوس میں ڈوبے ہونٹوں پر چپ کی انگلیاں
سرگوشیوں میں باتیں، ملاقاتیں
ذری ذری سہمی سی آنکھیں کمرے کی ہر دیوار کے ساتھ سجی ہیں
کہانیاں لمبی عمروں کی اور تنہا رہنے کی
آنے کی اور پھر کسی دور سفر پہ نکل جانے کی"
یہی وہ باتیں ہیں
ہجرتوں کی، جدائیوں کی، لمبے سفر پہ نکل جانے کی
اور مل کر بچھڑ جانے کی
جو اداس کرتی ہیں ـ
اور اداسی مجھے اچھی لگتی ہے ـ
مجھے پروؤوک کرتی ہے
تخلیق پر ابھارتی ہے
اس لئے مجھے شائستہ کی نظمیں پسند آئیں
لیکن کتاب کا نام ؟

کتاب کا نام پڑھ کر میں سوچ میں پڑ گیا
سورج پہ دستک
انسان نے چاند کو تسخیر کر لیا ہے
اور اب مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے
شاید اسی حوالے سے ــــــ شائستہ نے
سورج پہ دستک دی ہے
مگر سورج پر دستک کیسے دی جا سکتی ہے
وہ تو لاکھوں میل قطر کا آگ کا گولہ ہے
ایک عظیم بھانبھڑ ہے ۔
ایک بہت بڑا الاؤ ہے
جس کی طرف محض دیکھنے سے
گستاخ اکھیاں
اپنے چانن سے محروم ہو سکتی ہیں ۔
دستک دینا ــــ تو بڑی دور کی بات ہے
ہاں ــ جب ہماری نافرمانیاں
اور سرکشیاں
خیانتیں اور منافقیں
ہمارے مظالم اور معاصی
حد سے بڑھ جائیں گے
تو ایک دن سورج
خود دستک دینے آئیگا
سوا نیزے کے فاصلے پر
پھر شائستہ نے
ایسا نام کیوں رکھا "سورج پہ دستک"
میں نے اپنے سوال کا
جواب پانے کے لئے
کتاب کی ساری نظموں کے عنوانات کھنگال ڈالے
مگر مجھے اس عنوان کی کوئی نظم نظر نہ آئی
لیکن پھر کچھ لائنیں دیکھیں

لکھا تھا "سوال مت کرو"
"چلتے جاؤ
آگے اس سے بڑے فائدے کی توقع ہے
اپنے دماغ سے اٹھنے والی سوچ کا بٹن آف کردو
بجلی زیادہ خرچ نہ کرو
کچھ روشنی کالے دنوں کے لئے بھی بچا کر رکھو
چلتے جاؤ
خاموش رہو ــــ سوال مت کرو"
میں نے شائستہ کی بات پر عمل کیا اور چلتا رہا
ورق الٹتا رہا۔
اور میری نظر ایک اور لائین پر پڑی
"میرے دل کے جگنوؤں سے تمہارے لکڑ وجود کے اندر چنگاریاں نکلیں گی"
میں ٹھٹکا ــــ مجھے چمکتی چیزیں خواہ وہ جگنو ہی ہوں
اور خواہ مٹھی میں بند ہوں
اچھے لگتے ہیں۔
میں سنبھل ہی رہا تھا کہ شائستہ بولی
"جب گدھوں نے مردار کھانا چھوڑ کر چکن روسٹ کھانے شروع کر دیئے تو ایئر کنڈیشنڈ ریل کار کے اندر بیٹھے ہوئے لوگ
خدا کی طرح ان ہاتھوں کی آوازوں کو نہیں سن سکتے تھے جو بند شیشوں سے باہر پھیلے تھے"
بات کچھ کچھ ــــ میری سمجھ میں آنے لگی ــ پھر وہ کہنے لگی
"جی میں ہے کہ جل تھل برسوں
پر یہ آنسو کس کس نام سے روؤں
اک آنسو یہ نام ہے اس کا
جس کے ہاتھ سوالی ہیں۔
اس نے بہت سے نام گنوائے اور آخر میں جیسے رو کر بولی
"یہ آنسو کس کس نام کے
اُس کے، اُس کے۔
اپنے، تمہارے، کل کے، آج کے، یا پھر آنے والی کل کے
جو صاف سلیٹ کی مانند گم سم ہے
میں نے ایسی بہت سی باتیں

ان نظموں میں جگہ جگہ دیکھیں
سوچیں۔
ایک نظم کا عنوان تھا
"NO EXIT"
کچھ تھوڑی سی آپ بھی سن لیں
"ہواؤں کے ٹھنڈے کورے کفن اوڑھے
ہم کس جشن میں شریک ہیں۔
ہماری آنکھیں کس سمت کو دیکھ رہی ہیں کہ پتھریلا غبار برف کی طرح
آہستہ آہستہ ہماری پلکوں پر جمتا جا رہا ہے
ہماری زبانوں پر سنہرے تالے کس نے لگا دیئے۔
کہ اب اشارے ہمارے معانی بن گئے
دردناک آوازوں کے آگے یہ کیسے بند باندھے گئے کہ شور اور خاموشی
کانوں میں کڑوے دھوئیں کی طرح یکجا ہو رہے ہیں۔
کس بلا کا ہجوم ہے اور کیسی بے آس تنہائی ہے"
گیلے چاک سے لکھی ہوئی تحریر کی طرح
میرے ذہن کی صاف پلیٹ پہ
سورج پہ دستک والی بات
آہستہ آہستہ واضح ہونے لگی۔
اچھا تو یہ وہ سورج ہے
روشنی والا۔ کرنوں والا
بیج اور پھول اگانے والا
کالی راتوں گھپ اندھیاروں
گونگے بہرے اندھے لمحوں کو کھا جانے والا
چاندنی، تاب، توانائی، ہریالی، خوشحالی
کا سندیسہ لانے والا سورج
اچھی بات ہے۔ شائستہ بی بی۔
اس کے در پر دستک دینا
اُسے بلانا۔
بہت ضروری ہے۔

علی حیدر ملک

علامتی افسانہ، کب، کہاں، اور کیسے؟

مختصر افسانے میں علامت نگاری کا آغاز کب سے ہوا؟ ـــــ اس سوال کے جواب کی تلاش میں بعض لوگ بہت دُور
ل جاتے ہیں اور "دو بیل" کے حوالے سے پریم چند کو پہلا علامتی افسانہ نگار قرار دے ڈالتے ہیں۔ ایسا کہیں ناسمجھی کی بناء پر کیا گیا
ہے کہیں بدنیتی کی بناء پر۔ "دو بیل" ایک اچھی اور پُراثر کہانی سہی لیکن اسے علامتی قرار دینا کج فہمی یا سادہ لوحی کی دلیل ہے ـــ
ڑ سے گرے تو کھجور میں اٹکے کے مصداق کچھ لوگ پریم چند سے آگے بڑھکر "درون تیرگی" کے حوالے سے میرزا ادیب کو پہلا علامتی
نسانہ نگار منوانے پر اصرار کرتے ہیں جبکہ "درون تیرگی" کسی طرح علامتی افسانہ نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کہانی
پنے وقت کے عام دھارے سے الگ تھی اور اس میں کچھ دھندلے اور بالکل ابتدائی نقوش علامتی افسانے کے موجود تھے۔ اسی
لئے ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی اسے حقیقت اور علامت کے درمیان نومینز لینڈ (NO MAN'S LAND) قرار دیا ہے۔

صحیح معنوں میں اردو افسانے میں علامت نگاری کا باقاعدہ آغاز انتظار حسین سے ہوتا ہے لیکن ان سے بہت پہلے اختر
ورینوی نے "کیچلیاں اور بال جبریل" کے ذریعہ اسکی بنیاد رکھدی تھی ۔ واضح رہے کہ اختر اورینوی بھی اپنے مجموعی رُجحان کے
عتبار سے علامت نگار نہیں تھے مگر اردو افسانے کی تاریخ میں "کیچلیاں اور بال جبریل" کا ذکر علامتی افسانے کی خشت اوّل کے
طور پر ضرور آئے گا ـــ ویسے بعد میں بھی اختر اورینوی نے دو تین علامتی کہانیاں مثلاً "ایک درخت کا قتل" وغیرہ تحریر کیں لیکن اس
وقت تک علامتی دور کا باضابطہ آغاز ہوچکا تھا اور اس سے قبل کرشن چندر بھی "مردہ سمندر" جیسی علامتی کہانی لکھ چکے تھے ـــ
نتظار حسین کے فوراً بعد جن لوگوں نے افسانے کا رُخ علامت نگاری کی طرف موڑنے کی کوشش کی ان میں انور سجاد، بلراج مینرا اور
سریندر پرکاش وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے بعد علامت نگاری دیکھتے دیکھتے نئے افسانے
کا طرۂ امتیاز بن گئی ـــ یوں بعض حلقوں سے اسکی مخالفت بھی ہوتی رہی ۔ لیکن مخالفت کا کیا ہے یہ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔
کارواں اس کے باوجود چلتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے اس سلسلے میں بڑی اچھی اور سچی بات کہی ہے کہ "تاریخ ادب کا یہ
دلچسپ واقعہ ہے کہ ہر زبان میں علامت نگاری کی شدید مخالفت کے باوجود یہ بعض حالات میں بھرپور وسیلۂ اظہار رہی ہے ـــ"
(علامت نگاری ـــ اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت)۔

آگے چل کر اپنی اسی کتاب "اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت" میں عنوان نے لکھا ہے کہ ـــ "علامت کوئی متعین لفظی

صورت نہیں ہوتی۔ ہر لفظ، ترکیب، استعارہ، تشبیہ، دیومالائی اشارہ یا پیکر علامت کا درجہ اختیار کر سکتا ہے۔"
اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو افسانے میں علامت نگاری کے تین طریقے نظر آتے ہیں۔

اوّل طریقہ تو یہ ہے کہ آسمانی صحائف، اساطیر، لوک کہانیوں، حکایتوں، اور قدیم داستانوں کے بعض کرداروں کو ہم عصر ماحول میں نئی زندگی عطا کی گئی یا ان کے بعض واقعات کو اپنے زمانے سے RELATE کیا گیا۔ آسمانی صحائف میں قرآن و انجیل سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا۔ اساطیر کے سلسلے میں یونانی اور ہندی دیومالاؤں سے اخذ و انتخاب ہوا۔ حکایتوں اور قدیم داستانوں کے ضمن میں عربی، فارسی حکایتیں، طلسم ہوشربا، الف لیلہ، قصۂ چہار درویش اور دیگر داستانیں خصوصی توجہ کا مرکز رہیں۔ بعض اوقات تاریخی شخصیتوں کو بھی علامت کے طور پر پیش کیا گیا جن میں گوتم بدھ کی شخصیت سب سے زیادہ محبوب و مقبول رہی۔

دُوسرا طریقہ فطرت اور مظاہرِ فطرت میں سے بعض اشیاء اور چرند و پرند کو علامتی شکل عطا کرنے کا رہا۔ مثال کے طور پر سمندر، جنگل، طوطا، کبوتر، گھوڑا اور گائے وغیرہ۔

تیسرا طریقہ موجودہ عہد کی بعض ایجادات اور روزمرّہ استعمال ہونے والی چیزوں کو بطور علامت پیش کرنے کا سامنے آیا جیسے بس، سائیکل، فورک لفٹ اور ماچس وغیرہ۔ مگر یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ایک افسانہ نگار نے خود کو کسی ایک مخصوص طریقۂ کار تک محدود رکھا اور دوسرے نے کسی دُوسرے طریقۂ کار تک۔ عام طور پر ہر افسانہ نگار تینوں طریقوں کو علامت سازی کے لئے استعمال کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایسا کوئی افسانہ نگار شاید ہی نظر آئے جس نے علامت نگاری کے لئے کوئی ایک مخصوص طریقہ منتخب کر کے صرف اسی کو مستقل طور پر برتا ہو۔

پچھلی دو دہائیوں میں جن افسانہ نگاروں نے علامتی افسانے لکھے ہیں انہیں تین خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اوّل وہ جنہوں نے ابتدا تو روایتی افسانے سے کی تھی لیکن بعد میں علامتی افسانے کی طرف آ گئے۔ دوم وہ جنہوں نے آغاز ہی علامتی افسانوں سے کیا اور وہ صرف علامتی افسانے ہی لکھتے ہیں۔ سوم وہ جنھوں نے علامتی افسانے بھی لکھے اور بیانیہ بھی اور اب بھی وہ بیک وقت دونوں طریقہ ہائے اظہار میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔

علامتی افسانے یوں تو برِّصغیر کے ہر چھوٹے بڑے ادبی مرکز میں لکھے جا رہے ہیں لیکن پاکستان میں راولپنڈی اور کراچی اس کے سب سے اہم اور سرگرم مرکز بن کر اُبھرے ہیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ علامتی افسانہ جس کا آغاز لاہور سے ہوا تھا اسکی ترویج و پذیرائی اپنے مولد میں اس طرح نہ ہو سکی جیسی کہ پنڈی اور کراچی میں ہوئی۔ ہندوستان میں دہلی، بمبئی، پٹنہ، حیدر آباد اور لکھنؤ اس کے سب سے زرخیز مراکز تصور کئے جاتے ہیں۔

پیراگراف سازی اور وہ بھی ادیبوں کی، ایک مشکل اور نازک کام ہے۔ مشکل اس اعتبار سے کہ تمام لکھنے والوں کے نام ڈھونڈ ڈھونڈ کر یکجا کرنا مستقل مطالعے اور تلاش و جستجو کے بغیر ممکن نہیں۔ نازک اس لحاظ سے کہ اس سے تعلقاتِ عامہ کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے پھر بھی بعض اوقات فہرست سازی ناگزیر ہو جاتی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون کیا ہے اور کدھر ہے؟ اگر یہ کام آج نہیں کیا گیا تو کل اور مشکل ہو جائے گا ——— اور (CONFUSIONS) کنفیوژنز اور بڑھتے رہیں گے۔

لہٰذا اب یہ دیکھئے کہ پاکستان میں علامتی افسانہ نگاروں کی فہرست میں کون کون سے نام شامل ہیں چھوٹے بڑے۔ معمولی غیر معمولی کی بحث سے قطع نظر پنجاب میں، رشید امجد، احمد داؤد، مرزا حامد بیگ، احمد جاوید، محمد منشا یاد، رخسانہ صولت، سمیع آہوجہ، مستنصر حسین تارڑ، نجم الحسن رضوی، انتظار حسین، مسعود اشعر، انور سجاد، میرزا احمد شیخ، نگہت مرزا، خالدہ حسین، مرزا شرف صدیقی، محمود احمد قاضی

سلم سراج الدین، انوار احمد، مظہر الاسلام، علی تنہا، اقبال نظر، انجم ترازی، منصور قیصر، مشتاق قمر وغیرہ

کراچی یا سندھ میں افسر آذر۔ اسد محمد خاں، اے خیام، مشرف احمد، قمر عباس ندیم، رحمان شریف، ملکہ احمدی، اعجاز راہی، زاہدہ حنا، طاہر مسعود، فاطمہ حسن، ایوب خاور، آصف اسلم اور ۔۔۔۔۔ اگر آپ چاہیں تو ان میں اس خاکسار کا نام بھی شامل کر لیں۔

ہندوستان کے سینئر لکھنے والوں میں غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، انور عظیم، جوگندر پال، کلام حیدری، شرون کمار ورما، اقبال مجید، اقبال متین، عوض سعید، کمار پاشی، احمد یوسف، رتن سنگھ، بلراج کومل اور ظفر اوگانوی ـــــ بعد کی نسل میں قمر احسن، شوکت حیات، حسین الحق، کنور سین، علی امام، رضوان احمد، شفق، انور قمر، م۔ق۔خان، انور خاں، سلام بن رزاق، سلطان سبحانی، حمید سہروردی، عبد الصمد، اکرام باگ، انیس اشفاق، سید محمد اشرف، مظہر الزماں خاں، ساجد رشید، انیس رفیع، عشرت ظہیر، مومن مشتاق صدیقی، طارق چھتاری، غیاث الرحمان، مجید انور، سجاد عزیز، محمود شکیل، احمد عثمانی اور شمس الحق۔

ہندوستان ایک بڑا ملک ہے۔ وہاں بہت سارے لکھنے والے ہیں پھر وہاں کے رسالے اور کتابیں بھی یہاں دستیاب نہیں اس لئے ہو سکتا ہے کہ دو ایک نام اس فہرست میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں۔ یوں بھی کوئی فہرست قطعی اور آخری نہیں ہوتی ـــــ پھر بھی یہ دعویٰ شائد بیجا نہ ہو گا کہ پاکستان کی مندرجہ بالا فہرست بہت بڑی حد تک جامع اور قطعی ہے اور پاکستان میں علامتی افسانے کے حوالے سے تادم تحریر یعنی آٹھویں دہائی کے خاتمے تک وہی لوگ اہم یا قابل شمار ہیں جن کے نام اوپر دیئے گئے ہیں۔ ان تمام لوگوں میں سے کتنے مزید پیش قدمی کریں گے اور کتنے پسپا ہو جائیں گے اس کا جواب حرف آنے والا وقت ہی دے سکتا ہے ـــ ہم یا آپ نہیں ـــ

ہاں! یہاں ایک بات اور یاد آئی ـــ ایک نہیں بلکہ دو ایک ہندوستان کے حوالے سے اور ایک پاکستان کے حوالے سے، اردو افسانے کے ہر مرحلے پر خواتین مردوں کے شانہ بشانہ چلتی رہی ہیں لیکن ایسا کیوں ہے کہ ہندوستانی علامت نگاروں کی فہرست میں کسی خاتون افسانہ نگار کا نام شامل نہیں ہے؟ اسی طرح مندرجہ بالا فہرست کے مطابق پاکستان کے صوبہ پنجاب اور سندھ میں تو علامتی افسانے زوروں سے لکھے جا رہے ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہمارے دو صوبے سرحد اور بلوچستان اس معاملے میں بھی اپنے کوٹا سے محروم رہ گئے۔ ان دونوں صوبوں میں ادبی سرگرمیاں تو موجود ہیں۔ تحقیق و تنقید اور شاعری کا کام خاصا ہو رہا ہے۔ کچھ لوگ افسانے بھی لکھ رہے ہیں مگر علامتی افسانے کا خانہ سرے سے خالی نظر آتا ہے۔ آخر اسکی وجہ کیا ہے؟ یہ ایک نیا اور دلچسپ سوال ہے جس پر غور کیا جانا چاہئے بشرطیکہ ہمارے نقادوں کو اتنے زندہ سوالوں پر غور کرنے کی مہلت اور توفیق ہو ـــ

نسیم درانی (ایڈیٹر، پبلشر) نے انجمن پریس (پرنٹر) سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الفاظ، بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی کراچی ۲۸ سے شائع کیا
(اشاعت: فروری ۱۹۸۳ء)

سیپ
نسلِ نو کا ترجمان
اپنے عہد کی بہترین اور نمائندہ تحریروں کے ساتھ شائع ہو کر
آپ کے قریبی بک اسٹال پر دستیاب ہے
سیپ

تبسم رضوی

اشکوں کے گہر یوں سرِ مژگاں بھی نہ تولیں
ان آنکھوں سے کہہ دو کہ ابھی راز نہ کھولیں

تسکینِ دل و جاں کی تو نکلے کوئی صورت
اس نیزۂ مژگاں کی انی دل میں چبھولیں

آنکھوں سے کریں کیا تنک آبی کی شکایت
دل ہی کے لہو سے کبھی پلکوں کو بھگولیں

چاہت تو ہر اک بات سے ظاہر ہے اب ان کی
ہر چند زباں سے نہ کہیں، منہ سے نہ بولیں

قسمت میں اگر تم سے بچھڑنا ہی لکھا ہے
اک بار تمھیں سینے سے لپٹا کے تو رولیں

موجِ خوں سر سے گزرتی ہے گزر جانے دو
کہیں یہ گردشِ ایام ٹھہر جانے دو

اٹھنے والی ہے کوئی دم میں ستاروں کی بساط
اور کچھ دیر کا نشہ ہے اُتر جانے دو

راہ میں روک کے احوال نہ پوچھو ہم سے
ابھی باقی ہے بہت اپنا سفر، جانے دو

ابھی ہنگام نہیں راہ میں دم لینے کا
ابھی یہ قافلۂ اہلِ نظر جانے دو

لب پہ آ آ کے رہی جاتی ہیں کتنی باتیں
ہمیں کہنا تو بہت کچھ ہے مگر جانے دو

جمیل عظیم آبادی

کیسے ملاؤں آنکھ!

جب سے اپنی آنکھ لڑی ہے
سر پہ اپنے دھوپ کڑی ہے
برہا کی بے چین گھڑی ہے
رستہ روکے لاج کھڑی ہے
مُورکھ ٹوٹ نہ جائے ساکھ
اُن سے کیسے ملاؤں آنکھ!

جیون کی یہ کون گھڑی ہے
بپتا چاروں اُور کھڑی ہے
ہر آشا پہ اوس پڑی ہے
نس نس میں اک آگ بھری ہے
مُورکھ ٹوٹ نہ جائے ساکھ
اُن سے کیسے ملاؤں آنکھ!

ساون کی گھنگھور گھٹائیں
رِم جھِم رِم جھِم مینہہ برسائیں
یاد کے دیپک دل میں جلائیں
انکھیاں پل پل نیر بہائیں
مُورکھ ٹوٹ نہ جائے ساکھ
اُن سے کیسے ملاؤں آنکھ!

یاد کی لہریں پاگل پاگل
من کا ساگر ہلچل ہلچل
آگے پیچھے بادل بادل
نین کی ندیا جل تھل جل تھل
مُورکھ ٹوٹ نہ جائے ساکھ
اُن سے کیسے ملاؤں آنکھ!

پریم کا جھرنا پھُوٹ رہا ہے
پریت کا آنچل چھُوٹ رہا ہے
برہا دھیرج لُوٹ رہا ہے
لاج کا بندھن ٹوٹ رہا ہے
مُورکھ ٹوٹ نہ جائے ساکھ
اُن سے کیسے ملاؤں آنکھ!

اقبال فریدی

پنجاب کے دریا معمول پر ہیں

ہاں، میں نے دریاؤں کو ان کے کناروں سے اُبلتے دیکھا ہے
ہاں، میں نے اک برساتی راتوں میں راوی میں بوٹنگ کی ہے
ہاں، میں نے مچھیروں سے اسمگلنگ کے اسرار و رموز جانے ہیں
ہاں، میرے نتھنوں میں ہجسٹر کی دھول بھری ہوئی ہے
دوسری مرتبہ، ہاں، میرے نتھنوں میں ہجسٹر کی دھول بھری ہوئی ہے
ہاں، میں نے دیکھا کر سنیما مجامعت کی متحرک تصویر دکھاتے ہیں
ہاں، میں نے دیکھا ہے نوجوان کسرت کرنا بھول گئے ہیں
اخبار میں مسٹر پنجاب کی کوئی تصویر نہیں
تم خود بتاؤ ٹوٹے ہوتے پشتے پر بادشاہ اپنی پیٹھ لگادے تو سیلاب کیسے آئے گا
نوجوانوں سے بھرے سینما ہال میں سیٹیاں گونج رہی ہیں، سیلاب کیسے آئے گا
پنجاب کے دریا معمول پر ہیں ۔

تحقیق

تتلی خوشبو بھونرا جادو سالے میرے چراغ
اک دن جگمگ ہوگا پیشانی کا داغ
دودھ کٹورے شہد کی نہریں آنکھیں بھر آیا غ

جانے والے دن آتے اب تو یہ بند ہوئی
پردۂ شب نے لاکھ چھپایا سسکی بلند ہوئی
جسم کی مٹی مٹی میں آخر پیوند ہوئی

مٹی کے دروازے کے اُس پار نہیں ہے کوئی
کہنے والے کہتے ہیں اک حسن حسیں ہے کوئی
بے شک اے اقبال فریدی پار کہیں ہے کوئی
آؤ چلیں اُس پار

ماہ طلعت زاہدی

مٹّی کو مہکنے دو

قدم قدم، دَھڑکن دَھڑکن
ڈال ڈال، جھونکا جھونکا
اَن گِنت زمانوں کی یہ لگن
مٹّی مٹّی، خوشبو خوشبو
موسم موسم، برکھا برکھا
سودائی کی طرح ڈھونڈے کسے

خواب خواب، قریہ قریہ
صحرا صحرا، دریا دریا
جینے کا نشہ ملتا ہے کہاں!
اَن گِنت زمانوں کی یہ لگن
جس سُندرتا کی کھوج میں ہے
وہ یہیں ہمارے بیچ کہیں
کسی لمحے کی مُنھ بند کلی
کہیں بدن کی کوملتا میں چھُپی
کہیں من کی آگ میں روشن ہے

مٹّی کو مہکنے دو، پُروائی کو چلنے دو
بارش کو کھُل کر برسنے دو!!

تنویر انجم

اِک دن کے پار اُترنے پر

کسی سُرخ چنار کے جنگل میں
اک ناؤ ہوا کی لہروں پر
سازوں کے طرب میں بہتی ہے
کوئی گاتا ہے
دل میرا اجیاروں کا مسکن
اِک ناؤ مچلتی کرنوں کی
خوابوں کے اندھیرے جنتی ہے
اک سُرخ چنار کے جنگل میں
کوئی چلتا ہے

جہاں دن کے قدم رُک جاتے ہیں
تھک جاتے ہیں
اُمید کی نیندیں شاموں میں ڈھل جاتی ہیں
کوئی روتا ہے
ہنس دیتا ہے
پھر کوئی اندھیرے کی چادر کو اوڑھ کہیں کھو جاتا ہے
کیا ہوتا ہے۔

اِک دن کے پار اُترنے کا یہ کرب کہاں سے اُٹھتا ہے
برسے ہوئے خالی بادل سے
ساحل سے پلٹتے ساگر سے
ساگر کے کنارے بیتی ہوئی یادوں کے بدن
سیپی سے چھلکنے لگتے ہیں
کون سُنتا ہے
گیتوں کے بدن
دل تنہائی کا جوگ لئے
اِس بیداری کی چادر میں
کس دن کی یاد مناتا ہے
جب دن کا سفر رُک جاتا ہے۔

ن۔م۔ دانش

ہم سے آوارہ مزاج

ہم سے آوارہ مزاجوں کو کوئی کیا جانے
کونسا کرب ہے جو ساتھ لئے پھرتے ہیں

گھر سے نکلے ہیں
مہکتی ہوئی پوشاک میں سج کر ہم لوگ
قہقہے ہونٹوں پہ ہیں

o

قہقہے ہونٹوں پہ ہیں
کوئی نہ جانے لیکن
کونسا کرب ہے وہ
کونسی محرومی ہے
جس کو ان کھوکھلے لفظوں میں چھپا رکھا ہے۔

کونسا کرب ہے وہ
کونسی محرومی ہے
آتے جاتے ہوئے چہروں کو
جو حسرت سے تکا کرتے ہیں
بات بے بات پہ
بے وجہ کیوں ہنس پڑتے ہیں
صبح سے رات گئے
شہر کی سڑکوں پہ
کیوں آوارہ پھرا کرتے ہیں

پارٹی،
پوپ میوزک کی ضرورت کیوں ہے
کس لئے شہر کی فٹ پاتھ پہ،
گلیوں میں
مرا کرتے ہیں
کونسا کرب ہے وہ کونسی محرومی ہے
ہم سے آوارہ مزاجوں کو کوئی کیا جانے

سرنگوں خواب دربدر آنکھیں

در و دیوار پر یہ ویرانی
مضمحل سوچ جاگتے سائے
اونگھتی خواہشوں کی جھرمٹ میں
سرنگوں خواب دربدر آنکھیں

ذہن کے تیرہ تار گوشوں میں
مکڑیاں جال سا بنتی ہیں مگر
بیٹھ کے ہنس رہا ہوں لوگوں میں
اور آنکھوں میں ہیں لئے منظر
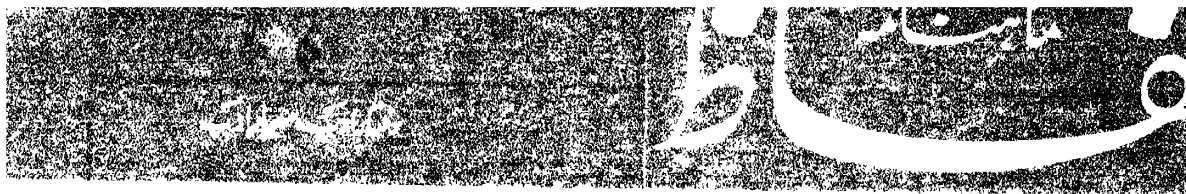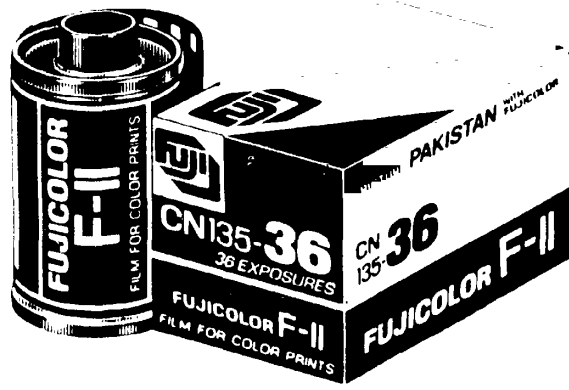
دھند پھیلی ہوئی ہے کیوں ہر سُو
سوچتا ہوں، سمجھ نہیں آتا
پھر کہیں دور میری ہستی سے
چھنتا رہتا ہے میرا سایا

شب کا سناٹا اور تاریکی
گھر کے دیوار و در پہ مایوسی
خواب سہمے ہوئے پلکوں پہ
رت جگے آنکھ میں اُتر آئے

اونگھتی خواہشوں کی جھرمٹ میں!
سرنگوں خواب دربدر آنکھیں

کہانی نمبر

فیوجی فلم میں کوالٹی
فیوجی کلر میں زندگی

واسطی انٹرپرائزز لمیٹڈ

کراچی ـ لاہور ـ راولپنڈی

1-17-MCM

فلپس بلب سے روشنی بھی زیادہ
بجلی کا خرچ بھی کم
اپنے گھروں کو فلپس بلب سے زیادہ روشن رکھیے۔
بجلی بچایئے
فلپس بلب نام لے کر
طلب فرمائیں
PHILIPS
فلپس

ASIATIC
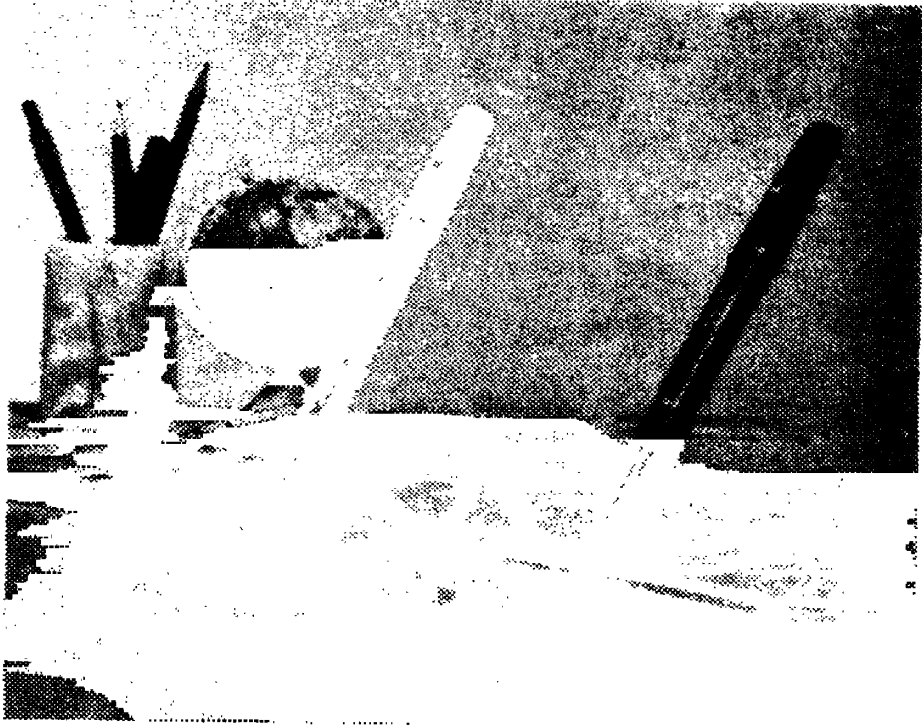
لکھنے پڑھنے کے شائق لوگوں کا بہترین ساتھی !
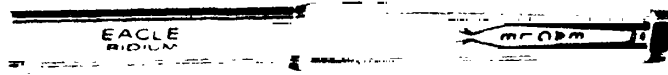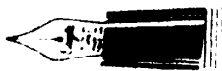
مینوفیکچررز :

آزاد فرینڈز اینڈ کمپنی لمیٹڈ

اپنی محنت کی کمائی کو بلبلوں کی طرح
مت اُڑائیے
این آئی ٹی یونٹ میں اپنا روپیہ لگا کر
ٹھوس سرمایے میں تبدیل کیجیے
اور سال بہ سال سود سے پاک معقول منافع کمائیے
غیر ضروری خریداری سے خود کو بچائیے۔ آپ کو اپنی محنت کی کمائی سے محروم کرنے کے لئے فضول خرچی کی ترغیب ہر قدم پر ملے گی۔ اسے قبول کرنا آئندہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے حق میں کانٹے بونا ہے۔ جب تک دم میں دم ہے ایمانداری سے کمائیے اور جس قدر بچا سکیں بچائیے۔
این آئی ٹی یونٹ خرید کر بڑے بڑے کاروباری اداروں میں شرکت کا منافع گھر بیٹھے حاصل کیجئے۔ یونٹ خریدنا بھی آسان ہے، وقت پر بھنانا بھی۔
این آئی ٹی یونٹ روپیہ بچانے کا محفوظ اور منافع بخش ذریعہ۔
این آئی ٹی ۔ سرمایہ کاری کا قابلِ اعتماد ادارہ
نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ
(امانیہ قومی سرمایہ کاری)
کراچی ۵۹-۵۶-۲۲۲، لاہور ۵۶۹۵۱ - ۶۸۱۳۴
راولپنڈی ۶۷۲۱۷، اسلام آباد ۲۸۷۱۱، پشاور ۷۲۸۴۸، کوئٹہ ۷۱۳۰۴
حیدرآباد ۳۱۶۹۳، ملتان ۷۵۲۱۵، فیصل آباد ۲۷۸۵۶
میرپور (آزاد کشمیر) ۲۲۳۷

ہر موسم میں
کھِلتے پھُول ...
آدم جی کی
شبنم
(امریکن ایجپشن کاٹن)
لان
ہلکی پھلکی لان ... جیسے خوشبو کے جھونکے!
دل بہار ڈیزائن ... نت نئے پرنٹس
جو پہنے ... سج جائے
رنگ ایسے ... کہ چھپنا مشکل ہو جائے
سکڑنے سے محفوظ اور دیرپا
آدم جی کی شبنم لان ...
خریدتے وقت ہرگز پر
آدم جی کا نام دیکھنا نہ بھولیے
adamjee
THE NAME YOU HAVE LEARNT TO TRUST
AL-2-81-UD
RSLINTAS

جدید ادب کا نمائندہ

ماہنامہ

الفاظ

شمارہ: اپریل ۱۹۸۳ء

کہانی نمبر

مدیر

جمیل اختر

قیمت فی پرچہ ——— چھ روپے

ایک سال کے لئے ——— پینتالیس روپے

پوسٹ بکس نمبر ۷۵۹۶ صدر کراچی ۳

فون: ۲۹۰۸۳۷ ——— ۶۸۰۱۰۶ ——— ۶۸۴۸۸۸

"قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات
میں اضافے اور تبلیغ کیلئے شائع کی جاتی ہیں ان کا احترام
آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو
صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں"

ترتیب

سرورق جمیل نقش

کہانیاں

الفاظ کراچی ۱۱

۴ بڑے شہروں سے
بین الاقوامی پروازوں کا نیا سلسلہ

پی آئی اے کا بنیادی ذریعہ اپنے مسافروں کو تمام تر سہولتیں فراہم کرنا اور اپنی کارکردگی کا خود ہی جائزہ لے کر اسے بہتر سے بہتر بنانا ہے۔ نئے اقدامات کے تحت موجودہ پروازوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ پی آئی اے کی بین الاقوامی پروازوں کا نیا سلسلہ چار بڑے شہروں سے بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ اس طرح پی آئی اے نے آپ کیلئے سفر کو آسان تر بنانے کی جو پہل کی ہے وہ فضائی سفر کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

سفر کے آغاز سے سفر کے اختتام تک — پی آئی اے اپنی مسافر نوازی کا معیار بلند سے بلند تر کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ پی آئی اے کی اعلیٰ کارکردگی پر مسافر اعتماد کرتے ہیں کیونکہ پروازوں کے اوقات، کمپیوٹر کے ذریعے سیٹوں کی بکنگ، خوش اخلاق عملے کی پرخلوص میزبانی اور کراچی، اسلام آباد، لاہور اور پشاور سے بین الاقوامی پروازوں کا نیا سلسلہ اس امر کا شاہد ہے کہ پی آئی اے شب و روز اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے مسلسل کوشاں ہے۔

پی آئی اے PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ - لاجواب پرواز

پی آئی اے — روز بروز
خوب سے خوب تر

سیپ شمارہ ۴۵ کی تحریریں

افسانے، ۱۴

• رضیہ فصیح احمد • کلام حیدری • میرزا ریاض • جوگندر پال • رحمٰن شاہ عزیز • رشید امجد
• مشرف احمد • احمد جاوید • سلطان جمیل نسیم • مرزا حامد بیگ • فردوس حیدر • قدسیہ انصاری
• علی امام نقوی • رفعت کیانی

شخصیت، ۱

• جوشؔ، کچھ یادیں کچھ باتیں ــــ سید مقصود زاہدی

مضامین، ۶

• قمر جمیل • فتح محمد ملک • محب عارفی • مستنصر حسین تارڑ • نجیب جمال • جمیل اختر

غزلیں، ۱۱۱

• فراق گورکھپوری • رئیس فروغ • شان الحق حقی • شمس زبیری • فارغ بخاری • احمد ہمدانی
• صبا اکبر آبادی • انجم اعظمی • جمیل ملک • محسن احسان • شاہد عشقی • نکہت بریلوی
• ثمر نظامی • ساقی امروہوی • رفعت سلطان • افسر ماہ پوری • جمیل عظیم آبادی • جعفر شیرازی
• ندا فاضلی • شبنم رومانی • مظہر امام • انور حسین صدیقی • کیف انصاری • ع۔ سلام
• رام ریاض • احمد رئیس • سلیم کوثر • عابد وسیم • شاہدہ تبسم • شوکت ہاشمی
• خواجہ رضی حیدر • گلزار بخاری • تاجدار عادل • محمد فیروز شاہ • سیما احمد • لطیف ساحل
• احمد شریف • جان کاشمیری • ن۔م۔ دانش • عنبر زیدی • صفدر صدیق رضی • رفعت ظفر
• اختر ہوشیارپوری • رفعت القاسمی • جمال احسانی

نظمیں، ۶۴

• فارغ بخاری • زہرا نگاہ • احمد ظفر • انجم اعظمی • شاہد عشقی • سرشار صدیقی
• قمر جمیل • افسر ماہ پوری • ادیب سہیل • اطہر قادری • حسن اکبر کمال • پروین شاکر
• شاہین • انور زاہدی • جمیل عظیم آبادی • شاہدہ تبسم • احسن سلیم • ماہ طلعت زاہدی
• نجم الحسن عطا • احمد فاخر • ن۔م۔ دانش • شاہین ملک • شفیق احمد شفیق • رضیہ انوار رضی

تبصرے، ۵۵

• حسن اکبر کمال • مشرف احمد • اشتیاق طالب • عابد وسیم • علی حیدر ملک • نسیم نیشو فوز

دوسری زبانوں کی کہانیاں

بیری پین
نیر مسعود

شجر الموت

وہ ہمیشہ مجھ کو شام کے ٹھنڈے دھندلکے میں دکھائی دیتی تھی اس وقت وہ دوسری عورتوں کے ساتھ دریا پر سے واپس ہوتی تھی۔ میرے لیے وہ لمحہ بڑا قیمتی ہوا کرتا تھا جب وہ جو دن بھر میرے دل میں رہتی تھی ۔ آخر کار میری نظروں کے سامنے آجاتی ۔ کبھی کبھی وہ بہت جلد میری نگاہوں سے اوجھل ہو کر اپنے گھر کے اندر چلی جاتی، اور کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ایک کچی مکان کی دیوار کے پاس بیٹھا راوی داستان سناتا اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ مکان کے زینے پر سمٹ کر بیٹھی ہوئی داستان سنا کرتی ۔ اور میں بڑے اشتیاق سے دیکھتا تھا کہ داستان کا عکس اس کی آنکھوں میں یوں جھلک رہا ہے جیسے گہرے پانی میں درختوں کا عکس پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ میرے برابر برابر چلنے لگتی اور میرے ساتھ باتیں کرتی ۔ سرخوشی اور مہجوری کی یہ شامیں مجھ کو بہت دنوں تک یاد آیا کرتیں۔

اور آخر ایک دن میں راوی کے پاس جا پہنچا ۔ اس کا رنگ سیاہ تھا اور اس کا تعلق ہماری نسل سے نہیں تھا۔ وہ کسی دور دراز سرزمین کا باشندہ تھا اور کئی مہینے تک دریا کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا یہاں پہنچا تھا ۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ اپنی جان بچا کر وطن سے فرار ہوا تھا۔

"راوی!" میں نے اس سے کہا، "آج شام آکر ہمیں کہانیاں سنانا ۔" اس نے فوراً ہاتھ ہلا کر انکار کر دیا ۔ لیکن جب اس نے وہ تحفے دیکھے جو میں اس کے واسطے لایا تھا تو راضی ہو گیا ۔ اور میں نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ میری آنکھیں اس کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھیں اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ آج شام بھی میرے قریب سے ہو کر نکلتی چلی جائے ۔

اور جب اس سیاہ رنگ راوی نے اپنے عصا کی نوک سے ریت پر لکیریں کھینچ کھینچ کر اپنے دور افتادہ وطن کے قصے چھیڑے تو سننے والوں کے حلقے میں وہ بھی تھی ۔ اور میں اسے تکے جا رہا تھا ۔ میری حالت اس انسان کی سی تھی جو پیاس سے بے جان ہو اور بہت دور پر اسے پانی دکھائی دے رہا ہو ۔

اور اس دن راوی نے ہمیں ایک درخت کے بارے میں بتایا جسے شجر الموت کہتے ہیں ۔ اس نے بتایا کہ اس کا بیج چاندی کی طرح چمکتا ہے اور جسامت میں ایک مٹھی کے برابر ہوتا ہے ۔ اگر اس بیج کو زمین میں دبا دیا جائے تو دو سال تک وہ یوں ہی دبا پڑا رہتا ہے ۔ اور پھر معجزے کا ظہور ہوتا ہے ۔ پھر آفتاب کے طلوع اور غروب کے درمیان شجر الموت پورا درخت بن جاتا ہے ۔ وہ ناقابل یقین سرعت کے ساتھ بڑھتا ہوا دو قدِ آدم کے برابر ہو جاتا ہے، اور پھر مر جاتا ہے اور اپنی اس مختصر زندگی میں شجر الموت کسی انسان کا

خون پینا چاہتا ہے۔ وہ ہر طرف اپنی لوجھل خوشبو پھینکنے لگتا ہے۔ یہ خوشبو نیند لاتی ہے اور موت بھی۔ اور وہ اپنی برزتی ہوئی اور اینٹھتی ہوئی جٹاؤں سے اپنے شکار کو جکڑ لیتا ہے۔ اور اس کی ہر جٹا میں کتنے ہی دہانے ہوتے ہیں، اور ان میں کا ہر دہانہ اسی طرح انسان کا خون چوستا ہے جس طرح جونک کا منہ خون چوستا ہے۔

اور اسی سلسلے میں اس نے ہمیں ایک بے وفا عورت اور ایک مرد کے دیر گیر انتقام کی کہانی سنائی۔ اس مرد نے رات کے وقت چپکے سے اپنی بیوی کے عاشق کے باغ میں شجر الموت کا بیج گاڑ دیا لیکن دو برس بعد جب درخت نکل آیا تو اس نے اس دوسری عورت کا خون چوس لیا جس کی خاطر عاشق نے بیوی کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس عورت کی ستی ہوئی رنگ باختہ لاش باغ میں پائی گئی۔ اور یہ لاش شجر الموت کے پژمردہ اور کمھلاتے ہوئے باقیات کے انبار میں دبی ہوئی تھی اور مزید برآں یہ کہ وہیں پر تین رو پہلے رنگ کے بیج ملے جو اسی شجر الموت سے نکلے تھے۔

"اور اب تمام عالم میں" وہ سیاہ رنگ راوی بولا "شجر الموت کے بس یہی تین بیج باقی رہ گئے ہیں۔ اور چونکہ ان میں اتنا شر پنہاں ہے اس لیے ابھی تک انھیں بویا نہیں گیا ہے۔" یہاں پر راوی نے دوبارہ اپنے ہاتھوں کی انگلیاں پھیلائیں اور سمیٹ لیں، "ہاں! اس کے بعد سے اب تک بیس مرتبہ دریا چڑھا اور اترا ہے اور ابھی پانچ برس تک اور ان بیجوں کی حفاظت کرنا ہے، تب کہیں جا کر ان کی قوت نمو، جو قوت شر ہے، زائل ہوگی۔ اور تب وہ بے ضرر کھلونے ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر کبھی کسی مرد یا کسی عورت کو شجر الموت کا طلسم دیکھنے کو نہ ملے گا۔"

میں نے اس کی کہانی کو مختصر کر کے بیان کر دیا ہے اس نے سب کچھ بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا تھا۔ اس نے اپنے الفاظ سے واقعات کی ایسی زندہ تصویریں کھینچی تھیں کہ ہم کو سب کچھ اپنے سامنے ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اور گفتگو کا ایک ایک لفظ سنائی دے رہا تھا۔ اور اس دوران میں سارے وقت میری نظریں اس عورت پر جمی رہیں جس سے میں بے سود محبت کرتا تھا۔ وہ کسی سحر زدہ کی طرح اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ارغوانی پھول تھا جس کو اس کی انگلیاں مسلسل نوچ نوچ کر پھینک رہی تھیں۔ سرخ پنکھڑیاں ریت پر گرتی ہوئی خون کی بوندیں معلوم ہو رہی تھیں اور اس شام ڈوبتا ہوا سورج بھی خون کی طرح سرخ تھا۔

اور جیسے ہی راوی نے قصہ ختم کیا، صحرا میں ایک گیدڑ نے چیخ ماری، اور اسی وقت ایک لڑکے نے قہقہہ لگا کر کہا کہ بڈھا جھوٹ بہت اڑاتا ہے۔

کتے کی اولاد! میں جھوٹ نہیں بولتا،" راوی بھڑک کر بولا" میں وہی بتا رہا ہوں جو میں نے خود دیکھا ہے اور جس کا مجھے علم ہے۔ دیکھ! اس ہاتھ میں، اسی ہاتھ میں شجر الموت کا بیج رہ چکا ہے۔ ہاں، یقیناً" وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔

"وہ میں نہیں تو کون تھا،" اس نے کہا "جس نے اپنے رقیب کے باغ میں وہ بیج بویا تھا"

ہم سب پر خاموشی طاری ہو گئی، اور وہ مڑا اور رخصت ہو گیا اور اب اس شام پہلی بار اس عورت نے میری طرف دیکھا اور اس کے ہاتھوں نے ایک مبہم سا اشارہ کیا تو میں اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے لب دریا تک پہنچ گیا۔ اور وہاں ہم دیر تک بیٹھے ہوئے چاند کی روشنی میں باتیں کرتے رہے۔

"تم میری بڑی تعریفیں کرتے ہو اور کہتے ہو کہ میں بہت حسین ہوں،" وہ کہنے لگی، "ہو سکتا ہے ایسا نہ ہو، لیکن یہ سب سننے میں بڑا اچھا لگتا ہے۔ تم نے میرے باپ کو بہت سے تحفے لا کر دیئے اور تحفے لینا بھی بڑا اچھا لگتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں تم نے بوڑھے راوی کو

بھی کچھ انعام ضرور دیا ہے اس لیے کہ اس نے دوسروں کے مقابلے میں تمہارا لحاظ بہت کیا اور یہ سب سے اچھی بات ہے، اس لیے کہ ہر دن دوسرے دنوں کی طرح ہوتا ہے اور ہم ایک ہی طرح چکر کاٹتے ہیں جیسے رہٹ چلانے والا بیل آنکھوں پر پٹی بندھوائے باغ کے لیے پانی کھینچتا رہتا ہے، کھینچتا رہتا ہے لیکن کہانیاں سنتے وقت ہم کئی کئی طرح سے جیتے ہیں اور ہر دم بدلتے رہتے ہیں لیکن پھر۔ پھر تم مجھ سے محبت جتاتے ہو اور چاہتے ہو کہ میں بھی تم سے محبت کروں۔ مگر ایسی چیز کوئی کسی کو کیونکر دے سکتا ہے جو اس کے پاس موجود ہی نہ ہو۔ دوسرے لوگ بھی مجھ سے اسی طرح محبت کی باتیں کرتے ہیں اور انھیں بھی یہی جواب ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میری عمر کا قصور ہو کیونکہ ابھی میں بہت چھوٹی ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی دن میرے اندر بھی یہ آگ بھڑک اُٹھے۔ لیکن ابھی جب تم مجھ سے محبت کی باتیں کرتے ہو تو مجھ کو یوں لگتا ہے جیسے میں کسی ایسی لکھائی کو دیکھ رہی ہوں جسے پڑھنا مجھے نہیں آتا لیکن پھر بھی۔ پھر بھی۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"بولتی رہو۔ تمہاری آواز بڑی اچھی لگ رہی ہے۔"

"میں اس کہانی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ پوری کہانی چاہے سچّی نہ ہو لیکن اس میں کچھ سچائی ضرور ہے میں تمہیں اس کی وجہ بتاتی ہوں جو میں نے آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ دو برس ہوئے ایک بوڑھی عورت اپنے مکان میں دم توڑنے کے قریب تھی۔ اور جن لوگوں کو اس کے سرہانے رہنا چاہیے تھا وہ ڈر کے مارے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے تو میں اس کے لیے دریا پر سے پانی لے گئی۔ اس نے بہت تڑپ کر پانی پیا اس لیے کہ اسے تپ چڑھی ہوئی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ اپنے بائیں ہاتھ کے چلّو میں پانی بھر کر اس کی آنکھوں کے قریب کروں تاکہ وہ اسے دیکھ سکے اور وہ اس پانی کو اتنی دیر تک دیکھتی رہی کہ میرا ہاتھ کپکپانے لگا۔ پھر اس نے وہ بات کہی جو میں نہ کبھی بھول سکی نہ کسی کو بتا سکی۔ اس نے کہا تھا۔

"مرتی ہوئی آنکھ نے ہونی کو دیکھ لیا۔ اور جو میں کہتی ہوں وہ ہو گا۔ سن! تیرا محبوب تیرے پاس یوں آئے گا کہ اس کے ہاتھ میں ایک گولا ہو گا جو چاندی کا نہ ہو گا لیکن اس کا رنگ چاندی کا سا ہو گا۔ اور اس گولے میں زندگی ہو گی اور موت ہو گی۔"

"آج رات مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ گولا شجر الموت کا بیج ہے۔ پتا نہیں وہ بیج کہاں ہو گا۔ بوڑھے نے بتایا تھا کہ اس کی بڑی حفاظت کی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بیج کو لانے کے لیے لمبا اور کٹھن سفر کرنا پڑے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی خاطر خون بہے اور یہ بھی کہ اس کا سودا بہت مہنگا پڑے لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جس دن تم اپنے ہاتھ میں شجر الموت کا بیج لیے ہوئے آؤ گے تو میرے دل میں تمہاری محبت کی آگ بھڑک اُٹھے گی، میرا سر تمہارے آگے جھک جائے گا، میری آنکھوں میں نشہ چھا جائے گا، اور میرا سب کچھ تمہارا ہو جائے گا۔

اور جب میں بولا تو میری آواز اچانک بیٹھ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہی بات تم نے کسی اور سے تو نہیں کہی؟"

"بتا یا نا کہ تم پہلے آدمی ہو جس سے میں نے یہ بات کہی ہے۔ اور اگر تم قسم کھا کر کہو کہ مجھ کو وہ روپہلا بیج لا دو گے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس وقت تک یہ بات کسی اور سے نہ کہوں گی جب تک تم کوشش کر کے ہار نہ جاؤ۔ میں نے اس کام کے لیے تم کو کئی وجہوں سے چنا ہے۔ تم شریف آدمی ہو اور جب میرا حُسن جاتا رہے گا اور تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو گے تب بھی تم مجھ پر ظلم کرنا شروع نہیں کرو گے۔ تم اتنے رئیس نہیں ہو جتنے میرے بعض دوسرے طلب گار ہیں لیکن پھر بھی تم خرچ کرتے ہیں ان کی طرح کنجوسی نہیں دکھاتے۔ تم نے راوی کو انعام بھی تو میری ہی خوشی کے لیے دیا تھا نا؟"

"تمہاری خوشی کے لیے۔ اور اپنی خوشی کے لیے بھی۔ کیونکہ تمہیں خوش دیکھ کر میں بھی خوش ہوتا ہوں۔"

میرا بھی یہی خیال تھا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے شجر الموت کا حال کبھی معلوم نہ ہوتا۔ اور اپنے مقدر کے راز کا بھی پتا نہ چلتا۔ اور

حالانکہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے ۔ ذرا بھی نہیں پھر بھی میں سب سے پہلے تمہارے ہی پاس آئی لیکن اگر تمہیں یہ کام مشکل یا خطرناک معلوم ہوتا ہو تو:
"نہیں نہیں، ٹھہرو!" میں نے کہا "یقین کرو میرے دل میں دم بھر کے لیے بھی کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوا ۔ وہ روپہلا بیج دنیا میں کہیں بھی ہو، میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اسے ڈھونڈھ نکالوں گا اور تمہارے پاس لے آؤں گا ۔ اس سے مجھے موت کے سوا کوئی شے روک نہیں سکتی یہ
"بس یہ بہت ہے"۔ وہ بولی " اور تم اسے کب تک لے آؤ گے ؟"
" ابھی کہہ نہیں سکتا کہ اس میں کتنی دیر لگے گی ۔ اگر اس میں ایک سال لگ جائے تو کیا تم اتنے تک میرا انتظار کر لوگی ؟"
" ہاں، ایک سال تک ۔ لیکن میں نے بہت دیکھا ہے کہ محبت پانی کی طرح اُڑ جاتی ہے ۔ اگر دیکھنا کہ بیج ہاتھ آ جانے کے بعد تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی تو اسے میرے پاس مت لانا کیوں کہ اس وقت کہیں ایسا نہ ہو کہ بیج کے ساتھ دکھ چلے آئیں"۔
میں نے پاس بہتے ہوئے دریا کی طرف اشارہ کیا ۔
دریا ہمیشہ بھاگتا رہتا ہے" میں نے کہا " لیکن دریا ہمیشہ اپنی جگہ پر موجود رہتا ہے ۔ میرے دل میں تمہاری محبت بھی دریا کی طرح ہے"۔
جب ہم رخصت ہونے لگے تو میں نے اس سے پوچھا :
" تو تم چاہتی ہو کہ تمہیں شجر الموت کا بیج مل جائے ؟"
" میرے لیے" اس نے کہا، "بس وہ مقدر کی ایک نشانی ہے، اور کچھ نہیں ۔ اگر تم ہی اسے لے آئے تو میں تم سے محبت کرنے لگوں گی ۔ اگر تمہارے مقدر میں اسے لانا نہیں ہے تو کوئی اور لائے گا، اور پھر میں اسی سے محبت کر دوں گی ۔ اور رہا خود وہ بیج ۔ تو وہ فتنے سے بھرا ہوا ہے اس لیے میں اسے آگ میں ڈال دوں گی ۔ یا ہو سکتا ہے" اس نے مجھے نظر بھر کر دیکھا، " میں اسے اپنے پاس ہی رکھے رہوں یہاں تک کہ اس کا اثر ختم ہو جائے ۔ تب میرے بچے اس سے کھیلا کریں گے"۔
اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی ۔ خوشی اور غم کے درمیان میرے خیالات اس گیند کی طرح بھٹک رہے تھے جس کو کھلاڑی اِدھر اُدھر پھینکتے رہتے ہیں ۔ خوشی اس بات کی تھی کہ آج اس نے میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کیں، اور اس نے ایک راز بتانے کے لیے مجھ پر بھروسہ کیا، اور اس نے خود اپنی مرضی سے مجھے اس کا موقع دیا کہ میں اس کی محبت حاصل کر سکوں ۔
غم اس کا تھا کہ اس کو اب بھی مجھ سے محبت نہیں تھی، اور یہ کہ اگر میں اپنی مہم میں ناکام رہا تو وہ مجھ سے کبھی محبت نہیں کرے گی ۔ تو وہ کسی اور سے محبت کرے گی ۔ بلکہ نہیں ۔ راوی نے تو یہ بتایا تھا کہ شجر الموت کے تین بیج موجود ہیں ۔ تو پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اگر ایک بیج میں حاصل کر لوں تو کوئی دوسرا شخص بھی ایک بیج پا جائے اور پھر زیادہ تیز رفتاری سے یا کسی مختصر راستے سے سفر کر کے میری محبوبہ کو مجھ سے چھین لے جائے علاوہ بریں، خواہ میں اس مہم میں اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیتا لیکن اگر میرے مقدر میں اس کی محبت نہیں تھی تو میری ناکامی یقینی تھی اور اگر وہ میری قسمت میں تھی تو چاہے میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہتا اور کوئی خطرہ مول نہ لیتا، بہر حال مشیت کا نادیدہ ہاتھ میرے ہاتھ میں شجر الموت کا روپہلا بیج لا کر رکھ دیتا اور اس طرح سوچتے سوچتے میں اس پرانے مقولے کا قائل ہونے لگا جو سنگ خارا کی طرح قدیم اور مضبوط اور سفاک ہے کہ جو لکھ دیا گیا وہ لکھ دیا گیا اور جو ہوتا ہے وہ ہوتا ہے ۔
یہ سب سہی، لیکن اگر مجھ کو وہ عورت نہ ملتی تو سونا اور جواہرات اور مویشیوں کے گلّے اور سرسبز کشت زار میرے کس کام کے تھے اس کے بغیر زندگی ہی کی کیا قیمت تھی ۔ لہٰذا میں نے طے کر لیا تھا کہ سب کچھ داؤں پر لگا دوں ۔ آخر میں نے خود بھی دیکھا تھا اور کتنی ہی داستانوں میں سُنا تھا کہ جو اپنی مرضی سے کوئی بڑی قربانی دیتا ہے ۔ اس کو پایان کار اس کا صلہ ضرور ملتا ہے ۔

اُمید کے مطابق سیاہ فام بوڑھا مجھے بستر پر لیٹا ہوا ملا گو طلوعِ آفتاب کو کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ وہ ہمیشہ کا کاہل تھا، حالانکہ اب بھی اس میں کام کرنے کی سکت موجود تھی۔ جو لوگ اتفاقیہ اس کی داستانیں سُن لیتے تھے وہ اس کو چھوٹے موٹے انعام دیا کرتے تھے لیکن اگر کوئی میری طرح خاص طور پر اس سے داستان سنواتا تو انعام بھی زیادہ ہوتا، اور اسی طرح اس کی روزی چلتی تھی۔

اور جب میں تیز دھوپ سے ہو کر اندر داخل ہوا تو شروع میں اس کی کُٹیا تاریک معلوم ہوئی۔ لیکن ذرا دیر بعد وہ مجھے اچھی طرح دکھائی دینے لگا۔ اور میں سمجھ گیا کہ جو لبادہ وہ پہنے ہوئے تھا اسے کسی نے دیا ہو گا اور وہ ڈھیلی چپلیں جو اس کے قریب ہی زمین پر رکھی ہوئی تھیں اُسے کسی سے ملی ہوں گی۔

اور صاحب سلامت کے بعد مَیں نے اس سے کہا:

" ایک بہت خاص معاملہ ہے۔ مَیں تمہیں اس کے بارے میں ابھی تفصیل سے بتاؤں گا، مجھے اس میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اگر تم میری مدد کر سکو تو مَیں اس کے انعام میں تم کو بہت قیمتی تحفے دوں گا۔ ذرا میرے باغ تک چلو، وہاں اطمینان سے گفتگو ہو گی۔ وہاں سایہ بھی خوب ہے اور نارنج کے پیڑ میں ابھی کچھ پھل بھی لگے ہوئے ہیں۔"

اِس پر اُس نے بڑے ادب کے ساتھ میری پاکیزہ نسبی کو شکوک سے بالاتر اور خود کو میرا خادم قرار دیا۔ اس نے بستر سے اُٹھ کر چپلوں میں پاؤں ڈالے اور انھیں زمین پر گھسیٹتا ہوا میرے ساتھ ہو لیا۔

نارنج کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اس نے قہوہ تو پی لیا لیکن پھل دوسرے وقت کے لیے اپنے لبادے میں رکھ لیے۔

" کل رات" میں نے اس سے کہا۔ " تم نے ہمیں شجر الموت کا حال بتایا تھا۔"

" اور اسی کی وجہ سے" وہ بولا۔ " آج سویرے ایک عورت میرے لیے نان اور قہوہ لائی۔ لیکن وہ قہوہ اتنا اچھا نہیں تھا جتنا یہ ہے۔"

" کیا وہ خوبصورت تھی؟"

" وہ لغزشِ عشق تھی! لیکن افسوس کہ اب میں بڈھا ہو گیا۔ خیر، جب میں کھا پی چکا تو باہر نکلا اور اس سگ زادے کو پکڑا جس نے مجھے جھوٹا کہا تھا اور چپل سے اس کی ایسی مرمت کی کہ وہ بلبلانے لگا، کس واسطے کہ میں نے تو ان چیزوں کا حال بتایا تھا جو رہ چکی ہیں اور اب بھی ہیں یہ ضرور ہے کہ میں ایسی چیزوں کی کہانیاں بھی سناتا ہوں جو ہو بھی سکتی ہیں۔ اور یہ کہانیاں سننے میں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ نو عمر لڑکے بزرگوں کو ذلیل کریں؟ خیر چھوڑیئے۔ براہ کرم یہ بتایئے کہ وہ کون سا معاملہ ہے جس میں آپ کو میری مدد مطلوب ہے؟"

" میں شجر الموت کے ان تین بیجوں میں سے ایک لانے جا رہا ہوں۔ اس کے بغیر میری زندگی اور جو کچھ مال و متاع میرے پاس ہے سب ہیچ ہے۔ اور یہ تم ہی بتا سکتے ہو کہ اس کے لیے مجھے کہاں جانا اور کیا کرنا ہو گا۔"

" اگر کوئی آدمی پوری رفتار سے بے محابا سفر کرے تو وہ چار مہینے میں یہ مسافت طے کرے گا۔"

" تو پھر مَیں چار مہینے میں یہ سفر پورا کر لوں گا۔"

" مگر راہ کے خطرے بھی تو ہیں، رہزن، درندے۔"

" مجھے ان کا خوف نہیں" اور میں نے اسے خنجر دکھایا جو میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

" لیکن آپ کو اس ملک میں جانا ہو گا جہاں اجنبیوں پہ شبہ کیا جاتا ہے۔ اور جس جگہ وہ پہلے بیجوں کو محفوظ کیا گیا ہے۔ وہاں تو کوئی اجنبی قدم ہی نہیں رکھ سکتا اور ان بیجوں کی حفاظت کے لیے تین پہرے بیٹھے ہیں۔ پہلے تو پہرے داروں کا ایک بڑا حصار ہے، پھر اس

ے اندر دوسرا، اور اس کے اندر تیسرا حصار، تو یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اپنے بدن کو رنگ کر میرے بدن کی طرح سیاہ کر لیں، لیکن نہ آپ
ن لوگوں کی زبان بول سکتے ہیں، نہ آپ کو اُن کے طور طریقے معلوم ہیں اور اگر آپ زور زبردستی سے کام نکالنے کی کوشش کریں گے تو
پ کو تن تنہا ایک انبوہ سے ٹکر لینا پڑے گی۔ غرض یہ کہ اگر آپ نے یہ سفر کیا تو دو باتیں یقینی ہیں۔ ایک یہ کہ آپ دو پہلے بیجوں کو
یہ بھی نہ سکیں گے، دوسری یہ کہ بہت جلد آپ ہلاک ہو جائیں گے۔"
"تم اس سے بہتر کسی اور طریقے سے میری مدد نہیں کر سکتے؟"
"ہوسکتا ہے اس کی بھی کوئی صورت نکل آئے آپ نے سچ کہا کہ یہ بڑا خاص معاملہ ہے۔ اس میں بہت غور و فکر اور ناپ تول کی ضرورت
ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں واپس جاؤں اور اس معاملے میں غور کروں۔ کل پھر اسی وقت آپ کے پاس آؤں گا۔"
میں نے اسے انعام دے کر رخصت کیا۔ اس کے لبادے میں بہت سے پھل تھے جن کی وجہ سے لبادہ عجیب طریقے پر پھول گیا تھا۔
اور دوسرے دن وہ میرے پاس واپس آیا اور کہنے لگا۔
"ایک اور صرف ایک راستہ ہے۔ ممکن ہے اس طرح آپ کو وہ شے مل جائے جس کی آپ کو تلاش ہے لیکن اس کا مل جانا ضروری
ی نہیں۔ اگر آپ یہ راستہ اختیار کرنے پر تیار ہوں تو اس کے لیے دو باتیں لازمی ہیں۔ اول یہ کہ آپ کو مجھ پر پورا پورا بھروسہ کرنا پڑے گا،
نا بھروسہ اپنے سگے بھائی پر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ۔ دوم یہ کہ اس میں خرچ بہت زیادہ بیٹھے گا۔ اتنا کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے
ا میں سے آپ کے لیے بہت کم بچ پائے گا۔"
"اور تمہیں یقین ہے کہ بس یہی ایک راستہ ہے؟"
"تو میں نے اسے چن لیا۔ اب مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔"
"آپ تو وہاں جا نہیں سکتے لیکن آپ کی طرف سے میں جا سکتا ہوں اور میں جانا چاہتا بھی ہوں۔ بیس برس تک میں اس چھوٹی سی
تی میں ایک اجنبی کی طرح بسر کر چکا ہوں، اور اب میری زمین مجھے پکار رہی ہے۔ میں اپنے ہم وطنوں کی زبان اور ریت رواج سے واقف
ں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں وہاں کے معبد کے سب سے اندر والے حصار کا پہرے دار رہ چکا ہوں، اور بہت سے ایسے راز جانتا
ں جو میری قوم کے دوسرے لوگوں پر ظاہر نہیں ہیں۔ اگر شجر الموت کے بیج تک کوئی انسانی ہاتھ پہنچ سکتا ہے تو میں بھی اس کو حاصل کر سکتا
ں۔ لیکن اس کے لیے مجھے کچھ آدمیوں کو اُجرت پر لینا ہوگا اور وہ آدمی معمولی اُجرت کو خاطر میں نہیں لائیں گے۔"
"واپس کب آؤ گے؟"
"میری روانگی کے نویں مہینے خواہ میرے ہاتھ سے خواہ کسی معتبر قاصد کے ذریعے آپ کو وہ پہلا بیج مل جائے گا۔"
"یہاں تک تو غنیمت ہے کہ میں تم پر بھروسہ کر لوں کیونکہ تم سے کم از کم میں واقف تو ہوں، لیکن کیا مجھے کسی ایسے قاصد پر بھی اعتبار کرنا
ے گا جو میرے لیے قطعاً اجنبی ہو؟"
"آپ اس پر بلا خوف و خطر اعتبار کر سکتے ہیں اس لیے کہ اس کی آدھی اُجرت اُس وقت تک رُکی رہے گی جب تک وہ آپ کے ہاتھ
ر وہ پہلا بیج رکھ نہ دے۔ علاوہ بریں اسے یہ بھی علم ہوگا کہ اگر اس نے کسی قسم کی گھات کی تو نہ صرف اس کی جان لے لی جائے گی بلکہ اس
ل اس محبوب ترین ہستی کو بھی قتل کر دیا جائے گا جسے اس نے وطن میں ضامن کے طور پر چھوڑا ہوگا۔"
"یہ سفر بہت سخت ہوگا۔ اور تم اتنے بوڑھے ہو چکے ہو۔"
"میرے اندر ابھی کافی قوت محفوظ ہے کیونکہ میں نے زیادہ محنت سے خود کو دور رکھا ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں دو طرح کے لوگ

بہت تیزی سے سفر کرتے ہیں: وہ نوجوان جو اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا ہو، اور وہ بوڑھا جو اپنے وطن لوٹ رہا ہو۔"

راستے میں تمہارے لٹ جانے کا اندیشہ تو نہیں ہے؟ تمہارے ساتھ اپنی خاصی دولت ہوگی۔"

"اگر میں باربردار اونٹوں کی قطار ساتھ لے کر کسی رئیس التجار کی طرح سفر کروں تو البتہ راہ میں بڑے خطرے ہیں لیکن میں ساری دولت اپنی کمر میں لپیٹ لوں گا اور دیکھنے میں قلاش معلوم ہوں گا۔ اس کا خطرہ ضرور ہے کہ دوران سفر کسی حیلے سے مجھے موت آ جائے۔ لیکن آپ کو اور مجھ کو اتنا خطرہ تو مول لینا ہی ہے۔"

"تمہیں اس کا یقین کیونکر ہے کہ تم کو روپہلے بیج مل جائیں گے۔ جب یہ طے ہے کہ ان بیجوں کی نہاد میں شر ہے تو وہ ضائع نہ کر دیے گئے ہوں گے؟"

"نہیں۔ اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ ان کے شر کو اپنی موت مرنا چاہیے۔ اور جو لوگ انھیں ضائع کریں گے وہ اور بھی بدتر قسم کا شر پیدا کریں گے۔ اور اس شر کی زد خود ان کے سروں پر پڑے گی۔"

"جب تم نے وہ بیج اپنے رقیب کے باغ میں بویا تھا، کیا اس زمانے میں بھی اسے معبد ہی میں رکھا جاتا تھا؟ تو پھر تم اسے حاصل کرنے کے لیے اتنی دولت کہاں سے لائے ہو گے؟"

"معبد پر نگہبانوں کی تہری چوکی بیٹھی تھی اور میں سب سے اندر والے درجے کا نگہبان تھا۔ لیکن بیج اس زمانے میں وہاں نہیں تھا، نہ کسی کو اس کی تاثیر کا علم تھا سوائے میرے۔ جب میں نے اسے بو دیا، اس کے دو برس بعد لوگوں پر اس کی تاثیر ظاہر ہوئی۔ میں نے اسے ایک اور ہی طریقے سے حاصل کیا تھا، اور وہ طریقہ کیا تھا، براہ مہربانی یہ مت پوچھیے گا، کیوں کہ وہ طریقہ میرے لیے بڑا شرمناک تھا۔"

اور بہت سے سوال میں نے اس سے پوچھے اور ہر سوال کا فوری جواب اس کے پاس تیار تھا۔ اور میں خود تو کوئی فیصلہ کرنے کے قابل تھا ہی نہیں، کیونکہ میرے ذہن میں اپنی مطلوبہ کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ لٰہذا میں نے ہر معاملے میں وہی کیا جو بوڑھے نے کہا:

اس کے بعد کئی روز تک میں اپنے مقبوضات فروخت کرتا رہا یہاں تک کہ اس سیاہ مرد نے کہا "بس، اتنا کافی ہے۔" پھر میں اس کے ساتھ تین دن کا سفر کر کے ایک قصبے میں پہنچا جہاں بڑی منڈی لگتی تھی۔ لیکن ہمارا کام منڈی میں نہیں بلکہ جوہریوں کی کوٹھی میں تھا جہاں ہم نے الماس، زمرد اور موتی خریدے اور موتیوں میں ایک جوڑی ایسی تھی جس کے دونوں دانے جسامت اور شکل اور وزن اور آب میں ہو بہو ایک دوسرے کی نقل تھے۔ جب راوی اس خزینے کو اپنی کمر میں لپیٹنے کی ایک پٹی میں باندھنے لگا تو اس نے ان جڑواں موتیوں میں سے ایک میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور مجھے اس کی حفاظت کی سخت تاکید کی۔

"یہ اس لیے" اس نے کہا، "کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور زیادہ امکان اسی کا ہے کہ میں اپنے آبائی وطن ہی میں مرنا پسند کروں۔ جس قاصد کے ہاتھ میں روپہلا بیج بھیجوں گا اسے میرے قبیلے کا حلفِ کبیر اٹھا کر سوگند کھانی ہوگی کہ وہ اپنا فرض پورا کرنے میں کوئی کوتاہی، کوئی دغابازی اور کوئی نافرمانی نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص یہ حلف اٹھائے اور پھر اپنی سوگند توڑ دے تو اس کو روئے زمین پر کہیں بھی ہمارے فوری اور بھیانک انتقام سے پناہ نہیں مل سکتی۔ اسی لیے میرے قبیلے کا کوئی شخص اس وقت تک یہ حلفِ کبیر نہیں اٹھاتا جب تک اسے بھاری انعام ملنے کا یقین نہ ہو۔"

"انصاف کی بات ہے" میں نے کہا۔

"اس لیے جب وہ بیج لے کر روانہ ہوگا تو میں اس کو جوڑی میں کا ایک موتی دوں گا۔ اور جب وہ آپ کے پاس پہنچ کر روپہلا بیج آپ کے ہاتھ میں دے دے گا اس وقت آپ دوسرا موتی دے دیجیے گا۔ تب وہ واپس آ کر مجھے دونوں موتی دکھائے گا اور یہی اس بات

بچان ہوگی کہ اس نے اپنی قسم پوری کی اور تب میں اسے حلفِ کبیر سے آزادی کی تحریر لکھ کر دوں گا۔ تب وہ موتیوں کو فروخت کرے گا اور اپنے یوی اور مکان حاصل کرے گا اور تب میں بھی سکون کے ساتھ مرسکوں گا۔"

اور اس نے بھورے بادبانوں والی ایک کشتی سے معاملت کی۔ یہ کشتی موافق ہوا میں قریبی گاؤں تک گنّا لے کر جارہی تھی۔ اور راوی کشتی ذ معمولی سا معاوضہ دے کر گنّے کے انبار پر دراز ہوگا۔ اور دھیرے دھیرے میری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ دن بھر اس کو کشتی میں سونا تھا ات کو کشتی سے اتر کر ایک تیز رفتار اور خوش قدم خچر خریدنا اور رات بھر اس کی پیٹھ پر سفر کرنا تھا اور اسی طرح اس کو کسی نہ کسی طریقے سے آگے ے جانا تھا اور ہر موقع و محل کے لحاظ سے مناسب قدم اٹھانا اور اپنی فراست کو پوری طرح بیدار رکھنا تھا تاوقتیکہ اس کا سفر ختم نہ ہوجائے۔

جس روز سیاہ رنگ راوی رخصت ہوا اسی روز میں نے اپنی باقی ماندہ پونجی کا تخمینہ لگایا۔ میرے پاس بس میرا مکان اور خانہ باغ بچ رہا اور مہینے بھر کی خوراک کا ذخیرہ تھا۔ اس کے سوا سب کچھ۔ گلّے، کھیت اور وہ گنجینہ جو مجھے اپنے اجداد سے ورثے میں پہنچا تھا۔ سب کچھ چھوٹے ٹے پتھروں میں تبدیل ہوگیا تھا اور یہ پتھر ایک ایسے سیاہ مرد کی کمر میں لپٹے ہوئے مجھ سے دور ہوتے جارہے تھے جیسے دوبارہ دیکھنا میرے مقدر تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں جو ابھی تک دوسروں کو ملازم رکھا کرتا تھا اب شاید ایک مہینے کے اندر اندر خود دوسروں کی ملازمت کیے ؛ رہ پاؤں گا۔

میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ان حالات سے سراسیمہ ہو کر گریبان پھاڑ لیتا اور اپنی اس حماقت کو کوستا جس کی بدولت اسے یہ تباہی دیکھنا پڑی ،میرے لیے یہ سب کچھ مسرت کا سرچشمہ تھا۔ میں خود سے کہتا " اب صحیح معنی میں، میں نے اپنی خوشی سے ایک بڑی قربانی دی ہے۔ اور انجام کار میری بر آئے گی۔"

اور اس شام اپنے معمول کے مطابق میں اپنی محبوبہ کے دریا پر سے لوٹنے کی راہ دیکھ رہا تھا اور جب وہ میرے قریب سے ہو کر نے لگی تو اس نے اشارے سے مجھے انتظار کرنے کو کہا۔ اور پانی کا مرتبان اپنے باپ کے مکان پر پہنچا کر وہ واپس میرے پاس آئی۔

جس رات ہم نے شجر الموت کی کہانی سنی تھی اور پھر دریا کے کنارے بیٹھ کر باتیں کی تھیں اس کے بعد سے آج پہلی بار وہ مجھ سے ب ہوئی تھی۔

ادھر کچھ دن سے" اس نے کہا" میں تمہارے اور بوڑھے راوی کے بارے میں بہت سی بیوقوفی کی باتیں سن رہی ہوں۔ جن ں کو ایک آدھ بات کا پتا ہے لیکن اصل راز نہیں معلوم وہ غلط سلط اندازے لگانے پر مجبور ہیں، مگر مجھے اصل راز معلوم ہے۔ جو جانتی ہوں سنو گے؟"

"تمہاری باتیں میرے لیے شیریں ترین موسیقی کی طرح ہیں۔"

" کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کالا آدمی دوسری بستیوں میں کہانیاں سنانے گیا ہوا ہے، اور یہ کہ ایک ایک کہانی پر وہ خوب خوب م سمیٹ رہا ہوگا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ کچھ دن کے لیے اپنے وطن چلا گیا ہے، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اپنی جو املاک بیچ ڈالی اس کے بدلے میں دوسری زمینیں اور مکان مول لینا چاہتے ہو اور یہ ڈھاوی دیکھنے گیا ہے۔ اتنی بات تو سب جانتے ہیں کہ وہ چلا گیا اور آج رات اس کی کٹیا میں کوئی اور سوئے گا۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ اپنے وطن گیا ہے، لیکن یہ راز مجھی کو معلوم ہے کہ وہ تمہارے لیے بلا بیج لینے گیا ہے، حالانکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم خود جاؤ گے چاہے اس میں تمہاری جان ہی چلی جائے، تمہیں مجھ سے ایسی ہی محبت"

اور تب میں نے اس کو وہ سب کچھ بتا دیا جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ میں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا کہ بیشک میں خود جانے پر آمادہ تھا

اور یہ کہ میرا جانا کیوں نہ ہو سکا۔ اس پر وہ بولی :

" اگر کوئی مرد کسی عورت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دے تو یہ اس کی محبت کی سب سے بڑی نشانی ہے، لیکن اگر وہ کسی اور آدمی کو خرید کر اپنی جگہ اُس کی جان خطرے میں ڈالے تو یہ اُس کے سیانے پن کی نشانی ہے۔ تاہم کئی باتوں میں تم نے مجھ سے کام نہیں لیا کیونکہ ہو سکتا ہے بڈھا مر جائے یا ہو سکتا ہے وہ چور ہو، اور اگر وہ بچ بھی جائے اور ایماندار بھی ہو، تب بھی ہو سکتا ہے کہ اسے روپہلا بیج مل ہی نہ سکے۔ اور اگرچہ اس کو بیج مل ہی جائے تب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسے تم تک پہنچا نہ سکے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھا جائے کہ میری خاطر تم نے کتنی بیوقوفیاں کی ہیں تو اس حساب سے بھی تمہاری چاہت کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ کچھ کم۔ تو اب اتنے دن تک کوئی نہ ہو گا جو مجھے کہانیاں سنائے اور ٹھنڈی شاموں کو میرے لیے گوارا بنائے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم نے مجھے پانے کے لیے جتنا خرچ کر دیا ہے، مجھے رکھنے کے لیے اتنا خرچ نہ لا سکو گے۔ اور میرے باپ نے مجھے تنبیہ بھی کی ہے، اور ــ"

یہاں پہنچ کر وہ رُک گئی اور اس کے ماتھے کی شکنیں غائب ہو گئیں اور وہ ہنسنے لگی۔

" اِن باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا اگر میرے مقدر میں تمہارا ہی ساتھ لکھا ہے تو یقیناً میں تم سے بہت محبت کرنے لگوں گی۔ اصل میں اس تیز ہوا نے مجھ پر ایسا اثر ڈالا کہ میں نے کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ اور اکیلی میں ہی ان جھکڑوں سے پریشان نہیں، دریا بھی پریشان ہے دیکھو تو کیا بپھر بپھر کر لہریں لے رہا ہے۔ اور ڈوبتا ہوا سورج بھی کتنا غضبناک معلوم ہو رہا ہے۔ آج رات کہیں نہ کہیں کہرام ضرور مچے گا اور بڑی تباہی آئے گی۔"

اور یہ اس نے سچ کہا تھا کیونکہ اسی رات بھونچال آ گیا۔ اس کے شور نے مجھے گہری نیند سے چونکا دیا بستی تک اس کا ہلکا سا جھٹکا پہنچا۔ میرے مکان میں دو مرتبان پاش پاش ہو گئے اور مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن مٹی کے تین مکان منہدم ہو گئے اور رات بھر لوگ چیختے اور دعائیں پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

میرا اندازہ تھا کہ زلزلے کا زیادہ زور صحرا پر صرف ہوا ہو گا۔ لہٰذا صبح ہوتے ہی میں نے اپنے خچر کو کسا اور سوار ہو کر یہ دیکھنے کو نکل کھڑا ہوا کہ رات صحرا پر کیا گذری۔ اب ہوا صاف اور ہموار ہو چکی تھی اس لیے یہ سفر بہت خوشگوار تھا۔ صحرا میں پہنچ کر ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا ٹیلا اپنی سابق جگہ سے ذرا سرک سا گیا ہے، اور اب اس کے حدود وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ میں اس کے قریب تک چلا گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ٹیلا تڑخ گیا ہے اور اس کے تڑخنے سے ایک زمین دوز مقبرے میں داخلے کا راستہ کھل گیا ہے۔

میں خچر پر سے اتر پڑا اور اس راستے پر کچھ دور تک بڑھتا چلا گیا، لیکن اندر ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ناچار میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کسی سے بیان نہیں کیا کہ مبادا دوسرے لوگ پیشقدمی کر کے مجھ سے پہلے وہاں جا پہنچیں۔

اور اس رات جب ساری بستی سو گئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میں پھر سوار ہوا، اس بار میرے ساتھ ایک پھاوڑا اور روشنی کا مناسب سامان بھی تھا اور وہ ساری رات میں نے مقبرے میں گذاری۔

میرا خیال ہے یہ شاہی نسل کے کسی فرد کا مقبرہ تھا۔ اس کے اندر کئی حجرے تھے جن کی دیواروں پر عجیب و غریب نقوش بنے ہوئے تھے یہ حجرے داخلے کے ایوان کے ارد گرد بنائے گئے تھے اور اسی ایوان سے خوبصورت اور کشادہ کیے ہوئے زینے نیچے اترتے تھے۔ یہ زینے ریت سے اَٹے ہوئے تھے اور کہیں کہیں پر لوٹے ہوئے ٹیلے کا ملبہ بھی حائل ہو گیا تھا۔ اور میں نے اپنی زندگی میں ایسا دفینہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ پیالے، تھالیاں، گھنٹیاں، مورتیاں سب کھرے سونے کی۔ اور ان کے علاوہ مرصّع زیورات بھی تھے۔

اس خزانے کا بڑا حصّہ میں نے اسی رات ایک دوسری جگہ لے جا کر دفن کر دیا اور اس جگہ کی شناخت کے لیے ایک ایسا نشان

بنا دیا جس پر میرے سوا اور کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد کئی راتوں تک میں باقی خزانہ بھی وہیں منتقل کرتا رہا۔ اور اس کام میں میری مدد کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے کہ میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو میں نے دو اونٹوں پر سارا خزانہ بار کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ کر دیا کہ دیکھنے میں اونٹوں پر چارہ لدا معلوم ہوتا تھا اس کے باوجود میں خوف کے عالم میں سفر کر رہا تھا۔ میرا خنجر ہمہ وقت میرے ہاتھ میں تیار تھا اور میں اونٹوں کو ایڑ پر ایڑ لگا رہا تھا۔

بہرحال نوشتہ یہی تھا کہ میں سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جاؤں۔ جوہریوں کی کوٹھی میں میرا پر زور خیر مقدم ہوا، اور اس طرح میں نے اپنا خزانہ فروخت کیا۔

تو یوں ہوا کہ رو پہلا بیج حاصل کرنے اور اپنی محبوبہ کا دل جیتنے کے لیے میں نے جو کچھ گنوایا تھا وہ سب میرے پاس پھر واپس آ گیا اور شروع شروع میں اس بات سے بہت خوش تھا۔

مگر میری آنکھیں کھلیں اور میں نے بڑے کرب کے ساتھ محسوس کیا کہ مجھ پر کیا سانحہ گذر گیا ہے۔ یہ کہ میں نے بلا جبر و اکراہ اپنی خوشی سے ایک قربانی پیش کی تھی۔ یہ قربانی قبول نہیں کی گئی اور یہ کہ جو کچھ میں نے ہاتھ سے کھویا تھا وہ سب کچھ میرے ہاتھ پر واپس رکھا ہوا تھا۔ پھر اب میں کسی صلے کی کیا توقع کر سکتا تھا؟

"کوئی شک نہیں" میں نے کہا "کہ بھونچال بوڑھے راوی کو کھا گیا، کیونکہ اس رات وہ سفر میں تھا۔ اب یا تو وہ الٹی ہوئی چٹانوں تلے دبا پڑا ہے یا دریا کی تہ میں بیٹھ چکا ہے اور کوئی شک نہیں کہ میری آرام جاں مجھ سے چھین لی گئی۔"

لیکن اسی رات ایک شخص سے میری گفتگو ہوئی جو زلزلے کے دوسرے دن بستی کی طرف آتے میں سیاہ مرد سے ملا تھا۔ تو یوں ہے کہ جو دروازہ دائماً مقفل رہتا ہے ہم اس پر فضول ہی اپنی کنجیاں آزماتے رہتے ہیں۔ جو لکھ دیا گیا وہ لکھ دیا گیا، جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔ پھر اس کے بعد سے میں نے اپنی شادکامی یا حرماں نصیبی کے متعلق کسی پیش قیاسی کی جرأت نہیں کی۔ میں نے ہاتھ باندھ لیے اور انتظار کرنے لگا۔

ایک شام پھر میری محبوبہ نے مجھ سے کہا۔

"بستی میں تمہاری بابت یوں باتیں کی جا رہی ہیں" وہ بولی "لوگ کہتے ہیں کہ پہلے تم نے بہت سا مال بیچ ڈالا اور اب بہت سا مال خرید رہے ہو۔ اور اس لین دین میں تم نے نفع کمایا ہے۔ یہ بیوقوفوں کی خیالی اڑان ہے۔ ان کے پاس راز کی کنجی نہیں ہے کنجی میرے پاس ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری ساری رقم کالا بوڑھا لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے یہ وہم ستانے لگا تھا کہ شاید میرا باپ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دینے پر راضی نہ ہو جو قلاش ہو چکا ہے۔ تو پھر اب تم اتنا سامان کہاں سے خرید رہے ہو؟ یا تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا اور بڈھا اپنے ساتھ کوئی دولت نہیں لے گیا، یا تم نے کوئی جادو کیا ہے۔ اگر پہلی بات سچ ہے تو بڈھا تمہیں روپہلا بیج نہیں بھیجے گا اس لیے کہ وہ کم داموں کا زیادہ کام کرنے والا آدمی نہیں ہے، تو پھر میرا تمہارا ساتھ بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر دوسری بات سچ ہے تو مجھے بھی بتاؤ کہ وہ جادو کس طرح کیا جاتا ہے تاکہ میں اپنے باپ کو خوب آرام پہنچا سکوں اور اپنے لیے بھی نیا لباس اور سونے کا کنگن خرید سکوں۔"

"نہ تو میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے اور نہ میں نے کوئی جادو کیا ہے۔ چونکہ تم نے مجھے اپنا راز بتا دیا تھا اور ابھی تک، جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اسے تم نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے اس لیے میں ایک بار پھر تم کو اپنے راز میں شریک کرتا ہوں۔ مقدر کا لکھا یہی تھا کہ مجھے ایک بڑا خزانہ مل جائے اور جو کچھ میں نے راوی پر خرچ کیا تھا وہ سب میرے پاس واپس آ جائے۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہ پوچھو۔ البتہ یہ بتاؤ کہ تمہیں نیا پیرہن اور سونے کا کنگن کیوں چاہیے؟"

"میری ایک چچا زاد بہن ہے۔ خوبصورت ہے مگر اتنی نہیں جتنی تم سمجھتے ہو میں ہوں اب اس کی شادی کا وقت آ گیا ہے نہ مجھے

اور یہ کہ میرا جانا کیوں نہ ہو سکا۔ اس پر وہ بولی :

" اگر کوئی مرد کسی عورت کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دے تو یہ اس کی محبت کی سب سے بڑی نشانی ہے، لیکن اگر وہ کسی اور آدمی کو خرید کر اپنی جگہ اُس کی جان خطرے میں ڈالے تو یہ اُس کے سیانے پن کی نشانی ہے۔ تاہم کئی باتوں میں تم نے مجھ سے کام نہیں لیا کیونکہ ہو سکتا ہے بڑھا مر جائے یا ہو سکتا ہے وہ چور ہو، اور اگر وہ بچ بھی جائے اور ایسا نہ بھی ہو، تب بھی ہو سکتا ہے کہ اسے رو پہلا بیج مل ہی نہ سکے۔ اور اگرچہ اس کو بیج مل ہی جائے تب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسے تم تک پہنچا نہ سکے۔ اسی طرح اگر یہ دیکھا جائے کہ میری خاطر تم نے کتنی بیوقوفیاں کی ہیں تو اس حساب سے بھی تمہاری چاہت کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ کچھ کم۔ تو اب اتنے دن تک کوئی نہ ہو گا جو مجھے کہانیاں سنائے اور ٹھنڈی شاموں کو میرے لیے گوارا بنائے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم نے مجھے پا لینے کے لیے جتنا خرچ کر دیا ہے، مجھے رکھنے کے لیے اتنا خرچ نہ لا سکو گے۔ اور میرے باپ نے مجھے تنبیہ بھی کی ہے، اور ــــ"

یہاں پہنچ کر وہ رُک گئی اور اس کے ماتھے کی شکنیں غائب ہو گئیں اور وہ ہنسنے لگی۔

" اِن باتوں کا کچھ خیال نہ کرنا اگر میرے مقدر میں تمہارا ہی ساتھ لکھا ہے تو یقیناً میں تم سے بہت محبت کرنے لگوں گی۔ اصل میں اس تیز ہوا نے مجھ پر ایسا اثر ڈالا کہ میں نے کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ اور اکیلی میں ہی ان جھکڑوں سے پریشان نہیں، دریا بھی پریشان ہے دیکھو تو کیا بپھر بپھر کر لہریں لے رہا ہے۔ اور ڈوبتا ہوا سورج بھی کتنا غضبناک معلوم ہو رہا ہے۔ آج رات کہیں نہ کہیں کہرام ضرور مچے گا اور بڑی تباہی آئے گی "

اور یہ اس نے سچ کہا تھا کیونکہ اسی رات بھونچال آ گیا۔ اس کے شور نے مجھے گہری نیند سے چونکا دیا۔ بستی تک اس کا ہلکا سا جھٹکا پہنچا۔ میرے مکان میں دو مرتبان پاش پاش ہو گئے اور مجھے اپنے پیروں کے نیچے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن مٹی کے تین مکان منہدم ہو گئے اور رات بھر لوگ چیختے اور دعائیں پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

میرا اندازہ تھا کہ زلزلے کا زیادہ زور صحرا پر صرف ہوا ہو گا۔ لہٰذا صبح ہوتے ہی میں نے اپنے خچر کو کسا اور سوار ہو کر یہ دیکھنے کو نکل کھڑا ہوا کہ رات صحرا پر کیا گذری۔ اب ہوا صاف اور ہموار ہو چکی تھی اس لیے یہ سفر بہت خوشگوار تھا۔ صحرا میں پہنچ کر ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ایک بڑا سا ٹیلا اپنی سابق جگہ سے ذرا سرک سا گیا ہے، اور اب اس کے حدود وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ میں اس کے قریب تک چلا گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ٹیلا تڑخ گیا ہے اور اس کے تڑخنے سے ایک زمین دوز مقبرے میں داخلے کا راستہ کھل گیا ہے۔

میں خچر پر سے اتر پڑا اور اس راستے پر کچھ دور تک بڑھتا چلا گیا، لیکن اندر ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ناچار میں گھر لوٹ آیا۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کسی سے بیان نہیں کیا کہ مبادا دوسرے لوگ پیشقدمی کر کے مجھ سے پہلے وہاں جا پہنچیں۔

اور اس رات جب ساری بستی سو گئی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میں پھر سوار ہوا، اس بار میرے ساتھ ایک پھاوڑا اور روشنی کا مناسب سامان بھی تھا اور وہ ساری رات میں نے مقبرے میں گذاری۔

میرا خیال ہے یہ شاہی نسل کے کسی فرد کا مقبرہ تھا۔ اس کے اندر کئی حجرے تھے جن کی دیواروں پر عجیب و غریب نقوش بنے ہوئے تھے یہ حجرے داخلے کے ایوان کے اردگرد بنائے گئے تھے اور اسی ایوان سے خوبصورت اور کشادہ کیے ہوئے زینے نیچے اترتے تھے۔ یہ زینے ریت سے اَٹے ہوئے تھے اور کہیں کہیں پر ٹوٹے ہوئے ٹیلے کا ملبہ بھی حائل ہو گیا تھا۔ اور میں نے اپنی زندگی میں ایسا دفینہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ پیالے، تھالیں، گھنٹیاں، مورتیاں سب کھرے سونے کی۔ اور ان کے علاوہ مرصع زیورات بھی تھے۔

اس خزانے کا بڑا حصہ میں نے اسی رات ایک دوسری جگہ لے جا کر دفن کر دیا اور اس جگہ کی شناخت کے لیے ایک ایسا نشان

بنا دیا جس پر میرے سوا اور کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد کئی راتوں تک میں باقی خزانہ بھی وہیں منتقل کرتا رہا۔ اور اس کام میں میری مدد کرنے والا کوئی نہ تھا اس لیے کہ میں کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔

رات کو میں نے دو اونٹوں پر سارا خزانہ بار کیا اور اسے اس طرح پوشیدہ کر دیا کہ دیکھنے میں اونٹوں پر چارہ لدا معلوم ہوتا تھا اس کے باوجود میں خوف کے عالم میں سفر کر رہا تھا۔ میرا خنجر ہمہ وقت میرے ہاتھ میں تیار تھا اور میں اونٹوں کو ایڑ پر ایڑ لگا رہا تھا۔

بہر حال نوشتہ یہی تھا کہ میں سلامتی کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ جاؤں۔ جوہریوں کی کوٹھی میں میرا پر زور خیر مقدم ہوا، اور اس طرح میں نے اپنا خزانہ فروخت کیا۔

تو یوں ہوا کہ روپہلا بیج حاصل کرنے اور اپنی محبوبہ کا دل جیتنے کے لیے میں نے جو کچھ گنوایا تھا وہ سب میرے پاس پھر واپس آ گیا اور شروع شروع میں اس بات سے بہت خوش تھا۔

مگر میری آنکھیں کھلیں اور میں نے بڑے کرب کے ساتھ محسوس کیا کہ مجھ پر کیا سانحہ گذر گیا ہے۔ یہ کہ میں نے بلا جبر و اکراہ اپنی خوشی سے ایک قربانی پیش کی تھی۔ یہ قربانی قبول نہیں کی گئی اور یہ کہ جو کچھ میں نے ہاتھ سے کھویا تھا وہ سب کچھ میرے ہاتھ پر واپس رکھا ہوا تھا پھر اب میں کسی صلے کی کیا توقع کر سکتا تھا؟

"کوئی شک نہیں" میں نے کہا "کہ بھونچال بوڑھے راوی کو کھا گیا، کیونکہ اس رات وہ سفر میں تھا۔ اب یا تو وہ الٹی ہوئی چٹانوں تلے دبا پڑا ہے یا دریا کی تہ میں بیٹھ چکا ہے اور کوئی شک نہیں کہ میری آرام جاں مجھ سے چھین لی گئی۔"

لیکن اسی رات ایک شخص سے میری گفتگو ہوئی جو زلزلے کے دوسرے دن بستی کی طرف آتے میں سیاہ مرد سے ملا تھا۔ تو یوں ہے کہ یہ دروازہ دائماً مقفل رہتا ہے ہم اس پر فضول ہی اپنی کنجیاں آزماتے رہتے ہیں۔ جو لکھ دیا گیا وہ لکھ دیا گیا، جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔ پھر اس کے بعد میں نے اپنی شادکامی یا حرماں نصیبی کے متعلق کسی پیش قیاسی کی جرأت نہیں کی۔ میں نے ہاتھ باندھ لیے اور انتظار کرنے لگا۔

ایک شام پھر میری محبوبہ نے مجھ سے کہا۔

"بستی میں تمہاری بابت یوں باتیں کی جا رہی ہیں" وہ بولی "لوگ کہتے ہیں کہ پہلے تم نے بہت سامان بیچ ڈالا اور اب بہت سامان خرید رہے ہو۔ اور اس لین دین میں تم نے نفع کمایا ہے۔ یہ بیوقوفوں کی خیالی اڑان ہے۔ ان کے پاس راز کی کنجی نہیں ہے کنجی میرے پاس ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ تمہاری ساری رقم کالا بوڑھا لے کر روانہ ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے یہ وہم ستانے لگا تھا کہ شاید میرا باپ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں میرا ہاتھ دینے پر راضی نہ ہو جو قلاش ہو چکا ہے۔ تو پھر اب تم اتنا سامان کہاں سے خرید رہے ہو؟ یا تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا اور بڈھا اپنے ساتھ کوئی دولت نہیں لے گیا، یا تم نے کوئی جادو کیا ہے۔ اگر پہلی بات سچ ہے تو بڈھا تمہیں روپہلا بیج نہیں بھیجے گا اس لیے کہ وہ کم داموں میں زیادہ کام کرنے والا آدمی نہیں ہے، تو پھر میرا تمہارا ساتھ بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر دوسری بات سچ ہے تو مجھے بھی بتاؤ کہ وہ جادو کس طرح کیا جاتا ہے تاکہ میں اپنے باپ کو خوب آرام پہنچا سکوں اور اپنے لیے بھی نیا لباس اور سونے کا کنگن خرید سکوں۔"

"نہ تو میں نے تم سے جھوٹ بولا ہے اور نہ میں نے کوئی جادو کیا ہے۔ چونکہ تم نے مجھے اپنا راز بتایا تھا اور ابھی تک جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے اسے تم نے اپنے سینے میں محفوظ رکھا ہے اس لیے میں ایک بار پھر تم کو اپنے راز میں شریک کرتا ہوں۔ مقدر کا لکھا یہی تھا کہ مجھے ایک بڑا خزانہ مل جائے اور جو کچھ میں نے راوی پر خرچ کیا تھا وہ سب میرے پاس واپس آ جائے۔ بس اس کے سوا اور کچھ نہ پوچھو۔ البتہ یہ بتاؤ کہ تمہیں نیا پیرہن اور سونے کا کنگن کیوں چاہیے؟"

"میری ایک چچا زاد بہن ہے۔ خوبصورت ہے مگر اتنی نہیں جتنی تم سمجھتے ہو میں ہوں اب اس کی شادی کا وقت آ گیا ہے۔ نہ مجھے

معلوم ہے نہ اسے کہ اس کی شادی کس کے ساتھ ہوگی لیکن وہ بے عذر لڑکی ہے اور اپنے شوہر کا انتخاب اپنے باپ کی مرضی پر چھوڑ دے گی۔ ظاہر ہے وہ کسی رئیس آدمی کو چنے گا اور شادی کے موقع پر بڑا جشن منایا جائے گا جس میں رات بھر گانا اور ناچنا ہوگا۔ میرے نام بھی اس جشن کا بلاوا ضرور آئے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہاں مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ ہونا پڑے۔ لیکن میرا باپ غریب آدمی ہے اور اسے کہیں سے کچھ ملتا بھی نہیں۔

اسے نہیں ملتا تو تمہیں ملنا چاہیے۔"

کیا ملنا چاہیے؟"

اناروں کی یہ ٹوکری کل سورج نکلتے ہی میں تمہارے باپ کے پاس بھیجوں گا۔"

"سنو" اس نے کہا " تمہارے دل میں میری محبت صحرا کی طرح ہے اور میرے دل میں تمہاری محبت ریت کے ایک ذرّے کے برابر بھی نہیں۔ پھر بھی تم مجھے یہ تحفہ بھیجو گے؟"

"پھر بھی میں تمہیں یہ تحفہ بھیجوں گا۔"

اُس نے اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر یہ بات پھیل گئی تو شر پسند لوگ اس پر طرح طرح کی تہمتیں لگائیں گے، لہٰذا اس کو راز رکھنا چاہیے اور وہ خوش تھی، جیسے کوئی بچہ چھوٹا سا کھلونا پا کر خوش ہو جاتا ہے۔ اس لیے ٹھیک ہی کہا تھا، واقعی وہ ابھی بہت چھوٹی تھی وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی رہتی تھی۔ اور اس کے دل میں میری یا کسی بھی شخص کی محبت کا شائبہ تک نہ تھا۔

مگر اس وقت بھی اس کی سرد آنکھوں کی گہرائی میں محبت سوئی ہوئی تھی، جیسے کنڈ کی تہ میں سنہرے سفنون والی مچھلی پڑی سویا کرتی ہے اور اس کے جاگنے کا وقت قریب آگیا تھا۔

جو کوئی خوشی میں بسر کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ وقت کی رفتار کتنی تیز ہو سکتی ہے اور جس کو کسی وقوع کا انتظار رہتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ رفتار کس قدر سست ہو جاتی ہے لیکن بہر کیف بوڑھے راوی کی روانگی کو آٹھ مہینے گذر ہی گئے اور اس کے کہنے کے بموجب آئندہ مہینہ ماہِ مراد تھا جس میں مجھ کو شجر الموت کا روپہلا بیج ملنے والا تھا، بشرطیکہ اس کا ملنا میرے مقدّر میں ہوتا۔

تو اب پیروں کی ہر چاپ کے ساتھ مجھے اپنے پاس آتے ہوئے قاصد کی آواز سنائی دیتی اور ہر آواز پر مجھے گمان گذرتا کہ کوئی میرا نام لے کر مجھے پکار رہا ہے۔ میرے خون کی حدت بڑھ گئی جیسے تپ چڑھ آئی ہو۔ میری نیند غائب ہو گئی اور میں رات کا بیشتر حصہ اپنے باغ میں چکر کاٹ کاٹ کر گذارنے لگا۔

اس مہینے کی نویں تاریخ تمام رات مجھے دور سے آتی ہوئی طرب و سرود کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ اس رات میری محبوبہ کی بہن کی شادی تھی۔ یہ اسی کے جشن کی آوازیں تھیں لیکن صبح ہوتے یہ آوازیں موقوف ہو گئیں۔ اور میں باغ میں دیوانہ وار گھومتا رہا اور جب میں باغ کے باہری دروازے کے نزدیک سے ہو کر گذر رہا تھا تو اچانک میں نے ایک ہلکی سی آہٹ سنی اور کسی نے میرا نام لے کر مجھے پکارا لیکن یہ آواز کسی قاصد کی نہ تھی۔ یہ میری محبوبہ کی آواز تھی۔

میں نے دروازہ کھول کر اسے اندر بلایا۔ وہ منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر چلی آئی۔ وہ نیا پیرہن اور طلائی کنگن پہنے ہوئے تھی صبح صادق کی پرکیف دھندلی روشنی میں اس کے چہرے پر حسن کا ایک عجیب سا شعلہ لپک رہا تھا اور اس کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا

"تھک گئیں؟"

اس نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

"ہاں" میں نے کہا، "شادی کا جشن بڑا طویل تھا۔ ساری رات مجھے گانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ تمہاری آنکھوں ہی سے تکان ظاہر ہو رہی ہے۔" اور میں نے اس کے آرام کرنے کے لیے ایک درخت کے نیچے ریشمی قالین بچھا دیا۔ میں اس کے اس طرح آجانے پر حیرت زدہ بھی تھا۔

وہ قالین پر دو زانو بیٹھ گئی۔ اس کا بدن جھکتا چلا گیا، اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

"میں جشن میں نہیں تھی۔" اس نے کہا "آہ، مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنا ہیں، اور ان میں کی ایک بات بھی ایسی نہیں جسے تم کبھی معاف کر سکو۔ پہلے وعدہ کرو کہ جو کچھ میں کہوں اُسے آخر تک سنو گے۔ اس کے بعد۔ اس کے بعد مجھ سے جو برتاؤ چاہنا کرنا۔"

اس پر میرا دل بیٹھنے لگا اور مشیّت کا مہیب زمزمہ مجھے اپنے کانوں میں گونجتا محسوس ہوا۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی، تب جا کر میں کہہ سکا:

"میں آخر تک سنوں گا۔"

اور اب وہ قالین پر لیٹ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کے نیچے تکیہ سا بنا لیا، اور اپنی بات یوں شروع کی جیسے کوئی تھکا ہوا بچہ طویل آموختہ دہراتا ہے۔

"کل سویرے۔" اس نے کہا "سورج نکلتے ہی دریا پر نہانے گئی تھی جب میں کپڑے پہن کر اوپر آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک جوان رو پہلے زیوروں سے سجے ہوئے ایک خچر پر سوار میری طرف چلا آ رہا ہے۔ قریب آکر وہ خچر پر سے اترا اور دیر تک مجھے گھورتا رہا۔ اس کی رنگت ہم لوگوں سے زیادہ کالی لیکن بوڑھے راوی سے صاف تھی۔ اور مجھے اس کی آنکھوں میں بھی وہی پیغام نظر آیا جو تمہاری آنکھوں میں اور دوسروں کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔ میں سمجھ گئی کہ وہ میرا طلب گار ہے۔ خوبصورت عورتیں آنکھوں کی اس زبان کو آئے دن پرکھا کرتی ہیں۔ لیکن مجھ پر اس زبان کا کوئی اثر نہ ہوا اور ایسا لگتا تھا جیسے میری آنکھوں کے آگے کہرا چھایا ہوا ہو۔

"اس نے تمہارا نام لے کر پوچھا کہ تم سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ ہماری ہی زبان بول رہا تھا۔ لیکن اٹک اٹک کر، جیسے اس نے ابھی حال ہی میں ہماری زبان سیکھی ہو۔

"میں نے کہا، میرے ساتھ چلو، میں تمہیں اس کے پاس پہنچا دوں گی۔"

"اور اس کے بعد؟' اس نے پوچھا، کیوں کہ تم دنیا کی سب سے حسین عورت ہو میری محبت کو تمہارا ہی انتظار تھا،

"میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اس لیے کہ میری آنکھوں کے آگے کہرا ابھی تک چھایا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بات بالکل بے دھڑک اور اچانک کہہ دی تھی۔ اس نے ابھی پہلی بار تو مجھ کو دیکھا تھا۔

"اس کے بعد' میں نے کہا، اس کے بعد جو ہونا ہے وہ ہونا ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"اس نے مجھ پر سے ایک دم یوں نظریں ہٹا لیں جیسے مجھے دیکھتے ڈر رہا ہو۔

"مجھے ممانعت ہے،' اس نے کہا، اس کے بارے میں کچھ بھی کہنا منع ہے۔

"اور تم یقین کرو یا نہ کرو، مگر اب جو بات میں نے اس سے کہی وہ صرف اس کو تھوڑا سا چڑھانے کے لیے کہی تھی۔ میں نے کہا نا کہ کہرا ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے تھا اور اسی لیے میں کچھ سوچ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"کیا خوب!' میں نے ہنستے ہوئے کہا، تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور پہلی بات جو میں تم سے پوچھ رہی ہوں اس کو بتانے سے انکار کر رہے ہو؟

"اور اب اس نے پھر مجھے دیر تک نظر بھر کر دیکھا۔ وہ ہلکے ہلکے ہانپ رہا تھا، پھر اچانک اس نے اپنے لبادے میں ہاتھ ڈال کر ایک چمڑے کا نہ نکالا، جو چمک رہی تھی۔

" اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے،" وہ بولا " تو لو دیکھ لو! میں اسے یہ دینے کے لیے آیا ہوں "
اور اب وہ میرے بالکل سامنے کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک گولا تھا جو چاندی کا نہ تھا لیکن اس کا رنگ چاندی کا سا۔ اور اس گولے میں زندگی تھی اور موت تھی تو یہ اس وقت سے لکھا ہوا تھا جب اوپر آسمان پر ستارے نہیں جڑے گئے تھے اور نیچے زمین نہیں بچھائی گئی تھی۔ پھر میری آنکھوں کے آگے سے ہٹ گیا اور میں نے دیکھا کہ کسی کا حسن اس کے حسن کی برابری نہیں کر سکتا اور جب وہ بولا۔ تو اس کی آواز مجھے ہر آواز سے میٹھی معلوم ہوئی اور اب محبت کی وہ آگ مجھ کو پھونکے ڈالتی تھی جو اس سے پہلے کبھی مجھے محسوس بھی نہ ہوئی تھی۔
" دیکھ!" وہ چلایا " میں نے حلفِ کبیر توڑ دیا۔ اور اس کی سزا میں عنقریب موت آ دبوچے گی۔ میری زندگی کی گھڑیاں گنی چنی رہ گئی ہیں لیکن اگر یہ گھڑیاں محبت کی گھڑیاں بن جائیں تو جان کے مول بھی سستی پڑیں گی۔ سُن! مجھ کو تجھ سے تو محبّت ہے، میں تیرا ہی تو پرستار ہوں "
" میرا سر جھک گیا اور میری آنکھوں میں نشہ چھا گیا اور میں اس کے سامنے دو زانو ہو گئی۔ 'میرے دل کے مالک! میں نے کہا 'میری زندگی کے مالک!' ... "
اور اب وہ قالین پر اوندھی ہو کر اتنا روئی کہ اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔
کچھ دیر تک میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر میں نے کہا۔
" تمہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکیں ؟ "
" نہیں نہیں!" وہ چلائی " نہیں نہیں! "
" تو بولتی رہو" میں نے کہا " اور مہربانی کر کے جلدی کہہ چکو "
اب وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے بعد کی ساری گفتگو اس نے کھڑے ہی کھڑے کی، البتہ اس نے سہارے کے لیے درخت کے تنے سے ٹیک لگا لی تھی۔
" وہ صحرا کے راستے سے آیا تھا اور پچھلی رات ایک بڑے ٹیلے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہاں اسے ایک پرانا مقبرہ نظر آیا، تو رات اس نے مقبرے ہی میں بسر کی۔ اس نے اپنا سارا اسباب وہیں چھوڑ دیا تھا اور خود سفید خچر پر سوار ہو کر تمہاری تلاش میں نکلا تھا تاکہ اپنا فرض ادا کر سکے۔
" لیکن اب اس کے دل میں اپنے فرض کا خیال بہت کم تھا اور چونکہ بستی کے لوگ ابھی سے ہوشیار ہو گئے تھے اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ اسی ٹیلے والے مقبرے میں لے گیا۔ میں خچر پر سوار تھی اور وہ میرے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا اور کچھ دیر بعد مقبرے کی ٹھنڈی اور دھندلی روشنی میں ہم تھے اور ہماری محبّت۔
" اور جب شام ہونے لگی تو میں ڈری کہ کہیں میرے باپ نے میری تلاش میں ہر طرف آدمی نہ دوڑا دیے ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس مقبرے میں اپنے عاشق کے ساتھ دیکھ لی جاؤں۔ تو میں اس سے رخصت ہو کر اپنے گھر آ گئی اور جب میرے باپ نے اتنی دیر تک گھر سے غائب رہنے کا سبب پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میں بہن کی شادی کے انتظاموں میں لگی ہوئی تھی۔ اور پھر میں نے یہ کیا کہ نیا پیرہن اور سونے کا کنگن پہن لیا اور اس سے کہا کہ اب میں شادی میں جا رہی ہوں۔ اسے اطمینان ہو گیا اور وہ پڑ کر سو رہا اس لیے کہ وہ بوڑھا اور کمزور ہے اور رات بھر جشن میں شریک رہنے کے قابل نہیں ہے۔
" اور پھر میں بھٹکتی ہوئی واپس اپنے محبوب کے پاس پہنچی۔ مجھے معلوم تھا ناکہ ہمارے پاس محبت کی بس چند گھڑیاں ہیں اور یہ کہ ہماری محبّت ایسی ہے کہ اگر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم ساتھ ساتھ رہیں تو بھی محبت سے ہمارا دل نہ بھرے گا۔ ابھی کچھ پہلے تک میں اسی کے پاس تھی۔ لیکن اب تم سے

ملنا ضرور تھا اور میں تمہارے باغ کے جالی دار دروازے کے پاس آئی، اور تمہارے قدموں کی آواز سن کر میں نے تمہیں پکارا۔ اور اب مجھے وہ بات کہنا ہے جس کے لیے میں تمہارے پاس آئی ہوں۔"

اور یہاں پر رُک کر اس نے لجاجت آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر کہنا شروع کیا۔

"تمہاری آنکھوں میں نہ غصّہ نظر آ رہا ہے نہ رحم! تمہاری آنکھیں پتھر کے بتوں کی آنکھیں بن گئی ہیں کہ نہ جھپکتی ہیں نہ دیکھتی ہیں۔ مگر میری پوری بات سن لینا۔

اس نے حلفِ کبیر کو توڑا ہے، اور اسے اس کی سزا مل کر رہے گی۔ کوئی اُس تک آ پہنچے گا۔ اُسے معلوم نہیں کب، لیکن بہت جلد یہ آنے والا اس سے کہے گا "لا' مجھے ان موتیوں کی جوڑی دکھا جو ہر طرح ایک سے ہیں، کہ یہی ثبوت ہے اس کا کہ تو نے اپنی سوگند پوری کر دی" اور اگر اس کے پاس موتیوں کی جوڑی نہ نکلی تو وہیں اور اسی وقت اسے قتل کر دیا جائے گا اور اس کے بعد جہاں سے وہ آیا ہے وہاں اس کی ماں کو بھی قتل کر دیا جائے گا کیونکہ حلفِ کبیر میں وہی اس کی ضامن تھی اور جب وہ مار ڈالا جائے گا تو کیا میں زندہ رہ سکوں گی؟

" اس کے پاس جوڑی میں کا صرف ایک موتی ہے۔ دوسرا تمہارے پاس ہے تو اس طرح اب تمہارے اختیار میں تین جانیں ہیں۔

" تم سمجھ سکتے ہو کہ میں نے اپنے بوڑھے پن میں اس کو قسم توڑنے پر اکسایا اور مجھے پتہ بھی نہ تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور پھر تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ تمہارا جھگڑا مشیت سے ہے، ان ننھی ننھی فاختاؤں سے نہیں جن کو مشیت کی ہوا نے اڑا کر ایک جگہ پہنچا دیا ہے۔ اگر تم یہی خیال کر کے مجھے وہ دوسرا موتی دے دو اور اس کے ساتھ اس کے وطن چلا جانے دو تو یہ تمہارا اتنا بڑا احسان ہوگا کہ اس کو بیان کرنے لیے لفظ نہ مل سکیں گے۔

" لیکن شاید میں تم سے جو کچھ مانگ رہی ہوں وہ اتنا زیادہ ہے کہ کوئی دے نہیں سکتا۔ تب، اگر تمہیں اب بھی میری ضرورت ہو تو میں یہیں رہ جاؤں گی اور تم چاہے مجھے اپنی بیوی بناؤ چاہے کنیز، میں ہمیشہ تمہاری فرمانبردار اور وفادار رہوں گی اس کے لیے میں تم سے اس کے سوا اور کچھ نہیں مانگتی کہ فوراً کسی آدمی کو دوڑا کر میرے محبوب کے پاس دوسرا موتی بھجوا دو تاکہ وہ خیریت کے ساتھ واپس جا سکے اور میں اب اس سے کبھی نہ ملوں گی۔ میرے ساتھ جیسا چاہو سلوک کرو لیکن اس کا خون میری گردن پر نہ آنے دو۔ غلطی تو میری ہی تھی اور پھر ایک طرح سے اس نے اپنی سوگند پوری بھی کر دی ہے اس لیے کہ اس نے میرے ہاتھ تمہارے پاس شجرالموت کا بیج بھجوایا ہے۔ بتاؤ، اب تمہارا جواب کیا ہے؟"

سچ یہ ہے کہ اس وقت تک مجھے خود بھی پتہ نہ تھا کہ میرا جواب کیا ہوگا۔ لیکن اپنی بات ختم کرتے کرتے اس نے اپنے پیرہن کے اندر سے دمکتا ہوا روپہلا گولا نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ اور میں نے اسے ہاتھ میں تھام لیا اور یہ گولا اس کے نازنین بدن کی حرارت سے اب تک گرم تھا۔

ایک لمحے کے اندر میں نے اپنا خنجر اس کے جسم میں قبضے تک اتار دیا۔ وہ میرے پیروں کے پاس گری، ایک بار سر سے پاؤں تک تھرتھرائی، اور ختم ہو گئی۔

اب میں پھر بالکل پُرسکون تھا۔ میرا دماغ پانی کی طرح صاف تھا۔ میرا دل اعتدال اور خاموشی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

میں نے اپنے باغ کے ایک گوشے میں اس کے لیے ایک گہری قبر کھودی پھر میں نے اس کے جسم سے خنجر کھینچ کر نکال لیا۔ میں نے اس کی لاش کو ریشمی قالین میں لپیٹ دیا۔ اور اس طرح میں نے اس کو زمین میں دفن کر دیا۔ میں نے روپہلے بیج کو بھی اسی کے ساتھ دفن کر دیا۔

میں نے اوپر سے مٹی ہموار کر دی اور اپنا خنجر صاف کر لیا اور آخر یہ سارا انتظام اتنا مکمل ہو گیا کہ باغ بالکل ویسا ہی نظر آنے لگا جیسا گذشتہ صبح نظر آ رہا تھا اور وہاں جو کچھ ہوا تھا اس کا کوئی سراغ باقی نہ رہا اور نہ کسی آنکھ نے یہ واقعہ دیکھا تھا۔

اور تب میں سوار ہو کر اسی مقبرے کی طرف روانہ ہوا جو میں نے بڑے ٹیلے کے نیچے دریافت کیا تھا اور جہاں عورت کا عاشق بھی پہنچ گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ مجھے اندیشہ بھی تھا، مجھ کو مقبرے تک پہنچنے میں دیر ہو گئی، اس لیے کہ میرا کام میری جانب سے انجام دیا جا چکا تھا۔

وہ مقبرے کے دروازے پر مرا ہوا پڑا تھا۔ اس کے گلے میں ایک چھرا پیوست تھا۔ اس کے خنجر کے جارے کا گھٹا کھل کر بستر کی طرح پھیل گیا تھا۔ اس کے برابر ہی پانی کا ایک مشکیزہ اور پیتل کا ایک پیالہ پڑا تھا۔ لیکن روپہلے زیورات سے آراستہ سفید خنجر کا اب وہاں کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ جس شخص نے قاصد کو قتل کیا ہے وہی خنجر کو لے گیا ہو گا۔ لیکن جوڑی کا دوسرا موتی قاتل اپنے ساتھ نہیں لے گیا تھا۔ کیونکہ وہ موتی اب بھی لاش کی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے یوں ہی رہنے دیا۔ میں نے لاش کو بھی کرگسوں اور گیدڑوں کے لیے پڑا رہنے دیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ جس وقت وہ، اپنے دور افتادہ ملک سے چلا تھا اسی وقت ایک اور شخص بھی یہ دیکھنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا تھا کہ وہ اپنی سوگند پوری کرتا ہے یا نہیں اور اس نامعلوم شخص کو یہ اختیار حاصل تھا کہ سوگند توڑنے کی صورت میں قاصد کو قتل کر دے۔

اور اس کے بعد میں گھر واپس پہنچا اور اپنی آخری نیند کا بندوبست کر کے بستر پر لیٹ رہا۔ مجھے یقین تھا کہ یہی نیند موت میں ضم ہو جائے گی، لیکن جو زہر میں نے استعمال کیا تھا وہ مجھے مار نہ سکا۔ نیند البتہ مجھے آگئی لیکن دوسرے دن عصر کے وقت میں پھر بیدار ہو گیا اور اسی نیند میں مجھے یہ مکاشفہ ہوا کہ مجھے "ابھی اور اس طرح موت نہ آئے گی۔ ابھی مجھے دو برس انتظار کرنا تھا" تاوقتیکہ روپہلا بیج وہاں جہاں میں نے اسے دفن کیا تھا، صدر موت میں۔ زندہ ہو کر آنکھ نہ کھول دے۔

بستی میں یہ خبریں گشت کر رہی تھیں کہ میری محبوبہ ایک غیر نسل کے آدمی کے ساتھ فرار ہو گئی ہے۔ وہ دونوں ساتھ دیکھے گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ دریا اسے نگل گیا کیونکہ وہ دریا میں نہانے کی عادی تھی۔ غرض کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ کہتا تھا، لیکن جو ہوا تھا وہ کوئی نہ بتا سکا، نہ کسی نے مجھے مجرم سمجھا۔

اور جوں جوں دن گزرتے گئے مجھ میں عجیب عجیب تغیر پیدا ہوتے گئے۔ اب کسی عورت کا حسن مجھے متاثر نہیں کرتا تھا، کوئی تمنا میرے دل کو اپنی طرف کھینچتی نہ تھی۔ اگر گنج سلیمان بھی میری دسترس میں ہوتا تو میں اسے ہاتھ نہ لگاتا۔ اب تنہا رہنے کی خواہش کے سوا مجھے کوئی خواہش نہ تھی۔ اب میرے گھر میں کوئی مہمان نہ آتا تھا، کوئی نغمہ کوئی قہقہہ نہ بکھرتا تھا۔ رات کی طویل خوشگوار نیند مجھ سے منہ موڑ چکی تھی۔ میں ہمیشہ ناوقت کٹی کٹی نیند سوتا تھا۔ اور سوتے میں ایسے ایسے خوابوں کے آسیب مجھے آگھیرتے کہ جاگنے کے بعد بھی میں سمجھ نہیں پاتا تھا کہ جاگ گیا ہوں یا ہنوز خواب میں ہوں۔ اب میں وہم کو حقیقت سے اور سائے کو پیکر سے الگ نہیں دیکھ پاتا تھا۔

سوتے جاگتے ہر وقت اس کا تصور مجھ پر مسلط رہتا جس سے میں نے محبت کی تھی۔ میں اس کو موت کی وادی سے بلا کر یہ بتانے کے لیے تڑپ رہا تھا کہ کس طرح میں اسے تقریباً معاف کر چکا تھا اور کس طرح آخر میں ایک چھوٹی سی چیز نے مجھے جنوں میں مبتلا کر دیا۔ میں یہ سوچ سوچ کر تلملاتا تھا کہ اسے یہ سب کبھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ اب میرے دل میں اس کے خلاف کوئی بدگمانی، کوئی عداوت نہ تھی۔ واقعی جیسا کہ اس نے خود اپنے بارے میں کہا تھا، وہ ایک ننھی سی فاختہ تھی جو طوفان مشیت کے ریلے میں آگئی۔

انتظار کا ایک سال پورا ہونے کے بعد کبھی کبھی جب میں خنک شام کے دھندلکے میں اپنے باغ میں گھومتا ہوتا تو وہ مجھے دکھائی دیتی وہ اچانک ظاہر ہوتی اور ہوا میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہو جاتی اور جوں جوں دوسرا سال آگے بڑھتا گیا اس کا ہیولا زیادہ جلدی جلدی نمودار ہونے لگا اور اب وہ ہیولا زیادہ دیر تک قائم رہتا۔ بلکہ اب تو میں اس کی آواز بھی سن لیتا تھا۔ وہ نارنج کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوتی اور پیرہن ہٹا کر اپنے سینے کا زخم دکھاتی۔

"تم نے میرے اوپر وار کیا" وہ کہتی، "تم تو مجھ سے محبت کرتے تھے، پھر تم نے کس دل سے مجھ پر وار کیا؟"

اور آخر کار ـــ آخر کار وہ دن آگیا جب شجرالموت کو ہویدا ہونا اور وہ قدِ آدم کے برابر پہنچا، جب شجرالموت کو میرا خون چوسنا اور پھر خود بھی مرجانا تھا۔ اور یہ سب کچھ آفتاب کے طلوع و غروب کے درمیان ہونا تھا۔

ابھی سورج پوری طرح نکلا نہ تھا کہ میں نے اس کی قبر کے اوپر کی مٹی کا غور سے جائزہ لیا۔ باغ کے اس حصے میں میرے سوا کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی اور میں خود اپنے ہاتھ سے اس ٹکڑے کو خس و خاشاک سے صاف رکھتا تھا اور اب میں نے دیکھا کہ قبر کے اوپر زمین میں بہت سے رخنے پڑ گئے ہیں۔ ان کی شکل ایسی تھی جیسی سورج کی کرنوں کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ اور ان رخنوں کے بیچوں بیچ میں کوئی سخت سی چیز ابھر رہی تھی۔ یہ چیز اوپر سے مدور تھی اور اس کا رنگ قرمزی اور کاہی ملا جلا تھا۔ اور اس کی سطح پر رطوبت کے ننھے ننھے قطرے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین پھاڑ کر باہر نکلنے کی جدوجہد میں اسے پسینہ آگیا ہو۔

تب میں اس اجڑے ہوئے چمن سے نکل کر اپنے سنسان مکان میں واپس چلا گیا، کیونکہ ایک دن پہلے میں اپنے تمام ملازموں کو رخصت کر چکا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے غسل کیا اور سفید پیراہن پہن لیا۔ میں نے گھر کے سارے دروازے مضبوطی کے ساتھ بند کیے اور پھر واپس شجرالموت کے پاس پہنچا۔ اب وہ میرے گھٹنوں تک آگیا تھا اور ابھی اس کی شکل ایک اکہرے مخروطی ڈنٹھل کی سی تھی۔ وہ عمودی شکل میں اوپر پتلا ہوتا چلا جا رہا تھا، اور اس میں سے ہلکے ہلکے ابخرات اٹھ رہے تھے۔ میں وہیں پر بیٹھ گیا اور اس عجوبے کو دیکھتا رہا۔

جب وہ ایک قدِ آدم کے برابر ہو گیا تو اس میں سے کئی تنے پھوٹ کر الگ ہو گئے اور یہ سب جڑ کے پاس مرکزی تنے سے جڑے ہوئے تھے۔ یہ نئے تنے باہر کی طرف ڈھلک گئے اور ان کا بڑھنا موقوف ہو گیا لیکن ان میں سے سانپوں کی طرح فضا میں لہریں لیتی ہوئی جٹائیں جھنڈ کی جھنڈ نیچے اترنا شروع ہوئیں۔ ان جٹاؤں پر تشنج طاری تھا اور بغور نظر کرنے پر میں نے دیکھا کہ یہ جٹائیں چھوٹے چھوٹے دہانوں سے پٹی ہوئی ہیں اور یہ دہانے مسلسل کھل رہے ہیں اور بند ہو رہے ہیں لیکن مرکزی تنا اب بھی عمودی شکل میں اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے سرے پر ایک عجب طرح کا گچھا سا تھا جو تنے کے ساتھ ساتھ اوپر جا رہا تھا، یہ گچھا بڑا ہوتا جا رہا تھا، اور میں سمجھ گیا کہ اسی میں سے شجرالموت کا پھول برآمد ہوگا۔

یہ ظہر کا وقت تھا۔ میں درخت سے ذرا ہٹ گیا اور نظریں گاڑے اسے دیکھتا رہا۔ بغلی تنوں میں سے جٹائیں مستقل امڈ امڈ کر نیچے اترتی چلی آرہی تھیں۔ اور یہ جٹائیں زمین پر اس طرح چھا گئی تھیں کہ جہاں پر میں نے اسے دفن کیا تھا وہاں اب کاہی اور قرمزی رنگ کا ایک سمندر موجیں مار رہا تھا۔

ظہر کے کچھ دیر بعد تنے کے سرے پر کا بڑا گچھا تین بیضوں کی شکل میں بٹ گیا۔ ان بیضوں پر شفاف باریک ریشم کی سی جھلی منڈھی ہوئی تھی، اور اس جھلی پر نسیں ابھری ہوئی تھیں جو انسانی رگوں سے مشابہ تھیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ نسیں پھولتی چلی جا رہی ہیں، اور ایسا لگتا تھا کہ کوئی سفید سفید چیز ان نسوں کے اندر سے زور مار رہی ہے۔ اور تنے کا سرا ہلکے ہلکے داہنے بائیں یوں جنبش کر رہا تھا جیسے اذیت میں مبتلا ہو۔

ابھی تک یہ سب کچھ کامل خاموشی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ لیکن اب اچانک ان میں سے ایک بیضے کی جھلی اس سرے سے اُس سرے تک چاک ہوتی چلی گئی اور اس کے چاک ہونے سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے کسی عورت پر وار کیا گیا ہو۔ اس پھٹے ہوئے بیضے میں سے اچھل کر ایک نہایت دلکش سفید پھول برآمد ہوا۔ اتنا بڑا پھول میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور اس پھول میں سے زرد پیلے رنگ کے غبار کا ایک بادل سا گرا اور دھوپ میں چمکنے لگا اور اس غبار میں سے ایک خوشبو پھیلی اور خوشبو جہاں پر میں کھڑا تھا وہاں پر بھی اتنی تیز تھی کہ برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

تب میں نے بلند آواز سے وہ کہا جو میرے دل میں تھا:

"شجر المحبت! میں پہنچا" تیری جڑوں نے میرے سرمایۂ محبت کو جذب کرکے اپنے وجود کا جز بنالیا ہے۔ اے مجھے بھی لے، کہ انجام کار ہم ایک ہو جائیں، کہ زندگی کی مکروہ اذیتوں کے بعد انجام کار سکون کی نوبت آئے۔ شجر المحبت! شجر الموت!! میں تیرے پاس آرہا ہوں"

اور میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا، اور درخت کے پاس پہنچ کر میں جھکا اور میں نے اوپر نظر اٹھائی۔ اور دو مرتبہ پھر میں نے مضروب عورت کی سی آواز سنی۔ یہ شجر الموت کا دوسرا اور تیسرا پھول کھلا تھا۔

زرد پیلے غبار کے بادل نے میری آنکھوں میں گھس کر مجھے اندھا کر دیا اور بوجھل خوشبو میرا دم گھونٹنے لگی۔ میں ان کپکپاتی ہوئی جڑوں کے گر پڑا جن کے بیشمار دہانے میرا لہو ڈھونڈھ رہے تھے اور مجھے آخر نیند آگئی۔

ایک مرتبہ چکھئے
ہمیشہ یاد رکھئے
پولکا کا ذائقہ ہی ایسا ہے جو دل میں
گھر کر لیتا ہے، کس قدر حسین، کس قدر
لذیذ کوئی بھی دوسری آئس کریم
پولکا جیسی نہیں ہوسکتی
دل نشین پولکا
پولکا سیلز آفس
کراچی: ۲۲۴۔ ہوٹل میٹروپول، کلب روڈ
فون: ۲۴۶/۵۱۲۰۵۲۰۱
polka
ICE CREAM
Polka-3

رابندر ناتھ ٹیگور
شمیم منظری

گنگا کی سیڑھیاں

اگر تم بیتے ہوئے دنوں کے بارے میں سننا چاہتے ہو تو میری سیڑھی پر بیٹھ جاؤ اور لہریں مارتے ہوئے پانی کی سرسراہٹ کو کان لگا کر سنو۔

ستمبر کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ ندی پوری طغیانی پر تھی۔ میری طرف چار سیڑھیاں پانی کی سطح کے باہر جھانک رہی تھیں۔ ریت کے کنارے کے پاس کُشا گھاس کا راستہ تھا، جس پر نکلتے ہوئے سورج کی روشنی پڑ رہی تھی، انھوں نے کھلنا شروع کر دیا تھا لیکن ابھی پوری طرح نہیں کھلے تھے۔ سورج کی روشنی سے چمکتے ہوئے پانی پر چھوٹی چھوٹی کشتیاں اپنے بادبان ہوا سے پھیلاتی ہوئی چل رہی تھیں۔ برہمن پجاری اپنے پوجا کے برتن لے کر اشنان کرنے کے لیے آ گیا تھا۔ عورتیں دو دو اور تین تین کے غول میں پانی بھرنے کے لیے آ گئی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ کسم اسی وقت گھاٹ پر نہانے آتی تھی۔

لیکن اس دن صبح میں نے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ بھبن اور سورنو گھاٹ پر افسوس کر رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ اس کی سہیلی اپنے شوہر کے گھر چلی گئی ہے، ایک ایسی جگہ جو یہاں سے بہت دور تھی اور جہاں کے لوگ، مکان اور سڑکیں اُس کے لیے اجنبی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد لوگ اس کو قریب قریب بھول گئے تھے۔ ایک سال گزر گیا۔ گھاٹ پر آنے والی عورتیں اب بہت کم کسم کے بارے میں بات کرتی تھیں لیکن ایک دن شام کو خوب جانے پہچانے پیروں کو دیکھ کر میں حیران ہو گئی۔ ارے، ہاں! اب اِن پیروں میں پازیب نہیں تھی۔ ان پیروں نے اپنی پرانی سُریلی تان کو کھو دیا تھا۔

کسم بیوہ ہو گئی تھی۔ اُن لوگوں نے بتایا کہ اس کا شوہر بہت دور جگہ کام کرتا تھا اور وہ اُس سے صرف ایک یا دو بار ملی تھی۔ ایک خط اس کی موت کی خبر لے کر آیا تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں وہ بیوہ ہو گئی تھی اور اس نے اپنے ماتھے پر سے سہاگ کا سیندور مٹا دیا تھا۔ اپنی چوڑیاں بھی توڑ دی تھیں اور اپنے پرانے گھر گنگا ندی کے کنارے واپس آ گئی تھی لیکن وہاں اس نے اپنی کچھ ہی پرانی سہیلیوں کو پایا۔

جس طرح برسات شروع ہونے پر گنگا تیزی سے بڑھنا شروع ہو جاتی ہے اسی طرح کسم بھی دن بہ دن خوبصورتی اور شباب کی منزلوں میں آگے بڑھتی رہی۔ دس سال چپکے سے گذر گئے اور کسی نے بھی نہ دیکھا کہ کسم جوان ہو گئی ہے۔

ایک دن صبح، جیسا کہ آج ہے ستمبر کے مہینے کے آخر میں ایک لمبے، گورے اور نوجوان سنیاسی نے جس کو میں نہیں جانتی کہ وہ کہاں سے آیا تھا، میرے سامنے والے شِو مندر میں پناہ لی۔ اس کے آنے کی خبر گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ عورتوں نے اپنے گھڑے پیچھے چھوڑ دیے

اور اس مقدس انسان کے استقبال کے لیے مندر میں جمع ہو گئیں۔

بھیڑ روزانہ بڑھتی رہی سنیاسی کی شہرت مہیلا سماج میں جلد ہی پھیل گئی۔ ایک دن وہ "بھاگوت" پڑھتا تھا تو دوسرے دن "گیتا" کے پاٹھ مندر میں سمجھاتا تھا۔ کچھ لوگ اُس سے اُپدیش لینے آتے، کچھ تعویذ لینے اور کچھ دوا لینے آتے۔

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ اپریل میں سورج گرہن کے وقت بہت سے یاتری ایک بڑی تعداد میں گنگا میں اشنان کرنے کے لیے آئے۔ اُن یاتریوں میں سے بہت سے یاتری سنیاسی کے درشن کرنے گئے۔ ان یاتریوں میں اس گاؤں کی عورتوں کی بھی ایک جماعت تھی، جہاں کسم کی شادی ہوئی تھی۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ سنیاسی میری سیڑھیوں پر بیٹھا مالا جپ رہا تھا، یکایک اُن عورتوں میں سے ایک عورت نے دوسری عورت کے کہنی مار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا — "کیوں! یہ کسم کا شوہر ہے؟"

دوسری عورت نے دو انگلیوں کے بیچ سے تھوڑا سا گھونگھٹ ہٹایا اور چلائی — "ارے ایسا ہی ہے! وہ ہمارے گاؤں کے چھتر گر خاندان کا سب سے چھوٹا لڑکا ہے۔"

تیسری نے، جس نے تھوڑا سا اپنے پردے کا دکھاوا کیا تھا، کہا "ارے اس کی بھنویں، ناک اور آنکھیں تو بالکل اسی طرح کی ہیں"

لیکن دوسری عورت نے بنا سنیاسی کی طرف دیکھے ہوئے اپنے گھڑے کے ڈھکنے سے پانی کو ہلایا اور دکھ سے بولی — "ہائے رے! وہ شخص اب زندہ نہیں ہے۔ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ یہ کسم کی بدنصیبی ہے!"

ایک نے مخالفت کی — "اس کی اتنی بڑی داڑھی نہیں تھی۔" اور دوسری نے کہا "وہ اتنا لاغر نہیں تھا، شاید وہ اتنا لمبا بھی نہیں تھا۔" اس بات نے بحث کو یہیں ختم کر دیا اور بات آگے نہ بڑھ سکی۔

ایک دن شام کو جیسے ہی پورا چاند نکلا کسم آئی اور پانی سے اوپر والی میری آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اُس کی پرچھائیں مجھ پر پڑ رہی تھی اس وقت گھاٹ پر دوسرا کوئی نہیں تھا۔ جھینگر میرے چاروں طرف شور کر رہے تھے۔ مندر میں گھنٹے اور گھڑیالوں کا بجنا بند ہو چکا تھا۔ آواز کی آخری لہر دھیمی ہوتی جاتی تھی۔ جب تک کہ وہ دور کے دوسرے کنارے کے تاریک کنج میں آواز کے سائے کی طرح ضم نہ ہو جاتی۔ گنگا کے سیاہ پانی میں چاند کی روشنی کی ایک چمکدار ریکھا پھیلی ہوئی تھی۔ کنارے کے اوپر جھاڑیوں میں، مندر کے دروازے کے سامنے کی جگہ میں، ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کے اندر۔ تاڑ کے درختوں میں عجیب وغریب شکل کے سائے دکھائی دیتے تھے۔ گھروں کے نزدیک گیدڑوں کا شور سنائی دیتا تھا اور پھر خاموشی مسلط ہو جاتی تھی۔

سنیاسی خراماں خراماں مندر کے باہر آیا۔ گھاٹ کی کچھ سیڑھیوں پر اُتر کر اُس نے ایک عورت کو تنہا بیٹھے ہوئے دیکھا اور وہ واپس جانے ہی والا تھا جب یکایک کسم نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور گھوم کر پیچھے دیکھا۔ گھونگھٹ اس کے سر پر سے سرک گیا۔ جیسے ہی اس نے اوپر کی طرف دیکھا چاند کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ اُلّو اُن کے سروں کے اوپر سے چلاتا ہوا اُڑ گیا۔ آواز پر چونک کر کسم کو ہوش آیا اور اس نے اپنا گھونگھٹ درست کیا پھر وہ سنیاسی کے قدموں پر جھک گئی۔ سنیاسی نے اس کو دعائیں دیں اور پوچھا "تم کون ہو؟"

اس نے جواب دیا — "مجھے کسم کہتے ہیں۔"

اُس رات کوئی اور بات نہیں ہوئی۔ کسم دھیرے دھیرے اپنے گھر چلی گئی جو قریب ہی تھا لیکن سنیاسی اسی رات میری سیڑھیوں پر بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ آخر جب چاند مشرق سے مغرب میں چلا گیا اور سنیاسی کا سایہ پیچھے سے ہٹ کر سامنے پڑا تو وہ اٹھا اور مندر کے اندر چلا گیا۔

اُس کے بعد میں نے ہر روز کسم کو آتے ہوئے اور اُس کے قدموں میں سر جھکاتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ مقدس کتابوں کی تفسیر بتاتا تھا تو یہ ایک کونے میں کھڑی ہو جاتی تھی اور دھیان سے سنتی تھی۔ اپنی صبح کی پوجا ختم کرنے کے بعد وہ اُس کو اپنے قریب بلا لیتا تھا اور دھرم کا اُپدیش دیتا تھا۔ کسم کچھ نہیں سمجھتی تھی لیکن خاموش رہ کر دھیان سے سنتی تھی اور سمجھنے کی کوشش کرتی تھی۔ جیسا وہ اُس کو اُپدیش دیتا تھا ویسے ہی وہ اُس پر عمل کرتی تھی۔ وہ روزانہ مندر میں پوجا کرتی تھی اور وہ بھگوان کی پوجا میں ہمیشہ مستعدی سے مشغول رہتی تھی۔ وہ پوجا کے لیے پھول اکٹھے کرتی تھی اور مندر کا فرش دھونے کے لیے گنگا جی سے پانی لاتی تھی۔

جاڑا ختم ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں لیکن اکثر شام کو موسم بہار کی گرم اور مندی ہوا خلافِ توقع جنوب کی طرف سے چلتی تھی۔ آسمان کی ٹھنڈک ختم ہو جاتی تھی۔ تب دنوں کی خاموشی کے بعد بانسری اور گانے کی آواز گاؤں میں سنائی دینے لگی۔ ملاحوں نے اپنی کشتیوں کو ندی کے بہاؤ کی طرف چھوڑ دیا اور پتوار سے کھینا بند کر دیا۔ انھوں نے کرشن کے گیت گانے شروع کر دیے۔ بڑا ہی خوشگوار موسم تھا۔

اُس دن میں نے کسم کی کمی کو محسوس کیا۔ کچھ دنوں کے لیے اُس نے مندر میں گھاٹ پر سنیاسی کے پاس آنا بند کر دیا۔

اُس کے بعد کیا ہوا۔ میں نہیں جانتی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ایک شام کو دونوں سیڑھیوں پر ملے۔

اپنا سر جھکائے ہوئے کسم نے پوچھا۔ "سوامی! کیا آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"ہاں، میں تمہیں کیوں نہیں دیکھتا ہوں؟ آج کل تم بھگوان کی پوجا سے کیوں غافل ہو گئی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔

"بغیر کچھ چھپائے ہوئے اپنے خیالات مجھ کو بتاؤ۔"

اپنا منہ پھیر کر اُس نے جواب دیا۔ "سوامی! میں پاپی ہوں اس لیے پوجا کرنے میں ناکام رہی ہوں۔"

سنیاسی نے کہا۔ "کسم میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں بے چینی ہے۔"

اُس نے چند جملے کہے اور ساڑی کا آنچل اپنے منہ پر کھینچ کر میری سیڑھی پر سنیاسی کے قدموں میں بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ وہ تھوڑی دور ہٹا اور بولا۔ "مجھے بتاؤ تمہارے دل میں کیا ہے؟ میں تمہیں سکونِ قلب کا راستہ بتاؤں گا۔"

اُس نے مستحکم آواز میں بیچ بیچ میں رک رک کر کہا۔ "اگر آپ مجھ سے پوچھنے کے لیے اتنا بضد ہیں تو میں ضرور بتاؤں گی لیکن میں صاف صاف نہیں کہہ سکتی ہوں سوامی! آپ نے ضرور ان سب باتوں کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ میں نے ایک کو اپنا دیوتا سمجھا اُس کی پرستش کی اور اس کی پرستش سے مجھے دلی مسرت نصیب ہوئی لیکن ایک رات کو میں نے خواب دیکھا کہ میرے دل کا مالک کہیں کسی باغ میں بیٹھا ہے۔ اُس وقت سے میرے دل کا سکون چھن گیا ہے۔ میرے دل پر تاریکی مسلط ہو گئی ہے۔"

جب وہ اپنے آنسو پونچھ رہی تھی اور یہ کہانی سنیاسی کو سنا رہی تھی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ سنیاسی میرے پتھر کی سطح کو اپنے داہنے پیر سے زور سے دبا رہا تھا۔

اُس کی بات ختم ہوئی تو سنیاسی نے کہا۔ "مجھے بتاؤ تم نے کسے خواب میں دیکھا تھا؟"

دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اُس نے التجا کی۔ "میں نہیں بتا سکتی۔"

سنیاسی نے زور دے کر پوچھا۔ "مجھے ضرور بتاؤ کہ وہ کون تھا؟"

اپنے ہاتھوں کو ملتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ "کیا مجھے ضرور بتانا پڑے گا؟"

اُس نے جواب دیا " ہاں تمہیں ضرور بتا دینا چاہیے "
تب روتے ہوئے اُس نے کہا۔" سوامی! وہ تم ہو"۔ وہ سیڑھی کی طرف منہ کر کے گر پڑی اور سِسک سِسک کر رونے لگی۔
جب وہ ہوش میں آئی تو بیٹھ گئی۔ پھر سنّیاسی نے آہستہ سے کہا:" میں آج رات کو یہاں سے چلا جاؤں گا تاکہ آئندہ تم مجھے نہ دیکھو۔
تم جانتی ہو کہ میں ایک سنّیاسی ہوں اور اِس سنسار سے میرا کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ تمہیں مجھے بھول جانا چاہیے"۔
کسم نے آہستہ سے جواب دیا " سوامی ایسا ہی کروں گی"۔
سنّیاسی نے کہا:" میں وداع ہوتا ہوں"۔
بنا کچھ کہے کسم نے اپنے سر کو اُس کے قدموں میں جھکا دیا، اور اُس کے قدموں کی دھول اپنے سر پر رکھ لی سنّیاسی وہاں سے چلا گیا۔
چاند بادلوں کی آغوش میں جا چکا تھا۔ چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔ اُسی وقت مجھے پانی میں کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔
اندھیری رات میں ہوا بہت زور سے چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آسمان کے تاروں کو بجھا دینا چاہتی تھی۔

کملیشور

سرجیت

اپنے دیش کے لوگ

وہاں بہت سے آدمی جمع تھے۔ سب کی گردنوں میں پٹے پڑے ہوئے تھے۔ اُن پٹوں پر اُن کے نام، عمر اور مرض لکھے ہوئے تھے۔
دینا دیال : عمر ۴۵، مرض : زیادہ تنخواہ مانگتا ہے۔ سلام نہیں کرتا۔
سدا نند : عمر ۲۵، مرض : دفتر کی اسٹیشنری چراتا ہے۔
ابراہیم : عمر ۳۰ سال، مرض : صحیح بات کہنے سے نہیں ڈرتا۔
ایس سبرامنیم : عمر ۲۸ سال، مرض : اپنے افسر سے زیادہ قابل ہے۔
سوبرتو گھوش، عمر ۲۶ سال، مرض : غلط بات نہیں مانتا۔
سبھود یکڑاسی : عمر ۲۵ سال، مرض : لکھ لکھ کر افسر کی شکایت کرتا ہے۔
سب کی گردنوں میں پڑے ہوئے پٹوں پہ نام اور طرح طرح کے مرض لکھے ہوئے تھے۔ وہ سب خاموش لائن میں کھڑے تھے۔ ایک سیکشن افسر نما کمپاؤنڈر دس گیارہ فائلیں پکڑے ہوئے ہر آدمی کی جانچ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی جیب سے ایک ایک گولی نکال کر سب کو دیتا جا رہا تھا۔ جو لوگ گولی کھا چکے تھے، وہ چپ چاپ کھڑے تھے۔ باقی شور مچا رہے تھے۔
کچھ کچھ اسپتال کی طرح کی فضا تھی۔ بہت سے افسر ڈاکٹروں کی طرح سفید لمبا کوٹ پہنے ہوئے پھرتی سے اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ وہ مصروف تھے ان کے ساتھ کچھ غیر ملکی ماہر بھی گھوم رہے تھے، جو اُن ڈاکٹر نما افسروں کو چلتے چلتے ہدایات اور رائے دے رہے تھے برآمدں میں فائلوں کے انبار تھے۔ فرش سے چھت تک وہ انبار لگے ہوئے تھے کہ ان کی وجہ سے آمد و رفت میں بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ نرسوں کی جگہ بیڑی پیتے ہوئے چپراسی تھے جو اپنے ڈاکٹر۔ افسر کو دیکھ کر بیڑی چھپا لیتے تھے۔ دوسرے افسروں کے سامنے پیتے رہتے تھے۔
وہاں سرگرمی بہت تھی۔ میں پبلک ریلیشن افسر کے کمرے میں گھس گیا۔ وہ پتھر کے بت کی طرح خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پاس کھڑے چپراسی نے آہستہ سے اُن کا بایاں گال دبایا۔ اُن کے پلک کھل گئے اور وہ مجھے دیکھنے لگے۔ چپراسی نے پھر دھیرے سے اُن کا داہنا گال کھینچ لیا جس سے اُن کے ہونٹ لمبے ہو گئے اور اُن پر مسکراہٹ نظر آنے لگی۔
میں نے اخلاقاً پوچھا۔" یہ کون سا محکمہ ہے اور کیا کام کرتا ہے ؟"
پبلک ریلیشن افسر نے چپراسی کی طرف دیکھا۔ چپراسی نے ان کی ٹھوڑی کے نیچے لگے ایک بٹن کو دابا اور آواز نکلنے لگی۔" بھارت

لو قائم کرنے کے لیے ایسے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے جو صرف دل لگا کر اپنا کام کریں . . . ڈسپلن کو سمجھیں، جو خواب نہ دیکھا
ل کا زیادہ استعمال نہ کریں۔ کھانا، کپڑا اور رہنے کی جگہ نہ مانگیں۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں سے پریشان اور ناراض نہ ہوں۔ یونینوں
، حصہ نہ لیں، کیونکہ اس سے ترقی میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ یہ محکمہ صرف ملازموں کے سدھار کے لیے کھولا گیا ہے، تاکہ وہ دل لگا کر
م کریں۔" اتنا بول کر پبلک ریلیشن آفیسر خاموش ہو گئے۔ چپراسی نے بٹن بند کر دیا تھا۔
ں نے پوچھا۔ "لیکن سرکاری اور کچھ غیر سرکاری ادارے بھی عوام کے لیے کام کر رہے ہیں۔ دیش میں مساوات اور نئے سماج کو استوار
یے قدم اٹھا رہے ہیں۔ پھر آپ کا محکمہ اس طرح کے ملازم کیوں پیدا کرنا چاہتا ہے؟"
ں بار چپراسی نے اُن کے کان کے اوپر لگے بٹن کو دبا دیا اور وہ بولنے لگا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ سرکار یا اچھے غیر سرکاری اداروں
، کچھ نہیں ہے۔ وہ ہاتھی کے دانت ہیں جنھیں دیکھ کر عوام خوش ہوتے ہیں۔ اصل دانت مونہہ کے اندر ہیں۔ انہیں کے کیے سب ہوتا
جتنے سماج سیوک اور سیاسی لیڈر ہیں، سب بکے ہوئے ہیں . . ." وہ کچھ اور کہنے جا رہے تھے کہ چپراسی نے دماغ کا بٹن بند کر دیا۔
آفیسر یکایک خاموش ہو گئے۔ چپراسی نے ان کے ہونٹوں کو دبا دیا۔ ہونٹ چپک گئے اور وہ میری جانب ٹکر ٹکر تکتے رہ گئے۔
مان کے کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے سے ہوتا ہوا اندر پہنچا۔ وہاں بہت سے افسر نما ڈاکٹر ایک آپریشن کی میز کے چاروں جانب
، کچھ غیر ملکی ماہر بھی تھے۔ ایک گوشے میں فائلوں کا انبار لگا ہوا تھا اور ایک کلرک کچھ لکھنے میں چپ چاپ مصروف تھا۔ میز کے پاس
ے دو سرجن کھڑے تھے۔ ہاتھوں میں دستانے تھے۔
ب ہی گوشے والے کلرک نے آواز لگائی۔ "دین دیال۔ عمر ۴۵ سال۔ مرض زیادہ تنخواہ مانگتا ہے۔ سلام نہیں کرتا۔"
ین دیال اندر آیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر گھسا، اُن افسر نما ڈاکٹروں نے اُس کو پکڑ لیا۔ اُس
یکھا۔ کچھ افسروں کو اُس نے پہچانا۔ تب ہی کھوکری لے کر کھڑے ہوئے دونوں سرجن آگے بڑھے۔
یلے سرجن نے اس کو ٹٹولا اور دوسرے سے کہا۔ "پہلے اس کی پرچھائیں نکال لیجیے۔"
رجن نمبر دو نے قریبی میز سے کوئی دوا اٹھا کے دین دیال کو سنگھائی اور اس کے مونہہ میں ہاتھ ڈال کے ایک آسمانی سی چیز کھینچ لی۔
رکی بغل والی پلیٹ میں رکھ دیا گیا۔
پہلے سرجن نے اشارہ کیا اور دوسرے سرجن نے کھوکری کے ایک جھٹکے سے دین دیال کی کھوپڑی کی ہڈی اتار دی۔ کھوپڑی
تے ہی ایک چھوٹی سی ڈائری نکل کر تکیے پر گر پڑی۔ قریب کھڑے افسر نما ڈاکٹروں نے دوڑ کر دین دیال کی کھوپڑی میں جھانکا
۔ ایک ڈاکٹر نے ڈائری اٹھا کر دیکھنی شروع کی۔ اس میں بہت سی باتیں نوٹ تھیں۔
تنا قرضہ اس نے لیا تھا وہ تفصیل کے ساتھ اس میں لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے حساب جوڑا تو قرضہ پانچ ہزار نکلا۔ اسی ڈائری
یں لکھے ہوئے تھے جب جب اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تھا . . . ڈاکٹروں نے حساب لگایا۔ بائیس برس کی ملازمت میں اس کا
دس روپیہ بڑھا تھا۔ پچاسی روپے سے اس نے ملازمت شروع کی تھی اور اب ایک سو پچانوے پا رہا تھا۔
س کے علاوہ ڈائری میں وہ رقمیں بھی نوٹ تھیں جو وہ اپنے بیٹے کو پڑھانے کے لیے ہر ماہ بھیجتا رہا تھا اور وقتاً فوقتاً سیلاب
ں فنڈز میں اس نے دی تھیں۔ اس میں ان گھر والوں اور اسپتالوں کے نام بھی درج تھے جن میں ان کی موت یا پیدائش

بی ڈاکٹر وہ ڈائری پڑھ ہی رہے تھے کہ سرجن نے پھر اشارہ کیا۔ اس دوسرے سرجن نے کھوکری ڈال ڈال کے اس کی

دونوں آنکھیں کاٹیں۔ پتلیاں نکالیں تو ان کے ساتھ کیمرے کی ریل کی طرح لمبی ریلیں نکلتی چلی آئیں۔ دونوں سرجن مل کر ریلوں کو کھینچتے رہے لیکن وہ ریلیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ آخر کار انہوں نے کھوکری سے وہ ریلیں کاٹ لیں۔

ان ریلوں پر ہزاروں تصویریں تھیں لیکن بہت عجیب۔ ان میں کچھ تصویریں مکانات کی تھیں، اچھے صاف ستھرے مکانات کی۔ کچھ تصویریں میں سجی ہوئی دکانوں کے عکس تھے جن کے شوکیسز میں خوبصورت ساڑیاں لٹک رہی تھیں۔ کچھ تصویریں قیمصوں، پینٹوں اور کوٹوں کی تھیں، جوتوں کی تھیں۔ اچھے ہوٹلوں کی تھیں، صحت مند بچوں اور ان کی مسکراہٹوں کی تھیں۔ پھلوں اور راشن کی تھیں۔ بنارس اور سپرمارکی تھیں۔ مندروں اور تیرتھ استھانوں کی تھیں۔ دواؤں اور ٹیکوں کی تھیں۔ بچوں کی رنگ برنگی پوشاکوں اور کھلونوں کی تھیں۔

ان تصویروں کو دیکھتے دیکھتے سب لوگ اکتا گئے۔ انہوں نے وہ ریلیں لپیٹ کر رکھ دیں۔ پھر سرجن نے اشارہ کیا اور دوسرے سرجن نے کھوکری مار کے اس کے پیٹ کو چیر دیا۔ اس کے کھلتے ہی دھوئیں کا ایک غبار سا نکلا اور چاروں طرف بیڑی کی بو پھیل گئی۔ دھواں جب صاف ہوا تو پیٹ سے ایک راشن کارڈ اور گھر یلو رسید کی کچھ پرچیاں نکل آئیں۔ بیڑی کے کچھ ٹکڑے اور چائے کی پتیاں بھی نکل آئیں۔

اُن سب چیزوں کو نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا گیا۔ ایک کلرک وہیں کھڑا ان کی فہرست بنا تا جا رہا تھا۔

اس کے بعد پہلے سرجن نے اشارہ کیا اور دوسرے سرجن نے اس کا سینہ چاک کیا۔ دل کے آس پاس کا حصہ اُس نے کاٹ لیا تھا۔ اُن کو امید تھی کہ ایک دھڑکتا ہوا دل وہیں ہوگا۔۔ لیکن کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک کر دونوں سرجنوں نے دیکھا تو وہاں جالا لگا ہوا نظر آیا۔ سرجن نے کھوکری کی نوک سے جالے کی ایک تہ ہٹائی۔ جالا پھر بھی لگا ہوا تھا۔ کھوکری کی نوک سے اُس نے پورا جالا صاف کیا تو اس کے ساتھ ایک زندہ مکڑی بھی نکلی۔

دونوں سرجنوں نے مل کر دین دیال کی کھوپڑی، آنکھیں، پیٹ اور دل والی جگہ اچھی طرف کر دی۔ صاف کرنے کے بعد اُن میں پاؤڈر چھڑکا۔

ایک پلیٹ میں کچھ چیزیں لیے ہوئے ایک کمپاؤنڈر حاضر ہوا۔ دوسرا سرجن ایک طرف ہٹ گیا۔ پہلے والے سرجن نے کمپاؤنڈر کی پلیٹ سے فائلوں کا ایک چھوٹا سا چپا ہوا گٹھر اٹھایا اور اس کی کھوپڑی میں رکھ کر کٹورے دار ہڈی چڑھا دی۔

اس کے بعد پلیٹ سے اس نے دین دیال کے سب افسروں کی تصویریں اٹھائیں اور ان کو لپیٹ لپیٹ کر آنکھوں کے گڑھوں میں بھر دیا۔ آنکھوں کے کٹورے بھر گئے تو اس نے بہت احتیاط سے پُتلیاں جڑ دیں۔

پھر پلیٹ سے اس نے اخباروں کی کترنیں اٹھائیں جن میں مہنگائی الاؤنس میں اضافہ ہونے اور قیمتوں کے کم ہونے کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ان کترنوں کو اس نے ایک آل پن سے اکٹھا کر دیا اور پیٹ میں رکھ کر سلائی کر دی۔

اس کے بعد اس نے پتھر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھایا اور دل کی جگہ رکھ کر سینے پر بھی ٹانکے لگا دیے۔ آخر کار اس نے پرچھائیں سنا آتما اٹھائی اور دین دیال کا منہ کھول کر اس کو اندر گھسیڑ دیا۔ اس کو میز سے اٹھانے سے قبل انہوں نے جلدی سے دو ٹانکے اس کی زبان میں بھی لگا دیے اور پیٹھ تھپتھپا کر اس کو بٹھا دیا۔

دین دیال چستی سے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جھک جھک کر اپنے سب افسروں کو سلام کیا اور باہر نکل گیا۔
اس کے جاتے ہی کلرک نے آواز لگائی " سدانند۔۔۔ عمر پچیس سال۔۔۔۔ مرض۔۔۔۔"

صادق ہدایت
حسنین کاظمی
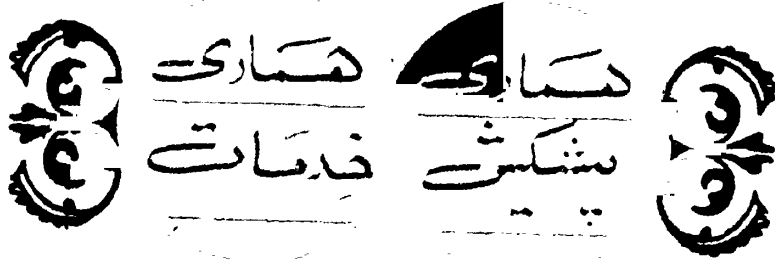
کبڑا داؤد

نہیں نہیں میں یہ کام ہرگز نہیں کروں گا سمجھے تو اس کا دھیان بھی نہیں آنا چاہیئے۔ دوسروں کو خوشی ہوتی ہوگی لیکن میرے لئے یہ کام بہت ہی تکلیف دہ اور پریشان کن ہے۔ میں تو ہرگز۔ ہرگز۔۔۔

داؤد بڑبڑا رہا تھا اور اپنی زرد رنگ کی چھوٹی سی لاٹھی ٹیک ٹیک کر مشکل سے چل رہا تھا جیسے اپنے بوجھ کو بڑی تکلیف کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہو اسکا بڑا چہرہ اس کے باہر نکلے ہوئے سینے پر دبلے پتلے کاندھوں میں دھنسا ہوا تھا ایک دوسرے سے چپکے ہوئے پتلے پتلے ہونٹ، باریک اور کمان جیسے ابرو نیچے کو جھکی ہوئی بھنویں، زرد رنگ اور ہڈیوں کا سا ڈھانچہ۔

جب وہ دور سے آتا تو اس کی عجیب سی شکل بن جاتی۔ کمر کے اوپر نکلا ہوا کوبڑ، بے تناسب لمبے لمبے ہاتھ، کانوں تک کو ڈھکی ہوئی ڈھیلی ٹوپی۔ اس کی خشک اور خطرناک قسم کی سنجیدگی، اس کا زور زور سے لاٹھی کو زمین پر مارنا۔ اس کی یہ ہیئت دیکھ کر بے تحاشا ہنسی آتی۔

وہ شاہراہ پہلوی کے موڑ سے نکل کر شہر کے باہر والی سڑک پر پہنچ گیا تھا اور دروازہ دولت کی طرف جا رہا تھا۔ غروب کا وقت تھا ہوا قدرے گرم تھی۔ بائیں طرف کچی کچی دیواریں سورج ڈوبنے کا تماشا دیکھنے میں کھوئی ہوئی خاموش اور آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑی تھیں داہنی طرف والی خندق کو پاٹ دیا گیا تھا اور اس کے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اینٹوں کے ادھورے مکان نظر آتے تھے۔ یہاں پر نسبتاً خاموشی تھی اور کبھی کبھار کوئی موٹر یا گھوڑا گاڑی گذر جاتی جس سے باوجود چھڑکاؤ کے تھوڑی بہت خاک اڑ جاتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف تیز رو پہاڑی نالوں کے کنارے چھوٹے چھوٹے پودے اور درخت لگے ہوئے تھے اسے خیال آیا کہ وہ بچپن ہی سے دوسروں کے مذاق کا تختۂ مشق بنتا رہا ہے لوگوں کے تمسخر یا رحم و کرم پر اس کی زندگی گذرتی رہی ہے اسے یاد آیا کہ جب مدرسہ میں تاریخ کے ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ اسپارٹا کے باشندے اپنے لنگڑے لولے بچوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا کرتے تھے تو کلاس کے سارے لڑکوں نے اسے مڑ مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا تھا اور اس پر ایک عجیب بے چارگی اور کس مپرسی کا سا عالم طاری ہو گیا تھا لیکن اب اس کی یہ تمنا تھی کہ کاش وہ قانون ساری دنیا میں نافذ کر دیا جائے یا کم از کم کچھ ملکوں کی طرح یہاں بھی بدشکل اور بے ڈول لوگوں کو شادی کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے باپ کی وجہ سے ہوا ہے چہرے کی اڑی اڑی رنگت۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ، آنکھوں میں سیاہ حلقے

آدھا کھلا ہوا منہ اور اپنے باپ کے مرتے وقت کا سارا نقشہ جو اس نے دیکھا تھا۔ سب اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا اس کا بوڑھا اور لنجا باپ جس نے ایک جوان عورت سے شادی کرلی تھی اس کے سارے ہی بچے اندھے یا مفلوج پیدا ہوئے تھے اس کے بھائیوں میں سے جو ایک زندہ بچ گیا تھا گونگا اور بدھو تھا۔ یہاں تک کہ دو سال ہوئے وہ بھی مرگیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"شاید وہ سب کے سب بڑے خوش نصیب تھے"

لیکن وہ ابھی زندہ تھا وہ خود سے اور دوسروں سے بیزار تھا اور سب اس سے گریزاں۔ وہ سب سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے کا عادی ہوچکا تھا۔ وہ بچپن ہی سے مدرسہ میں کھیل کود، چھیڑ چھاڑ، دوڑنا، بھاگنا، گیند کھیلنا، دوسرے کھیل اور ساری چیزوں سے جو اس کے ساتھیوں کے لئے تفریح و خوشی کا باعث تھیں بے بہرہ تھا۔

کھیل کود کے وقت وہ مدرسے کے صحن میں ایک گوشہ میں جا بیٹھتا۔ منہ کے سامنے کتاب رکھ لیتا اور اس کے پیچھے سے کھیلتے کودتے بچوں کو دیکھتا رہتا لیکن ایک کام وہ سب سے نرالا کرتا تھا وہ چاہتا تھا کہ کم از کم پڑھائی لکھائی میں دوسروں سے وہ ضرور بازی لے جائے۔ وہ دن رات کتاب کے اوپر جھکا رہتا اسی وجہ سے دو تین نکھٹو قسم کے طالب علم اس کی چاپلوسی میں لگے رہتے وہ بھی صرف اس لئے کہ حساب کے سوال نکالنے میں اس سے مدد ملے اور پھر ان سوالوں کو نقل کریں۔

وہ خوب جانتا تھا کہ یہ سب مطلب کے یار ہیں کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ اس کے سارے ساتھی حسن خاں پر جان چھڑکتے تھے خوبصورت اور چھریرا بدن اور ہمیشہ خوش رنگ لباس میں ملبوس اکثر و بیشتر طلباء کو یہ حسرت رہتی تھی کہ حسن خاں ان کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ہی ڈال لے۔ استادوں میں سے صرف دو تین ایسے تھے جو اس کا بہت خیال رکھتے تھے، وہ بھی اس کی محنت، مشقت اور جانفشانی کی وجہ سے نہیں بلکہ ازراہ ہمدردی۔ انھیں اس کی حالت پر بہت رحم آتا لیکن اتنی جانفشانی اور محنت کے باوجود بھی بیچارہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکا۔

اور اب تو وہ غریب بالکل ہی تہی دست تھا۔ سب اس سے کتراتے تھے ساتھیوں کو اسکے ساتھ چلنے میں بھی عار تھا عورتیں اس پر پھبتیاں کستیں۔ وہ دیکھنا ذرا کیڑے کو۔"

ان کا یہ کہنا اسے بہت کھلتا اور وہ غصہ میں جامہ سے باہر ہو جاتا۔ چند سال پہلے وہ دو جگہ شادی کے لئے اپنا پیغام بھجوا چکا تھا لیکن ہر مرتبہ عورتوں نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ اتفاقاً ان میں سے ایک زینبدہ تھی جو وہیں نزدیک فیشر آباد میں رہتی تھی وہ کئی مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ چکے تھے وہ اس سے بات چیت بھی کرچکا تھا عصر کے وقت جب وہ مدرسہ سے واپس ہوتا تھا اس کے دیدار کے لئے یہاں تک آتا تھا اب اس کو فقط اتنا یاد تھا کہ اس کے ہونٹوں کے پاس کالا تل تھا۔ جب اس نے اپنی خالہ کے ہاتھ اپنا پیغام بھجوایا تھا تو اسی لڑکی نے اس کا خوب مذاق اڑایا تھا اس نے کہا تھا۔

"کیا آدمیوں کا قحط پڑ گیا ہے۔ جو میں اس کیڑے سے شادی کروں؟"

اور جتنا اس کے ماں باپ نے اسے مارا اتنی ہی اس نے ضد کی اور قبول نہ کیا وہ کہتی تھی۔

"کیا آدمیوں کا کال پڑ گیا ہے؟"

لیکن داؤد ابھی تک اس پر جان دیتا تھا اور یہ اس کے شباب کی بہترین یادگار تھی ابھی تک اسے وہ سارے خیالات آ آکر ستاتے تھے اور گزری ہوئی یادیں اس کی آنکھوں کے سامنے آتیں اور وہ اس کے دل میں مچلا کرتیں۔ اسے سب کچھ یاد تھا سب کچھ۔

وہ زیادہ تر اکیلا ہی ٹہلنے نکلا کرتا تھا اور ہمیشہ آبادی سے دور ہی بھاگتا چونکہ جو کوئی بھی اسے ہنستا ہوا نظر آتا یا اپنے کسی ساتھی

سے بات چیت کرنا ہوتا تو اس کو فوراً شک ہو جاتا کہ وہ سب اسی کا مذاق اڑا رہے ہیں اور ہر طرف اسی کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔
جب کوئی اسے چھیڑتا یا پکڑنا چاہتا۔ اپنی چندھی آنکھوں اور بھونڈی شکل کے ساتھ اپنے جسم کے آدھے حصے اور گردن کو بڑی مشکل سے اس طرف موڑتا، اس پر قہر آلود نگاہیں ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا۔ راستہ چلتے وقت اس کا دھیان ہمیشہ دوسروں کی طرف لگا رہتا اس کا چہرہ ہر وقت بگڑا رہتا اور اس کی تیوری پر ہمیشہ بل پڑے رہتے۔ وہ یہی چاہتا کہ اپنے متعلق دوسروں کے خیالات معلوم کرے۔
وہ پہاڑی نالوں کے کنارے کنارے چلتا رہتا اور کبھی کبھی اپنی لاٹھی سے پانی کو اچھالتا جاتا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا خیالات پریشان تھے۔
اس نے دیکھا کہ لمبے بالوں والا ایک سفید کتا اس کی لاٹھی کی آواز سے جو پتھر سے ٹکرا گئی تھی چونک پڑا ہے اور سر اٹھا کر اسے دیکھ رہا ہے کسی پرانے مریض کی طرح یا جیسے کوئی نزع کے عالم میں ہو وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا تھا تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا سر زمین پر پٹخ دیا وہ بڑی مشکل سے اس کتے کے اوپر جھکا۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی اور اس ٹھنڈی روشنی میں ان دونوں کی نگاہیں آپس میں ٹکرائیں اس کے دل میں ایک عجیب قسم کا خیال پیدا ہوا اس نے محسوس کیا کہ اس کی تمام زندگی میں ایک بھولی بھالی اور محبت بھری نگاہ تھی جو اس نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ وہ دونوں بدبخت تھے اور کسی بیکار اور فضول چیز کی طرح ٹھکرائے ہوئے وہ دونوں بیچارے اور آدم کی اولاد کے دھتکارے ہوئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کتے کے نزدیک جو اپنی بدبختیوں سمیت، آدمیوں کی کڑی نگاہوں سے چھپ کر شہر کے باہر بھاگ آیا ہے جا بیٹھے اور اسے اپنی گود میں بٹھا کر اس کے سر کو اپنے باہر نکلے ہوئے سینے سے چمٹا لے۔ لیکن فوراً ہی اسے یہ خیال آیا کہ اگر کسی راہ گیر نے اسے اس طرح دیکھ لیا تو اس پر قہقہے لگائے گا۔

اب وہ دروازۂ یوسف آباد سے آگے نکل آیا تھا اس کی نگاہیں اس چاند کے ہالہ میں جو اس غمگین اور دلخراش رات کے شروع ہوتے ہی افق سے ابھرا تھا۔ اٹک گئیں، اس نے نامکمل مکانوں، اینٹوں کے ڈھیروں، اونگھتے شہر، درختوں مکانوں کے سایوں اور سرمئی رنگ کے پہاڑوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ اس کو ہر چیز دھندلی نظر آ رہی تھی۔ آس پاس کوئی بھی نظر نہ آتا تھا خندق کے اس طرف کوئی ابوعطا کا درد بھرا نغمہ الاپ رہا تھا دور کی آواز مدھم پڑتی جاتی تھی اور نغمہ کے سننے سے جی بھر آتا تھا اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اوپر اٹھایا وہ تھک کر چور ہو گیا تھا اور اس کے دل و دماغ پر غم و اندوہ کے بادل چھائے ہوئے تھے اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح جل رہی تھیں اور اس کا سر بدن پر بوجھ معلوم ہوتا تھا۔
داؤد نے اپنی لاٹھی کو پانی کی نالی کے اوپر ڈالا اور اس کے اوپر سے نالی پار کر گیا۔ بغیر کسی ارادے کے سڑک کے کنارے پتھروں پر جا بیٹھا۔ ناگہاں اس نے دیکھا کہ نالی کے کنارے تھوڑی دور پر ایک عورت چادر اوڑھے بیٹھی ہے اس کا دل دھڑکنے لگا اس عورت نے بغیر کچھ کہے اپنا منہ پھیرا اور ہنستے ہوئے بولی۔
" ہوشنگ بڑی دیر لگا دی۔ اب تک کہاں رہے۔"
داؤد کو اس عورت کی آواز سن کر بہت تعجب ہوا کہ کس طرح وہ اسے دیکھ کر بیٹھی رہی اور وہاں سے اٹھ کر نہ چلی گئی اسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا اسے دے دی گئی ہو۔ اس کے استفسار سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے بات چیت کرنا چاہتی ہے لیکن رات کے وقت وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ آیا کوئی شریف زادی ہے؟ ہو سکتا ہے کسی پر عاشق ہو! بہرحال اس نے اپنے دل سے ڈر دور کیا اور ازخود کہنے لگا!!

جو کچھ بھی ہو کم از کم بات ہی شروع کروں، کچھ تو بولے گی ممکن ہے پیار کی دو باتیں ہی ہو جائیں۔
جیسے اسے اپنی زبان پر قابو ہی نہ ہو کہنے لگا:
"کیوں جی کیا تم اکیلی ہو؟ میں بھی اکیلا ہوں۔ ہر وقت اکیلا ہوں۔ ساری عمر تنہائی میں گذر گئی۔"
ابھی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس عورت نے جو عینک لگائے ہوئے تھی دوبارہ مڑ کر دیکھا اور پوچھا۔
"لیکن تم ہو کون؟ میرا خیال تھا کہ تم ہوشنگ ہو۔ وہ ہمیشہ یہاں آتا ہے اور مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا ہے۔" اس آخری جملے سے داؤد کے پلے کچھ نہ پڑا اور اس کا مطلب نہ سمجھ سکا دراصل اس کو تو اتنی سی بھی امید نہ تھی۔ مدتیں گذر گئیں کہ کسی عورت نے اس سے بات تک نہ کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ عورت خوب صورت ہے اس کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ بڑی مشکل سے اس کی زبان کھلی۔
"نہیں میں ہوشنگ نہیں ہوں۔ میرا نام داؤد ہے۔"
اس عورت نے قہقہہ لگایا اور کہا۔
"میں تمہیں نہیں دیکھ سکتی، میری آنکھوں میں درد ہے۔ اچھا تم داؤد ہو۔ ؟ کبڑا داؤد۔ پھر اپنا ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔
"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ آ[illegible] میں نے کہیں سنی ہے۔ میں زبیدہ ہوں مجھے پہچانتے ہو؟"
اس کی بکھری ہوئی زلفیں جو[illegible] آدھے چہرے کو چھپائے ہوئے تھیں ذرا سی ہٹ گئیں اور داؤد کو اس کے ہونٹ کے پاس ایک کالا تل نظر آگیا اس کے سینے میں ٹیس سی اٹھی پسینے کے قطرے اس کی پیشانی پر ابھرے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کوئی بھی نہ تھا۔
ابو عطا کے درد بھرے نغمے کی آواز نزدیک ہوتی چلی گئی اس کا دل ہلنے لگا اتنی تیزی سے دھڑکا کہ اس کا سانس الٹنے لگا بغیر کچھ کہے اپنی جگہ سے ہلتا کانپتا اٹھا۔ غم و غصہ سے اس کی آواز گلوگیر ہو رہی تھی لاٹھی اٹھائی اور گرتا پڑتا جدھر سے آیا تھا اسی طرف چل پڑا آنسو بہنے لگے اور لرزتی ہوئی آواز سے زیر لب بڑبڑایا۔
ارے یہ زبیدہ تھی! اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ شاید ہوشنگ اس کا منگیتر یا شوہر ہوگا۔ کون جانے؟" وہ لرزنے لگا۔
"نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ بالکل ہی بھلا دینا چاہیئے۔ نہیں اب ہو تو میرے بس کی بات نہیں۔۔۔۔"
وہ گھسٹتا گھسٹتا اسی کتے کے پاس پہنچا جسے راستے میں دیکھا تھا وہیں بیٹھ گیا اور اس کے سر کو اپنے باہر نکلے ہوئے سینے سے چمٹا کر بھینچنے لگا۔
لیکن وہ کتا مر چکا تھا۔

(ایرانی کہانی)

ہری نارائن چٹرجی

شام سندر شرما

ہمیں ساقی ہمیں پیمانے

دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنتے ہی رما اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دبے پاؤں زینے سے نیچے اُتری۔ بڑی احتیاط سے آنچل سنبھال کر دروازے کی چٹخنی کھولی۔ دروازہ کھولتے ہی دہی مانوس تیکھی بو ناک میں آئی اور دہی شخص جھومتا جھامتا اندر داخل ہوا۔ دیوار کا سہارا لے کر اُس نے خود کو سنبھالا۔ وہ کچھ بولی نہیں، سکھے کا ہاتھ پکڑ کر چپ چاپ اوپر چڑھنے لگی۔ زینے کے درمیان پہنچ کر سکھے نے ایک بار کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن رما نے اس کا منہ آنچل سے بند کر دیا اور پھسپھسائی "تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ یہاں کوئی بات نہ کرو، کمرے میں چلو، سب کچھ سنوں گی۔"

سکھے نے کیا سوچا، یہ تو اس کو معلوم ہوگا۔ منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر وہ رما کے سہارے اوپر چڑھ گیا۔ پلنگ پر سکھے کے بیٹھتے ہی رما کو رونا آگیا۔ اس نے پہلے کمرے کا دروازہ اچھی طرح بند کر دیا تاکہ اس کے رونے کی آواز نیچے ساس، دیورانی یا دیور کے کانوں تک نہ پہنچے۔

لیکن اتنی احتیاط کے باوجود رما اس رسوائی کی بات کو چھپا نہ سکی۔ اگر کبھی کبھار ایسا ہوتا تو لوگوں کی نظر اُدھر نہ جاتی، وہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیتی۔ لیکن یہ تو بارہ مہینے تیسوں دن کا دھندہ بن گیا۔ سکھے روز رات کو نشے میں چور گھر لوٹتا تھا۔ رما کو تعجب ہوتا تھا کہ راستے میں گھوڑا گاڑی سے بچ کر کیسے آتا ہے۔ نہ ٹانگیں اس کے قابو میں تھیں نہ جسم پر کوئی اختیار تھا۔

زیادہ نہیں سال بھر پہلے تک سکھے بالکل ایک دوسرا آدمی تھا۔ آفس سے وہ سیدھا گھر لوٹتا تھا۔ رما کو لے کر کسی دن سینما، کسی دن پارک اور کسی دن جھیل پر گھومنے جاتا تھا۔ کوئی جھنجھٹ نہ تھا۔ شادی کو آٹھ سال گزر گئے تھے، کوئی بال بچہ نہ تھا۔ نہ ہی آئندہ ہونے کی امید تھی۔ ڈاکٹر کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو ان کا افسوس نہ تھا، نہ رما کو نہ سکھے کو۔

سکھے ہنس کر کہتا "بال بچہ ہونے کا مطلب ہے تمہارا دور ہو جانا۔ بچہ میرے تمہارے بیچ میں گوشت پوست کی ایک دیوار بن جائے گا۔ اس سے یہی اچھا ہے بال بچے نہ ہوں۔ ہماری ہر رات سہاگ رات ہے اور تم ہمیشہ نئی نویلی دلہن رہو گی۔"

شروع شروع میں رما کو یہ باتیں ناگوار گزرتی تھیں۔ دل خالی خالی معلوم ہوتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کس چیز کی کمی ہے ایک ننھی سی جان کی کمی اسے کھٹکتی رہتی۔ لیکن دیور کے بچہ ہو جانے پر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ رما اپنی چھاتی سے لگا کر بچے کو اوپر لے آئی۔ دیورانی سے بولی "یہ میرا بچہ ہے اچھا، خبردار جو تو نے واپس مانگا۔"

لیکن سبھی جگہ زبردستی سے کام نہیں چلتا، یہ بات سمجھنے میں رما کو زیادہ دیر نہ لگی۔ چھاتی سے لپٹانے سے ہی بچہ نہیں بڑا ہو جاتا۔ اس کی بھوک پیاس نہیں مٹتی۔ صرف ممتا سے ہی تو بچہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجبور ہو کر پھر بچہ کو نیچے لے آئی۔ دیورانی کی گود میں ڈال کر بولی — "لے بابا

جلدی سے دودھ پلا دے۔ یہی ایک مصیبت ہے
آبھا ہنس کر بولی "کیوں دیدی رکھا نہیں گیا لوٹا ناہی پڑا نا ؟"
لیکن جب بچہ بڑا ہوا تو یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ زیادہ تر رما کے پاس ہی رہتا صرف رات کو سونے کیلئے ہی ماں کے پاس جاتا تھا۔
لیکن آج کل نہ تو لڑکا اس کے پاس آتا تھا اور نہ اس کی بہن للّی آتی تھی۔ بچوں کا اوپر آنا یکدم بند ہو گیا تھا۔ سکھیے کے سامنے بھی نہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں بھی نہیں۔ دیور اور دیورانی کا خیال ہے کہ سکھیے کی غیر موجودگی میں بھی پینے پلانے کے سارے لوازمات رما کے کمرے میں سجے رہتے ہیں اور ان پر نظر پڑنے سے بچے بگڑ جائیں گے۔ رما کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ اعتراض کرنے کی طاقت بھی اس میں نہ تھی۔ اس کی تو ریڑھ کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی تھی۔ اب شاید وہ کبھی دنیا سے نظریں ملانے کے قابل نہ ہو سکے گی۔ سکھیے اتنا کیوں بدل گیا ؟ چوکھٹ پر سر پٹخنے اور دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے پر بھی رما کو اس سوال کا جواب نہ ملا۔
پہلا دن ـــــ اس دن کی بات رما زندگی بھر نہ بھولے گی۔ سکھیے کافی رات گئے لوٹا تھا۔ سویرے کہہ گیا تھا کہ کلب جائے گی۔ کلب میں کوئی تقریب ہے۔ اس کی چال ڈھال میں کوئی فرق نہ تھا۔ کھانا پروستے وقت رما کو تھوڑا سا شبہ ہوا۔ نیچے جھک کر دال پروس رہی تھی کہ یکایک سیدھی کھڑی ہو گئی۔ ہوا میں نہ جانے کیسی بو تھی۔ کئی بار زور زور سے سانس لے کر بولی "کس چیز کی بو ہے یہ ؟"
تب تک سکھیے آسن چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ غسل خانے کی طرف جاتا ہوا بولا "کھانا کھانے نہ بیٹھتا تو اچھا تھا۔ پیٹ بالکل بھرا ہوا ہے" لیکن رما نے پیچھا نہ چھوڑا۔ بولی "ارے سنو تو"
سکھیے گھوما "کیا ہے ؟"
"بُو تمہارے جسم سے ہی آرہی ہے"
"کاہے کی بُو ؟" اس کا لہجہ تیز تھا۔
کچھ ہچکچا کر رما بولی "شراب .... شراب کی بُو !"
بات کھل جانے پر بھی سکھیے بولا "ہو سکتا ہے"
"ہو سکتا ہے ! کیا مطلب ؟"
"مطلب یہ کہ میں نے پی ہے" سکھیے ہاتھ منہ دھونے لگا۔
رما نے بات نہیں بڑھائی، کمرے میں لوٹ آئی۔ جب سکھیے بستر پر لیٹ گیا تو اس نے بات چھیڑی۔ مسہری کا پردہ ڈالنے کے بہانے وہ اپنا منہ سکھیے کے منہ کے قریب لے گئی۔ اب شک نہ رہا۔ مذاق کی بات نہ تھی، سکھیے نے واقعی شراب پی تھی۔ اب تک وہ تذبذب میں تھی، بات کھل جانے پر وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پچھاڑ کھا کر سکھیے کے جسم پر گر پڑی۔
"یہ تم نے کیا کیا ــــ اس زہر کو کیوں پی آئے ؟"
سکھیے نے چند ہی گھونٹ پیے تھے، گلابی نشہ تھا، رما کے رونے سے نشہ ہرن ہو گیا۔ سکھیے بستر پر اُٹھ بیٹھا "ارے یہ تم نے کیا شروع کر دیا نیچے سب سنیں گے تو کیا کہیں گے ؟"
"سنیں .... خوب سنیں .... میری بربادی کی بات سب کو معلوم ہو جانی چاہیئے۔ تم نے یہ کیا کیا ؟ اس چیز سے تو مجھے ہمیشہ سے نفرت تھی"

رمانے زور زور سے اپنا سر سکھے کے پیروں پر پٹخنا شروع کر دیا۔ نشہ دور ہونے پر سکھے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا غسل خانے سے پانی لاکر رما کے سر اور چہرے پر چھینٹے دینے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا " دیکھو تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اب ایسا کبھی نہ کروں گا۔ آج بھی زیادہ نہیں، دوستوں کے کہنے سے سکھے نے تھوڑی سی پی لی تھی۔ پہلے گھونٹ میں ہی اسے محسوس ہوا تھا کہ گویا سارا حلق جل گیا ہو، ایک آتشیں سیال تیزی سے نیچے اتر گیا۔ پھر اسے کچھ کچھ اچھا لگنے لگا۔ دوستوں کی باتوں اور جام اور بوتل کی کھنک میں اسے ایک نیا ترنم محسوس ہوا رما حیران تھی، جو شخص اتنی احتیاط برتتا تھا کہیں ماں، بھائی اور بھاوج نہ جان جائیں وہ آہستہ آہستہ آج کتنا گر گیا تھا کہ کسی کے جاننے نہ جاننے کی اسے پروا ہی نہ تھی۔ کپڑے کیچڑ میں بھر کر جوتوں کی جوڑی گم کر کے لڑکھڑاتے قدموں سے دروازہ کھٹکھٹاتا تھا کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ محلے کے لوگ مدہوشی کے عالم میں اسے دروازے پر چھوڑ گئے۔ شرم کے مارے رما زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی دن پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال کر لٹک جائے۔ زندہ رہنے سے نہ جانے ابھی کیا کیا دیکھنا پڑے، کیا کیا سننا پڑے۔

لیکن رما خود کو ختم نہ کر سکی، ہمت نہ ہوئی، ایسی ذلیل زندگی کی تمنا! سکھے نے دونوں ہاتھوں سے کیچڑ اپنے چہرے پر ہی نہیں پوتی ہے بلکہ اس کے چہرے پر بھی پوت دی ہے۔ پھر بھی زندہ رہنے کی حسرت! شاید وہ پھر اچھا بن جائے۔ اس کی زندگی میں پھر وہی بہار آجائے اس امید اور اعتماد پر رما زندہ رہنا چاہتی تھی۔

پہلے تو صرف سنیچر کو ہی لیکن پھر ہر روز یہی حالت ہونے لگی۔ محلے کے لوگوں کو منہ دکھانا مشکل ہو گیا گھر والوں سے تو اور بھی زیادہ شرم آتی تھی۔ ساس کو سب سے پہلے پتہ چلا۔ سکھے کو سہارا دے کر جب وہ اوپر لے جا رہی تھی تو ان سے سامنے ہو گیا۔ رما کا خیال تھا کہ ساس سو گئی ہوں گی۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ رات کے گیارہ بجے تک جاگتی رہی ہوں گی۔

اس دن ساس بالکل خاموش رہیں۔ دیوار کا سہارا لے کر پلک جھپکائے بغیر سب کچھ دیکھتی رہیں۔ اگلے دن بولیں۔ رما دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرنے جا رہی تھی کہ وہ آئیں۔

"بہو"!

"کیا ہے ماں؟"

"سکھے کی وجہ سے ہمیں محلہ چھوڑنا پڑے گا۔ کب سے یہ لت لگی ہے اُسے؟ یہ ستیاناسی عادت۔ شادی سے پہلے تو اس میں یہ عادت نہ تھی۔"

رما ایک لفظ بھی نہ بولی، کہنے لائق کوئی بات نہ تھی۔ شادی سے پہلے لڑکا اچھا تھا۔ اس کا تنزل شادی کے بعد ہوا ہے۔ ساسوں کے اس الزام کا جواب نہیں ہوتا۔ جو خوبیاں ہوتی ہیں۔ ان کا سہرا ماں باپ اور خاندان کے سر بندھتا ہے۔ اور سب طرح کی برائیاں پرائے گھر کی بیٹی کے سر منڈھ دی جاتی ہیں۔

شام کو سکھے دفتر سے سیدھا گھر لوٹا۔ خدمت اور حاضری کے لئے رما اس کے سامنے رہی۔ شام کا ناشتہ قرینے سے اس کے سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔

"آج تو جلدی لوٹ آئے ہو چلو کہیں گھوم آئیں۔ نہ جانے کتنے دن ہو گئے ہیں گنگا کنارے گئے ہوئے۔"

سکھے خاموش رہا۔ پھر کنکھیوں سے رما کی طرف دیکھ کر بولا "مجھے ابھی باہر جانا ہے۔"

"کہاں؟"

"ایک دوست کے ہاں۔"

"دوست کے ہاں یا نرک میں؟" رما فوراً سخت ہو گئی۔

"جو بھی سمجھو۔" سکھے نے اس کی بات پر غور نہ کیا۔

"تمہاری وجہ سے محلے میں منہ دکھانا مشکل ہو گیا ہے۔ جانتے ہو؟"

"نہیں جانتا تھا لیکن اب جان گیا ہوں۔" سکھے نے چائے کا پیالہ منہ کی طرف بڑھایا۔

"اپنی بات نہیں کہتی۔ ماں کی بات ہے۔ ماں آج دوپہر کو مجھے سنا گئی ہیں۔ تم سمجھتے نہیں۔ تمہارا بھائی، آبھا کوئی بھی اب مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کرتا۔ شاید انہیں یہ خیال ہے کہ میں نے تمہیں بگاڑا ہے یا میری ضد کی وجہ سے تم ایسا کرتے ہو۔ اتنے پر بھی تمہیں ہوش نہیں آتا۔ اتنی اچھی ملازمت ہے۔ دفتر میں بھی تمہاری اتنی عزت ہے۔ لیکن جس طرح تم گھر لوٹتے ہو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ محلے کے لڑکے جس وقت تمہیں لاتے ہیں تو وہ کس طرح تم پر ہنستے ہیں یہ تم نہیں دیکھتے لیکن میں دیکھتی ہوں۔ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔"

ان باتوں کو سکھے نے سنا یا نہیں، اس کے ظاہر نہیں ہوا۔ کھڑے ہو کر کرتا پہنتے ہوئے بولا "تم بہت اچھے ڈھنگ سے بات کہتی ہو، لیکن یہ لیکچر پارک میں دیتیں تو ملک بھر میں نام ہو جاتا۔" سکھے زیادہ نہ رکا۔ جوتے پیر میں ڈال کر نیچے اتر گیا۔ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رما بستر پر لڑھک گئی۔ پڑے پڑے بہت روئی۔ ایک بار سوچا، بھائی کو خبر کر دے۔ پتا جی کو سب کچھ بتا دے۔ وہ لوگ آ کر سمجھائیں۔ شاید سکھے بدل جائے، سدھر جائے۔

رما سو گئی تھی۔ شور و غل سن کر جاگ اٹھی۔ جلدی جلدی نیچے اترتے اترتے زینے کے بیچ میں رک گئی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر ساس زور زور سے چلا رہی تھی۔

"میرا ستیاناس ہو گیا۔ میں لٹ گئی۔ میرے ہیرے سے لڑکے کی یہ حالت کس نے کر دی ہے۔"

آبھا خاموشی سے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس کے بچے اس کے پاس کھڑے حیرانی سے وہ منظر دیکھ رہے تھے۔ زینے کے سامنے سکھے بیٹھا تھا۔ کپڑے کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے۔ روکھے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ سر آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ دیور اس کے ہاتھ پکڑ کر آگے کی طرف کھینچ رہا تھا۔

چند لمحوں کے لیے رما کے حواس مختل ہو گئے۔ ایک بار اس کے دل میں آیا کہ چھت سے نیچے پکے صحن میں کود پڑے۔ پھر سوچا کہ غسل خانے کے پائپ سے ساڑھی باندھ کر لٹک پڑے۔ لیکن دونوں میں سے کوئی کام نہ کیا اس نے۔ تیزی سے نیچے اتر کر دیور کو پرے ہٹایا اور سکھے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ نہ جانے کہاں سے اس میں اتنی طاقت آ گئی۔ کھینچ کر سکھے کو اوپر لے گئی۔ گویا وہ سکھے نہ تھا اُس کی عزت تھی، اس کی آبرو تھی، جسے وہ دنیا کی نظروں سے بچا کر اوٹ میں لے گئی۔ سکھے کو جب ذرا ہوش آیا تو رما نے اس کے پیروں کو پکڑ کر کہا "میں جان گئی کہ تم یہ زہر نہ چھوڑ سکو گے۔ ایک کام کرو، اپنے گھر میں دروازہ بند کر کے پیو۔ اس طرح دس آدمیوں کے سامنے اپنی اور میری مٹی پلید نہ کرو۔"

تکیئے کے سہارے بیٹھ کر سکھے نے چپ چاپ ان سب باتوں کو سنا۔ پھر آہستہ سے بولا "ارے گھر میں اکیلے اس چیز کے پینے میں کوئی مزا نہیں۔"

پھر رما نے بات نہ بڑھائی۔ لیکن اتنا سمجھ گئی کہ سکھے اس عادت کو نہ چھوڑے گا کم از کم رما میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس کی یہ لت چھڑا سکے۔ اس کی باقی عمر اسی طرح کٹے گی۔ ایک بے قابو ذلیل زندگی سے لپٹ کر۔

اگلے دن سکھے کے آفس چلے جانے پر آبھا نے رما پر تیکھا طنز کیا تھا" بلہاری جاؤں تمہاری ہمت پر دیدی۔ کیسے سپاٹے سے جیٹھ جی کو اوپر لے گئیں۔ میں تو مر کے بھی شرابی کے پاس نہیں پھٹک سکتی۔ شرابی سے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔" آبھا نے آخری فقرہ اس طرح کہا گویا شرابی سے وہ ڈرتی ہی نہیں نفرت بھی کرتی ہو۔ رما کو ایسے خاوند کے پاس نہ جانا چاہیے تھا۔ اُسے چھوڑ دینا ہی مناسب تھا۔ آبھا پھر بولی، منا اور للی

تو بہت ڈر گئے تھے۔ مجھ سے بار بار پوچھتے تھے "کیا ہوا ہے ماں تاؤجی کو؟ وہ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟ میں نے کہا "تاؤجی کے سر پر بھوت سوار ہے۔ ایک روگ ہوتے ہوئے دوسرا روگ لگنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ اپنے گھنے سنبھال کر رکھنا دیدی!"

رما کھانا کھا رہی تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو تھالی میں گرتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی جیسے تیسے ہاتھ منہ دھو کر اوپر چلی گئی۔ کمرے کی سب کھڑکیاں بند کر کے فرش پر اوندھے منہ لیٹ کر خوب روئی۔ لیکن آنکھوں کے پانی سے نشہ تو پھیکا نہیں پڑتا۔ اب سکھیے انسان نہیں رہا۔ نرم مزاجی اور شرافت شراب کے جھاگوں والے پانی میں بہہ گئی تھی۔

رونا رک گیا تو رما نے سوچنا شروع کیا۔ سکھیے کو کیسے بچایا جائے۔ اُسے کس طرح واپس لاؤں؟ کیا سکھیے کے دوستوں کو خط لکھوں؟ رما کو ان کے نام معلوم تھے۔ نشے کی حالت میں سکھیے نے بہتوں کے نام خود ہی بتا دیے تھے۔ ان میں سے دو تین کو رما جانتی بھی تھی وہ پہلے گھر پر بھی آتے تھے۔ وہ سکھیے کے گہرے دوست ہیں! اس لئے اس کے نفع نقصان کے بھی ساتھی ہیں۔ انھیں خط لکھنا چاہیے کہ وہ سکھیے کو سمجھا بجھا کر تباہی کے راستے سے ہٹا دیں۔ اسے اس طرح بربادی کے گڑھے میں گرنے سے روک لیں۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ہی رما کو اپنی ترکیب کی کمزوری کا احساس ہوا۔ جو رہزن ہیں ان سے رہبری کی درخواست کرنا لاحاصل ہے۔ رما کی منت سماجت کا اُن پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

اُسی رات رما نے پھر وہی ذکر چھیڑا۔ سکھیے رات کے ساڑھے آٹھ بجے گھر لوٹا۔ اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ظاہر ہوتا تھا کہ آج محفل کچھ جمی نہیں۔ ایک دو گھونٹ سے زیادہ شراب پیٹ میں نہ پڑی تھی۔

سکھیے چھت پر بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ رما پاس جا کر بیٹھ گئی۔

"تم سے ایک بات کہنی ہے؟"

"صرف ایک ہی! ایسا کیوں چندر مکھی۔ کیا میں اتنی جلدی بوڑھا ہو گیا ہوں؟"

سکھیے شروع سے ہی زندہ دل تھا۔ پہلے جب وہ نارمل حالت میں تھا تب رما کو ہی نہیں سارے گھر کو ہنسی مذاق سے خوش رکھتا تھا۔ اب بھی زندہ دلی کا سرچشمہ خشک نہ ہوا تھا۔ صرف اس میں کچھ آلائش ہوگئی تھی۔

"کونسی چیز ملنے سے تم شراب چھوڑ سکتے ہو؟"

"تخت ہندوستان ملنے پر بھی نہیں" سکھیے نے جواب دیا۔

"مذاق نہیں سچ سچ بتاؤ۔"

سکھیے سیدھا بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک رما کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "پہلے کبھی کبھی میرے پیٹ میں درد اٹھتا تھا۔ یاد ہے نہ، جس کی وجہ سے میں دو دو دن دفتر بھی نہ جا پاتا تھا۔"

رما کو یاد تھا۔ کھانا کھانے کے بعد سکھیے کے پیٹ میں درد اٹھتا تھا۔ سکھیے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ تکیے سے پیٹ دبا کر اوندھے منہ لیٹ جاتا تھا۔ کوئی کہتا "اپنڈی سائیٹس ہے۔" کوئی کہتا "گیسٹک السر ہے۔" ڈاکٹر کو دکھانے کی بات چلی تو سکھیے نے منع کر دیا۔ دوست [illegible]۔ اس کا واحد علاج آپریشن ہے۔ سکھیے آپریشن سے بہت ڈرتا تھا۔

"[illegible] درد اب بالکل اچھا ہوگیا ہے جانتی ہو کس طرح؟ اسی چیز سے" سکھیے نے ایسے لہجے میں کہا گویا یہ بات اب بحث کا

[illegible] تھا کہ شراب پینا شروع کرنے کے بعد سکھیے کے پیٹ میں وہ درد اٹھا تھا کہ نہیں۔ اگر اٹھا بھی ہوگا تو ہلکا،

کیونکہ دفتر سے چھٹی نہیں لینی پڑی تھی۔

"ٹھیک ہے تم گھر بیٹھ کر پیو، میرے سامنے۔ اس طرح راستے میں جگہ جگہ نشے میں چور ہو کر تمہارا پڑے رہنا میرے لئے بڑے شرم کی بات ہے۔ تم جو کیچڑ لوت کر آتے ہو۔ اس کے نشان میرے جسم پر بھی لگتے ہیں اور دل پر بھی۔"

سکھیے نے ایک دو منٹ کچھ سوچا۔ پھر بولا "یہی ہوگا۔ دوکان میں پینے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ دوستوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ سب میرے ہی ذمے پینا چاہتے ہیں۔"

رما کھیل اٹھی۔ اتنے دنوں بعد شاید اب عقل آئی۔ بڑی عادت کا آدھا کم ہونا بھی اچھا ہوتا ہے۔ بولی "یہی ٹھیک ہے۔ روز تم کو مقررہ مقدار میں ناپ کر دے دیا کروں گی۔ پی کر سو جایا کرنا۔ گھر میں محلے میں کسی کو معلوم نہ ہوگا۔"

"اونہوں۔ صرف ناپنے سے کام نہ چلے گا۔ ساتھ بیٹھ کر پینا بھی پڑے گا۔ دو ایک گھونٹ۔ ورنہ نشہ کچھ جمے گا نہیں۔ لطف نہیں آئے گا۔"

"پینا بھی پڑے گا!" رما سب کچھ بھول کر کراہ اٹھی۔ اپنی بیوی سے، گھر کی لکشمی سے ایسی بات جھجکے بغیر سکھیے نے کیسے کہہ دی؟ یہ الفاظ اس کی زبان پر کیسے آئے؟

"کیوں اس میں جھجکنے کی کیا بات ہے۔ دیکھنا دو دن میں ہی جسم نکھر آئے گا۔ نئی جوانی لوٹ آئے گی۔ جسم خوبصورت اور گداز ہو جائے گا۔" جوش میں سکھیے کی آنکھیں مندھ گئیں۔ اسے محسوس ہوا گویا دوبارہ رما کا حسین اور گداز جسم اس کے سامنے ہے۔

اس رات کوئی بات نہ ہوئی۔ لیکن بہت سوچنے اور غور کرنے کے باوجود رما یہ نہ سمجھ سکی کہ سکھیے نے یہ بات نشے کی حالت میں کہی تھی یا اپنی اصلی حالت میں۔ یہ بات قابل یقین نہ تھی کہ سکھیے اپنی بیوی سے ایسی بات کہہ سکتا ہے۔ شاید سکھیے دوستوں کے علاوہ ایک ساتھی چاہتا ہے۔ لیکن رما کیا کرے؟ ایک طرف خاوند، دوسری طرف اخلاقی زندگی، رما پلڑے کے کس طرف بیٹھے۔ دونوں سے محرومی اس کے لئے موت ہے۔ ساری رات رما بستر پر پڑی چھٹپٹاتی رہی۔ کبھی اس کروٹ کبھی اُس کروٹ۔ آنسوؤں سے تکیہ بھیگ گیا۔ روتے روتے آنکھیں سوج گئیں لیکن مسئلہ کا حل نہ نکلا۔

دو دن سکھیے وقت پر گھر لوٹا۔ لیکن اپنی اصلی حالت میں نہیں۔ قریب جانے سے جسم سے بو آتی تھی۔ دونوں آنکھیں تھوڑی سرخ ہوتی تھیں۔ یہ بھی رما کے لئے اچھا تھا۔ لوگوں کو پتہ نہ چلے۔ شور وغل نہ ہو یہی کیا کم تھا۔ لیکن رما کی قسمت، اگلی رات اس کی مصیبت انتہا کو پہنچ گئی۔ آدھی رات کے وقت مکان کے سامنے ایک ٹیکسی رکی۔

رما کو محسوس ہوا کہ انسان نہیں کیچڑ کا ایک ڈھیر سڑک پر لڑھک گیا۔ اس کے بعد پھر وہی چلا چلا کر بے سرا ل کا گانا شروع ہوگیا رما کا اندازہ صحیح نکلا۔ دروازہ کھولتے ہی دیکھا، دیورجلدی جلدی باہر جا رہا تھا۔ رما نیچے اتری۔ دیوار کے سہارے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ سکھیے کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر دیور اوپر چڑھا۔ اس وقت بھی اس کا گانا جاری تھا۔ صرف ہندی چھوڑ کر بنگلہ شروع کر دی تھی۔

سکھیے کو دیکھتے ہی رما لرز اٹھی۔ پہلے اسے محسوس ہوا کہ سینے کے بیچوں بیچ خون کا داغ ہے لیکن غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ پان کی پیک ہے۔ کرتے کے سامنے کا حصہ رنگا ہوا تھا سکھیے کو دیور اوپر نہیں لے گیا۔ اس نے سکھیے کو زینے میں ہی رما کے سامنے ڈال دیا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا "اس کا کوئی انتظام کرو بھابی۔ تم لوگوں کو تو اپنی عزت آبرو کا خیال نہیں رہا۔ لیکن میری تو محلے میں عزت باقی ہے۔ ایک دن، دو دن، اب تو روز کی مصیبت ہوگئی۔ برداشت کرنا مشکل ہوگیا۔ بہتر ہو تم لوگ کوئی دوسرا انتظام کر ڈالو۔ بھائی صاحب کی یہ عادت اب نہیں چھوٹے گی۔ یہ یقینی بات ہے کل پرسوں تک بندوبست کر لو۔ یہ میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں۔"

آنکھوں میں آنسو بھر کر رما نے ایک بار دیکھا۔ پہلے دیور کو پھر نیچے کھڑی ساس کو اور پھر دیورانی کو۔ سب کے چہروں پر دیور کی آخری بات کا نقش تھا۔ اس کے علاوہ کسی کے پاس رما سے کہنے کے لئے کوئی دوسری بات نہ تھی۔ نہ تسلی دینے کی بات، نہ ہمدردی کا اظہار۔ تھوڑی دیر کھڑی رہ کر رما اوپر چلی گئی۔ زور سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگالی۔ سکھمے اسی طرح زینے میں پڑا رہا۔ نیچے سے ساس اور دیورانی کی طعن و تشنیع سنائی دی، "بے چارے کو اس طرح باہر پھینک کر غصہ دکھانا کسی بھی عورت کو شوبھا نہیں دیتا۔ یہ غصہ خاوند پر نہیں بلکہ دیور پر دکھایا گیا ہے۔ عقل پر پتھر پڑ جانے پر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچھی بات بھی بری لگتی ہے۔"

صبح رما نے دروازہ کھولا۔ سکھمے اسی طرح سکڑا ہوا پڑا سو رہا تھا۔ چپکے سے زینہ اتر کر رما اس کے پاس پہنچی۔ پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو اس نے بڑے پیار سے ہٹایا۔ آہستہ آہستہ اسے ہلانے لگی۔ آواز دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ نہ معلوم کون سن لے۔ کچھ دیر بعد سکھمے نے آنکھیں کھولیں۔ سرخ آنکھیں، ٹھہری ہوئی پتلیاں۔ ہاتھ کے اشارے سے رما نے اوپر آنے کے لئے کہا۔ تعجب کی بات ایک بار بلانے پر ہی سکھمے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید اس کا نشہ اتر گیا تھا۔ ٹانگیں ذرا بھی نہ لڑکھڑائیں۔ منہ سے کوئی خراب بات نہ نکلی۔ رما کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ اوپر آ کر وہ اپنے بچھونے پر لیٹ گیا۔

پہلے اس قسم کے واقعہ کے بعد رونا دھونا، سر پٹخنا اور کھینچا تانی ہوتی تھی۔ لیکن آج کچھ نہ ہوا۔ سکھمے گہری نیند سویا ہوا تھا رما گھٹنوں پر چہرہ رکھے خاموش بیٹھی رہی۔

اگلے دن سکھمے جب آفس چلا گیا تو رما پیچھے کے دروازے سے باہر نکلی۔ چار پانچ مکان پار کر کے وہ ایک دو منزلہ مکان میں داخل ہوئی۔ ایک نوجوان بہو کپڑے دھو رہی تھی۔ اس سے اس کے دیور کا پتہ پوچھا۔ بہو اسے دیکھ کر ہنسی۔ پھر بولی "ہاں ہیں۔ بڑے بنے کے کمرے میں سیدھی چلی جاؤ۔"

"اچھا میں ان سے ایک ضروری بات کر کے ابھی آتی ہوں۔"

"تمہاری ضرورت میں سمجھ گئی۔" کپڑے پھٹکارتے ہوئے بہو بولی۔

دو قدم آگے بڑھ کر رما ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ آنچل کی گانٹھ اپنی مٹھی میں بھینچ کر اس سے مخاطب ہو کر بولی "کیا سمجھ گئی ہے تو؟"

"نئے ناول کی ضرورت ہے لائبریری کے سیکریٹری سے اور کونسی ضرورت ہو سکتی ہے۔"

رما نے اطمینان کا سانس لیا۔

امیر کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ رما کمرے میں جا کر بولی "بہت مصروف ہو امیر دادا"

"نہیں تو، کیا بات ہے بھابی؟"

"تمہیں ایک کام کرنا پڑے گا۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

امیر کو تعجب ہوا۔ ایسا کیا کام ہے جسے کوئی نہ جان پائے سکھمے کی بات تو محلے میں بچے بچے کو معلوم تھی۔ امیر ہی کئی بار اسے ٹرام سے پکڑ کر لایا تھا۔

رما امیر کے بہت قریب جا کھڑی ہوئی۔ آنچل کھول کر نوٹ نکالتی ہوئی بولی۔

"بڑھیا شراب کی ایک بوتل کی کیا قیمت ہوتی ہے؟"

"شراب کی قیمت؟" امیر نے ایک بار رما کے ہاتھ کے نوٹوں کو دیکھ کر سیدھے اس کی طرف دیکھا۔ پھر بولا "شراب کا کیا کرو گی؟"

"تم تو سب کچھ جانتے ہو امیر دادا۔ کتنے ہاتھ پیر جوڑے۔ سر پٹخا۔ یہ روگ نہ گیا۔ اب میں نے سوچا ہے کہ باہر کی بدنامی سے بچنے کے لئے گھر کے اندر پلاؤں گی۔ جو کچھ ہوگا گھر کے اندر ہوگا۔ کم از کم باہر کے لوگ تو نہ ہنسیں گے۔"

"سکھے دادا راضی ہیں؟"

"جیسے تیسے نیم راضی کیا ہے۔ باقی سب طریقے آزما لیے اب اسے اور آزما دیکھوں۔"

امیر نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ ان سے روپے لے لیے "ٹھیک ہے بھابی میں رات کو تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

جلدی جلدی کھانا بنا کر اور سکھے کا کھانا لے کر رما اوپر چلی گئی۔ شام کو امیر بوتل دے گیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ بالکل کوئی شک نہ ہوا کیونکہ امیر اکثر کتا بسلے کر آتا تھا۔ ان کے کمرے میں سیدھا چلا جاتا تھا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں بند کر کے رما نے الماری کھولی۔ کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل آہستہ سے کھولی۔ بوتل دیکھتے ہی آنچل سے منہ دبا کر رما بھیک اٹھی۔ گھڑی کی طرف دیکھا۔ سکھے کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ شیشے کا گلاس نکال کر اس میں دھیرے دھیرے سرخ شراب انڈیلی۔ کتنی مقدار ہونی چاہیئے۔ یہ اس کو معلوم نہ تھا لیکن اتنا اُسے معلوم تھا کہ زہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہوتی۔ انجام کے نقطہ نظر سے بوند اور سمندر برابر ہیں۔ تباہی کے راستے میں ہوش و خرد کا کوئی مقام نہیں ہوتا خصوصاً جو مرنے کے لئے آمادہ ہو۔ اس کے لئے پہلے گھونٹ میں ہی رما ناک منہ سکیڑنے لگی۔ ایک پگھلی ہوئی کانپتی سی جلن اس کے حلق سے نیچے اتری۔ گلا، سینہ اور معدہ سب کو جلاتی ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد ایک گھونٹ اور پیا۔ اس بار جلن کم تھی لیکن تیکھا پن محسوس ہوا رما کو محسوس ہوا کہ ابھی قے ہو جائے گی۔ ایک گھونٹ اور پیا۔ محسوس ہوا گویا آنکھوں کے سامنے کمرے کی سب چیزیں ناچ رہی ہیں۔ بجلی کا بلب بھی تھر ادر تال کے ساتھ ناچ رہا ہے۔

اس کے بعد وہ اٹھی قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ دیوار کا سہارا لے کر اس نے خود کو سنبھالا۔ الماری کھولی اور بوتل اور گلاس رکھے۔ پھر لڑکھڑاتے قدموں سے چل کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے بعد رما کو ہوش نہ رہا۔ سکھے کب آیا۔ ڈھکی ہوئی تھالی سے کھانا نکال کر کب کھایا اور کب رما کے برابر لیٹ کر سو گیا۔ اُسے کچھ علم نہ تھا۔ صرف سویرے سر میں سخت درد محسوس ہوا۔ غسل خانے میں جا کر وہ نہا آئی پھر اس نے سکھے کو اٹھایا۔ کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ رات کو جلد سو جانے کی کیفیت طلب کئے بغیر وہ آفس چلا گیا۔ البتہ قدرے متفکر اور بے چین نظر آ رہا تھا۔

یکے بعد دیگرے پانچ راتوں تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ ایک بوتل ختم ہونے پر امیر نے دوسری لا دی۔ بوتل دیتے وقت اس نے رما سے پوچھا "کیوں بھابی کچھ کام بنا؟"

"ہاں یہ تو بالکل رام بان ہے۔ لیکن پورا اثر ہونے میں وقت لگے گا۔"

آج کل رما بہت خوش رہتی ہے۔ صبح سے ہی انتظار کرتی رہتی ہے کہ کب رات ہوگی۔ اپنا کھانا بھی اوپر لے جاتی ہے۔ اپنے کمرے میں اسٹوو پر چھوٹے پکوڑے بنا لیتی ہے۔ اس طرح اس شے کا ذائقہ دوگنا ہو جاتا ہے۔

اس دن صبح سے ہی رما نے سوچ رکھا تھا کہ آج سکھے سے کہے گی کہ اب اُسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اب عادی ہو گئی ہے۔ سکھے کے ساتھ پینے میں اب اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دوپہر کے بعد اس نے تیاری شروع کر دی۔ علیحدہ گوشت منگوایا۔ خوب مرچ مسالے سے اُسے پکایا۔ دو گلاس قریب رکھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھی۔ لیکن شروع کرنے سے پہلے سکھے کو رما کا جسم چھو کر قسم کھانی پڑے گی کہ آفس کے بعد سیدھا گھر چلا آیا کرے گا۔ باہر کبھی نہیں پیا کرے گا۔ جتنی پیئے گا رما کے ساتھ بیٹھ کر۔ گھر کا باہر کا کوئی بھی آدمی نہ جان سکے گا۔ پہلے پہل رما کو خوف تھا کہ کہیں گھر میں پکڑی نہ جائے۔ کہیں کسی کو شک نہ ہو جائے۔ منہ میں پان کے کئی بیڑے رکھ کر نیچے جاتی

تھی۔ حتیٰ الامکان کسی کے زیادہ قریب نہ جاتی تھی۔

رمانے اٹھ کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے پانچ بجے ہیں۔ سکھمے کے لوٹنے میں ابھی بہت دیر ہے۔ تھوڑی سی انڈیل کر پی لی۔ چپ چاپ بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ پھر ایک دو گھونٹ پینے میں بھی مزا آتا ہے۔ نظر کے سامنے سب چیزیں اپنا نیا روپ لے کر مبیٹی تھیں۔

چند لمحے گزرے، رمانے پھر انڈیلی۔ گلاس خالی کر دیا۔ اچانک نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی وہ اٹھی اور بے ترتیب کپڑوں میں ہی چل کر وہ درگا ماتا کے قریب پہنچی اور بڑی عقیدت سے پرنام کیا "دیوی شما کرنا۔ اس کے سوائے پتی کو بچانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میری مجبوری سمجھ کر مجھے شما کر دو" یہ کہہ کر اس نے دیوی کے سامنے ماتھا ٹیکا۔

عین اسی وقت سیڑھیوں پر آہٹ ہوئی۔ رما اس آہٹ کو پہچانتی تھی۔ اس نے جلدی جلدی دو گلاس بھرے۔ ایک کو خالی کر کے آنچل سے ہونٹ پونچھ کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھولتے ہی تعجب سے رما پیچھے ہٹ گئی۔ پسینے سے سکھمے کے بال پیشانی سے چپک گئے تھے۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ گویا وہ خود کو کسی خوف سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ستیاناس ہو گیا۔ بابو لال موہن مر گئے۔"

"کون بابو لال موہن؟" رما بہکی ہوئی آواز سے بولی۔

ہماری مٹھیک کے بابو لال موہن۔ آج دوپہر کو ہسپتال میں مر گئے۔ سروسس آف دی لیور سے۔ شراب پینے کا انجام۔ آج سے میں کان پکڑتا ہوں، اب کبھی شراب نہ پیوں گا۔ اس زہر کے قریب بھی نہ پھٹکوں گا۔ ایسا عہد میں پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں لیکن آج میں تمہیں چھو کر کہتا ہوں کہ یہ میری آخری قسم ہے۔"

رما جسم چھوئے جانے پر الگ جا کھڑی ہوئی۔ بستر پر لیٹ کر چلا کر رونے لگی۔ کسی کے سُن لینے کا اب اُسے خوف نہ تھا۔ حیران ہو کر سکھمے نے دیکھا ایک خالی گلاس دوسرا بھرا ہوا اور ایک چپٹی بوتل میں سرخ رنگ کی شے۔

بہت سنبھل کر سکھمے چارپائی کی پٹی پکڑ کر کھڑا ہوا۔ آج شراب کی ایک بوند بھی اُس کے حلق سے نیچے نہ اتری تھی پھر بھی اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے جو دیکھ رہا تھا اُس کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

رما کی طرف کچھ بڑھ کر سکھمے رک گیا۔ رما کو ہاتھ لگائے؟ آج اتنی بڑی خوشخبری سُن کر بھی رما کیوں رو رہی ہے؟ ذہن پر بہت زور ڈالنے پر بھی سکھمے کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

(بنگالی سے ترجمہ)

امرتا پریتم

زاہدہ خان

اجنبی

نہ جانے کیوں لوک ناتھ کو اپنی زندگی کی ہر بات کسی نہ کسی جانور کی صورت میں یاد آتی تھی۔ بچپن کے کتنے ہی پل کسی ناچتی ہوئی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزر جاتے تھے۔

لوک ناتھ کا چھوٹا بھائی پریم ناتھ اب نیوی میں تھا۔ ابھرے بدن کا لمبا سا خوبصورت نوجوان لیکن بچپن میں وہ پڑھائی میں بھی اتنا ہی کمزور تھا۔ جتنا جسمانی طور پر۔ لوک ناتھ جب اسے پڑھانے کے لئے کبھی اپنے پاس بٹھاتا تھا تو کتاب کے لفظوں پر سکڑی ہوئی اس کی آنکھیں کئی بار اچانک خوف سے پھیل کر لوک ناتھ کے چہرے کو تکنے لگتی تھیں اور پھر جب لوک ناتھ اسے دلاسا دیتا تھا تو جیسے منت سی کرتی ہوں، اس کی آنکھیں پگھلنے لگتی تھیں اور اب وہ نیوی کا افسر بننے کے بعد نئی نئی بندرگاہوں پر جاتا تھا۔ وہاں سے تصویر کھینچ کر لوک ناتھ کو بھیجتا تھا تو لوک ناتھ کو اس کے ساتھ بتائے ہوئے لمحوں کی یاد بالکل ایسی آتی تھی جیسے ایک چھوٹا سا پلا دم ہلاتے ہوئے اپنی گیلی زبان سے اس کے تلوؤں کو چاٹنے لگا ہو۔

اس نے دل سے کسی سیاسی پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لینا چاہا تھا۔ مگر تجربے کی بھوک اسے اکثر میٹنگوں میں لے جاتی تھی، اسے نہیں معلوم تھا کہ کب خفیہ پولیس نے اپنے کاغذوں میں اس کا نام درج کر لیا تھا اور اس کے بارے میں اپنی لمبی چوڑی رائے قائم کر رکھی تھی اس کی ڈگریوں سے گھبرا کر جب کبھی کوئی سرکاری دفتر اسے ملازم رکھنے کا وعدہ کر لیتا تو پولیس کی یہی لمبی چوڑی رائے اس وعدہ کو ایک جھٹکے میں توڑ کر رکھ دیتی اب جبکہ لوک ناتھ ایک کالج کا پروفیسر تھا اور اپنے لئے اس نے ایک مستقل مقام بنا لیا تھا تو اسے بیشتر پریشان لمحوں کی یاد ان ابابیلوں اور چمگادڑوں کا روپ دھار کر آتی تھی جو نہ جانے کہاں سے آتے تھے اور اس کے ہاتھوں میں خراشیں ڈال کر روٹی کا ٹکڑا چھین کر لے جاتے تھے۔

سرکاری دفتروں کی ڈھیلی رفتار اسے کیچوؤں جیسی لگتی۔ قابلیت کے راستے میں آڑے آنے والی جلن اسے سانپ کی طرح پھنکارتی سنائی دیتی بہت سے لوگوں کے حسد اور جلن کو اس نے اپنے جسم پر جھیلا تھا۔ بالکل بھینس کے سینگوں کی طرح ۔ اپنے رشتہ داروں کے فضول غصے اور روٹھنے کے لمحات اسے الماری میں گھسے ہوئے چوہے معلوم ہوتے تھے جو قیمتی کاغذوں کو کترتے چلے جاتے ہیں۔

لوک ناتھ اپنی بیوی پر جان دیتا تھا قصے کہانیوں کے شہزادیوں سے بھی زیادہ اسے چاہتا تھا اس کے ساتھ بیتی ہوئی گھڑیاں، لوک ناتھ کی نظر میں ایسی تھیں جیسے ننھی ننھی چڑیاں اس کے آس پاس چہکتی ہوں۔ جیسے بگلوں کی ایک قطار بادلوں کو کاٹ کر گزری ہو۔ جیسے فاختاؤں کے کچھ جوڑے اس کی کھڑکی میں آکر بیٹھ گئے ہوں، جیسے طوطوں کا ایک جھنڈ اس کے آنگن کے پیڑ پر آکر بیٹھا ہو۔ اپنی بیوی کے خط اور بیوی کے نام لکھے ہوئے اپنے خط لوک ناتھ کو ہمیشہ ان کبوتروں جیسے لگتے تھے جو کسی دیوار کی آڑ میں گھونسلا بنانے کے لئے تنکے جوڑتے رہتے ہیں
شادی سے پہلے لوک ناتھ اپنی بیوی کو اس کے ہر جنم دن پر ایک کتاب پیش کیا کرتا تھا۔ شادی کے بعد ہر سال جنم دن پر اسے

چوم کر رکھتا تھا: "میری عمر کا یہ سال ایک کتاب کی طرح تمہاری نذر" اس طرح لوک ناتھ اپنی بیوی کو اپنی عمر کے ۵۲ سال ۵۲ کتابوں کی طرح سوغات میں دے چکا تھا - اسے یقین تھا کہ اس کے جیتے جی اس کی بیوی کا کوئی ایسا جنم دن نہیں آئے گا جب وہ اپنی زندگی کا کوئی سال ایک کھلی کتاب کی طرح اسے پیش نہ کر سکے۔

صرف ایک بار ایسا ہوا تھا۔

بائیس سال پہلے کی بات ہے ایک صبح لوک ناتھ چارپائی سے اٹھا تو اس کا بدن تپ رہا تھا۔ رات کو وہ اچھا بھلا سویا تھا۔ گرمی والا ایک کیک لا کر اس نے اپنی الماری میں رکھا تھا۔ اس بار پتہ نہیں کیوں اس کی بیوی کو اپنا جنم دن یاد نہیں رہا تھا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس کی ایک بہت پیاری سہیلی کئی برس بعد اس دن غیر ملک سے واپس آ رہی تھی اور اسے اس سے ملنے کے لئے جانا تھا لوک ناتھ نے صبح اپنی بیوی کو چونکانے کے لئے کیک لا کر الماری میں چھپا دیا تھا لیکن صبح کو جب وہ جاگا تو اس کے سر میں زوروں کا درد ہو رہا تھا بیوی کے ساتھ اس نے چائے بھی پی اور کیک بھی کھایا۔ اسے چونکایا بھی۔ اسے چوم کر اسے اپنی عمر کا ایک سال کتاب کی طرح سوغات میں بھی دیا مگر اس کے بعد وہ سارا دن چارپائی سے نہیں اٹھ سکا تھا اس دن وہ سوچ رہا تھا کہ جو کتاب اس نے اپنی بیوی کو دی تھی اس کا ایک ورق پھٹا ہوا تھا اس رات وہ پھٹا ہوا ورق کسی جانور کے ٹوٹے ہوئے پنکھ کی طرح اس کی چھاتی میں ہلتا رہا۔ لوک ناتھ کی زندگی کے کچھ پل اڑتے ہوئے معصوم پرندوں کی طرح تھے کچھ پالتو پرندوں کی طرح اور کچھ جنگل کے جانوروں کی طرح، لیکن کسی پل سے وہ کبھی ڈرا نہیں تھا چونکا بھی نہیں تھا۔ مگر ایک گھڑی۔ ہاں لوک ناتھ کی زندگی میں وہ ایک گھڑی بھی آئی تھی بمشکل سے پندرہ منٹ کے لئے۔ جو چمگادڑ کی طرح اس کے دل میں چپک گئی تھی ہوش و حواس کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں لیکن وہ گھڑی کسی اندھی چمگادڑ کی طرح بار بار دیواروں سے ٹکراتی رہی تھی اور بار بار لوک ناتھ کے کانوں پر جھپٹتی رہی تھی لوک ناتھ نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے اور کچھ منٹ کے لئے اسے آوازیں سنائی نہیں دی تھیں۔ ضمیر کی آواز بھی نہیں مگر ایک آواز تھی، جو اس وقت بھی کنپٹیوں میں گونج رہی تھی اور خون کی اس آواز سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے . . . .

بائیس سال بیت گئے تھے لیکن وہ گھڑی بمشکل سے پندرہ منٹ کی وہ گھڑی لوک ناتھ کو جب کبھی یاد آ جاتی، یاد نہیں آتی تھی بلکہ چمگادڑ کی طرح اس کے سر پر اڑتی تھی تو لوک ناتھ گھبرا کر اسے جلدی سے باہر نکال دینے کے لئے اس کے پیچھے دوڑنے لگتا تھا۔

اس چمگادڑ کے آنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ کبھی "دفر اُمڈ" کے صبح اٹھتے ہوئے وہ اچانک آ جاتی تھی تو کبھی کسی خوبصورت نظم کو پڑھتے ہوئے بھی وہ دکھائی دے جاتی تھی ———————— ایک بار اپنے نومولود بیٹے کی گردن سے دودھ کی مہک سونگھتے ہوئے بھی لوک ناتھ کو وہ چمگادڑ نظر آئی تھی اور آج جب لوک ناتھ کی بڑی بیٹی سہیتا میکے میں بچے کی پیدائش کے دن کاٹنے کے بعد سسرال جانے لگی تھی اور اپنے شیر خوار بچے کو جھولی میں لے کر اپنے باپ سے منت کی تھی کہ وہ اس کی چھوٹی بہن رنیتا کو کچھ دن کے لئے اس کے ساتھ سسرال بھیج دیں کیونکہ ننھا بچہ شاید اس سے اکیلا نہ سنبھلے، تو لوک ناتھ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ ایک چمگادڑ اس کے سر پر منڈلانے لگی تھی آنگن میں بیٹھی ہوئی اس کی بیوی، اس کی بیٹی، اسے لینے کے لئے آیا ہوا اس کا شوہر، جھولی میں پڑا ہوا بچہ کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی اس کی دوسری بیٹی، آنگن میں کیرم کھیلتا ہوا اس کا بیٹا سب کے سب جیسے نظروں سے اوجھل ہو گئے ہوش و حواس کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں لیکن ایک زندہ چمگادڑ دیواروں سے سر ٹیک رہی تھی لوک ناتھ کے کانوں پر جھپٹ رہی تھی اور لوک ناتھ اسے جلدی سے باہر نکال دینے کے لئے اپنے من کے چاروں دائروں میں دوڑنے لگا۔

یہ چمگادڑ ایک تھی۔ بات بائیس سال پہلے کی تھی۔ لوک ناتھ کے گھر پہلا بچہ ہوا تھا۔ یہی سہیتا لوک ناتھ کی بیوی کافی کمزور ہو گئی تھی

اپنی بیوی کو میکے سے اپنے گھر لانے کی بجائے وہ اسے پہاڑ پر لے گیا تھا اسے اپنی سالی پندرہ سال کی آرمی بالکل اپنی بیوی جیسی دکھائی دیتی تھی۔ جب بچی سو رہی ہوتی تو وہ آرمی کو اپنے ساتھ گھمانے کے لیے لے جاتا تھا اس کی بیوی ابھی گھومنے پھرنے کے قابل نہیں تھی کہیں کہیں چیڑ کے درخت کے نیچے گرے ہوئے پتوں کی تہیں بیٹھ جاتی تھیں۔ آرمی دوڑنے لگتی تھی تو اسے پھسلنے سے بچانے کے لیے وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس آرمی کو اس کے ہاتھوں کبھی ٹھیس بھی لگ سکتی تھی۔

ایک دن سیر کے لیے جاتے وقت اس نے اپنی بچی کی گردن کو چوما۔ سوتی ہوئی بچی کے جسم سے سونفیا دودھ اور پاؤڈر کی عجیب سی ملی جلی خوشبو اٹھ رہی تھی بچی کی ماں بھی بچی کے پاس لیٹی ہوئی تھی بچی والی خوشبو اسے اپنی بیوی کے بالوں میں سے بھی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی اور پھر اسی دن کی بات ہے۔ سیر کرتے ہوئے جب اس نے آرمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھسلواں چڑھائی چڑھنے کے لیے سہارا دیا تو اس کے نتھنے کو چھوتی ہوئی اس کی سانسوں میں سے بھی اسے وہی بو لپکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لوک ناتھ اپنی بیوی سے مذاق کرتا ہی رہتا تھا اسی لہجے میں وہ آرمی سے بھی بولا "بے بی سونفیا دودھ معلوم ہوتا ہے تم دونوں کو بھی اچھا لگتا ہے۔"

اس کے بعد لوک ناتھ کو نہیں معلوم کہ کیا اور کیسے ہوا۔ ایک بو تھی جو اس کے گلے میں سمٹ آئی تھی۔ سونفیا دودھ کی، پاؤڈر کی گداز گوشت کی اور چیڑ کے پیڑوں کی اور لوک ناتھ کو محسوس ہوا کہ جنگل کی کھلی ہوا میں بھی اس کا دم گھٹ رہا تھا اور پھر یہ تو کہرے کی طرح اٹھی اور اس کے حلق سے ہو کر دماغ پر چھا گئی اور پھر سارے چہرے کہرے کی دھند میں چھپ گئے۔ آرمی کا چہرہ اس کی بیوی کا چہرہ، اس کی بچی کا چہرہ۔ چہروں کا احساس ہوتا تھا، لیکن پہچانے نہیں جاتے تھے پھر لوک ناتھ کو ایسا لگا کہ نزدیک اور دور دور کوئی بستی نہیں تھی، جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں تک صرف کھنڈر ہی کھنڈر تھے پھر کسی کھنڈر سے چمگادڑوں کی ایک تیز بو اٹھی اور اس کے سر میں سما گئی، پھر اسے محسوس ہوا جیسے کسی دیوار کی آڑ سے نکل کر ایک چمگادڑ اس کے کانوں پر چپٹنے لگی ہو۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے تھے کچھ دیر تک اسے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی ضمیر کی آواز بھی نہیں لیکن ایک آواز اسے اب بھی سنائی دے رہی تھی، کانوں سے نہیں سنائی دے رہی تھی بلکہ خون کی ہر بوند سے اٹھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

یہ جیسے ایک بہت بڑی سازش تھی ضمیر کی آواز، رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی آواز اور چہرے کے ہر پہچان کے خلاف ایک بو کی سازش تھی جنگل کی کھلی ہوا کے خلاف ایک بو کی سازش تھی، ہر آبادی کے خلاف ہر کھنڈر کی سازش تھی۔

لوک ناتھ کسی کی کوئی سازش نہ سمجھ سکا۔ پندرہ منٹ کا وہ وقت جب اس کی عمر سے ٹوٹ کر ایک انگ کی طرح دور جا پڑا تو لوک ناتھ لگا کہ اس کی ساری زندگی اپاہج بن کر رہ گئی تھی۔

اس شام کو جب وہ گھر لوٹا تو بیوی کے کمرے میں جلتی ہوئی موم بتی کو دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے موم بتی کی لپٹ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر تھرتھراتی ہوئی جلدی سے بجھ جانا چاہتی تھی۔

جب رات پھر آئی تو اندھیرا لوک ناتھ کو اچھا لگا لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ ایک اور اندھیرا اس کی چھاتی میں سما گیا تھا اندھیرے کا ایک ٹکڑا رات کے اندھیرے سے ٹوٹ کر الگ جا پڑا تھا۔ رات کا اندھیرا تالاب کے پانی کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ جس میں سے ایک بو اٹھ رہی تھی اس رات لوک ناتھ کو کتنے ہی خیال آتے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ سارے خیال اس تالاب میں تیرتے ہوئے مچھروں جیسے تھے۔

دوسرے دن وہ پہاڑ سے لوٹ آیا تھا، وہ آرمی کو اس کے ماں باپ کے پاس چھوڑ آیا تھا پھر آرمی سے اس کے بیاہ کے دن ایک بار بھرے آنگن میں ملنے کے علاوہ وہ کبھی نہیں ملا تھا۔ یہ ایک معذرت تھی، جیسے وہ ساری عمر خود کو غیر حاضر سمجھ کر آرمی سے معافی مانگتا رہا تھا۔

" پاپا جی "، سچیتا نے منت کے ساتھ لوک ناتھ کی خاموشی کو توڑنا چاہا اور دھیرے سے بولی "آپ کیا سوچ رہے ہیں پاپا؟ ویسے میں جانتی ہوں آپ " نہ " نہیں کریں گے۔"

"کیا"، لوک ناتھ نے حیران ہو کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ یہ بیٹی اسے بہت پیاری تھی اس کی بات اس نے کبھی نہیں ٹالی تھی لیکن وہ حیران تھا کہ اگر کوئی ہونی وقت کے ساتھ مل کر ایک سازش کرنے لگی تھی تو اس کی بیٹی اس سازش کو سمجھ کیوں نہیں رہی تھی۔

ریتا کو میں کچھ دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں؟ یہ سونی مجھ سے سنبھلتی نہیں۔ "، سچیتا پھر کہہ رہی تھی۔

ماں نے بھی حامی بھر لی — "ایک مہینے تک ریتا کا کالج کھل جائے گا - یہی چھٹیوں کا ایک مہینہ ہے ایک مہینہ اسکے یہاں ہی رہی راجندر بھی زور ڈال رہا ہے۔"

" راجندر بڑا ہونہار ہے۔"، لوک ناتھ کو خیال آیا اور پھر اپنے داماد کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے محسوس ہوا کہ کوئی ہونی ایک پاگل کتے کی طرح اس اچھے لڑکے کو کاٹنے کے لیے دانت نکوس رہی تھی۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا، اس طرح جیسے وہ اسے پاگل کتے سے بچا سکتا تھا۔

"میں اگلے ہفتے خود آ کر ریتا کو چھوڑ جاؤں گا۔" راجندر نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں، بالکل نہیں۔"، لوک ناتھ نے ذرا سختی سے کہا۔ سب نے گھبرا کر لوک ناتھ کی طرف دیکھا، پھر ایک دوسرے کی طرف۔ اس طرح جیسے انھوں نے لوک ناتھ کی آواز سنی نہیں تھی کسی اجنبی کی آواز سنی تھی۔

اپنی بیوی کو میکے سے اپنے گھر لانے کی بجائے وہ اسے پہاڑ پر لے گیا تھا اسے اپنی سالی پندرہ سال کی اُرمی بالکل اپنی بیوی جیسی دکھائی دیتی تھی۔ ا
جب بچی سو رہی ہوتی تو وہ اُرمی کو اپنے ساتھ گھمانے کے لئے لے جاتا تھا اس کی بیوی ابھی گھومنے پھرنے کے قابل نہیں تھی کہیں کہیں چیڑ کے درخ
کے نیچے گرے ہوئے پتوں کی تہیں بیٹھ جاتی تھیں۔ اُرمی دوڑنے لگتی تھی تو اسے پھسلنے سے بچانے کے لئے وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا اس نے ک
سوچا بھی نہیں تھا کہ اس اُرمی کو اس کے ہاتھوں کبھی ٹھیس بھی لگ سکتی تھی۔

ایک دن سیر کے لئے جاتے وقت اس نے اپنی بچی کی گردن کو چوما۔ سوتی ہوئی بچی کے جسم سے سونفیا دودھ اور پاؤڈر کی عجیب سی ملی جلی خو
اٹھ رہی تھی بچی کی ماں بھی بچی کے پاس لیٹی ہوئی تھی بچی والی خوشبو اسے اپنی بیوی کے بالوں میں سے بھی اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی اور پھر اسی دن کی با
ہے۔ سیر کرتے ہوئے جب اس نے اُرمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھسلواں چڑھائی چڑھنے کے لئے سہارا دیا تو اس کے شانے کو چھوتی ہوئی اس کی سانسو
میں سے بھی اسے وہی بو لپکتی ہوئی محسوس ہوتی۔ لوک ناتھ اپنی بیوی سے مذاق کرتا ہی رہتا تھا اسی لہجے میں وہ اُرمی سے بھی بولا ”بے بی کا
سونفیا دودھ معلوم ہوتا ہے تم دونوں کو بھی اچھا لگنے لگا ہے۔“

اس کے بعد لوک ناتھ کو نہیں معلوم کہ کیا اور کیسے ہوا۔ ایک بو تھی جو اس کے گلے میں سمٹ آئی تھی۔ سونفیا دودھ کی، پاؤڈر کی گداز اور
گوشت کی اور چیڑ کے پیڑوں کی اور لوک ناتھ کو محسوس ہوا کہ جنگل کی کھلی ہوا میں بھی اس کا دم گھٹ رہا تھا اور پھر یہ تو کہرے کی طرح اٹھی اور ا
کے حلق سے ہو کر دماغ پر چھا گئی اور پھر سارے چہرے کہرے کی دھند میں چھپ گئے۔ اُرمی کا چہرہ اس کی بیوی کا چہرہ، اس کی بچی کا چہرہ۔ چہرو
کا احساس ہوتا تھا، لیکن پہچانے نہیں جاتے تھے پھر لوک ناتھ کو ایسا لگا کہ نزدیک اور دور کوئی بستی نہیں تھی، جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں تک
صرف کھنڈر ہی کھنڈر تھے پھر کسی کھنڈر سے چمگادڑوں کی ایک تیز بو اٹھی اور اس کے سر میں سما گئی، پھر اسے محسوس ہوا جیسے کسی دیوار کی آڑ
نکل کر ایک چمگادڑ اس کے کانوں پر چپٹنے سی گئی ہو۔ اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے تھے کچھ دیر تک اسے کوئی آواز سنائی نہیں
دی تھی ضمیر کی آواز بھی نہیں لیکن ایک آواز اسے اب بھی سنائی دے رہی تھی، کانوں سے نہیں سنائی دے رہی تھی بلکہ خون کی ہر بوند سے اُبھر
ہوئی نظر آ رہی تھی۔

یہ جیسے ایک بہت بڑی سازش تھی۔ ضمیر کی آواز، رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی آواز اور چہرے کے ہر پہچان کے خلاف ایک بو
کی سازش تھی جنگل کی کھلی ہوا کے خلاف ایک بو کی سازش تھی، ہر آبادی کے خلاف ہر کھنڈر کی سازش تھی۔

لوک ناتھ کسی کی کوئی سازش نہ سمجھ سکا۔ پندرہ منٹ کا وہ وقت جب اس کی عمر سے ٹوٹ کر ایک انگ کی طرح دور جا پڑا تو لوک ناتھ
لگا کہ اس کی ساری زندگی اپاہج بن کر رہ گئی تھی۔

اس شام کو جب وہ گھر لوٹا تو بیوی کے کمرے میں جلتی ہوئی موم بتی کو دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے موم بتی کی لپٹ اس کے چہرے کی طرف دیکھ
کر تھرتھراتی ہوئی جلدی سے بجھ جانا چاہتی تھی۔

جب رات بھر آئی تو اندھیرا لوک ناتھ کو اچھا لگا لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ ایک اور اندھیرا اس کی چھاتی میں سما گیا تھا اندھیرے
کا ایک ٹکڑا رات کے اندھیرے سے ٹوٹ کر الگ جا پڑا تھا۔ رات کا اندھیرا تالاب کے پانی کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ جس میں سے ایک بو اٹھ رہ
تھی اس رات لوک ناتھ کو کتنے ہی خیال آتے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ سارے خیال اس تالاب میں تیرتے ہوئے مچھروں جیسے تھے۔

دوسرے دن وہ پہاڑ سے لوٹ آیا تھا، وہ اُرمی کو اس کے ماں باپ کے پاس چھوڑ آیا تھا پھر اُرمی سے اس کے بیاہ کے دن ایک
بار بھرے آنگن میں ملنے کے علاوہ وہ کبھی نہیں ملا تھا۔ یہ ایک معذرت تھی، جیسے وہ ساری عمر خود کو غیر حاضر سمجھ کر اُرمی سے
مانگتا رہا تھا۔

" پاپا جی "، سچیتا نے منت کے ساتھ لوک ناتھ کی خاموشی کو توڑنا چاہا اور دھیرے سے بولی " آپ کیا سوچ رہے ہیں پاپا؟ ویسے میں جانتی ہوں آپ " نہ " نہیں کریں گے۔"

"کیا"، لوک ناتھ نے حیران ہو کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ یہ بیٹی اسے بہت پیاری تھی اس کی بات اس نے کبھی نہیں ٹالی تھی لیکن وہ حیران تھا کہ اگر کوئی ہونی وقت کے ساتھ مل کر ایک سازش کرنے لگی تھی تو اس کی بیٹی اس سازش کو سمجھ کیوں نہیں رہی تھی۔

رینا کو میں کچھ دن کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں؟ یہ سونی مجھ سے سنبھلتی نہیں۔ "، سچیتا پھر کہہ رہی تھی۔

ماں نے بھی حامی بھر لی — " ایک مہینے تک رینا کا کالج کھل جائے گا — یہی چھٹیوں کا ایک مہینہ ہے ایک مہینہ اسکے یہاں ہی سہی راجندر بھی زور ڈال رہا ہے۔"

" راجندر بڑا ہونہار ہے۔"، لوک ناتھ کو خیال آیا اور پھر اپنے داماد کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے محسوس ہوا کہ کوئی ہونی ایک پاگل کتے کی طرح اس اچھے لڑکے کو کاٹنے کے لیے دانت نکوس رہی تھی۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا، اس طرح جیسے وہ اسے پاگل کتے سے بچا سکتا تھا۔

"میں اگلے ہفتے خود آکر رینا کو چھوڑ جاؤں گا"۔ راجندر نے دھیرے سے کہا۔

" نہیں، بالکل نہیں۔ " لوک ناتھ نے ذرا سختی سے کہا — سب نے گھبرا کر لوک ناتھ کی طرف دیکھا، پھر ایک دوسرے کی طرف اس طرح جیسے انھوں نے لوک ناتھ کی آواز سنی نہیں تھی کسی اجنبی کی آواز سنی تھی۔

حسین قلی
محمد ظفر خان

آخری علاج

میں ایک بیمار کو ٹیکہ لگانے میں مشغول تھی کہ ایک نرس جلدی سے کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی، جلدی چلو ڈاکٹر صاحب نے یاد کیا ہے۔
ڈاکٹر صاحب ہسپتال کے انچارج تھے، ہم سب انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ ہسپتال کے ملازمین کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ مشفقانہ ہوتا تھا۔ مگر وہ تھے نہایت خشک اور کم گو۔ ان کا چہرہ بڑا پروقار تھا وہ نرسوں کو شاذ ہی کبھی اپنے کمرے میں بلاتے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوگا۔ فوراً ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں گئے۔ ٹیلیفون ان کے ہاتھ میں تھا اور کسی عورت کے ہنسنے کی آواز اس میں سے آرہی تھی۔ جب میں داخل ہوئی تو فرمایا۔
"آؤ بیٹھو، کہو کیسی ہو؟ ہاں تو سنو یہ بیگم صاحبہ میرے عزیز ترین دوستوں میں سے ہیں۔ ان کے شوہر ایک عرصہ سے بیمار ہیں اور میرے زیر علاج ہیں، بیگم صاحبہ خود تیمارداری کے فرائض پوری طرح ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ میں کسی اچھی، شریف اور فرض شناس نرس مقرر کر دوں۔ تم چونکہ تمام نرسوں سے اچھی ہو اور اگرچہ تمہاری یہاں پر حاضری بھی ضروری ہے تاہم بیگم صاحبہ اور ان کے شوہر کی دوستی کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمہارا انتخاب کیا ہے امید ہے تم انکار نہ کروگی، ـــ ممکن ہے تمہاری خدمات کی چند ماہ تک ضرورت ہو، وہاں تمہیں ایک صاف ستھرا کمرہ دیدیا جائے گا، تنخواہ تمہیں ہسپتال سے ملتی رہے گی۔ (پھر آہستہ سے ٹیلیفون پر سنائی نہ دے) وہ لوگ بھی تمہیں کچھ نہ کچھ دیں گے، شاید تمہاری تنخواہ سے بھی زیادہ (پھر بلند آواز سے) تمہارا مجھ پر احسان ہوگا۔ اور میری عزیز دوست بیگم ناصر بھی تمہاری ممنون ہوں گی۔ اور کیا عرض کروں۔"
میں نے ایک لمحہ سوچنے کی اجازت چاہی، ڈاکٹر صاحب ٹیلیفون پر بیگم سے باتیں کرنے لگے۔ میں نے ایک سیکنڈ کے لئے سوچا اور ارادہ کر لیا کہ اس پیش کش کو قبول کرنا میرے لئے کسی تکلیف کا باعث نہ ہوگا، یہ تو ایک طرح کی تفریح ہوگی، قید تھوڑی ہوگی، شوہر کی موت اور اپنے اکلوتے بچے کو پرورش گاہ میں داخل کرنے کے بعد اس دنیا میں میرا اور کوئی نہ تھا، میں نہیں جانتی اور شاید کبھی بھی نہ جان سکوں کہ میرے ماں باپ کون تھے اور کیا تھے میں تو ایک بچہ تھی جو یتیم خانے میں پلا بڑھا ہو اور کسی اسکول میں بلا فیس پڑھا ہو۔ ڈاکٹر نے دو تین منٹ بعد ہنستے ہوئے مجھ سے کہا، اچھا۔ میں نے رضامندی کا اظہار کیا، خوش ہو کر بیگم صاحبہ کو اطلاع دی۔ دو گھنٹے بعد میں اپنی نئی جگہ پر تھی۔
کوٹھی میں داخل ہوتے ہی بیگم صاحبہ سے ملی۔ اس کے زرق برق لباس اور ہوس انگیز لڑکیوں کے اطوار دیکھ کر میری روح کانپ گئی۔ اس نے میری آمد اور اس خیال سے کہ میں اس کے شوہر کی تیمارداری کے لئے آئی ہوں مسرت کا اظہار کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور کہا سب سے پہلے بہتر ہے کہ میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دوں۔"
اب موقع تھا کہ میں عمارت کا کچھ حصہ دیکھ سکوں۔ یہ ایک عالی شان اور بہت وسیع کوٹھی تھی جس کے چار حصے تھے۔ آخری حصہ آراستہ پیراستہ

تھا، حیرت انگیز نفیس چیزیں دنیا پرستی، عشرت دوستی اور بے پناہ دولت و ثروت کی منہ بولتی تصویریں تھیں وہ کمرہ جو میرے لئے خالی کیا گیا تھا اتنا اچھا تھا کہ خواب میں بھی ایسا کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی دیکھنے کی امید تھی۔ میں نے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کیا، انہوں نے کہا " اچھا تو اب بیمار کے پاس چلتے ہیں۔"

" بیگم صاحبہ کیا آپ کے شوہر بیمار ہیں "

" ہاں۔ میرا شوہر ہے بے چارہ ۔۔۔۔ بہت بدقسمت ہے۔"

ہم ایک وسیع اور روشن ہال میں داخل ہوئے، بیمار کی چارپائی کمرے کے ایک کونے میں کھڑکی کے پاس پڑی تھی۔ بیمار کو اگر وہاں سے نکال دیا جائے تو یہ جگہ قابل دید تھی۔ لیکن بیمار کی موجودگی رغبت مشاہدہ کو سلب کر لیتی تھی۔ بیمار بتیس سالہ نوجوان تھا۔ مجھے یاد آیا کہ چند سال پہلے اس شخص کو میں نے ہسپتال میں دیکھا تھا۔ انہیں دنوں میں نے نرسنگ کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور ہسپتال میں کام کرنے لگی تھی، ابھی میں نے شادی نہیں کی تھی۔ یہ شخص اپنی بہن کی عیادت کے لئے آیا کرتا تھا۔ ایک دو گھنٹے میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ یہ اس قدر خوبصورت اور خوش اطوار تھا کہ میں حیران رہ گئی تھی دل ہی دل میں کہتی تھی۔ اے خدا کیا ہی اچھا ہو اگر مجھے اس جیسا شوہر ملے یا یہ شخص کبھی میری طرف توجہ کیا کرتا تھا۔ میں بھی تو خوبصورت تھی۔ میرے بھی چاہنے والے تھے۔ کئی ایک تو میرے پیچھے پیچھے پھرتے تھے اور بعض تو مزاحم بھی ہوتے، لیکن کہاں میں اور کہاں یہ شخص، جس روز اس کی بہن صحت یاب ہو کر ہسپتال سے رخصت ہوئی، مجھے سو تومان انعام دیئے۔ سب سے بڑی رقم جو اس وقت تک مجھے کسی نے دی تھی سات تومان تھے۔ اس نے سو تومان دیئے تھے۔ میری خوبصورتی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی امارت کے باعث۔

یہ وہی تھا لیکن اف کیا سے کیا ہو گیا تھا، اگر وہ درد کی شدت سے اپنا سر اس طرف اور اس طرف نہ مارتا، اگر موت سے بھاگنے کے لئے وہ اپنی آنکھیں تیزی سے نہ جھپکاتا، اگر اس کی جگہ خراش چیخوں سے اس خوبصورت کمرے میں شور نہ ہوتا تو ہر ایک یہی خیال کرتا کہ یہ ہزاروں سال سے ممی شدہ لاش ہے جو عجائب خانے کے صاف ستھرے کونے میں پڑی ہے، جھریاں، ہڈیوں سے چپکی ہوئی کھال، زرد اور سیاہ رنگ بالکل جلے ہوئے قہوہ کے رنگ کے مشابہ تھا، خشک ہونٹ، دانت منہ سے باہر نکلے ہوئے اور درد کی شدت سے وہ انتہائی اضطراب میں تھا۔

میں بیگم صاحبہ کے ساتھ بیمار کی چارپائی کے پاس کھڑی تھی، میں سخت گھبرا رہی تھی اور پشیمان تھی کہ ڈاکٹر صاحب کا کہا کیوں مان لیا اور ایسے وحشت انگیز اور قریب مرگ مریض کی تیمارداری اپنے ذمہ لی۔ بیگم نے غضبناک ہو کر بیمار سے کہا۔ آرام سے رہو، تم نے تو مردوں کے نام کو ڈبو دیا ہے۔ عورتوں کی طرح کس قدر شور مچا رہے ہو، مریض نے ایسی آواز سے جو سننے والے کو زندگی سے بیزار کر دے کہا، کیا کروں، اف میں کیا کروں، یہ ظالم درد مارے ڈال رہا ہے۔ علاج بھی تو نہیں ہو رہا۔

شور مچانے سے تو کچھ نہیں ہوا کرتا، تمہیں صبر کرنا چاہیئے تاکہ اچھے ہو جاؤ، اچھا تو سنو میں کہہ رہی ہوں۔ انہیں ڈاکٹر صاحب نے میری خواہش پر یہاں بھیجا ہے ۔۔۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ نرس بہت اچھی ہیں اور ہسپتال میں سب سے سینئر ہیں، واقعی یہ بہت اچھی ہیں، خوبصورت بھی ہیں اور فرض شناس بھی انہوں نے مجھ پر احسان کیا ہے اور تمہاری تیمارداری کو اپنے ذمہ لیا ہے، جو کام بھی ہو ان سے کہنا بس اس کے بعد مجھے تنگ مت کرنا۔ اور نہ اتنا شور مچانا کہ لوگ یہ سمجھیں بیچارے کو کوئی پوچھتا ہی نہیں "

بیمار جو اپنا سو سر ہانے پر ساکن رکھ ہی نہ سکتا تھا میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگا۔ آپ کا بہت بہت شکر گزار ہوں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے، میں تو اب لاعلاج ہوں، اگر کوئی معجزہ ہو جائے اور اچھا ہو جاؤں تو انشاء اللہ حق ادا کر دوں گا "

وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا، اس کا درد بڑھ گیا۔ وہ مرض سرطان میں مبتلا تھا، وہی ہولناک بیماری تھی جس نے میرے محبوب شوہر کی جان لی تھی۔ میں اس مرض کی حالتوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ ایسی اچھی طرح کہ میں اس تمام تکلیف کو ذاتی طور پر محسوس کر رہی تھی۔ مریض درد سے تڑپ رہا تھا۔ انجکشن جو دو گھنٹے ہوئے دیا گیا تھا اپنا اثر زائل کر چکا تھا۔ اس کا دل اجازت نہیں دیتا تھا اتنی جلدی ایک اور ٹیکہ لگایا جائے۔ مرض نے اپنے بے رحم پنجے اس پر گاڑ رکھے تھے۔ دو دفعہ تہران میں، ایک دفعہ جرمنی میں، ایک دفعہ سوئیزرلینڈ میں اور پھر اس کے بعد ایک دفعہ تہران میں اس نے آپریشن کرایا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹروں

نے اس کے معدے کا بھی آپریشن کیا تھا، اس نے یہ تمام آپریشن برداشت کئے تھے، وہ حسین و رعنا، شوخ اور با مذاق نوجوان ان تکالیف سے سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ میرا شوہر تو صرف ایک دفعہ آپریشن برداشت کر سکا تھا اگر دوسرا آپریشن وقت پر ہو جاتا تو ممکن تھا چند سال اور زندہ رہتا لیکن ہمارے پاس کیا رکھا تھا۔ میں نے تو گھر کا بوریا بستر تک بیچ دیا تھا۔ جانے کتنی کوشش اور منت خوشامد سے سول ہسپتال کے ڈاکٹر آپریشن کرنے پر راضی ہوئے تھے لیکن وقت گزر چکا تھا اور میرے شوہر نے آپریشن کی میز پر ہی جان دیدی تھی، آہ مفلسی کا شکار ہوگیا۔ دوست احباب کا خیال تھا کہ مفلسی نے ہی اسے اس مرض میں مبتلا کیا اور مفلسی کے ہاتھوں مر گیا مگر یہ شخص تو دولت مند ہونے کے باوجود اسی مرض میں مبتلا ہے اور مر رہا ہے۔ . . . ایک دو ہفتہ کے بعد جب اس کی زندگی کے طور طریقوں سے واقف ہوگئی تو پتہ چلا کہ اس کی دولت کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔ اس کی بیگم ایک وقت میں پچاس ہزار بلکہ ایک لاکھ تک چیک کاٹتی ہے، ان کے ایک پرانے نوکر نے بتایا کہ ہزار سال تک اسی طرح خرچ کرتے رہیں تو ان کا روپیہ ختم نہیں ہو سکتا۔ میں نے حیرت اور حسرت سے اس کی طرف دیکھا، سنتی رہی اور سوچتی رہی، ہماری اور اس کی زندگی میں کتنا بعد تھا اور اس دنیا میں کتنے لوگ ہیں، جنہیں اپنی دولت و ثروت کا پتہ تک نہیں اور کتنے ہی لوگ ہیں کہ ان کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں۔

بیمار جلد ہی مجھ سے مانوس ہوگیا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ ایک اچھی تیماردار اسے مل گئی، ایک دن جبکہ اسے تکلیف کم اور درد بھی قابل برداشت تھا مجھ سے اپنا درد دل بیان کرتے ہوئے کہنے لگا "اس مرض کا علاج نہ ہو سکا اور شاید کبھی نہ ہو سکے گا۔ میں تو چاہتا تھا اور اب بھی میری یہی خواہش ہے کہ تمام دولت صرف ہو جاتے اور میری خوشی و خرمی کے لمحات میں سے ایک لمحہ مجھے مل جاتے۔ اس کے بعد مجھے سکتہ ہو جائے اور مر جاؤں، میری یہ آرزو یقیناً کبھی پوری نہیں ہو سکتی، اب تک بیس لاکھ تو ان علاج معالجہ پر خرچ کر چکا ہوں اور حالت دن بدن بگڑتی چلی جارہی ہے۔"

میں اس کی باتیں سن رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کی اور اپنے شوہر کی حالت کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اس کے بعد بھی جب کبھی میں نے اس بارے میں سوچا میرے دل نے گواہی دی کہ میرا شوہر اس سے کہیں زیادہ خوش قسمت تھا کیونکہ اس کی بیوی مجھ جیسی عورت تھی جسے اس کی تکلیف کا احساس تھا آہ میں اس کی خدمت کرنے میں کسقدر راحت محسوس کرتی تھی بلکہ جس قدر اس کی حالت خراب ہوتی گئی میرا حال بھی تباہ ہوتا گیا۔ میری زندگی کی سب سے تعجب خیز بات یہی ہے کہ اس کے مرجانے کے بعد میں کیونکر زندہ رہی۔ اس کی تیمارداری کے دوران میں اس کی اس قدر غم خوار و غم گسار تھی کہ تسکین درد کے وسائل میں اس کا عشر عشیر بھی اس شخص کو حاصل نہیں تھا۔ میں تو اپنے شوہر کی جاں نثار تھی مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ اسکی بیوی حسین تھی، دل آرا تھی، ہمیشہ خوش رہتی اور دوسروں کو بھی خوش رکھتی۔ اپنی مسرت و شادمانی کے لئے سب کچھ کر گزرتی۔ لیکن اپنے شوہر کے بارے میں سرد مہر، بے اعتنا اور زود رنج تھی، جب کوئی وہاں نہ ہوتا تو اس کے سرہانے آتی اور اب اس کے اپنے کہنے کے مطابق جب تم یہاں موجود ہو تو میرا وہاں کیا کام ہے۔ جس وقت بیمار شدت درد سے چلاتا تھا اور کبھی گھر میں ہوتی تو اس کمرے سے دور چلی جاتی تاکہ اس بدبخت کی آواز بھی نہ سن سکے، دوسرے موقعوں پر جب کبھی اس کے کمرے میں آتی تو چند لمحے اس کی چارپائی کے پاس کھڑی ہوتی اور اسقدر سرد مہری کا ثبوت دیتی جیسے وہ کسی نفرت کردہ نوکر کی عیادت کو آئی ہو۔ لیکن جس وقت ڈاکٹر یا ان لوگوں کے ساتھ آتی جو بیمار کی عیادت کے لئے آتے رہتے تھے تو خاوند کے سرہانے کھڑی رہتی، کچھ کام بھی کر دیتی اور میں نے تو یہ حالت کئی بار دیکھی تھی اور ہر بار جب وہ تجدید کرتی تو میں حیران رہ جاتی۔ نہ جانے کیسی عورت تھی، ایسی باتیں کرتی اور اس قدر غم و اندوہ اور دلسوزی کا اظہار کرتی کہ جو کوئی سنتا اور دیکھتا خیال کرتا کہ بیچاری شوہر کی بیماری پر رات دن آنسو بہاتی ہے، ڈاکٹر سے عاجزی سے التماس کرتی اور شوہر کی درخواست دہراتی، بیمار جس کا دل مرنے کو نہ چاہتا تھا، اور مرنے کی تکلیف سے کہیں زیادہ یہ درد اس کی تکلیف کا باعث تھا۔ بھرائی ہوئی تضرع آمیز آواز میں میرے ہسپتال کے انچارج اور دوسرے ڈاکٹروں سے کہتا تھا "کچھ سوچئے، مشورہ کیجئے، میری تمام دولت آپ کے اختیار میں ہے اگر آپ بہتر سمجھتے ہیں تو مجھے علاج کے لئے باہر بھیج دیجئے۔ کوئی مشہور حکیم، ڈاکٹر یا سرجن دنیا کے کسی حصے میں ہو بتایئے، فیس چاہے کتنی ہو فکر نہ کیجئے جو مانگیں گے میں دوں گا ان میں سے دو تین کو یہاں لے آیئے، وہ آپریشن کر دیں، آپ کے علم و دانش، خلوص، محبت و لطف اور میرے روپے سے کیونکر ممکن ہے کہ مجھے لعنتی مرض سے نجات نہ ملے۔

اس کی بیوی بھی نہایت شیریں زبانی اور اس رقت سے کہ پتھر کا دل پانی ہوجاتے کہتی تھی، اگر آپ یہ کام کر دیں تو آپ مجھے نئی زندگی دے دیں گے آپ ایسا کر سکیں تو تمام عمر احسان مند رہوں گی، میں آپ کی مرید اور لونڈی بن جاؤں گی، آج کی دنیا میں خاص طور پر ایسے شخص کے لئے جو اس قدر دولت رکھتا اور لاکھوں روپے خرچ کرنے سے بھی گریز نہ کرتا ہو ایک ایسی بیماری سے مرجانا ظلم ہے۔ دنیا کے دانشمند اور ڈاکٹر یہ کس طرح کہتے ہیں کہ موت پر غلبہ پالیا گیا ہے۔"

میں حیرت اور غصہ سے اس کی مکاریوں کو دیکھتی۔ اس کی باتوں کو سنتی تو میری آنکھوں کے سامنے اپنی زندگی کے واقعات گھومنے لگتے اور میں سوچتی کہ میں تمنا کرتی رہی کہ کم از کم مہینہ میں ایک دفعہ دو تین تو مان کا ایک جوڑہ اپنے خاوند کے لئے خرید دوں مگر افسوس میری تمنا پوری نہ ہوتی۔ سوائے اس صورت میں کہ گھر کی کوئی چیز بیچ دیتی یا کسی سے ادھار لیتی۔

جس وقت ڈاکٹر یا عیادت کرنے والے چلے جاتے تو بیگم صاحبہ بھی ان کے ہمراہ باہر چلی جاتیں اور پھر کبھی واپس نہ آتیں تا وقتیکہ کوئی عیادت کے لئے آتا۔ ان مواقع کے علاوہ اس کا جو برتاؤ تھا کیا کہوں۔ کبھی کبھی جب بیمار سویا ہوا ہوتا تو مجھے اپنے کمرے میں لے جاتی اور نہایت رازداری سے کہتی کہ کسی سے نہ کہنا کہ اس کے ظاہر و باطن میں کس قدر فرق ہے۔

دو ماہ اسی طرح گذر گئے، ڈاکٹروں نے ارادہ کیا کہ آخری علاج بیمار کا آپریشن ہے، کہتے تھے ۹۵ فیصد ناکامی کا امکان ہے۔ بیگم صاحبہ مان گئی تھیں، لیکن مریض کو یہ بات نہیں بتائی گئی تھی بلکہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ اگر مرض جڑوں سے نہ گیا تو کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ وہ دس بارہ سال اور آرام و راحت سے زندگی بسر کر سکے گا۔

آپریشن کرنے سے ایک ہفتہ پہلے ایک رات تقریباً بارہ بجے ہوں گے، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ میرے ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر صاحب بیگم صاحبہ کے کمرے میں ہیں میں نے بڑی مشکل سے اندر جھانکا اور رشک دور ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب ہی تھے، وہ صبح تک وہیں رہے، میں کیا کہوں کہ رات بھر کیا سوچتی رہی، دوسری رات بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا آج رات میں چاہتی ہوں کہ اپنے شوہر کے پاس رہوں، کئی دنوں سے کہہ رہا ہے کہ ایک رات تو میرے پاس گزارو، تم جانتی ہو میں اس سے کس قدر بیزار ہوں لیکن آج میں نے مان لیا ہے، پورے دو سال ہوئے کہ میں ایک رات بھی اس کے پاس نہیں گئی۔ آج خیال ہوا یہ بھی ایک گناہ ہے، اسے مرنا تو ہے ہی ایک رات جیسے بھی ہوگی کاٹ لوں گی۔

اس دن مریض کی حالت بھی بری نہ تھی۔ درد بھی کم تھا، ڈاکٹر صاحب نے ایک طاقتور مسکن کا ٹیکہ لگایا تھا لیکن اس رات میں نے رات کے ابتدائی حصہ میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ اس کی حالت بتدریج خراب ہو رہی ہے، رات کے ایک دو گھنٹے گزرے تھے کہ بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں اور مجھے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا ہے۔ مجھے دروازے پر کان لگانے کا خیال آیا کیونکہ نوکروں کے آجانے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میں اپنے کمرے میں بہت دیر تک جاگتی رہی اور سوچتی رہی، نہ جانے کب نیند آئی، جب بیدار ہوئی تو صبح ہو چکی تھی، بیمار کا حال بہت برا تھا، بیگم صاحبہ نے ایک لمبی چوڑی کہانی شروع کی اور مجھے تلقین کی کہ سب جگہ اور سب کے سامنے کہوں کہ اس کی حالت کا خراب ہونا اس کا اپنا قصور ہے کہ باوجود اس قدر شدید بیماری کے اپنی خواہشات نفسانی پر قابو نہ پاسکا اور بیگم کو مجبور کیا کہ رات اس کے پاس بسر کرے، لیکن میں تو سب کچھ جانتی تھی، میں نے اندازہ لگالیا بلکہ یقین ہو گیا تھا کہ بیگم صاحبہ اور ڈاکٹر صاحب نے کیا پاپڑ بیلے ہیں، میرا خیال تھا کہ آپریشن کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیں گے اور انہوں نے ایسا ہی کیا، ایک دن بیگم صاحبہ نے ظاہری غصے اور رنج سے مجھ سے کہا، دیکھا اس نے مجھے کس مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا میں پہلے تو احتیاط کرتی رہی۔ اس دفعہ غفلت ہوگئی۔" اس واقعہ کے دو دن بعد مریض کا آپریشن ہو گیا اور چند گھنٹے کے بعد آپریشن روم سے قبرستان میں منتقل کر دیا گیا۔ آپریشن روم سے تابوت تک بیگم صاحبہ کئی بار غش کھا کر زمین پر گریں۔ اتنا روئیں اور چیخی چلائیں کہ میں حیران رہ گئی مردے کے دفن ہونے تک بیگم صاحبہ کمال استادی سے کئی دفعہ مریں اور زندہ ہوئیں ڈاکٹر چونکہ وہاں موجود تھا اور پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے برابر انجکشن لگا رہا تھا سب کو یقین تھا کہ بیگم صاحبہ کے لئے یہ غم ناقابل برداشت ہے۔ میت کے دفن ہونے کے بعد بیگم قبر پر اس طرح بیہوش

ہو گئی کہ مجھے بھی یقین ہو گیا، اس دن دوستوں اور رشتہ داروں میں مشہور ہو گیا کہ بیگم صاحبہ خاوند کے مرجانے کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں گی۔

میرا اب اس گھر میں کوئی کام نہ تھا، میں ہسپتال میں اپنی ڈیوٹی پر واپس آگئی۔ دو ماہ میں کوئی دو دفعہ احوال پرسی کے لئے گئی، بیگم اسی طرح اپنے آپ کو بیمار اور دیوانی ظاہر کرتی۔ اس کے بعد میں کبھی نہیں گئی، ایک دن اچانک بیگم صاحبہ نے ٹیلیفون پر کوٹھی آنے کی دعوت دی، وہ ابھی تک ماتمی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آٹھواں نواں مہینہ ہوگا، بہت مہربانی سے پیش آئی۔ ایک نفیس تحفہ مجھے دیا۔ اس کے بعد ایک کاغذ میرے سامنے رکھا اور اس رات کے بارے میں گواہی دینے کو کہا، میں نہیں جانتی تھی کہ کیا کروں، میں نے ایک لمحہ کے لئے سوچا پھر اس گناہ کی مرتکب ہو گئی۔ میں نے لکھ کر دستخط کر دیئے، پھر میں نہیں جانتی کیا ہوا۔ دو ماہ بعد سنا کہ اس بات کا سرٹیفکیٹ لیا ہے کہ یہ بچہ مرحوم کا ہے۔

میں یہ واقعہ بھول چکی تھی کہ آج جب کہ مریض کی موت کو پورا ڈیڑھ سال گذر گیا ہے میں نے اتفاقاً سنا کہ بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر صاحب سے نکاح کر لیا ہے اور کل دعوت ولیمہ ہے۔

سیپ
سیپ
سیپ

راجندر ادستھی
ترجمہ: شرجیت
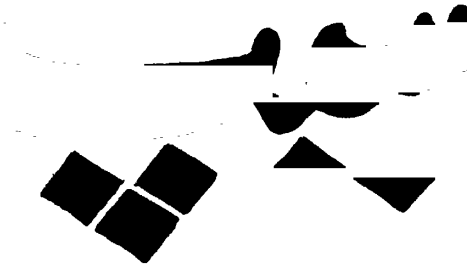
دو جوڑی آنکھیں

تم سے پہلی بار مل کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اپنے پچھلے تمام عقیدوں کو توڑ کر میں نے ایک نیا عقیدہ قائم کیا تھا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی کھو گیا اور مجھے پھر ایک نیا معیار قائم کرنا پڑا۔ یوں لگتا ہے ایک جھوٹ سے شروع کر کے ہم پھر دوسرے جھوٹ پہ لوٹ آتے ہیں۔

تم اُس دن کتنی مضطرب و بیقراری پلیٹ فارم پر منتظر تھیں۔ تمہارے ساتھ ایک چہرہ اور تھا۔ اب اُس کا تصور دھندلا گیا ہے۔ ہم دونوں انجانے اور اجنبی تھے۔ تب بھی کہیں غلطی نہیں تھی۔ ورنہ کون عورت ایک مرد کے پاس آکر یکایک کھڑی ہو سکتی ہے اور مرد کے لیے تو... کھلی سڑکوں پر مرد کے لیے کوئی رعایت نہیں۔ تم نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی تھی۔ تب میں نے تمہاری روشن آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ مرچ کی مانند سُرخ اور جلیبی پیپر کی مانند چمکدار تمہاری ساڑی آج بھی ہواؤں میں تیرتی سی نظر آتی ہے۔ اُس کے اندر اور اندر کے اندر ایک ہی نظر میں مَیں سب کچھ دیکھ گیا تھا۔

میں نے پوچھا تھا "آپ کو پریشانی تو نہیں ہوئی تلاش کرنے میں؟"

تم نے کہا تھا "اور آپ کو؟"

میں نے کہا تھا "میں نے تو رسک لیا تھا...؟"

تم نے کہا تھا "میں رسک نہیں لیتی!"

ہم تینوں (یعنی تمہاری سہیلی بھی) کتنے ہنسے تھے اُس دن! الفاظ سے انجان، معنوں سے ناواقف ایک نئے جذبے میں نئے پن کے ایک احساس میں۔

تمہارے گھر کے دو دن... ! اتنا خوش ہو کر بھی میں نہیں چاہتا کہ وہ دو دن پھر واپس آئیں! مَیں نہ وقت میں یقین کرتا ہوں اور نہ وقت کو جان سکتا ہوں! ایک خوبصورت اور خوشگوار ماضی مستقبل میں حال بن کر کتنا کچھ بھاری ہو سکتا ہے! ورنہ تمہارے پیارے پتا۔ تمہاری ماں، بھاوج ان کے بچے اور پھر تم! ان ساری آنکھوں کا نم آلود اصرار۔ سوچتا ہوں یہ پہلی ملاقات پہلی ہی بنی رہتی تو ایک خواب نہ ٹوٹتا۔

مجھے تمہاری بیٹی سے پیار ہے۔ تب بھی تھا۔ آج بھی ہے۔ گڑیا کی طرح گول مٹول اور خوبصورت وہ کتنی بھولی ہے۔ جب ہم باتیں

کرتے ہیں تو وہ ہماری جانب ٹکٹکی لگائے ایک خالی کردار کی مانند دیکھتی ہے، لگتا ہے پچھلی کی طرح باتیں بھی اس کی سمجھ سے پھسل جاتی ہیں۔ وہ کچھ سوچ پاتی ہے کچھ نہیں اور اس کا قدرتی چہرہ اور اس کے دودھ کے دانت ایک راگ کی مانند کھنچتے ہیں "جی انکل...!"

"ہاں بیٹی!"

"ہم چڑیا گھر ضرور دیکھیں گے۔ ممی تو کچھ دکھاتی ہی نہیں، بس اپنی بات کرتی رہتی ہیں۔"

"اپنی بات یعنی؟"

"کچھ نہیں انکل..."

"نہیں بتاؤ، کیا بات کرتی ہیں؟"

"آپ کتنے اچھے ہیں انکل!"

"تمہاری ممی کہتی ہیں؟"

"ارے... رے! انکل کو کوئی جادو آتا ہے! ممی، دیکھو نا ٹھیک تمہارا کہا انکل نے دہرا دیا۔"

جی میں آیا۔ اس کو زور سے کھینچ کر اپنی چھاتی سے لگا لوں اور لگائے رہوں۔ میری بیٹی! لیکن وہ میری بیٹی نہیں تھی۔ وہ تمہاری بیٹی تھی اور تمہیں اپنے اوپر، اپنی پرچھائیں کے اوپر، اپنی سوچ کے اوپر اتنا یقین ہے کہ تم نہیں چاہتیں کہ تمہاری اُن سے دور جا سکے ورنہ اس دن اسٹیشن پر تم اتنا نہ بگڑتیں۔

میں نے کہا تھا "رشم کے سامنے ایسی باتیں مت کیا کرو۔ وہ کس طرح ٹکر ٹکر موم کی گڑیا کی مانند دیکھتی رہتی ہے۔"

گاڑی چھوٹنے کو پانچ منٹ رہ گئے تھے اور تم نے پانچ منٹ میں ہی ایک خاصا ڈرامہ بنا ڈالا "میں کیسی ہوں؟ میری بیٹی کیسی ہے؟ میں کیا باتیں کرتی ہوں؟ آپ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میری بےعزتی کرنا چاہتے ہیں؟ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں؟"

اور تم تیزی سے اپنے ڈبے میں جاکر اوپر کی برتھ پر لیٹ گئی تھیں۔

میں ایک بار تب بھی اندر آیا تھا، مگر تمہارا دماغ کہیں رہن تھا اور تم نے ایک جڑا ہوا تار توڑ دیا تھا۔ ڈبے سے اتر کے مجھے کتنی کوفت ہوئی تھی۔ میرا اپنا کچھ حق ہوتا تو تمہاری چوٹیاں پکڑ کے تمہیں ڈبے سے باہر لاتا اور پیٹھ میں دو گھونسے جڑ دیتا اور چھوڑ دیتا اور پھر اُسی گاڑی میں میں بھی چل پڑتا۔ یہ دیکھنے کو کہ تمہارا دماغ کب تک رہن رہتا ہے مگر میں ایسا نہ کر سکا۔ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے جو ٹوٹنا تھا ٹوٹ گیا۔ اسی لمحے ٹوٹ گیا۔

اور ٹوٹے ہوئے تار کبھی نہیں جڑتے۔ اُن کی جگہ نئے تاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اُن نئے تاروں میں کتنی طاقت تھی!

میرے شانوں پر اپنا سر رکھ کر تم کتنا روئی تھیں۔ میں نے کہا تھا "نیرا! پچھلی باتیں یاد کر کے رونے سے کوئی فائدہ نہیں!"

تم نے تب اپنے دونوں ہاتھ میری گردن میں ڈال دیے تھے۔ اُن سے تم بھول گئی تھیں۔ تم نے کہا تھا "راجو رو لینے دو مجھے! خوب رو لینے دو!" اور میں بدحواس سا تمہیں سسکیاں بھر بھر کے روتے دیکھ رہا تھا اور ایک بڑی اُلجھن اور کشمکش تھی، ایک مشکل پہیلی۔ کیا ہر عورت اسی طرح رو رو کر اپنا سکھ بٹورتی ہے؟

تمہارے رونے میں گرمی تھی اور میں اُس گرمی میں پگھلتا جارہا تھا... اور انجانے ہی میں میں نے تمہاری گردن پکڑ کے نیچے گرا دی تھی۔ تم کبوتر کی طرح جھٹپٹا کر نیچے جھک گئی تھیں، اور میں باز کی طرح تمہارے جلتے ہوئے لبوں پہ ٹوٹ پڑا تھا۔ تم تب اوپر اٹھتی جارہی تھیں۔ لگتا تھا، ہلکی ہوکر ہوا میں تیرنے لگوگی اور میرے گلے میں کاغذ کی طرح بندھ کر ایک سرسراہٹ پیدا کروگی۔ ہوا بھی یہی۔ پندرہ منٹ کے اندر ہی تمہارے آنسو غائب تھے۔ تمہارا درد میرا ہوچکا تھا (کیونکہ میری گردن اکڑ گئی تھی) اور تمہارے رخساروں اور لبوں کی تہیں نرم ہوکر لو دے اٹھتی تھیں۔

پہلی بار تم نے مجھے چاہا تھا۔

پہلی بار تم نے اپنے شوہر کو فراموش کیا تھا۔

پہلی بار تم نے ایک ارادہ مضبوط کیا تھا... !

ڈائی ورس کا... !

تم اپنے شوہر کو ڈائی ورس دے دوگی بہت ہوچکا۔ تنگ اور پریشان کرنے کی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ تمہارا شوہر جاہل ہے۔ تمہارے اندر کے نازک جذبات کو وہ نہیں سمجھتا۔ ایک بڑی نوکری سے برخاست کیے جانے کے بعد وہ فالتو آدمی اب تمہارا سر درد ہے۔ تمہاری پریشانیاں میں محسوس کرتا رہا ہوں۔ میرے دل میں یہ احساس رہا ہے کہ تم میں سنجیدہ ہونے کی اور سنجیدگی سے حقیقت کو سمجھنے کی طاقت ہے۔ تم اپنے بل پہ اکیلی کھڑی ہونا چاہتی ہو، لیکن تمہارا شوہر ہر قدم پر تمہیں اس بات کا احساس کراتا رہتا ہے کہ تم عورت ہو، ایک کمزور اور بغیر سہارے کے نہ ٹک سکنے والا تنکا ہو اسی لیے وہ تمہیں مارتا ہے۔

اُس دن شام جھک آئی تھی۔ ہم ریتیلے ٹیلوں کی سیر کرکے واپس لوٹے تھے۔ ہوٹل کے پاس آتے آتے کافی اندھیرا ہوگیا تھا۔ اور تم میری کمر میں ہاتھ ڈالے ایک ایک قدم ساتھ بڑھا رہی تھیں۔ تنگ گلیوں کے ایک چوک میں تم آکر رک گئی تھیں۔ تم نے بتایا تھا۔ "راجو! ایسی جگہ ہے جہاں آکر میرے قدم معاً ٹھٹھک جاتے ہیں۔ انھوں نے یہیں پہ مجھے چپلوں سے پیٹا تھا۔ تب میں کالج جارہی تھی۔ میرے ساتھ میرا ایک طالب علم تھا جو شیکسپیئر کی اس ٹریجڈی کو سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کا ہر پلاٹ دردناک ہی کیوں ہے۔ میں اس کو سمجھا رہی تھی۔ سامنے سے میرے شوہر آرہے تھے۔ قریب آئے تو میں نے مسکرا کر کہا۔ شام کو ہم پکچر دیکھنے چلیں گے۔ آپ کے لیے کھانا بنا کر رکھ دیا ہے۔"

شوہر نے سر سے پیر تک تمہیں دیکھا تھا اور پھر اُسی طالب علم کے سامنے پوچھا تھا۔ "یہ کون ہیں؟"

"رمیش... تھرڈ ایر کا اسٹوڈنٹ ہے۔" تم نے بڑے قدرتی انداز میں جواب دیا تھا۔

"تو اس سے تمہارا عشق ہو رہا ہے۔" تمہارا شوہر زور سے چیخا تھا۔

تم بدحواس سی اپنے شوہر کی اُبھرتی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھتی رہیں اور اس نے دوسرے ہی لمحے ایک زور کا چانٹا تمہارے گال پہ جڑ دیا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے وہ چلّانے لگا تھا۔ "آوارہ... بدچلن... !" تمہارے سامنے دھرتی گھوم گئی تھی۔ رمیش بھاگ گیا تھا۔ تمہارے شوہر نے تمہارا ہاتھ پکڑا تھا اور تمہیں گھر واپس لایا تھا۔ مارے شرم کے تم کوئی احتجاج بھی نہیں کرپائی تھیں۔ تمہارے ساتھی اور اُن کے خاندان کے لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ گھر آکر اس نے تمہیں اور پیٹا تھا اور بہت سی گالیاں دی تھیں۔

"تمہارا شوہر بہت جاہل آدمی ہے!" میں نے کہا تھا۔ تمہارے لیے میرے دل میں انجانی ہمدردی اُبھر آئی تھی۔

تم نے بتایا تھا اُسی شام وہ تمہیں جبراً سنیما لے گیا تھا۔ مردوں کی کھڑکی کے سامنے کافی بھیڑ تھی۔ تم عورتوں کی قطار میں کھڑی

ہو گئی تھیں۔ ٹکٹ لے کر تم لوٹی تھیں تو تمہارے شوہر نے اُسی سینما ہال کے سامنے چوراہے پر چپلوں سے تمہاری تواضع کی تھی۔ اُس نے پوچھا تھا۔ "وہ کون عاشق ہے جو تمہیں گھور گھور کے دیکھ رہا تھا؟" اور تم پریشان تھیں۔ اس لیے بھی کہ کم از کم اس انجانے عاشق کا چہرہ ہی دیکھ لیا ہوتا! تمہارے شوہر نے زور سے آوازہ کسا تھا۔ "دستو! یہ میری بیوی ہے یا طوائف ہے! ایک کالج میں لیکچرار ہے! خود آنکھیں لڑاتی ہے اور۔۔۔" تم نے بھاگ کر کہیں پناہ لی تھی۔

تم نے اپنے شوہر کی حرکتوں کے کتنے ہی قصّے سنائے تھے! وہ نوکر کے سامنے تمہیں ڈانٹتا ہے۔ مارتا ہے۔ جب مار کا درد تمہاری پیٹھ سے اُتر کر رانوں تک آتا ہے تب وہ تمہیں اپنے ساتھ سونے کے لیے مجبور کرتا ہے اور تم۔۔۔! تم نے ہی کہا تھا "مجھے اِن باتوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے خوف لگتا ہے اور میں چیخنے لگتی ہوں۔ تب وہ اور زور سے میری بدچلنی کی تاریخ دہراتے ہیں۔۔ پھر کہتے ہیں تم کہیں سے بھی عورت نہیں ہو! تمہارے شوہر کی باتیں مجھے غلط نہیں لگتیں۔ ایسی حالت میں تم کیا کوئی بھی عورت اپنے اندر کی عورت کو زندہ نہیں رکھ سکتی لیکن۔۔۔ تب بھی تم اپنے شوہر کا پیچھا نہیں چھوڑتیں! تب بھی سیتا اور ساوتری بننے کا ڈرامہ کھیلتی ہو۔ تمہارا دل ایک تحریک کرتا ہے۔ تمہیں ارتقا کی جانب لے جانا چاہتا ہے اور ہر بار پچھڑ جاتی ہو کہتی ہو "میری لڑکی کا کیا ہوگا؟ دوسرا مرد میرے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرے گا اس کا کیا بھروسہ ہے"؟ پھر تمہارے سامنے عمر کا ایک نقشہ اُبھرتا ہے۔

"ابھی میں پینتیس کی ہوں۔ دس برس بعد میرے بدن میں جو ہے نہیں رہے گا تب۔۔۔؟"

"دس برس کی فکر تمہیں آج ہی نہیں کرنی چاہیے"۔ میں نے تمہیں حوصلہ دیا تھا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے میں نے تمہاری پیٹھ سہلائی تھی اور تم رہ رہ کر چیخ پڑتی تھیں۔ کیونکہ تمہاری پشت پہ جو نشان بنے ہوئے تھے۔ ان کا درد کم نہیں ہوا تھا۔ تم نے لوٹ کر میری جانب دیکھا تھا اور کہا تھا۔ "یہ تم کہہ رہے ہو؟"

"ہاں!" میں نے کھلی آنکھوں سے کہا تھا۔

"آگے کی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔ یہ تم کہہ رہے ہو؟" تم نے عجیب انداز میں یہ بات دہرائی تھی۔

"ہاں! میں تو کل کی بات نہیں سوچتا۔ کل دیکھا نہیں جاسکتا تو سوچ بھی بیکار ہے"۔ میرے لہجے میں استقلال تھا۔

تم نے مجھے ایک جھٹکا دیا تھا۔ تم اٹھ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھی تھیں اور تم نے مُنہ بنا لیا تھا۔ اس طرح بے باتوں کے مُنہ بنانا معمولی عورتوں کا کام ہے اور میں تمہیں معمولی عورت کبھی نہیں سمجھتا تھا۔ اسی لیے میں نے تمہیں سمجھایا تھا۔ میں نے کہا تھا" نیرا، یوں بات بات پر بگڑنے کی عادت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں سنجیدہ ہو کر اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔"

"تو کیا میں اپنے کو تمہارے ہاتھوں میں سونپ دوں؟"

تم جس انداز میں چیخی تھیں اُس سے میرا دل یکایک کانپ گیا تھا۔ میں بدحواس تھا۔ میں نے کہا تھا" میں نے تو یہ نہیں کہا کہ تم مجھے کچھ بھی کبھی کے لیے بھی سونپ دو۔"

"مجھے مردوں کا قطعی بھروسہ نہیں! سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ تم کل کی نہیں سوچتے اور چاہتے ہو میں اپنے شوہر کو چھوڑ دوں!"

میں تب بھی پرسکون تھا۔ میں نے اسی انداز میں کہا تھا" نیرا مجھے کل واپس جانا ہے تمہیں اپنی ریسرچ کے سلسلے میں باتیں کرنی تھیں۔ چاہو تو کرلو۔ جو بات میں نہیں سوچتا۔ تم کیسے کہہ دیتی ہو؟"

"ہاں!" تم نے اسی انداز میں کہا تھا۔" تم میرے بارے میں کیوں سوچنے لگے۔ جاہل۔۔۔!"

میری طاقت ختم ہو گئی تھی۔ کیونکہ تمہارا گیان اور تمہارا دل دونوں باہر کھڑے ہو کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے

ادنی کپڑوں کے سامنے ٹھنڈ کھڑی ہوئی کانپتی ہے۔ بزدلی اور پسماندگی کی کوئی دوا کبھی ایجاد نہیں ہوئی۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ تم کیا چاہتی ہو۔ کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے میں اس دن اُٹھ کر چلا آیا اور دوسرے دن اپنے شہر واپس آگیا تھا۔ آتے ہی مجھے تمہارا خط ملا تھا جس میں تم نے شکایت کی تھی کہ میں نے ذرا سی محبت بھی تمہیں نہیں دکھائی۔ تم نے لکھا تھا "یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ تم مجھے اب نہیں چاہتے۔ کسی بہتر عورت کی گرفت میں تم آگئے ہو... ورنہ جاتے وقت یوں بیگانے کی طرح مجھ سے سلوک نہ کرتے!"

تمہارا درد!

واقعی میں وہ درد نہیں بھول پا رہا ہوں۔ بیمار تمہاری بہن تھی لیکن مجھے لگتا تھا۔ بیمار وہ نہیں تم ہو۔ تمہارے اندر ایک مرض تھا۔ ایک بڑا مرض جس کی ڈاکٹروں کے پاس کوئی دوا نہیں تھی اور تمہاری بہن اس کو جانتی تھی۔ وہ تمہیں چاہتی تھی، تمہاری خاطر جیسے اُس کی ہر سانس چلتی تھی۔ مجھ سے اُس نے کہا تھا "میری بہن بہت پریشان رہتی ہے۔ آپ اُس کی پریشانیاں دور کر سکتے ہیں؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ تم مجھے چاہتی ہو اور یہ سُن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اسی دن دونوں دادر کے ایک ریستوراں میں دوپہر کا لنچ لے رہے تھے۔ تب میں نے تم سے مذاق کیا تھا اور پھر سیریس ہو کر تمہاری بہن کی تعریف کی تھی۔ مجھے یہ اچھا لگا تھا۔ مجھے لگتا تھا تمہاری بہن کے دل میں تمہارے لیے اتنا پیار بھرا ہے کہ اگر وہ سب پھوٹ کر باہر آجائے تو شاید اُس کے سیلاب سے ساری دنیا ہی ڈوب جائے۔ تم میرے نزدیک بیٹھی میری باتوں کو سُن رہی تھیں اور پھر یکایک تمہارے دل میں جانے کیا آیا تھا کہ تم تنک کر اٹھی تھیں اور اُٹھ کر سامنے کی سیٹ پہ جا بیٹھی تھیں۔ تم نے ہمارے پیار کے اُن تنہا لمحوں پر حقارت کا اظہار کیا تھا۔ تم نے اپنے مزاج کے مطابق تنک کر کہا تھا "تم میری بہن سے پیار کرنے لگے ہو۔ وہ مجھ سے چھوٹی ہے۔ زیادہ خوبصورت ہے۔ اُس کی ناک زیادہ نوکیلی ہے۔ اس کی خالی آنکھوں میں تم اپنا عکس دیکھنے لگے ہو! میں ٹھہری بدصورت، بے مزا، کرکری عورت! تم میری کیا فکر کرو گے... !"

تمہارا وہ روپ میرے سامنے ہے۔ آدھی رات کی اس تنہائی میں بھی تمہاری آنکھیں تیرتی سی نظر آتی ہیں اور میں اُڑتی ہوئی دھول میں ایک پتے کی مانند ایک عورت کو دیکھ رہا ہوں۔ کیا ہر عورت اسی طرح اُڑتی اور بدلتی ہے؟ لیکن نہیں! ایسا ہوتا تو تمہاری بہن وہ سب مجھ سے نہ کہتی جو تمہارے لیے ایک پاک محبت سے لبریز تھا۔ تم جتنے دن رہیں برابر یہ ڈرامہ ہوتا رہا۔ تمہاری بیمار بہن کی فکر میں اس لیے کرتا تھا کیونکہ وہ تمہاری بہن ہے پر تم شاید یہی سوچتی رہیں کہ میں تمہیں اس لیے چاہتا ہوں کیونکہ تم اپنی بیمار بہن کی بہن ہو۔ سوچ کے اس دائرے میں کتنا فرق ہے! اُسی دن میں نے تمہارے بارے میں ایک اعتقاد مضبوط کر لیا تھا۔ پھر اُسی دن تمہاری بہن نے تمہارے سامنے کہا تھا "راجو! نیرا کو تمہارے جیسا ہی ساتھی چاہیے تھا!"

میں نے تمہاری جانب ہنس کر دیکھا تھا۔ تمہاری مُکدّر آنکھیں تب بھی صاف نہیں تھیں۔ تم نے کہا تھا "ایسا نہیں ہوگا! پہلے تمہیں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہیے"۔

تمہاری بہن بڑی دیر تک ہنستی رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا تھا "دیدی! تم اسی طرح معاملہ بگاڑ دیتی ہو!"

تم نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی اور یہ کہہ کر تم تنک اٹھی تھیں "ملں تمہارے لیے راستہ کھلا رہنے دوں!"

مجھے خوشی ہے تمہاری بھولی بہن اس کا مطلب نہیں سمجھ پائی تھی ورنہ...؟

شکایتیں کرنا تمہاری عادت ہے۔

تمہارے دل کے ریشے خون کی طرح اُلجھے ہوئے ہیں۔ تمہارا دماغ سوچ کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ تم نے وہاں ایک گرہ باندھ لی

الفاظ کراچی ۱۷

ہے۔ لیکن اس کے بغیر بھی تم نہیں رہ سکتیں۔
ہے۔ ہر مرد کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتی ہو۔ ہر مرد تمہیں ے لئے پیار جتلاتی ہو اور جب پیار کا پودا پنپنے کر
تمہیں دورے پڑتے ہیں اور تب تم اس سے لگ کر ، اہو
ہوتا ہے تب جیسے اندر سے تمہیں کوئی دھکیل دیتا ہے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں "تم ظالم اور بے رحم ہو
تمہارا تازہ خط میرے ہاتھ میں ہے میلے ہو رہے ہیں اس لیے ... تمہارے اوپر آج کل کانتا طاری
... تم مجھ سے پیار نہیں کرتے ... میں بوڑھی ۔ تم نے اپنی بیوی کو مجھے نہیں دکھایا ... سنا ہے وہ دبلی پتلی اور
ہے ... سر کچھا کو تم نہیں بھول سکتے ۔ وہی ۔ تمہیں بھول نہیں سکتی ۔ فوراً چلے آؤ ... لیکن تم کیوں میری تعیسیں میں
سندر ہے ۔ کل میں کالج سے لوٹ رہی
مرد دینے چلے ہو۔ میں کانتا تھوڑ
اس خط کو میں تین مرتبہ آخری حصہ میں نے پانچ بار پڑھا ہے ... "یہ خط میرا آخری خط ہے ۔ تم
جواب بھی نہیں دیتے ... میں ... جاؤں گی اور گھٹ گھٹ کر دم توڑ دوں گی ۔ تمہاری زندگی کا اگلے مہینے جنم دن
ہے تمہیں ضرور آنا ہے سمجھے !"
خط کے اس آخر ۔ جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ شاید تم نہ سمجھ سکو کیونکہ تم عورت ہو اور ہر عورت جنم دینے
سے قبل اور جنم دینے کے ۔ اسی وجہ سے شاید وہ سورج ڈھلتے وقت کچھ اور ہوتی ہے اور اندھیرے کے اترنے پہ
اس کا روپ ہی اور ہوتا
تم بھول گئیں میں نے تم سے ایک بات کہی تھی اس پہ تمہارا جو ردِ عمل ہوا تھا کیا اس کو تم اب بدلنے کو تیار ہو؟
تمہارے ... میں آئے تھے ۔ انہوں نے وزیٹر سلپ بھیجی تھی اور میں بڑی دیر تک اس کو دیکھتا رہا تھا۔ میں یہ سمجھ بھی نہیں سکتا
تھا کہ وہ شکل اور چال ... سکتا ہے ۔
میں نے شوہر کو دیکھا تھا۔ وہ سوشل اور مہذب شخص تھا۔ چپ چاپ آ کر وہ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں
نے ہی باتیں ... خیریت پوچھی تھی۔ اُن کے ٹھہرنے اور کھانے کے متعلق پتہ لگایا تھا اور تب وہ کھڑے ہو گئے تھے ۔ انہوں نے
ایک لمبا ... کر سیدھا میرے سامنے بڑھا دیا تھا ۔ میں کانپ اٹھا تھا ۔ اپنے سامنے ناچتی موت سے نہیں ۔
دفتر کے اندر ... ناٹک سے ! اسی خوف سے میں بغیر بولے انہیں دیکھتا رہا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی آنکھیں
بند کر لی تھیں میرے پار ہو جائے اور ایک ناٹک ختم ہو ۔ لیکن انہوں نے چاقو نہیں مارا ۔ وہ ہاتھ کھینچ کر کرسی پہ بیٹھ
گئے اور تابجا کر اپنے چپراسی کو بلایا۔ اب وہ پریشان تھے ۔ اُن کے گالوں کے دونوں جانب دو لکیریں ابھر آئی تھیں۔
میں نے کہا تھا "دو چائے لے آؤ"
... نے پوچھا تھا "تمہیں ڈر نہیں لگا؟"
... نے کہا تھا "ڈر کاہے کا؟"
"... ان کا خوف نہیں؟"
فلسفی کی طرح نپے تلے الفاظ میں دہرایا تھا "روح امر ہے نہ وہ ہتھیاروں سے مر سکتی ہے نہ آگ سے
جل سکتی ہے اس کو روگ سوگ لگ سکتے ہیں۔ پھر ڈر کاہے کا؟" لیکن اتنا کہتے ہوئے میرے دل میں جو ایک لہر اٹھ

ادنی کپڑوں کے سامنے ٹھنڈ کھڑی ہوئی کانپتی ہے۔ بزدلی اور پسماندگی کی کوئی دوا کبھی ایجاد نہیں ہوئی۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ تم کیا چاہتی ہو۔ کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس لیے میں اس دن اُٹھ کر چلا آیا اور دوسرے دن اپنے شہر واپس آگیا تھا۔ آتے ہی مجھے تمہارا خط ملا تھا جس میں تم نے شکایت کی تھی کہ میں نے ذرا سی محبت بھی تمہیں نہیں دکھائی۔ تم نے لکھا تھا "یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ تم مجھے اب نہیں چاہتے۔ کسی بہتر عورت کی گرفت میں تم آگئے ہو . . . ورنہ جاتے وقت یوں بیگانے کی طرح مجھ سے سلوک نہ کرتے !"

تمہارا درد !

واقعی میں وہ درد نہیں بھول پا رہا ہوں۔ بیمار تمہاری بہن تھی لیکن مجھے لگتا تھا۔ بیمار وہ نہیں، تم ہو۔ تمہارے اندر ایک مرض تھا۔ ایک بڑا مرض جس کی ڈاکٹروں کے پاس کوئی دوا نہیں تھی اور تمہاری بہن اس کو جانتی تھی۔ وہ تمہیں چاہتی تھی، تمہاری خاطر جیسے اُس کی ہر سانس چلتی تھی۔ مجھ سے اُس نے کہا تھا "میری بہن بہت پریشان رہتی ہے۔ آپ اُس کی پریشانیاں دور کر سکتے ہیں؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا تھا۔ اُس نے بتایا تھا کہ تم مجھے چاہتی ہو اور یہ سُن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اسی دن دونوں وادر کے ایک ریستوراں میں دوپہر کا لنچ لے رہے تھے۔ تب میں نے تم سے مذاق کیا تھا اور پھر بے بس ہو کر تمہاری بہن کی تعریف کی تھی۔ مجھے یہ اچھا لگا تھا۔ مجھے لگتا تھا تمہاری بہن کے دل میں تمہارے لیے اتنا پیار بھرا ہے کہ اگر وہ سب پھوٹ کر باہر آجائے تو شاید اُس کے سیلاب سے ساری دنیا ہی ڈوب جائے۔ تم میرے نزدیک بیٹھی میری باتوں کو سُن رہی تھیں اور پھر یکایک تمہارے دل میں جانے کیا آیا تھا کہ تم تنک کر اٹھی تھیں اور اُٹھ کر سامنے کی سیٹ پہ جا بیٹھی تھیں۔ تم نے ہمارے پیار کے اُن تنہا لمحوں پر حقارت کا اظہار کیا تھا۔ تم نے اپنے مزاج کے مطابق تنک کر کہا تھا "تم میری بہن سے پیار کرنے لگے ہو۔ وہ مجھ سے چھوٹی ہے۔ زیادہ خوبصورت ہے۔ اُس کی ناک زیادہ نوکیلی ہے۔ اس کی خالی آنکھوں میں تم اپنا عکس دیکھنے لگے ہو! میں ٹھہری بدصورت، بے مزا، کرکری عورت! تم میری کیا فکر کرو گے . . . !"

تمہارا وہ روپ میرے سامنے ہے۔ آدھی رات کی اس تنہائی میں بھی تمہاری آنکھیں تیرتی سی نظر آتی ہیں اور میں اُڑتی ہوئی دھول میں ایک پتے کی مانند ایک عورت کو دیکھ رہا ہوں۔ کیا ہر عورت اسی طرح اُڑتی اور بدلتی ہے؟ لیکن نہیں! ایسا ہوتا تو تمہاری بہن وہ سب مجھ سے نہ کہتی جو تمہارے لیے ایک پاک محبت سے لبریز تھا۔ تم جتنے دن رہیں برابر یہ ڈرامہ ہوتا رہا۔ تمہاری بیمار بہن کی فکر میں اس لیے کرتا تھا کیونکہ وہ تمہاری بہن ہے پر تم شاید یہی سوچتی رہیں کہ میں تمہیں اس لیے چاہتا ہوں کیونکہ تم اپنی بیمار بہن کی بہن ہو۔ سوچ کے اس دائرے میں کتنا فرق ہے! اُسی دن میں نے تمہارے بارے میں ایک اعتقاد مضبوط کر لیا تھا۔ پھر اُسی دن تمہاری بہن نے تمہارے سامنے کہا تھا "راجو! نیرا کو تمہارے جیسا ہی ساتھی چاہیے تھا!"

میں نے تمہاری جانب ہنس کر دیکھا تھا۔ تمہاری مُکدّر آنکھیں تب بھی صاف نہیں تھیں۔ تم نے کہا تھا "ایسا نہیں ہوگا، پہلے تمہیں اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہیے"

تمہاری بہن بڑی دیر تک ہنستی رہی تھی۔ پھر اُس نے کہا تھا "دیدی! تم اسی طرح معاملہ بگاڑ دیتی ہو!"

تم نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی اور یہ کہہ کر تم تنک کر اُٹھی تھیں "ہاں تمہارے لیے راستہ کھلا رہنے دوں!"

مجھے خوشی ہے تمہاری بھولی بہن اس کا مطلب نہیں سمجھ پائی تھی ورنہ . . . ؟

شکایتیں کرنا تمہاری عادت ہے۔

تمہارے دل کے ریشے خون کی طرح اُلجھے ہوئے ہیں۔ تمہارا دماغ سوچ کی صلاحیت کھو چکا ہے۔ تم نے وہاں ایک گرہ باندھ لی

ہے۔ ہر مرد کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتی ہو۔ ہر مرد تمہیں پہلی
تمہیں دور سے پڑتے ہیں اور تب تم اس سے لگ کر ‌پہنچی اور بدبو سے بھرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بغیر بھی تم نہیں رہ سکتیں۔
ہوتا ہے تب جیسے اندر سے تمہیں کوئی دھکیل دیتا ہے پر جھک کر اس میں خود کو مٹا کر پیار جتلاتی ہو اور جب پیار کا پودا پنپنے کو
تمہارا تازہ خط میرے ہاتھ میں ہے ہے اور تم پھر ناٹک کرنے لگتی ہو۔
... تم مجھ سے پیار نہیں کرتے ... میں بوڑھی اور میں اس کو ہلکی روشنی کے نیچے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں "تم ظالم اور بے رحم ہو
ہے ... مگر دیکھا کو تم نہیں بھول سکتے۔ وہ ہو رہی ہوں۔ میرے بال سفید ہو رہے ہیں اس لیے ... تمہارے اوپر آج کل کانشا طاری
شندر ہے۔ کل میں کالج سے لوٹ رہی تھی دونوں زیادہ خوبصورت ہیں۔ تم نے اپنی بیوی کو مجھے نہیں دکھایا۔ سنا ہے وہ دُبلی پتلی اور
مرد دینے چلے ہو۔ میں کانتا تھوڑی تھی۔ راستے میں تم یاد آ گئے۔ تمہیں بھول نہیں سکتی۔ فوراً چلے آؤ ... لیکن تم کیوں میری تصویریں
اس خط کو میں تین مرتبہ پڑھ چکا ہوں !"
جواب بھی نہیں دیتے ... میں یہ پڑھ چکا ہوں اس کا آخری حصہ میں نے پانچ بار پڑھا ہے ... "یہ خط میرا آخری خط ہے۔ تم
ہے تمہیں ضرور آنا ہے سمجھے !" اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤں گی اور گھٹ گھٹ کر دم توڑ دوں گی۔ تمہاری لڑکی کا اگلے مہینے جنم دن

خط کے اس آخری
سے قبل اور جنم دینے کے ری حصے کو جوڑ دینے پہ جو بات میری سمجھ میں آتی ہے وہ شاید تم نہ سمجھ سکو کیونکہ تم عورت ہو اور ہر عورت جنم دینے
اس کا روپ ہی اور ہوتا ہے بعد ایک نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے شاید وہ سورج ڈھلتے وقت کچھ اور ہوتی ہے اور اندھیرے کے اترنے پہ
تم بھول گئے ہے۔
تمہارے ئی ہوگی کچھ عرصے قبل میں نے تم سے ایک بات کہی تھی اس پہ تمہارا جو ردِ عمل ہوا تھا کیا اس کو تم اب بدلنے کو تیار ہو؟
تھا کہ وہ شکی اور جا شوہر آج میرے دفتر میں آئے تھے۔ انہوں نے وزیٹر سلپ بھیجی تھی اور میں بڑی دیر تک اس کو دیکھتا رہا تھا۔ میں یہ سمجھ بھی نہیں سکا
میں ہل آدمی مجھ سے ملنے آ سکتا ہے۔
نے ہی یا نہیں نے پہلی بار تمہارے شوہر کو دیکھا تھا۔ وہ سوشل اور مہذب شخص تھا۔ چپ چاپ آ کر وہ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں
ایک لمبا اپیالی تھیں۔ اُن کی خیریت پوچھی تھی۔ اُن کے ٹھہرنے اور کھانے کے متعلق پتہ لگایا تھا اور تب وہ کھڑے ہو گئے تھے۔ انہوں نے
دفتر کے اندر رنگ دار چاقو کھول کر سیدھا میرے سامنے بڑھا دیا تھا۔ میں کانپ اٹھا تھا۔ اپنے سامنے ناچتی موت سے نہیں۔
بند کر لی تھ پیش ہو رہے ہے اس ناٹک سے ! اسی خوف سے میں بغیر بولے انہیں دیکھتا رہا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی آنکھیں
گئے اور تب میں تاکہ وہ چاقو میرے پار ہو جائے اور ایک ناٹک ختم ہو۔ لیکن انہوں نے چاقو نہیں مارا۔ وہ ہاتھ کھینچ کر کرسی پہ بیٹھ
میں نے تب میں نے گھنٹی بجا کر اپنے چپراسی کو بلایا۔ اب وہ پریشان تھے۔ اُن کے گالوں کے دونوں جانب دو لکیریں اُبھر آئی تھیں۔
ہنستے ہوئے کہا تھا "دو چائے لے آؤ"
"تمہارے شوہر نے پوچھا تھا "تمہیں ڈر نہیں لگا؟"
"نہیں !" میں نے کہا تھا "ڈر کاہے کا؟"
تمہیں اپنی جان کا خوف نہیں؟"
جلا سکتی ہے میں نے ایک فلسفی کی طرح نپے تُلے الفاظ میں دہرایا تھا "روح امر ہے نہ وہ ہتھیاروں سے مر سکتی ہے نہ آگ سے
ہے اور نہ ہی اس کو روگ سوگ لگ سکتے ہیں۔ پھر ڈر کاہے کا؟" لیکن اتنا کہتے ہوئے میرے دل میں جو ایک لہر اٹھ

ہوں ۔ میں نے بہ مشکل اپنے خون کی شدّت کو روکا تھا اور
رہی تھی ۔ اس کی بات کر کے میں اپنے کو صرف بزدل ہی ثابت کر نان تھے ۔ اور اٹھ کر بھاگنا چاہتے تھے میں نے انھیں
اُن کی جانب جذبات سے عاری نظروں سے دیکھ رہا تھا ۔ وہ پچ پُئے جبراً پی پڑی تھی ۔ آخری چسکی لیتے ہوئے وہ چائے
نہیں بھاگنے دیا ۔ اسی وقت اُن کے سامنے چائے آگئی تھی اور انھیں دیکھ کر کہا تھا " ہو سکے تو معاف کر دیجیے میں
کی گرمی سے کھلبلا اٹھے تھے اور اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے ۔ انھوں نے میری جا
پھر کبھی آپ سے نہیں ملوں گا ۔ آپ میری بیوی کے لائق ہیں " انا ۔ وہ چلے گئے ۔
میں نے انھیں روکنا چاہا تھا لیکن میرا زیادہ زور دینا وہاں ایک ناٹک ہوں اسے پھر پڑھوں یا بغیر پڑھے ہی
میری آنکھوں کے سامنے تمہارا یہ "آخری خط" ہے (جیسا تم نے لکھا ہے) سوچ میں وہ سوکھ کر ٹھنٹھ رہ جاتا ہے اس
رہنے دوں ۔ تمہیں میں نے ایک بار بتایا تھا میرے گھر کے سامنے ایک بڑا درخت ہے ۔ ایک بار تو نیچے آکر گرے لیکن
کی پھنگ پر تب بھی ایک پتی لٹکی ہوتی ہے ۔ میں اس کو ہر سال دیکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ و ان)
وہ اپنی جگہ ہے اور میں اپنی جگہ کھڑا ہوں اور دونوں ایک دوسرے کو تاکتے رہتے ہیں ۔ (ہند

کرشن بلدوید
فضل تابش

میرا دشمن

وہ اس دوسرے کمرے میں بیہوش پڑا تھا۔ آج میں نے اس کی شراب میں کوئی چیز ملا دی تھی کہ خالی شراب وہ شربت کی طرح غٹ غٹ پی جاتا ہے اور اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ آنکھوں میں لال ڈورے سے جھولنے لگتے ہیں۔ ماتھے کی شکنیں پسینے میں بھیگ کر دمک اٹھتی ہیں۔ ہونٹوں کا زہر اور اجاگر ہو جاتا ہے اور بس —— ہوش و حواس بدستور قائم رہتے ہیں۔

حیران ہوں کہ یہ ترکیب مجھے پہلے کبھی کیوں نہیں سوجھی۔ شاید سوجھی بھی ہو اور میں نے کچھ سوچ کر اسے دبا دیا ہو میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ سوچ کر کئی باتوں کو دبا جاتا ہوں۔ آج بھی مجھے اندیشہ تو تھا کہ وہ پہلے ہی گھونٹ میں ذائقہ پہچان کر میری چوری پکڑ لے گا۔ لیکن گلاس ختم ہوتے ہوتے اس کی آنکھیں بجھنے لگی تھیں۔ اور میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ جی میں آیا تھا کہ اسی لمحے اس کی گردن مروڑ دوں لیکن پھر نتیجوں کے تصور سے دل دہل کر رہ گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر بزدل آدمی کی کلپنا بہت تیز ہوتی ہے۔ ہمیشہ اسے ہر خطرے سے بچائے جاتی ہے۔ پھر بھی ہمت باندھ میں نے ایک بار سیدھے اس کی طرف دیکھا ضرور تھا۔ اتنا بھی کیا کم ہے کہ عام حالات میں میری نگاہیں سہمی ہوئی سی اس کے سامنے ادھر ادھر پھڑپھڑاتی رہتی ہیں۔ عام حالات میں میری حالت اس کے سامنے غیر معمولی رہتی ہے۔

خیر اب اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ اور سر جھول رہا تھا۔ ایک طرف لڑھک کر گر جانے سے پہلے اس کی بانہیں دو لدی ہوئی ٹہنیوں کی سی سست سی اٹھان کے ساتھ میری سمت اٹھ آئی تھیں۔ اسے اس طرح لاچار دیکھ کر خیال آتا تھا کہ وہ دم توڑ رہا ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ موذی کسی بھی لمحے اچھل کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ ہوش سنبھالتے پر وہ کچھ کہے گا نہیں —— اس کی طاقت اس کی خاموشی میں ہے —— باتیں وہ اس زمانے میں بھی بہت کم کیا کرتا تھا۔ لیکن اب تو جیسے بالکل گونگا ہو گیا ہو۔

اس کی گونگی خلاف ورزی کے تصور سے مجھے ایک قسم کی وحشت ہو رہی ہے۔ کہا نا کہ میں ایک بزدل انسان ہوں۔

ویسے میں نہ جانے کیسے سمجھ بیٹھا تھا کہ اتنے عرصہ کی علیحدگی کے بعد اب میں اس کے غلبہ سے پوری طرح آزاد ہو چکا ہوں۔ اس خوش فہمی میں شاید اس روز اسے میں اپنے ساتھ لے آیا تھا شاید من میں کہیں اس پر رعب گانٹھنے، اسے نیچا دکھانے کی خواہش بھی رہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے سوچا ہو کہ وہ میری جیتی جاگتی خوبصورت بیوی، چہکتے مٹکتے تندرست بچوں اور آراستہ پیراستہ عالیشان کوٹھی کو دیکھ کر خود ہی میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا اور ہمیشہ کے لئے مجھے اس سے نجات مل جائے گی شاید میں اس پر یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ اس سے پیچھا چھڑا لینے کے بعد کس خوشگوار حد تک میں نے اپنی زندگی کو سنبھال، سنوار لیا ہے۔

لیکن یہ سب عذر لنگ ہے۔ حقیقت شاید یہ ہے کہ اس روز میں اسے اپنے ساتھ نہیں لایا تھا بلکہ وہ خود ہی میرے ساتھ چلا آیا تھا۔ جیسے میں اسے نہیں بلکہ وہ مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس وقت یہ باریک بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہوگی۔ موقع پر ٹھیک بات میں کبھی نہیں سوچ پاتا۔ یہی تو مصیبت ہے۔ ویسے مصیبتیں اور بھی بہت ہیں لیکن ان سب کا ذکر یہاں بے کار ہوگا۔

خیر مالا کے سامنے اس روز میں نے اس قسم کی کوئی عذر لنگ پیش کرنے کی کوشش کی تھی اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بپھر اٹھی تھی۔ سب سے پہلے اپنی بے وقوفی اور ساری حالت کا احساس شاید اسی لمحہ ہوا تھا۔ مجھے اس کمبخت سے وہیں گھر سے دور اس سڑک کے کنارے کسی نہ کسی طرح نپٹ لینا چاہئے تھا۔ اگر اپنی اس سہمی ہوئی خاموشی کو توڑ کر میں نے اپنی تمام مجبوریاں اس کے سامنے رکھ دی ہوتیں مالا کا ایک خاکہ کھینچ دیا ہوتا۔ صاف صاف اس سے کہہ دیا ہوتا۔ " دیکھو گرو! مجھ پہ دیا کرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔" تو شاید وہیں ہم کسی نتیجے پر پہنچ جاتے۔ اور نہیں تو وہ مجھے کچھ مہلت تو دے ہی دیتا۔ چھوٹتے ہی دو موروچوں کو ایک ساتھ سنبھالنے کی دقت تو پیش نہ آتی۔ کچھ بھی ہو اسے اپنے گھر نہیں لانا چاہئے تھا۔ لیکن اب یہ ساری سمجھداری بے کار تھی۔ مالا اور وہ ایک دوسرے کو یوں گھور رہے تھے جیسے دو پرانے اور جانی دشمن ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے میں یہ سوچ کر پرامید ہوا تھا۔ مالا سارا معاملہ خود سنبھال لے گی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے میں مالا کی لعنت ملامت کا تصور کر کے سہم گیا تھا۔ بات کو مذاق میں گھول دینے کی کوشش میں میں نے ایک گلگلے لہجے میں (جو میرے پاس ایسے نازک موقعوں کے لئے محفوظ ہوتا ہے) کہا تھا۔ " ڈارلنگ ذرا راستہ تو چھوڑ دو کہ ہم بہت لمبی سیر سے لوٹے ہیں۔ ذرا بیٹھ جائیں تو جو سزا جی میں آئے دیدینا۔"

وہ راستے سے تو ہٹ گئی تھی مگر اس کے تناؤ میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے مجھے بیٹھنے دیا تھا۔ ساتھ ہی اس مردار نے میری طرف یوں دیکھا تھا جیسے کہہ رہا ہو ــــ تم تو واقعی اس عورت کے غلام بن کر رہ گئے ہو۔ اور خود میں ان دونوں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے ایک کی نظر بچا کر دوسرے سے کوئی سازش کرنے کی خواہش ہو۔

پھر مالا نے موقع پاتے ہی مجھے الگ لے جا کر ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا تھا۔ میں پوچھتی ہوں کہ یہ تم کس آوارہ گرد کو پکڑ کر ساتھ لے آئے ہو۔ ضرور کوئی تمہارا پرانا دوست ہوگا ؟ ہے نا ؟ اتنے برس شادی کو ہو گئے لیکن تم ابھی تک ویسے کے ویسے ہی رہے۔ میرے بچے اسے دیکھ کر کیا کہیں گے ؟ پڑوسی کیا سوچیں گے ؟ اب کچھ بولو گے بھی ؟۔

میں حیران تھا کہ کیا بولوں۔ مالا کے سامنے بولتا کم ہوں زیادہ وقت تولنے میں ہی بیت جاتا ہے۔ اس کا مزاج بگڑ جاتا ہے۔ ویسے اس کا غصہ بجا تھا۔ اس کا غصہ ہمیشہ بجا ہوتا ہے۔ ہماری کامیاب شادی کی بنیاد ہی اس پر قائم ہے۔ اس کی ہر بات ہمیشہ صحیح ہوتی ہے۔ اور میں ہر غلطی کو چپ چاپ اور فوراً قبول کر لیتا ہوں۔ اوپر سے وہ کچھ بھی کیوں نہ کہے۔ اسے میری فرمانبرداری پر پورا بھروسہ ہے۔ بیچ بیچ میں محض مجھے خاموش کر دینے کے خیال سے وہ اس قسم کی شکایتیں ضرور کر دیا کرتی ہے ــــ " تمہیں نہ جانے ہر معمولی سی بات پر میرے خلاف ڈٹ جانے میں کیا مزہ آتا ہے۔ مانتی ہوں کہ تم مجھ سے کہیں زیادہ سمجھدار ہو لیکن کبھی کبھی میری بات رکھنے کے لئے ہی سہی ..... وغیرہ وغیرہ۔"

مجھے اس کے یہ جھوٹے دلاسے بہت پسند ہیں۔ گو میں اس سے زیادہ خوش نہیں ہو پاتا پھر بھی وہ سمجھتی ہے کہ اس سے میرا بھرم بنا رہتا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ باگ ڈور اس کے ہاتھ میں رہتی ہے اور یہ ٹھیک ہی ہے۔

تو مالا دانت پیس کر کہہ رہی تھی ــــ اب کچھ بولو گے بھی ؟ میرے بچے پارک سے لوٹ کر اس منحوس آدمی کو بیٹھک میں بیٹھا دیکھیں گے تو کیا کہیں گے ــ ان پر کیا اثر ہوگا اف اتنا گندہ آدمی۔ سارے گھر میں بدبو پھیلی ہوئی ہے۔ بتاؤ نا میں اپنے بچوں سے کیا کہوں گی۔

اب ظاہر ہے مالا کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ سو میں سر جھکائے کھڑا رہا اور وہ منہ اٹھا کر خوب دیر تک برستی رہی۔

ویسے یہ صاف کر دوں کہ وہ بچے مالا اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ وہ میرے بھی اتنے ہی ہیں جتنے اس کے لیکن ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ میرے بچے، کہہ کر مجھ سے انہیں یونہی الگ کر لیا کرتی تھی۔ جیسے کوئی کپڑے سے لعل نکال رہا ہو۔ کبھی کبھی مجھے اس بات پر بہت دکھ بھی ہوتا ہے لیکن پھر کبھی ٹھنڈے دل سے سوچنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جسمانی سچائی کچھ بھی ہو روحانی طور پر ہمارے سب ہی بچے مالا کے ہی ہیں۔ ان کے رنگ ڈھنگ میں میرا حصہ بہت کم ہے اور یہ ٹھیک ہی ہے کیونکہ اگر وہ مجھ پر پڑ جاتے تو انہیں بھی میری طرح سیدھا ہونے میں نہ جانے کتنی دیر لگتی۔ میں خوش ہوں کہ ان کا مستقبل خوب روشن ہے اور اس روشنی میں میرا ہاتھ بس اتنا ہے کہ میں ان کا قانونی اور شاید جسمانی باپ ہوں۔ ان کے لئے پیسے کماتا ہوں اور دل و جان سے ان کی ماں کی سیوا میں دن رات صرف کر رہا ہوں۔

خیر کچھ دیر یونہی سر نیچا کئے کھڑے رہنے کے بعد آخر میں نے نہایت عاجزانہ آواز میں کہنا شروع کیا تھا۔ "ارے بھائی میں تو اس کمبخت کو ٹھیک طرح سے پہچانتا بھی نہیں اس سے دوستی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اگر راستہ میں کوئی آدمی مل جائے تو

نہ جانے میرے فقرے کا اختتام کیوں کر ہوتا شاید ہوتا بھی کہ نہیں لیکن مالا نے بیچ میں ہی ٹانگ پھنسا کر کہہ دیا، "جھوٹ سراسر جھوٹ" یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی اور میں کچھ دیر تک اور وہیں سر نیچا کئے کھڑا رہنے کے بعد واپس اس کمرے میں لوٹ آیا۔ جہاں بیٹھا وہ بیڑی پی رہا تھا اور مسکرا رہا تھا جیسے سب جانتا ہو کہ میں کس مرحلے سے گزر رہا تھا۔

اب ہوا دراصل یہ تھا کہ اس شام مالا سے کچھ دور اکیلا گھوم آنے کی اجازت مانگ کر میں یونہی بے مطلب گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ عام طور پر وہ ایسی اجازتیں آسانی سے نہیں اور نہ ہی میں مانگنے کی ہمت کر پاتا ہوں۔ بے مقصد گھومنا اسے بہت برا لگتا ہے کہیں بھی جانا ہو کسی سے بھی ملنا ہو، کچھ بھی کرنا ہو مطلب کا صاف اور صحیح فیصلہ وہ پہلے سے ہی کر لیتی ہے ٹھیک ہی کرتی ہے۔ میں اس کی سمجھداری کی داد دیتا ہوں۔ ویسے گھر سے دور اکیلا میں کسی مقصد سے بھی نہیں جا پاتا۔ مالا کی صحبت کی کچھ ایسی عادت سی پڑ گئی ہے کہ اس کے بغیر سب سونا سونا لگتا ہے۔ جب وہ ساتھ رہتی ہے تو کسی قسم کا اول، جلول خیال دل میں آ ہی نہیں پاتا۔ ہر چیز ٹھوس اور بامطلب دکھائی دیتی ہے۔ اندر کی حالت ایسی رہتی ہے جیسے مالا کے ہاتھوں سجایا ہوا کمرہ ہو۔ جس میں ہر چیز قرینے سے پڑی ہو۔ بے قاعدگی کی کوئی گنجائش نہ ہو اور جب وہ ساتھ نہیں ہوتی تو وہی ہوتا ہے جو اس شام ہوا۔ یا پھر اس قسم کا کوئی اور حادثہ۔ کیونکہ اس سے پہلے ایسی بات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اس شام نہ جانے کس دھن میں گھر سے بہت دور نکل گیا تھا۔ عام طور پر گھر سے دور رہنے پر بھی میں گھر ہی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اس لئے نہیں گھر میں کسی قسم کی کوئی پریشانی ہے گاڑی نہ صرف چل رہی ہے بلکہ خوب چل رہی ہے۔ باگ ڈور جب مالا جیسی عورت کے ہاتھ ہو تو چلے گی نہیں تو اور کرے گی بھی کیا؟ نہیں گھر میں کوئی پریشانی نہیں۔ اچھی تنخواہ۔ اچھی بیوی۔ اچھے بچے، اچھے بارسوخ دوست، ان کی بیویاں بھی خوب ہٹی کٹی اور اچھی۔ اچھا سرکاری مکان، اچھا خوشنما لان، پاس پڑوس بھی اچھا۔ مہنگائی کے باوجود دونوں وقت اچھا کھانا، اچھا بستر اور اچھی بستری زندگی۔ میں پوچھتا ہوں ان کے علاوہ اور چاہیئے بھی کیا۔ ایک اچھے انسان کو؟ پھر بھی اکیلا ہونے پر گھریلو معاملوں کو بار بار الٹ پلٹ کر دیکھنے سے ویسا ہی اطمینان ملتا ہے جیسا کسی بھی صحت مند آدمی کو بار بار آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر ملتا ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اچھی طرح کٹ جاتا ہے۔ اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ یہ بھی مالا کے اچھے برتاؤ کا نتیجہ ہے نہیں تو ایک زمانہ تھا کہ میں ہر دم اکتاہٹ کا شکار رہا کرتا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ اس شام دماغ کچھ دیر کے لئے اسی گزرے ہوئے زمانے کی اور بھٹک گیا ہو کچھ بھی ہو میں گھر سے بہت دور نکل گیا تھا اور پھر اچانک وہ میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

محسوس ہوا تھا جیسے مجھے اکیلا دیکھ کر گھات میں بیٹھے ہوئے کسی خطرناک اجنبی نے ہی راستہ روک لینا چاہا ہو۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا تھا اور اس کی ستی ہوئی آنکھوں سے پھسل کر میری نگاہ اس کی مسکراہٹ پر جا ٹکی تھی جہاں اب مجھے اس کے ساتھ بتائے ہوئے گرد آلود زمانے کی ایک ٹمٹماتی ہوئی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں تک روپوش رہنے کے بعد پھر مجھے پکڑ کر کسی کے سامنے پیش کر دیا گیا ہو۔ میرا سر اس بیٹی کے خیال سے دب کر جھک گیا تھا۔

کچھ پتا شاید کتنی ہی دیر ہم سڑک کے اس ننگے اور آوارہ اندھیرے میں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے رہے تھے اگر کوئی تیسرا اس وقت دیکھ رہا ہوتا تو شاید سمجھتا کہ ہم کسی نعش کے سرہانے کھڑے کوئی پرارتھنا کر رہے ہیں۔ یا ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے سے پہلے کسی منتر کا جاپ۔

ویسے یہ ہے کہ اسے پہچانتے ہی میں نے مالا کو یاد کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہر مصیبت میں میں ہمیشہ اسی کا نام لیتا ہوں۔ ساتھ ہی وہاں سے دم دبا کر بھاگ پڑنے کی خواہش بھی دل میں اٹھتی رہی تھی، ایک اڑتی ہوئی سی تمنا یہ بھی ہوئی تھی کہ گھر واپس لوٹنے کے بجائے چپ چاپ اس کمبخت کے ساتھ ہو لوں۔ جہاں وہ ساتھ لے جانا چاہے چلا جاؤں۔ اور مالا کو خبر تک نہ ہو۔ اس خیال پر تب بھی میں بہت چونکا تھا۔ اور ابھی تک حیران ہوں کیوں کہ آخر اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہی تو میں نے مالا کی گود میں پناہ لی تھی۔ اگر آج سے کچھ برس پہلے میں نے اس کے خلاف بغاوت نہ کی ہوتی تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس بھاگنے کو بغاوت کا نام دے کر میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ میں نے سوچا تھا اور میرا منہ شرم کے مارے جل اٹھا تھا۔ میرا منہ اکثر اس آگ میں جلتا رہتا ہے۔

اس حرام زادے نے ضرور میری ساری پریشانی کو بھانپ لیا ہوگا۔ اس سے میری کوئی کمزوری چھپی نہیں اور اسی سے بھاگ کر مالا کی گود میں پناہ لینے کی ایک بڑی وجہ یہی تھی۔ اس کی ہنسی مجھے سوکھے پتوں کی ہیبتناک کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی اور اس کھڑکھڑاہٹ میں اس کے سائے میں گزرے ہوئے زمانے کی بے شمار راتیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے آنکھ اٹھا کر اس کی اور دیکھا تھا۔ اس کا ہاتھ میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ میں بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا اور اس کی ہنسی اور اونچی ہو گئی تھی بھینچے ہوئے دانتوں سے میں نے اس کی آنکھوں کا سامنا کیا تھا۔ اپنا ہاتھ اس کے کھردرے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس کے سانسوں کی بدبودار حرارت اپنے چہرے پر پھیلتے ہوئے میں نے محسوس کیا تھا جیسے اتنی مدت آزاد رہ لینے کے بعد اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا ہو۔ عجیب بات ہے احساس سے جتنی تکلیف مجھے ہونی چاہئے تھی شاید ہر مفرور مجرم دل سے یہی چاہتا ہے کہ کوئی اسے پکڑ لے۔

گھر پہنچنے تک کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اپنی اپنی خاموشی میں لپٹے ہوئے ہم دھیمے دھیمے چل رہے تھے جیسے کندھوں پر کوئی نعش اٹھائے ہوں۔

جب مالا کی ڈانٹ ڈپٹ سن لینے کے بعد منہ بنائے میں واپس بیٹھک میں لوٹا تو وہ بدذات مزے میں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے خیال ہوا جیسے وہ کمرہ اسی کا ہو۔ پھر کچھ سنبھل کر اس سے نظر ملائے بغیر میں نے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ پنکھے کو اور تیز کر دیا۔ ایک جھنجھلائی ہوئی ٹھوکر سے اس کے جوتوں کو صوفوں کے نیچے دھکیل دیا۔ ریڈیو چلانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی پھٹی ہوئی ہنسی سنائی دی اور میں بے بس ہو کر اس سے دور ہٹ کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

جی میں آیا کہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں ساری حقیقت سنا کر کہہ دوں ـ" دیکھو دوست اب میرے حال پر رحم کرو، اور مالا کے آنے سے پہلے چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ نتیجہ بہت برا ہوگا۔"

لیکن میں نے کچھ کہا نہیں کہا بھی ہوتا تو سوائے ایک اور زہریلی ہنسی کے اس نے میری اپیل کا کوئی جواب نہیں دیا ہوتا۔ وہ بہت ظالم ہے ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کا قائل اور جذباتیت سے اسے سخت نفرت ہے۔

اسے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر میں نے دبی نگاہ سے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ٹانگیں سمیٹ کر وہ صوفے پر بیٹھا ہوا ایک جانور سا دکھائی دیا۔ اس کی حالت بہت خستہ دکھائی دی لیکن اس کی شکل اب بھی مجھ سے کچھ کچھ ملتی تھی۔ اس خیال سے مجھے کوفت بھی ہوئی اور ایک عجیب قسم کی خوشی بھی محسوس ہوئی۔ ایک زمانہ تھا جب وہی ایک طرح سے میرا آدرش ہوا کرتا تھا جب ہم دونوں گھنٹوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے۔ جب ہم نے بار بار کئی تحریریں

اب ظاہر ہے مالا کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ سو میں سر جھکائے کھڑا رہا اور وہ منہ اٹھا کر خوب دیر تک برستی رہی۔

ویسے یہ صاف کر دوں کہ وہ بچے مالا اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ وہ میرے بھی اتنے ہی ہیں جتنے اس کے لیکن ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ "میرے بچے" کہہ کر مجھ سے انہیں یونہی الگ کر لیا کرتی تھی۔ جیسے کوئی کیچڑ سے لعل نکال رہا ہو۔ کبھی کبھی مجھے اس بات پر بہت دکھ بھی ہوتا ہے لیکن پھر بھی ٹھنڈے دل سے سوچنے پر محسوس ہوتا ہے کہ جسمانی سچائی کچھ بھی ہو روحانی طور پر ہمارے سب ہی بچے مالا کے ہی ہیں۔ ان کے رنگ ڈھنگ میں میرا حصہ بہت کم ہے اور یہ ٹھیک ہی ہے کیونکہ اگر وہ مجھ پر پڑ جاتے تو انہیں بھی میری طرح سیدھا ہونے میں نہ جانے کتنی دیر لگتی۔ میں خوش ہوں کہ ان کا مستقبل خوب روشن ہے اور اس روشنی میں میرا ہاتھ بس اتنا ہی ہے کہ میں ان کا قانونی اور شاید جسمانی باپ ہوں۔ ان کے لئے پیسے کماتا ہوں اور دل و جان سے ان کی ماں کی سیوا میں دن رات صرف کر رہا ہوں۔

خیر کچھ دیر یونہی سر نیچا کئے کھڑے رہنے کے بعد آخر میں نے نہایت عاجزانہ آواز میں کہنا شروع کیا تھا۔ "ارے بھائی میں تو اس کمبخت کو ٹھیک طرح سے پہچانتا بھی نہیں اس سے دوستی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب اگر راستہ میں کوئی آدمی مل جائے تو۔

نہ جانے میرے فقرے کا اختتام کیوں کر ہوتا شاید ہوتا بھی کہ نہیں لیکن مالا نے بیچ میں ہی ٹانگ پھنسا کر کہہ دیا، "جھوٹ سراسر جھوٹ" یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی اور میں کچھ دیر تک اور وہیں سر نیچا کئے کھڑا رہنے کے بعد واپس اس کمرے میں لوٹ آیا۔ جہاں بیٹھا وہ بیڑی پی رہا تھا اور مسکرا رہا تھا جیسے سب جانتا ہو کہ میں کس مرحلے سے گزر رہا تھا۔

اب ہوا دراصل یہ تھا کہ اس شام مالا سے کچھ دور اکیلا گھوم آنے کی اجازت مانگ کر میں یونہی بے مطلب گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ عام طور پر وہ ایسی اجازتیں آسانی سے نہیں اور نہ ہی میں مانگنے کی ہمت کر پاتا ہوں۔ بے مقصد گھومنا اسے بہت برا لگتا ہے کہیں بھی جانا ہو کسی سے بھی ملنا ہو، کچھ بھی کرنا ہو مطلب کا صاف اور صحیح فیصلہ وہ پہلے سے ہی کر لیتی ہے ٹھیک ہی کرتی ہے۔ میں اس کی سمجھداری کی داد دیتا ہوں۔ ویسے گھر سے دور اکیلا میں کسی مقصد سے بھی نہیں جا پاتا۔ مالا کی صحبت کی کچھ ایسی عادت سی پڑ گئی ہے کہ اس کے بغیر سب سونا سونا لگتا ہے۔ جب وہ ساتھ رہتی ہے تو کسی قسم کا اول، جلول خیال دل میں آ ہی نہیں پاتا۔ ہر چیز ٹھوس اور بامطلب دکھائی دیتی ہے۔ اندر کی حالت ایسی رہتی ہے جیسے مالا کے ہاتھوں سجایا ہوا کمرہ ہو۔ جس میں ہر چیز قرینے سے پڑی ہو۔ بے قاعدگی کی کوئی گنجائش نہ ہو اور جب وہ ساتھ نہیں ہوتی تو وہی ہوتا ہے جو اس شام ہوا۔ یا پھر اس قسم کا کوئی اور حادثہ۔ کیونکہ اس سے پہلے ایسی بات کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اس شام نہ جانے کس دھن میں گھر سے بہت دور نکل گیا تھا۔ عام طور پر گھر سے دور رہنے پر بھی میں گھر ہی کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ اس لئے نہیں گھر میں کسی قسم کی کوئی پریشانی ہے گاڑی نہ صرف چل رہی ہے بلکہ خوب چل رہی ہے۔ باگ ڈور جب مالا جیسی عورت کے ہاتھ ہو تو چلے گی نہیں تو اور کرے گی بھی کیا؟ نہیں گھر میں کوئی پریشانی نہیں۔ اچھی تنخواہ۔ اچھی بیوی۔ اچھے بچے، اچھے بارسوخ دوست، ان کی بیویاں بھی خوب ہنس مکھ اور اچھی۔ اچھا سرکاری مکان، اچھا خوشنما لان، بال پڑوس بھی اچھا۔ مہنگائی کے باوجود دونوں وقت اچھا کھانا، اچھا بستر اور اچھی بستری زندگی۔ میں پوچھتا ہوں ان کے علاوہ اور چاہیئے بھی کیا۔ ایک اچھے انسان کو؟ پھر بھی اکیلا ہونے پر گھریلو معاملوں کو بار بار الٹ پلٹ کر دیکھنے سے ویسا ہی اطمینان ملتا ہے جیسا کسی بھی صحت مند آدمی کو بار بار آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر ملتا ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ وہ اچھی طرح کٹ جاتا ہے۔ اکتاہٹ نہیں ہوتی۔ یہ بھی مالا کے اچھے برتاؤ کا نتیجہ ہے نہیں تو ایک زمانہ تھا کہ میں ہر دم اکتاہٹ کا شکار رہا کرتا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ اس شام دماغ کچھ دیر کے لئے اسی گزرے ہوئے زمانے کی اور بھٹک گیا ہو کچھ بھی ہو میں گھر سے بہت دور نکل گیا تھا اور پھر اچانک وہ میرے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

محسوس ہوا تھا جیسے مجھے اکیلا دیکھ کر گھات میں بیٹھے ہوئے کسی خطرناک اجنبی نے ہی راستہ روک لینا چاہا ہو۔ میں ٹھٹھک کر رک گیا تھا اور
اس کی سُتی ہوئی آنکھوں سے پھسل کر میری نگاہ اس کی مسکراہٹ پر جا ٹکی تھی جہاں اب مجھے اس کے ساتھ بتائے ہوئے گرد آلود زمانے کی ایک ٹمٹماتی ہوئی سی
جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ برسوں تک روپوش رہنے کے بعد پھر مجھے پکڑ کر کسی کے سامنے پیش کر دیا گیا ہو۔ میرا سر اس بیٹی کے
خیال سے دب کر جھک گیا تھا۔

کچھ یا شاید کتنی ہی دیر ہم سڑک کے اس ننگے اور آوارہ اندھیرے میں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے رہے تھے اگر کوئی تیسرا اس وقت دیکھ
رہا ہوتا تو شاید سمجھتا کہ ہم کسی نعش کے سرہانے کھڑے کوئی پرارتھنا کر رہے ہیں۔ یا ایک دوسرے پر جھپٹ پڑنے سے پہلے کسی منتر کا جاپ۔

ویسے یہ ہے کہ اسے پہچانتے ہی میں نے مالا کو یاد کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہر مصیبت میں میں ہمیشہ اسی کا نام لیتا ہوں۔ ساتھ ہی وہاں سے دم دبا
کر بھاگ پڑنے کی خواہش بھی دل میں اٹھتی رہی تھی، ایک اڑتی ہوئی سی تمنا یہ بھی ہوئی تھی کہ گھر واپس لوٹنے کے بجائے چپ چاپ اس کمبخت کے ساتھ
ہو لوں۔ جہاں وہ ساتھ لے جانا چاہے چلا جاؤں۔ اور مالا کو خبر تک نہ ہو۔ اس خیال پر تب بھی میں بہت چونکا تھا۔ اور ابھی تک حیران ہوں کیوں کہ آخر
اس سے پیچھا چھڑانے کے لئے ہی تو میں نے مالا کی گود میں پناہ لی تھی۔ اگر آج سے کچھ برس پہلے میں نے اس کے خلاف بغاوت نہ کی ہوتی تو . . . . . لیکن اس بھاگنے کو
بغاوت کا نام دے کر میں اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہوں۔ میں نے سوچا تھا اور میرا منہ شرم کے مارے جل اٹھا تھا۔ میرا منہ اکثر اس آگ میں جلتا رہتا ہے۔

اس حرام زادے نے ضرور میری ساری پریشانی کو بھانپ لیا ہوگا۔ اس سے میری کوئی کمزوری چھپی نہیں اور اس سے بھاگ کر مالا کی گود میں پناہ
لینے کی ایک بڑی وجہ یہی تھی۔ اس کی ہنسی مجھے سوکھے پتوں کی ہیبتناک کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی اور اس کھڑکھڑاہٹ میں اس کے سائے میں گزرے
ہوئے زمانے کی بے شمار باتیں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے آنکھ اٹھا کر اس کی اور دیکھا تھا۔ اس کا ہاتھ میری طرف بڑھا ہوا تھا۔ میں بدک کر دو قدم
پیچھے ہٹ گیا تھا اور اس کی ہنسی اور اونچی ہو گئی تھی بھینچے ہوئے دانتوں سے میں نے اس کی آنکھوں کا سامنا کیا تھا، اپنا ہاتھ اس کے کھردرے ہاتھ میں
دیتے ہوئے اس کے سانسوں کی بدبودار حرارت اپنے چہرے پر جھیلتے ہوئے میں نے محسوس کیا تھا جیسے اتنی مدت آزاد رہ لینے کے بعد اپنے آپ کو اس کے
حوالے کر دیا ہو۔ عجیب بات ہے احساس سے جتنی تکلیف مجھے ہونی چاہئے تھی شاید ہر مفرور مجرم دل سے یہی چاہتا ہے کہ کوئی اسے پکڑ لے۔

گھر پہنچنے تک کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اپنی اپنی خاموشی میں لپٹے ہوئے ہم دھیمے دھیمے چل رہے تھے جیسے کندھوں پر کوئی نعش اٹھائے ہوں۔

جب مالا کی ڈانٹ ڈپٹ سن لینے کے بعد منہ بنائے میں واپس بیٹھک میں لوٹا تو وہ بدذات مزے میں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے خیال
ہوا جیسے وہ کمرہ اسی کا ہو۔ پھر کچھ سنبھل کر اس سے نظر ملائے بغیر میں نے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول دیں۔ پنکھے کو اور تیز کر دیا۔ ایک جھنجھلائی ہوئی ٹھوکر
سے اس کے جوتوں کو صوفوں کے نیچے دھکیل دیا۔ ریڈیو چلانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی پھٹی ہوئی ہنسی سنائی دی اور میں بے بس ہو کر اس سے دور ہٹ کر
چپ چاپ بیٹھ گیا۔

جی میں آیا کہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں ساری حقیقت سنا کر کہہ دوں ــ " دیکھو دوست اب میرے حال پر رحم کرو، اور مالا کے آنے
سے پہلے چپ چاپ یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ نتیجہ بہت برا ہوگا۔

لیکن میں نے کچھ کہا نہیں کہا بھی ہوتا تو سوائے ایک اور زہریلی ہنسی کے اس نے میری اپیل کا کوئی جواب نہیں دیا ہوتا۔ وہ بہت ظالم ہے ہر بات کی
تہہ تک پہنچنے کا قائل اور، جذباتیت سے اسے سخت نفرت ہے۔

کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر میں نے دبی نگاہ سے اس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ٹانگیں سمیٹ کر وہ صوفے پر بیٹھا ہوا ایک جانور سا
دکھائی دیا۔ اس کی حالت بہت خستہ دکھائی دی لیکن اس کی شکل اب بھی مجھ سے کچھ کچھ ملتی تھی۔ اس خیال سے مجھے کوفت بھی ہوئی اور ایک عجیب قسم کی خوشی بھی
محسوس ہوئی۔ ایک زمانہ تھا جب وہی ایک طرح سے میرا آدرش ہوا کرتا تھا جب ہم دونوں گھنٹوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے۔ جب ہم نے بار بار کئی لڑکیوں

سے ایک ساتھ استعفے دیئے تھے کچھ ایک سے ایک ساتھ نکالے بھی گئے تھے۔ جب ہم اپنے آپ کو ان تمام لوگوں سے بہتر اور اونچا سمجھتے تھے جو بنی بنائی لکیروں پر چلتے ہوئے اپنی ساری زندگی ایک بدنما اور روایتی گھروندے کی تعمیر میں برباد کر دیتے ہیں جن کے دماغ ہمیشہ اس گھروندے کی چہار دیواری میں قید رہتے ہیں۔ جن کے دل صرف اپنے بچوں کی کلکاریوں پر ہی جھومتے ہیں جن کی بے وقوف بیویاں دن رات ٹکنی کا ناچ نچاتی ہیں اور جنہیں اپنی سفید پوشی کے علاوہ اور کسی بات کا کوئی غم نہیں ہوتا۔ کچھ دیر میں اس زمانے کی یاد میں ڈوبا رہا محسوس ہوا جیسے وہ پھر اسی دنیا سے ایک پیغام لایا ہو پھر مجھے انہیں رومانی ویرانوں میں بھٹکا دینے کی کوشش کرنا چاہتا ہو جن سے بھاگ کر میں نے اپنے لئے ایک پھولوں کی سیج سنوار لی ہے۔ جس پر مالا تقریباً ہر رات مجھ سے میری فرمابرداری کا ثبوت طلب کیا کرتی ہے۔ اور جہاں میں بہت سکھی ہوں۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ جیسے اس نے میرے اندر جھانک لیا ہو اسے ہر طرح آسانی سے اپنے اوپر قابض ہوتے دیکھ کر میں نے بات بدلنے کے لئے کہا۔

"کتنے روز یہاں ٹھہرو گے اس کی ہنسی سے ایک بار پھر ہمارے گھر کی سجی سنوری فضا دہل گئی اور مجھے خطرہ ہوا کہ مالا اسی دم وہاں پہنچ کر اس کا منہ نوچ لے گی۔ لیکن یہ خطرہ اس بات کا گواہ ہے کہ اتنے برسوں کی رفاقت کے باوجود میں ابھی تک مالا کو پہچان نہیں پایا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک خوبصورت ساڑھی پہنے مسکراتی اٹھلاتی ہوئی ہمارے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ہاتھ جوڑ کر بڑے دلفریب انداز میں نمسکار کرتی ہوئی بولی "آپ بہت تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں میں نے گرم پانی رکھوا دیا ہے آپ، واش، کرلیں تو کچھ پی کر تازہ دم ہو جائیں۔ کھانا تو ہم لوگ دیر سے ہی کھائیں گے۔"

میں بہت خوش ہوا۔ اب معاملہ مالا نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اور میں یونہی پریشان ہو رہا تھا۔ من ہوا کہ اٹھ کر مالا کو چوم لوں۔ میں نے کنکھیوں سے اس حرامزادے کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی سہما ہوا دکھائی دیا۔ میں نے سوچا اب اگر وہ خود بخود ہی بھاگ اٹھا تو میں سمجھوں گا کہ مالا کی ساری سمجھداری اور رنگ و روپ بیکار ہے۔ کتنا لطف آئے گا اگر وہ کمبخت بھی بھاگ کھڑا ہونے کے بجائے مالا کے داؤ میں پھنس جائے اور پھر میں اس سے پوچھوں کہ "اب بتا سالے اب بات سمجھ میں آئی۔" میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اسے مالا کے ارد گرد ناچتے ہوئے اس پر فدا ہوتے ہوئے اس کے ساتھ لیٹے ہوئے دیکھا ایک عجیب راحت کا احساس ہوا۔ آنکھیں کھولیں تو وہ غسلخانے میں جا چکا تھا اور مالا بھی صوفے کو ٹھیک کر رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے کی کوشش کی لیکن پھر اس کی تنی ہوئی صورت سے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ ظاہر تھا کہ اس نے مجھے ابھی معاف نہیں کیا تھا۔

نہا کر وہ باہر نکلا تو وہ میرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اسی درمیان مالا نے بیئر نکال لی تھی اور اس کا گلاس بھرتے ہوئے پوچھ رہی تھی "آپ کھانے میں مرچ کم لیتے ہیں یا زیادہ" میں نے بہت مشکل سے ہنسی پر قابو پایا۔ اس سالے کو کھانا ہی کب ملتا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا اور مالا کی ہوشیاری پر خوش ہو رہا تھا۔

کچھ دیر ہم بیٹھے پیتے رہے مالا اس سے کھل مل کر باتیں کرتی رہی۔ اس سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتی رہی "آپ کو یہ شہر کیسا لگا؟ بیئر ٹھنڈی تو ہے نا؟ آپ اپنا سامان کہاں چھوڑ آئے۔" اور وہ بغلیں جھانکتا رہا۔ ہمارے بچوں نے آکر اپنے انکل کو گریٹ کیا۔ باری باری اس کے گھٹنوں پر بیٹھ کر اپنا نام وغیرہ بتایا ایک دو گانے گائے اور پھر گڈ نائٹ کہکر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مالا کی میٹھی باتوں سے یوں لگ رہا تھا جیسے ہمارے اپنے ہی حلقے کا کوئی بے تکلف دوست کچھ دنوں کے لئے ہمارے پاس آٹھہرا ہو۔ اور اس کی بڑی سی گاڑی ہمارے دروازے کے سامنے کھڑی ہو۔

میں بہت خوش تھا اور جب مالا کھانا لگوانے کے لئے باہر گئی تو اس شام پہلی بار میں نے بیدھڑک اس کمینے کی طرف دیکھا وہ تین چار گلاس بیئر کے پی چکا تھا اور اس کے چہرے کی زردی کچھ کم ہو چلی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ میں مالا کے باہر جاتے ہی پھر وہی زہر اور چیلنج آگیا تھا۔ اور مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو "بیوی تمہاری مجھے پسند ہے لیکن بیٹے اسے خبردار کر دو میں اتنا بلپلا نہیں جتنا وہ سمجھتی ہے۔"

ایک لمحے کے لئے پھر میرا جوش کم پڑ گیا۔ لگا جیسے بات آسانی سے سلجھنے والی نہیں۔ یاد آیا کہ خوبصورت اور شوخ عورتیں اس زمانے میں بھی اسے بہت پسند تھیں۔ لیکن ان کا جادو زیادہ دیر تک نہیں چلتا تھا پھر بھی میں نے سوچا بات اب میرے ہاتھ سے نکل گئی ہے اور سوائے انتظار کے میں

ر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

کھانا اس روز بہت عمدہ تھا اور کھانے کے بعد مالا خود اسے اس کے کمرے تک چھوڑنے گئی تھی۔ لیکن اس رات میرے ساتھ مالا نے کوئی بات نہیں
۔ میں نے کئی مذاق کئے، کہا، "نہا دھو کر وہ کافی اچھا لگ رہا تھا کیوں؟" بہت چھیڑ چھاڑ کی کوششیں کیں کہ صلح نامہ ہو جائے لیکن اس نے مجھے اپنے پاس
میں بھٹکنے دیا۔ نیند اس رات مجھے نہیں آئی۔ پھر بھی اندر سے مجھے اطمینان تھا کہ کسی نہ کسی طرح مالا دوسرے روز اسے بھگانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔

لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ مانا کہ مالا بہت چالاک ہے، بہت سمجھدار ہے بہت من موہنی ہے لیکن اس حرامزادے کی ڈھٹائی کا بھی کوئی
نا بلہ نہیں۔ تین دن تک مالا اس کی خاطر تواضع کرتی رہی میرے کپڑوں میں وہ بالکل مجھ جیسا ہو گیا تھا اور نظر یوں آتا تھا جیسے مالا کے دو شوہر
ں۔ میں تو صبح سویرے گاڑی لیکر دفتر کو نکل جاتا تھا۔ پیچھے ان دونوں میں نہ جانے کیا باتیں ہوتی تھیں۔ لیکن جب کبھی اسے موقع ملتا وہ مجھے اندر
، جا کر ڈانٹنے لگتی: "اب یہ مردار یہاں سے نکلے گا بھی کہ نہیں جب تک یہ گھر میں ہے ہم کسی کو نہ تو بلا سکتے ہیں اور نہ کسی کے یہاں جا سکتے ہیں۔ میرے بچے
تے ہیں کہ اسے بات کرنے تک کی تمیز نہیں آخر یہ کیا چاہتا ہے۔" میں اسے کیا بتاتا کہ وہ کیا چاہتا ہے کبھی کہتا "تھوڑا صبر کرو اب جانے کی سوچ رہا ہوگا۔"
ہی کہتا "کیا بتاؤں مالا میں تو خود شرمندہ ہوں" کبھی کہتا "تم نے خود ہی تو اسے سر چڑھا لیا ہے اگر تمہارا برتاؤ روکھا ہوتا تو۔۔۔"

مالا نے اپنا برتاؤ تو نہیں بدلا لیکن چوتھے روز اپنے بچوں سمیت گھر چھوڑ کر اپنے بھائی کے یہاں چلی گئی۔ میں نے بہتیرا روکا لیکن وہ نہیں
ی، اس روز وہ کمبخت بہت ہنسا تھا زور زور سے۔ بار بار۔

آج مالا کو گئے پانچ روز ہو گئے ہیں۔ میں نے دفتر جانا چھوڑ دیا ہے۔ وہ پھر اپنے اصلی رنگ میں آ گیا ہے۔ میرے کپڑے اتار کر اس نے
پھر اپنا میلا سا کرتہ پاجامہ پہن لیا ہے۔ کہتا کچھ نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کیا چاہتا ہے "وہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ چلی گئی ہے
بہتر یہی ہے کہ اس کے لوٹنے سے پہلے تم بھی یہاں سے بھاگ چلو۔ اس کی فکر مت کرو وہ اپنا انتظام خود کر لے گی۔

اور آج آخر میں اسے تھوڑی دیر کے لئے بیہوش کر دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں اب میرے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ ہوش
نے سے پہلے میں اسے جان سے مار ڈالوں اور دوسرا یہ کہ اپنا ضروری سامان باندھ کر تیار ہو جاؤں اور جونہی اسے ہوش آئے ہم دونوں پھر اسی
استے پر چل دیں جس سے بھاگ کر کچھ برس پہلے میں نے مالا کی گود میں پناہ لی تھی۔ اگر مالا اس وقت یہاں ہوتی تو وہ کوئی تیسرا راستہ بھی نکال لیتی
یکن وہ نہیں ہے اور میں نہیں جانتا کہ میں کیا کروں۔

ویریندر دیپک
زاہدہ خان

ایک پُرانا دِن

سینتہ نے ہاتھوں کی انگلیوں کو توڑنے کے بعد ایک انگڑائی لینی چاہی۔ مگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ ایک پارک کی بینچ پر بیٹھی ہوئی تھی اور پارک میں کم از کم بیس پچیس آدمی تو موجود رہے ہی ہوں گے۔ انگڑائی اور اتنے آدمیوں کی موجودگی میں! ہائے رام وہ کیا کرنے والی تھی! اسے لگا کہ اس نے انگڑائی لے ہی لی ہے اور کچھ قدم کے فاصلے پر بیٹھا ہوا نوجوان اسے گھورنے لگا۔ اس کی نظر کپڑوں کو چیرتی ہوئی جانے کہاں کہاں تک پہنچ رہی ہے اور سینتہ اسے چاہ کر بھی نہیں روک پا رہی ہے اس نے کنکھیوں سے دیکھا، وہ نوجوان سگریٹ پی رہا تھا اور سامنے کے یکلپٹس کو اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے اس کی پتیاں گن رہا ہو۔ اس نے سینتہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ سینتہ کو اس نوجوان کا یوں ہی صرف یوکلپٹس کو دیکھتے رہنا اچھا نہیں لگا۔ یوکلپٹس بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے! ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ اسے دیکھتا۔ لیکن کیا وہ اسے برداشت کر لیتی؟ شاید۔ نہیں۔ تب تو یہ ٹھیک ہی تھا کہ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن اگر وہ دیکھ ہی لیتا، تو؟ کیا کرتی وہ؟ وہ سوچنے لگی کہ وہ کیا کرتی۔ شور مچانا تو نامناسب تھا۔ نوجوان کو بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا یعنی کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ وہ نوجوان خواہ مخواہ ہی اس کے ذہن پر سوار ہو کر رہ گیا تھا۔

نوجوان نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اسے مرغولہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ یہ ہوا بھی تو شام کو یوں تھم جاتی ہے کہ مرغولے بآسانی ٹھہر جائیں۔ لیکن ہوا پر ناراضگی سے کیا فائدہ! یہ لوگ سگریٹ ہی کیوں پیتے ہیں! اس نے چاہا کہ وہ اسی نوجوان کو سگریٹ پینے سے منع کر دے لیکن وہ کیوں منظور کرنے لگا۔ کیا لگتی ہے وہ اس کی؟ پھر سینتہ نے محسوس کیا کہ وہ دراصل اس کے سگریٹ پینے پر اعتراض نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ اس بات کو لے کر پریشان تھی کہ وہ سگریٹ کیوں نہیں پی سکتی! اس نے دیکھا کہ وہ سگریٹ پی رہی ہے اور چھلّے بنا رہی ہے۔ ننھے ننھے گول دائرے۔ کتنے دلکش اور تسلی بخش! امریکہ میں کتنی آزادی ہے چاہے جو کرو۔ سب چلتا ہے اور اپنے یہاں ــــ یہ مت کرو، وہ مت کرو، یہاں مت بیٹھو، وہاں مت کھڑی ہو۔ ہوں۔ کتنے بندھن ہیں۔ وہ انجانے میں ہی ہندوستان اور امریکہ کا مقابلہ کرنے لگی۔

مگر ہندوستان میں رہ کر بھلا امریکی بننے میں کون تک ہو سکتی تھی اس نے اس مقابلہ کو وہیں روک دیا اور کسی ایسی چیز کا تصور کرنے لگی جس سے متعلق کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا۔ اسے اِن چیزوں میں قطعی دلچسپی نہیں ہے، جو بغیر کسی نتیجے کے پیدا ہو جاتی ہیں اور ختم بھی۔ ایک لمحہ ہی اس نے پارک میں موجود لوگوں کو گن لیا۔ پندرہ آدمی، تین عورتیں، سات لڑکے اور دو لڑکیاں۔ حال ہی میں دو اور مرد پارک میں داخل ہوئے تھے اسے نا امیدی ہوئی۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی اجنبی نہیں تھا۔ کسی کا نہ آنا وہ بھی اسی حالت میں، جب کہ اس نے آنے کا وعدہ کیا ہو

تنا گراں گزرتا ہے۔

اور زیادہ بور نہ ہونے کے لئے سنیہ نے ناول پڑھنا شروع کردیا۔ بولتا۔ کل ہی پرانی کتابوں کی دکان سے خریدا تھا۔ سیکنڈ ہینڈ کتاب تھی۔ اندر کے ایک ورق پر لکھا ہوا تھا *my loveliness was born when men praised my talkative faults and blamed my silent virtues.* نیچے دستخط تھے۔ الکا بخشی۔ تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔ پندرہ دسمبر انیس سو ساٹھ۔ نہ جانے کون تھی؟ نہ جانے کہاں رہتی تھی؟ نہ جانے کیسی نظر آتی تھی؟ ممکن ہے کہ وہ خوبصورت ہو! اب نہ جانے کہاں ہوگی؟ شاید شادی ہوگئی ہو اس کی۔ دو ایک بچوں کی ماں بن گئی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ۱۹۶۰ء میں بھی شادی شدہ رہی ہو۔ سنیہ پوری طرح الکا بخشی کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکی۔ کاش وہ سامنے آجاتی اور کہتی ہے۔ "تم مجھے تلاش کر رہی ہو نا! میرا نام الکا بخشی ہے جبلپور کی پیدائشی ہوں۔ شادی شدہ ہوں دو بچے ہیں شوہر کالج میں لکچرار ہیں اور میں گھر بار سنبھالتی ہوں۔ کھانا بناتی ہوں، ریڈیو سنتی ہوں اور ناول پڑھتی ہوں۔ تمہارے پاس جو ناول ہے، وہ میں نے اسی وقت پڑھا تھا جب میں انٹر میں پڑھتی تھی۔ ایک سہیلی تھی اب نام کیا بتلاؤں۔ ایک دفعہ پڑھنے کو مانگ کر لے گئی اور اس کے بعد آج تمہارے ہاتھ میں دیکھ رہی ہوں۔ کیا پتہ کچھ اور کہے یا شاید کچھ نہ کہے۔ لیکن الکا بخشی نہ آسکی اور سنیہ اس کے متعلق ہی سوچتی رہی حتی کہ تھوڑی دیر میں اسے محسوس ہونے لگا کہ اسی کا نام بخشی ہے دوسری شخصیت کا بوجھ برداشت کرنا زیادہ دیر تک تو ناممکن تھا۔ سنیہ نے ناول رکھ دیا اور سیمنٹ کی بنچ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

بنچ کسی حد تک ٹھنڈی اور چکنی تھی۔ سنیہ نے محسوس کیا کہ اگر وہ اسی طرح ہاتھ پھیرتی رہی تو اس کی ہتھیلی ٹھنڈی ہو جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ اسے زکام بھی ہو جائے۔ تبھی خیال آیا کہ سردی کے اس موسم میں وہ بغیر جمپر کے نکل آئی ہے۔ خود پر ہی جھنجھلاہٹ ہوئی کتنی فالتو لڑکی ہے وہ بھی! سردی کی شام میں انتظار کرنے آبیٹھی ہے اور وہ بھی بغیر جمپر کے۔ اس نے دل ہی دل میں اجنیش کو گالی دی۔ اس نے طے کیا۔ اجنیش کے آنے پر وہ اس سے بولے گی بھی نہیں روٹھی ہی رہے گی۔ لیکن کب تک؟ کتنا سناب (SNOB) ہے اجنیش۔ منانے کی سینکڑوں ترکیبیں جانتا ہے۔ کوئی نہ کوئی ترکیب تو کامیاب ہو ہی جائے گی اور سارا غصہ بھول جائے گی۔ سب کچھ تالاب میں کنکر پھینکنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی لہروں کی طرح ختم ہو جائے گا۔ پھر وہ باہم گفتگو میں مشغول ہو جائیں گے۔ پارک، گھر، ہندوستان، شہر، کشمیر اور۔۔ اور نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں۔ رفتہ رفتہ دونوں خالی ہو جائیں گے اور ایک تناؤ سا ماحول پر طاری ہو جائے گا۔ پھر وہ چپ چاپ اٹھیں گے۔ کسی ریستوران میں کافی پئیں گے اور گڈ نائٹ (GOOD NIGHT) کہہ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔

کئی دنوں سے اس فہرست میں کسی نئے تجربے کا اضافہ نہیں ہوا ہے۔ وہ دونوں روز ایک ہی فلم دیکھ رہے ہیں۔ وہی آغاز وہی انجام۔ سنیہ کو ایسا لگا۔ جیسے وہ کسی چیز کی تلاش کر رہی ہے چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی میں خود کے قدموں کی آواز کتنی ڈراؤنی لگتی ہے ایسے میں کوئی پکڑ لے تو! نہیں، وہ کہیں نہیں جائے گی۔ وہ پھر سے اسی بنچ پر آگئی ہے اور شام کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے ہیں تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا اور لان کی سبز گھاس مرکیوری میں ایک عجیب سا رنگ اختیار کرلے گی۔

سنیہ نے دیکھا، وہ نوجوان اب بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا اور اب اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس پڑے تھے سنیہ کو لگا کہ وہ اس کی تنہائی کا مضحکہ اڑا رہے ہیں۔ سر تا پا

ایک چنگاری سی رگوں میں دوڑتی چلی گئی اور اس نے محسوس کیا کہ اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ ایک حصے کا خیال تھا کہ اسے لوٹ جانا چاہئے اور دوسرے کا خیال تھا، نہیں یہ بزدلی ہوگی۔ سنیہ نے خود کو دلاسہ دیا کہ وہ بزدل نہیں تھی۔ اس کشمکش سے نجات پاکر اس

نے اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اور پھر سے ان دونوں کی جانب دیکھنے لگی۔

نہ جانے کب آکر اجنیش کھڑا ہو گیا تھا لیکن اس کی موجودگی کا علم سینئہ کو اسی وقت ہوا جب کہ اجنیش نے اسے آواز دی۔ مضطرب ہو کر اس نے نگاہیں اٹھائیں۔ اجنیش مزید کچھ اور کہے بغیر اس کے قریب بیٹھ گیا ایک مختصر وقفہ تک مزید خاموشی چھائی رہی۔ آخر اس نے ہی اس خاموشی کو توڑا — بڑی دیر کر دی آج تم نے ؟

جملہ ادا کرنے کے بعد اس نے سوچا، اگر وہ اسے نہ بھی کہتی۔ تو کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا اس کے جملے نے کہیں بھی تو کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ جملے کی ادائیگی کی فضولیت کا کرب اسے پریشان کرنے لگا۔ وہ اس بات سے واقف تھی کہ اجنیش وہی رٹی رٹائی کہہ دے گا کہ ذرا دوستوں نے گھیر لیا تھا مگر اجنیش خاموش رہا۔ وہ صرف مرکری راڈ کو دیکھتا۔ جملے کا لمس تک اسے محسوس نہیں ہوا۔ سینئہ کو افسوس ہونے لگا، اپنی ہی بات پر کہیں اجنیش کے ساتھ کوئی المناک واقعہ نہ پیش آیا ہو۔ اس حالت میں اس کے الفاظ نے اجنیش کو تکلیف ہی پہنچائی ہوگی۔ اس نے مدھم آواز میں دریافت کیا — کوئی خاص بات ہے کیا ؟

اجنیش نے چونکتے ہوئے کہا — نہیں . . . نہیں تو ! یوں ہی سوچ رہا تھا تم روزانہ میرا انتظار کرتی ہو اور میں روزانہ دیر سے آتا ہوں۔ تمھیں برا تو لگتا ہوگا نا ؟

سینئہ نے چاہا کہ اپنے ہی ہاتھ سے گال پر ایک طمانچہ جڑ لے وہ اسے کوئی خاص بات تصور کر رہی تھی۔ ایک اندازہ کے غلط ہو جانے کا کرب اس کے ذہن پر سوار ہو گیا۔ کیا ہو رہا ہے اسے ! ان دنوں کوئی بھی اندازہ صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ صبح اٹھنے پر اس نے ممی سے پوچھا تھا۔ کتنے بجے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ آٹھ کے آس پاس ہی وقت ہوا ہوگا۔ مگر تب صرف سات ہی بجے تھے اس نے سوچا تھا کہ آج کالج میں انگریزی کا استاد لیونارڈو دونچی پر اپنا بقیہ لیکچر دے گا۔ مگر آج وہ چھٹی پر چلا گیا تھا۔ کیوں ہو رہا ہے ایسا ؟ پہلے تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ تبھی اجنیش کی آواز نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا — دیکھو نا، میں سوچ رہا تھا کہ آج تم واپس لوٹ گئی ہوگی اور تم یہیں ہو REALY I AM SO SORRY FOR THIS.

وہ یوں خوش ہو گئی۔ تو آج کل اجنیش کے اندازے غلط ثابت ہو رہے ہیں اس کے بھی اندازے غلط ثابت ہوں گے دونوں ایک ہو گئے ہیں شدت سے اجنیش سے قربت کا احساس ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو جناب آپ چاہتے ہیں کہ میں لوٹ جایا کروں !

نہیں تو ! میں نے یہ کب کہا ؟

آپ کا اس بات سے اور کیا مطلب تھا ؟

میں تو . . . . ،

کچھ دیر تک انھیں باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر دونوں نے محسوس کیا کہ اب بہت دیر ہو گئی ہے دونوں خالی ہو چکے ہیں وہ بغیر کچھ بولے کھڑے ہو گئے اور پارک سے باہر نکل آئے۔ ریستران میں بیٹھ کر ان دونوں نے کافی پی اور گڈ نائٹ کہہ کر جدا ہو گئے۔

گھر پہنچ کر سینئہ نے اپنی ڈائری نکالی اور کافی دیر تک کچھ لکھنے کے لئے سوچتی رہی۔ آج کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ سب کچھ کل جیسا ہی تھا اس نے ایک پرانا دن پھر سے ؟ لیا تھا۔ پریشان ہو کر اس نے بتی بجھا دی اور بستر پر لیٹے ہوئے چھت کی طرف دیکھتی رہی۔

پر. بودھ کمار سانیال

شمیم جیواروی

تعویذ

کاتب تقدیر نے شاید سوچا ہوگا کہ شوبھنا جیسی لڑکی کا بیاہ اگر واماپد جیسے مرد کے ساتھ نہ ہوا تو مستقبل میں دونوں میں سے ہی کسی نہ کسی کو مشکلات کا سامنا ضرور پڑے گا۔

کاتب تقدیر نے کسی کا بہ ظاہر کبھی برا بھی چاہا ہو اس کا بھی ابھی تک ثبوت نہیں ملا۔ شاید اسی بھروسے پر ہاتھی بگان کے پنڈتوں نے دونوں کی جنم پتری اچھی طرح جانچ پرکھ کر کہا تھا کہ ان دونوں کا بیاہ بہت کامیاب رہے گا۔!

اس بیاہ کے نتیجے میں اب، لگ بھگ چھ برس کی ایک لڑکی اور چار برس کا ایک لڑکا ہے۔ لڑکا بے حد رونے والا ہے۔ ایک برس کی عمر سے اُسے رونے کی عادت پڑی تھی۔ اور شوبھنا اپنی ہزار کوششوں کے بعد بھی ابھی تک اس کی یہ عادت چھڑا نہ سکی تھی۔ لڑکی اپنے ماما کے یہاں رہتی تھی۔

"ارے بھئی، ذرا اسے گودی لے لو۔ جب سے لوٹا ہوں، تب سے رو رہا ہے۔ لڑکے کا تمھیں ذرا بھی خیال نہیں رہتا!"

تپائی پر کھڑی شوبھنا دیوار میں کیل ٹھونک رہی تھی۔ منہ گھما کر بولی۔ "دن بھر روتا رہتا ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی بات کی ضد کرتا رہتا ہے۔ تم ہی کیوں نہیں اسے باہر لے جاتے؟ نئے مکان میں ایک منٹ سانس لینے تک کی فرصت نہیں۔"

واماپد چوکی پر ہی بیٹھا رہا۔ ذرا بھی ہلا ڈلا نہیں۔ "آہا، کیا سندر طریقہ ہے گھر سجانے کا۔ اسے ہی کہتے ہیں عورتوں کی عقل۔ وہاں تصویریں ٹنگے گی تو مسہری کی ڈوری کہاں بندھے گی؟ بہو بازار میں رہتے تھے، تب ہی کہا تھا پرانا پلنگ مت بیچو!"

شوبھنا کیل پر ہتھوڑی مارتے مارتے بولی۔ "دیکھو اس پلنگ کا نام تک مت لو۔ تمھارے باپ دادا نے اس پلنگ پر دم توڑا اس پلنگ پر تمھاری بوڑھی دادی نے آخری سانس لی۔ اور اگر گئے سال تمھاری ماں کی موت کاشی میں نہ ہوئی ہوتی تو ان کی قسمت میں بھی وہی پلنگ لکھا تھا۔ میں اس پلنگ کو اس مکان میں کیسے لے آتی۔؟"

لڑکا تب بھی برابر اپنی بین بجا رہا تھا۔

واماپد جھنجھلا اُٹھا "کچھ سمجھتی تو ہو نہیں، بس خالی بحث کرنا جانتی ہو۔ اصلی ساگوان کا سو سال پرانا پلنگ تھا۔ اب تو کہیں کھوجنے پر بھی نہیں ملتی۔ اور صرف پلنگ ہی کیوں۔ وہ کٹھل کی لکڑی کا بڑا صندوق بھی تو کسی کو دے دیا تم نے!"

شوبھنا نے بھی چڑکر جواب دیا۔ "اچھا ہی کیا میں نے۔ پرانا جنجال جتنا کم ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ اب نئے مکان میں سب نئی نئی

چیزیں لاؤں گی۔ اور اب تم پہلے اپنے لاڈلے کو تو چپ کراؤ۔ تب سے بیکار میرے پیچھے پڑے ہو۔"
"اُنہہ — نیا مکان! — اسے تم مکان کہتی ہو۔ صرف ڈیڑھ کمروں کا مکان۔ نہ چاروں اور دیوار، نہ رسوئی گھر۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا —"

"ذرا سنوں تو کیا کہہ رہے تھے تم۔؟" شوبھنا نے وامایدکی طرف گھوم کر پوچھا۔

"کیوں، کہا نہیں تھا کہ باستی بگان کی طرف ہی کہیں مکان لے کر رہ لیں گے۔ تب یہ سب جھنجھٹ سہنا تو نہ پڑتا۔ ہر مہینہ کرایہ دو۔ آرام سے رہو۔ بس سارا جھنجھٹ ختم۔"

ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے شوبھنا نے کہا۔ "تو کیا کرائے کے مکان سے اپنا گھر زیادہ اچھا نہیں۔ کیا اپنا مکان بنوا لینے میں کوئی فرق نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں، اب اس فرق کو دھو دھو کر پیتی رہو۔" وامایدکا بڑبڑانا جاری تھا۔ "کیا ہے یہاں۔ نہ دکان، نہ ہاٹ بازار، ایک پان تک کی دکان نہیں۔ رات برات میں کوئی بیمار پڑ جائے تو پاس کوئی ایک ڈاکٹر تک نہیں۔"

شوبھنا تپائی سے نیچے اتری۔ "یہاں اور بھی تو پانچ چھ خاندان رہتے ہیں۔ ان کا کام کیسے چلتا ہے۔ وہ لوگ بھی تو آفس سے لوٹتے ہوئے سامان لے آتے ہیں۔ اسٹیشن کے پاس ہی کیا تم نے مودی کی دکان نہیں دیکھی۔ بیچ بیچ میں یہاں ساگ واگ سب چیز بکنے آتی ہے۔ مچھلی والی بھی کبھی کبھی آجاتی ہے۔ یہاں بھلا کیا رہ سکیں گے۔ زندگی بھر بہو بازار کی اس اندھیری گلیوں کے گھٹے مکان میں اور رہ پانے کی سوچ ہی نہیں سکتی۔"

"وہاں تو گھر کے پاس سب مل جاتا تھا۔"

"اسی لئے تو تم اتنے کاہل ہو گئے ہو۔ نہ تو تمہارے اپنے اندر طاقت ہے۔ اور نہ کوئی کام کرنے کی ہمت۔ تکلیف اٹھانی تو تم جانتے ہی نہیں۔ محنت کرنا تمہارے بس کا نہیں۔ آج تک کرا کرایا سب پاتے رہے ہو۔ اپنی کوشش سے تو کچھ کیا نہیں تم نے۔ یہ نوکری بھی تمھیں اپنے پھوپھا کی کوششوں سے ملی ہے۔ تمہارے ذاتی حوصلہ پر نہیں۔"

وامایدخفیف ہو کر بولا۔ "اچھا اچھا، مان لیا۔ تم بہت حوصلے والی ہو۔ تب ہی تو اس جنگل میں زمین خریدی۔ اب تم ہی اپنی طاقت دکھاؤ میں بھی دیکھوں کتنا حوصلہ ہے تم میں۔"

شوبھنا ہنس پڑی۔ "اچھا یہ بتاؤ، اس مکان کا کون سا کام تم نے کیا ہے۔؟ کس نے رات دن راج مستری لگا کر ان سے کام لیا۔ کس نے بھر بھر بالٹی پانی انڈیل اینٹیں بھگائیں۔ سمنٹ کا پرمٹ کس نے بنوایا۔ کھڑکی دروازوں پر رنگ کس نے کیا۔؟"

بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے وامایدنے کہا۔ "بیاہ سے پہلے مجھے یہ تھوڑے ہی معلوم تھا کہ تم ایک مردانی عورت ہو۔!"

شوبھنا مسکرائی۔ "اور مجھے بھی یہ معلوم تھوڑے ہی تھا کہ تم عورت سے بھی گئے گزرے ہو۔ خالی ہر کام میں مینخ نکالنا جانتے ہو۔ اس سے تو اچھا کچھ کام کرو نا۔ جاؤ بانس کی کھپچیاں کاٹ کر بیڑا باندھو۔ اور اگر کر سکو تو پھول کے پودے ٹھیک کر لو۔ بھئی ہاتھ جوڑتی ہوں تم اس چوکی سے اٹھ کر باہر ہوا اور روشنی میں جاؤ۔ تین کٹھا زمین کم نہیں ہوتی۔ اپنی زمین سے پیار کرنا سیکھو ذرا۔"

وامایدبولا — "ہوں، میں پہلے ہی جانتا تھا۔!"

"کیا جانتے تھے۔؟"

"یہی کہ مجھے اکیلا پا کر تم میری جان پر اتر آؤ گی۔ اسی ڈر سے میں بھائیوں سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔"

"ہوں، اور جب وہ امپرومینٹ ٹرسٹ والے تم لوگوں کا مکان گرانے آئے تھے، تب انھوں نے ان لوگوں سے کہا کیوں نہیں کہ ہم لوگ اس زمانے کے ہار پانچ پانڈو ہیں۔!"

لڑکا ابھی تک منہ پکڑے رو رہا تھا۔ باہر جا کر شوبھنا نے بچّی کے لئے چائے کا پانی چڑھایا۔ پھر جھاڑو لے کر کمرہ اور برآمدہ صاف کیا۔ ہینڈ پمپ سے پانی بھر کر رکھا۔ شام کے کھانے کے لئے کوئلے توڑ کر رکھے۔ اور مسالہ پیسنے بیٹھ گئی۔ بیکار کی بحث کرنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

اندر چوکی سے اُٹھ کر اب واماپد بھی باہر آکر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ اور بولا۔ "دیکھ رہا ہوں، جو میں نے سوچا تھا ٹھیک وہی بات ہے۔ الگ گھر بسانے کے بعد تمہارا دماغ ساتویں آسمان پر جا پہنچے گا۔ یہ میں پہلے ہی جانتا تھا۔ بڑی بھابی ٹھیک کہہ رہی تھیں۔"

"تو جاؤ نا، اپنی بڑی بھابی کے پاس ہی جاؤ۔ اپنے لڑکے کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ تم لوگوں کے پُراتن خاندان کا لاڈلا ہے۔!" جلدی جلدی شوبھنا نے مسالہ پیس کر کیتلی میں چائے بھیگوئی، پھر بولی۔ "سوچا تھا، دفتر سے لوٹتے ہوئے تم مچھلی ساگ سبزی کچھ لے آؤ گے۔ اب تم ہی بتاؤ بغیر کسی چیز کے اس وقت کیسے کھانا بناؤں۔"

واماپد بولا۔ "اب مزا چکھو۔ پیٹ باندھ کر سو رہو اب۔ میں صبح ہی کہہ گیا تھا کہ اسمرتی رتن کے یہاں جا کر تعویذ لانا ہے۔ ارے باپ رے، وہ بھی کیا سیدھا راستہ ہے کوئی۔ کوئلہ گھاٹ کے دفتر سے نکل کر وہ تمہارے جیلے ٹولہ تک جانا پڑا۔"

"پر تم بھی اتنی دور پیدل جانے والے نہیں ہو۔"

"اور سنو، پیدل چلنا بالکل منع ہے۔ اسمرتی رتن نے کہہ دیا ہے کہ دفتر سے سیدھے گھر اور گھر سے سیدھے دفتر۔ اگر ایک قدم بھی اِدھر سے اُدھر ہوئے تو تعویذ کا اثر ختم۔ پیدل چلنا بالکل منع ہی سمجھو۔"

چائے کا کپ پتی کے سامنے رکھ کر شوبھنا نے کہا۔ "لڑکے کے بدن پر تین اور تمہارے بدن پر سات۔ ابھی اور کتنے تعویذ باندھنے باقی ہیں۔؟ لوگوں کے سامنے کھڑے کیسے ہو پاتے ہو؟"

چائے کی گھونٹ بھر کر واماپد نے کہا۔ "ارے چینی تو ہے ہی نہیں اس میں!"

"بس اتنی ہی کافی ہے۔ میرے پاس مہینے بھر کے حساب سے صرف چھ سیر چینی ہے۔ تھوڑی ہلکی پیو۔"

"ہوں، یہ میں پہلے ہی جانتا تھا۔ اسی لئے میں بڑی بھابی کے ہاتھ کے سوا اور کسی کے ہاتھ کی چائے نہیں پیتا تھا۔"

"اچھا۔! تو دفتر سے لوٹتے ہوئے بڑی بھابی کی گود میں بیٹھ کر میٹھی میٹھی چائے بھی پی آیا کرو۔" شوبھنا بھنبھناتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

پیچھے سے واماپد بولا۔ "جو اندازہ لگایا تھا ٹھیک وہی ہو رہا ہے۔ اب تمہارے اس تیز مزاج کو ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی ایک تعویذ لانا پڑے گا۔"

بچہ ابھی تک برابر رو رہا تھا۔

اندر پہنچ کر شوبھنا نے ساڑی بدلی اور پھر باہر آئی۔ بولی۔ "ذرا مہربانی کر کے گھر کا دھیان رکھنا۔ دروازہ کھلا ہی ہے۔ میں ابھی آرہی ہوں۔"

بھرائی ہوئی آواز میں واماپد بڑبڑایا۔ "دنیا مجھے جورو کا غلام کیا یوں ہی کہتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ میں اپنی بیوی کے اشارے پر چلتا ہوں۔ چار بھائیوں کے ساتھ آرام سے رہ رہا تھا۔ تمہاری ایک بات پر سب چھوڑ آیا۔ نہ مجھے کسی کی بات کے لئے سوچنا پڑتا تھا، نہ سوچ فکر کرنی پڑتی تھی۔ باپ دادا کی جائداد تھی۔ بڑے مزے سے رہتا تھا۔ دو کمرے اپنے حصے کے تھے۔ ان ہی میں بڑے مزے کی زندگی کٹ جاتی۔ صبح دس بجے سے شام پانچ بجے تک آفس۔ پھر چھٹی، آرام سے دن گزر رہے تھے۔ ذرا بھی فکر نہیں تھی..."

شوبھنا دروازے پر کھڑی یہ سب سنتی ہوئی ہنس رہی تھی۔ بولی۔ "اب شاید بہت بُرا لگ رہا ہے نا۔؟"
"بُرا کیوں نہیں لگے گا"، واما پد پیچھے سے بولا۔ "اصل میں تم ہی آزاد ہونا چاہتی تھیں۔ میں تو صرف نام کے لئے ہوں۔ بھائی بھائی میں کس کے یہاں جھگڑا نہیں ہوتا؟ پر کیا اس کے لئے سب سے تعلق ختم کر لینا پڑتا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ میں معافی مانگ کر صلح کر لیتا۔"
"معافی مانگنے کی ایسی کیا بات ہے۔ آخر تم نے ہی ایسی کیا بد سلوکی کی تھی۔ اس سے تو یہی ہزار گنا اچھا ہے کہ الگ الگ رہو۔ سب کے نزدیک بھلے بھی رہو۔ نہ کسی کو لینا نہ کسی کو دینا۔ بس گھر میں چین کی بانسری بجاؤ۔"
"یہ سب تمہاری کرتوت ہے۔ تم ہی پرانے انتظام کو برباد کرنے پر تلی تھیں۔ ہر بات میں تمہیں کچھ نیا پن چاہیئے۔ بہو بازار والے مکان میں تمہیں پر پھیلانے کی سہولتیں نہیں تھیں، اسی لئے وہاں تم چڑچڑائی رہتی تھیں۔ دیور، جیٹھ، ساس، نند، ان کے گھیرے سے تم چھٹکارا پانا چاہتی تھیں۔ میں تب ہی کہہ رہا تھا کہ مکان کو درست کرنے کا تعویذ باندھ لو سب ٹھیک ہو جائے گا مگر تم کسی کی سنو تب نا۔ اب کرو سوچ۔ پڑی رہو اس جنگل میں چاروں طرف سائیں سائیں۔ ہر وقت سانپ بچھو کا خوف۔ تمہیں بازار جانا ہے جاؤ۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں مجھ سے یہاں اس اندھیرے میں لڑکے کے ساتھ تنہا نہ رہا جائے گا۔"
شوہر کی طرف دیکھ، شوبھنا مسکرا دی۔ پھر باہر سے دروازہ لگا کر سیدھے سڑک پر آگئی۔
لگ بھگ ایک میل کا راستہ ہے۔ درمیان میں ایک لوہے کے کارخانے کی چہار دیواری پڑتی ہے۔ دیوار کافی لمبی ہے۔ شام کے وقت اس طرف کا راستہ ذرا سونا ہی رہتا ہے۔ سڑک پر ابھی تک بجلی نہیں لگی۔ مگر بات چیت چل رہی ہے۔ اس دیوار کو پار کر لینے پر اسٹیشن کی روشنی دور سے دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور آج تو پھر بھی مختصر سے لمحے کی پھیکی سی چاندنی ہے۔
آج کل بازار کا کام کرنے کی شوبھنا کو عادت ہو گئی ہے۔ جب نئے گھر کو بنوانے کی، اسے بسانے کی ساری ذمہ داری اس کی ہے تو یہ سب بھی اس کو کرنا پڑے گا۔ اور اس میں اس کو تکلیف نہیں۔ بلکہ خوشی ہے۔ سارا حساب روپیہ پیسہ سب اپنی تحویل میں۔ کچھ دن اور گزارنے پر ذرا اور بھی آرام سے رہنے کی صورت نکل آئے گی۔
اسٹیشن کے پاس کا یہ بازار بہت چھوٹا ہے۔ گھوم گھما کر شوبھنا نے ضرورت کا سارا سامان خرید لیا۔ دھیرے دھیرے اس کا تھیلا بھر گیا۔ وہ ابھی خریداری میں مصروف ہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اسے پکار کر کہا۔
"ارے آپ، اس وقت شام کو بازار میں۔؟"
شوبھنا نے پلٹ کر دیکھا، پھر مسکرا دی۔ "او، وینئے بابو! آپ کب آئے۔ آپ کے گھر کے سامنے سے ہی تو ہو کر آئی ہوں۔"
وینئے نے ہنس کر جواب دیا۔ "میں صبح ہی بمبئی میل سے آیا ہوں۔ آپ سب لوگ مزے سے تو ہیں۔؟ ارے گووند دیدی کے ہاتھ سے تھیلا لے لو۔"
"نہیں نہیں رہنے دیجئے۔ ایسا خاص بھاری نہیں۔"
"تو کیا ہوا دیدیجئے نا اس کے ہاتھ میں۔"
گووند نے آگے بڑھ کر شوبھنا کے ہاتھ سے تھیلا لے لیا۔
وینئے بولا "سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کا میں کس طرح شکریہ ادا کروں۔ میرا سارا سامان الٹا سیدھا پڑا تھا۔ آپ ہاتھ نہ لگاتیں تو کس طرح سلیقے سے نہ لگ پاتا۔ میں نے گووند سے سب حال سنا ہے۔ آپ کو اپنے کاموں میں وقت کیسے مل گیا۔؟"
شوبھنا بولی۔ "وہ کون بڑا کام تھا۔ مجھے اگر تھوڑا سا اور وقت ملتا تو میں آپ کا گھر بھی بہت اچھی طرح سجا دیتی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی دیکھ کر آئی تھی کہ آپ کے گھر کا تالا بند ہے۔ گووند کو جب نہیں دیکھا تو سوچا کسی کام سے کہیں گیا ہو گا۔ اچھا اب یہ بتائیے، آپ یہاں کب سے رہتی ہیں؟"
"بہت جلدی ہی۔ یہی کوئی ڈیڑھ دو مہینے تک باورچی خانہ تو بن ہی چکا ہے۔ اب صرف چاروں طرف کی دیوار اور غسل خانہ باقی ہے۔

جلدی سے جلدی کام ختم کرنے کی کوشش میں ہوں۔"

"آپ کہہ رہے تھے نا کہ کمروں کا فرش موزائیک کا بنوانے کا ارادہ ہے۔؟"

"اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔ سب سے پہلے لائٹ کی ضرورت ہے۔ ہاں آپ اپنے مکان کی گلی کس طرف رکھ رہی ہیں؟"

شوبھنا مسکرائی۔" ابھی تو آنگن بھی نہیں بنا۔ گلی تو دور رہی!"

گووند بولا۔" دیدی، آپ کو اگر گائے رکھنی ہے اور اس کا چھپر بنوانا ہو تو مجھے بتائیے گا۔ میں بنادوں گا۔ مجھے چھپر ڈالنے کا کام بہت اچھا آتا ہے۔"

"اچھا دیکھوں گی۔ دو چار مہینے گزر جانے دو۔"

دینیش بولا۔" سچ، آپکا مجھ پر بہت احسان ہے آج یہاں پہنچکر دیکھا، چاروں کمرے بڑے خوبصورت ڈھنگ سے سجے ہوئے تھے۔ آپ کو اس کا بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ کہیں بھی تو کچھ آپکی نظر سے چھوٹتا نہیں۔"

"نظر سے نہیں، دل سے" یہ کہکر شوبھنا ہنس پڑی۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔ دل نہ لگے تو کوئی کیسے کچھ کر سکتا ہے۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کس طرح آپ نے خود کھڑے رہ کر مکان بنوایا ہے، بھئی، سچ، آپ میں غضب کی ہمت ہے۔ ایک ہی دن ہم دونوں کے مکان بننے شروع ہوئے تھے مگر آپ کا کام کتنی جلدی آگے بڑھ گیا۔"

مذاق کے لہجے میں شوبھنا نے کہا۔" دیکھئے میرے پتی کے سامنے آپ میری اتنی بڑائی نہ کریں تو اچھا رہے گا۔"

"کیوں؟ اس میں کچھ جھوٹ تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ انھیں بلکہ خوشی ہوگی میری بات سن کر۔"

فوراً شوبھنا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔" اچھا ہوا کہ آپ ڈاکٹر ہیں وقت بے وقت سہولت رہے گی۔ ڈاکٹر حکیم کا گھر اگر نزدیک ہو تو میرے پتی بہت بے فکر رہتے ہیں۔ آپ اپنا چیمبر کہاں کھول رہے ہیں۔؟"

"ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔ پر ویسے میں صبح سات بجے سے دن دس بجے تک یہاں رہوں گا۔ اور اگر کلکتہ میں چیمبر کھول سکا تو ساڑھے دس بجے سے ایک بجے تک اور شام کو پانچ سے آٹھ بجے تک کھولا کروں گا۔"

"تب تو آپ کو روزانہ سفر کرنا پڑے گا۔"

نیچے منہ کرکے دینیش نے جواب دیا۔" یہ تو شاید ممکن نہ ہو سکے گا۔ اگر پریکٹس اچھی جم گئی تو پھر شاید ایک گاڑی خریدنی پڑے گی۔"

شوبھنا چپ رہی۔ دینیش کی معاشی حالت بھی اچھی ہے۔ یہ اس کے چہرے سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کے سوا ان کے مکان کی زمین بھی، شوبھنا کی زمین سے چوگنی ہے۔ وہ لوگ نوکروں کے رہنے کے لئے الگ کمرے بنوا رہے ہیں۔ گیرج بن ہی چکا ہے۔ شوبھنا اور دینیش کی معاشی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

دینیش نے پوچھا۔" آپ کی خریداری ہو گئی ہو تو اب چلیں۔"

"ہاں چلئے۔ ارے" شوبھنا ٹھٹھک کر رک گئی۔ مجھی سی آواز میں بولی۔" یہ دیکھئے مٹی کے تیل کی بوتل لانا تو میں بھول ہی گئی اب آپ لوگوں کا مین دیکھ کر یاد آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ گھبرائیے مت۔ تنہا جان آپ کہاں تک سب سنبھال سکتی ہیں۔ اس پر آپ کے پتی کا روگ، آپ کے بچے بھی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ ایسی بھول ہو ہی جاتی ہے۔ دیکھو گووند تم گھر پہنچتے ہی ان کی لالٹین میں تیل بھر آنا۔"

"ہاں بابو، میں بھر دوں گا۔ بے فکر رہیں۔"

چلتے چلتے شوبھنا بولی ۔ "لیکن اس سے حساب میں گڑبڑی ہوگی، وینئے بابو۔ اس سے بہتر تو یہ ہو کہ گووند میری پوری شیشی ہی بھر دے"۔
"اوہ، وینئے ہنسنے لگا" آپ شاید واپس کرنے کی بات سوچ رہی ہیں۔"
"یقیناً۔ نہیں تو وہ ناراض ہوں گے۔"
اب تک اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ ایک ہی سڑک پر تین آگے پیچھے رہ کر چلنا اچھا نہیں لگتا۔ آخرکار شوبھنا کو وینئے کے ساتھ ساتھ چلنا پڑا۔ دفعتاً وینئے پھر ہنسا۔ "مانا کہ آپ تیل واپس کر دیں گی تو پھر مجھے بھی بدلے میں آپ کا گھر سجا آنا چاہیئے۔"
دونوں کی ملی جلی ہنسی سڑک پر گونج اٹھی۔ اچھا ہی ہوا گووند نے کچھ سنا نہیں۔ وہ کافی پیچھے تھا۔
کارخانے کی دیوار سے لگتی ہوئی اس سنسان سڑک سے دونوں لوٹ رہے تھے۔ راستے میں روشنی نہیں ہے پر تو بھی چاند کی مدھم روشنی سے زیادہ دقت نہیں ہو رہی ہے۔ دونوں میں کچھ اجنبیت ہے ہی۔ وینئے کی خاندانی تفصیلات سے شوبھنا واقف نہیں۔ اور نہ ابھی تک واقفیت حاصل کرنے کا اتفاق ہی ہوا ہے۔ دونوں کے مکانوں میں لگ بھگ پچیس گز کا فاصلہ ہوگا۔ آتے جاتے شوبھنا ان کے راج مستریوں کا کام دیکھ جاتی ہے۔
ایک دن دوپہر میں گووند نے آکر ایک چھٹی پڑھائی تھی۔ اس دن شوبھنا کو پتہ لگا تھا کہ یہ لوگ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ ٹھیکیدار اس مکان کو بنوا رہا ہے۔ اور گووند یہاں پر چوکیداری کے لئے ہے۔ جس دن لوگوں کا سامان آیا تھا، گووند نے آکر مدد مانگی تھی۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں آج سے پہلے وینئے سے اسکی ملاقات صرف دو بار ہوئی ہے۔ وہ کب آتا ہے، کب جاتا ہے، ان سب باتوں کی بابت شوبھنا کو کوئی بیقراری بھی نہیں تھی۔
باتوں ہی باتوں میں ایک میل لمبا راستہ کب ختم ہوا یہ پتہ ہی نہ لگا۔ گھر کے پاس پہنچ کر وینئے نے کہا۔
"اچھا اب آپ بھی گھر جائیے۔ میں ابھی گووند کو بھیجتا ہوں۔"
"اچھا"، شوبھنا نے اپنا تھیلا لیا اور گھر کی طرف قدم بڑھائے۔
ابھی تک مکان کے چاروں طرف کی باہری دیوار نہیں بنی ہے۔ اس لئے باہر کے دروازے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ شوبھنا نے برآمدے میں پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔
اندر سے داماپد نے پوچھا۔ "کون ہے؟"
"میں ہوں، دروازہ کھولو بھی۔"
خوف کے مارے شاید داماپد اپنی بیوی کی آواز بھی ٹھیک سے پہچان نہیں سکا۔ آخر تاؤں دریافت کیا۔ "کون ہو تم؟"
شرما کر شوبھنا نے جواب دیا۔ "اوہ! بہرے ہو گیا تم۔ کہہ تو رہی ہوں، میں ہوں، میں — شوبھنا۔"
فوراً دروازہ کھل گیا۔ ظاہر تھا کہ اندر کان لگا کر، بیوی کی آواز ٹھیک سے سن کر، پہچان کر ہی داماپد نے دروازہ کھولا ہے چھوٹتے ہی بولا۔ "بڑی دیر لگا دی تم نے —!"
"ارے یہ کیا ابھی تک لالٹین بھی نہیں جلائی۔ کیسا گھپ اندھیرا کر رکھا ہے"۔
"ہاں نہیں جلائی لالٹین۔ کس کی گز بھر کی چھاتی ہے۔ جو برآمدے میں دیا سلائی کھوجنے جاتا۔ اتنا بڑا گیدڑ آکر تمھارے آنگن میں کھڑا ہوا تھا۔ ادھر اندھیرا ادھر رادھو کا رونا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی دیر لگا دو گی۔ جانے کے پہلے روشنی جلا کر نہیں رکھ سکتی تھیں کیا؟"
بحث میں پڑنے کی خواہش شوبھنا کو نہیں تھی۔ وہ جب گئی تھی، تب بھی ہلکا ہلکا اجالا تھا۔ ماچس وہ چولہے کے پاس ہی رکھ گئی تھی۔ وہیں لالٹین بھی رکھی تھی۔ شوبھنا چپ چاپ کام میں لگ گئی۔ پہلے دونوں لالٹین جلا کر پھر چولہا سلگایا۔ مگر نہیں، وہ تو یہ نہیں چاہتی تھی ایسی کھچ کھچ، ایسی زندگی کا سفر۔ ناکامی — اس کی تو اس نے تمنا نہیں کی تھی۔ وہ تو کچھ اور ہی چاہتی تھی —!

اتنے میں باہر آواز سن کر شوبھنا بولی۔ "او گووند، دیکھو اس شیشی کو بھر دینا بھئی۔"
"گووند نہیں، میں ہوں وینئے۔"
شوبھنا اٹھ کر باہر آئی "او، آپ ہیں۔ آیئے آیئے۔ اس وقت آپ نے آنے کی زحمت کیوں اٹھائی۔ ارے بھئی یہاں آؤ دیکھو تو تم نے ان کو پہچانا۔ یہی ہیں وہ وینئے بابو جن کے بارے میں تمھیں اس دن بتایا تھا۔ یہ سامنے والا مکان ان ہی کا ہے۔"
واماپد نے نمسکار کرتے ہوئے کہا۔ "آیئے، پر آپ کو کہاں بیٹھاؤں۔ ارے ارے آپ زمین پر ہی کیوں بیٹھ گئے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں۔ آپ اندر بیٹھیے۔"
مسکرا کر وینئے نے کہا۔ "حرج ہی کیا ہے یہاں میں بڑے آرام سے بیٹھا ہوں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کل اتوار ہے صبح چائے کی بیٹھک ہونی چاہیئے۔ پھر دوپہر کو آپ لوگوں کی دعوت میرے یہاں پکی رہی۔"
واماپد بولے۔ "یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ لیکن میں نے ابھی ایک نیا تعویذ حاصل کیا ہے۔"
"تعویذ؟" حیرت زدہ ہو کر، گہری نگاہوں سے واماپد کو دیکھتے ہوئے وینئے نے کہا۔
"جی ہاں تعویذ! اس تعویذ کے بل پر ہی تو آج شام کو میری جان بچ سکی ہے وینئے بابو۔"
وینئے ہنس دیا۔ اتنے میں اندر ایک چٹائی بچھاتے ہوئے شوبھنا بولی۔ "وینئے بابو، اس پر بیٹھیے۔ میں چائے لے کر آ رہی ہوں۔" پھر پتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں سنو جی یہ ڈاکٹر ہیں۔ اپنے تعویذ کے بارے میں ان سے ذرا سوچ کر بات کرنا۔"
"ارے تم کہتی کیا ہو، اتنا بڑا گیدڑ آ کر کھڑا ہوا تھا وہاں پر آج صرف اس تعویذ کی وجہ سے باپ بیٹے کے سر سے بلا ٹلی ہے۔ تو بھی سب طرف سے بچاؤ کہاں ہو سکا۔ چاروں طرف کی سوئی ہوا لگ گئی ہے لڑکے کو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بیچارہ روتے روتے سو گیا ہے۔"
وینئے نے ایک بار شوبھنا کو دیکھا۔ اس کے دیکھنے یا نگاہوں کے تبادلے سے صاف ظاہر تھا کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کی نظر سے دل کو بہت کچھ امیدیں بندھ جاتی تھیں۔
شوبھنا بولی۔ "وینئے بابو! جن لوگوں کو تعویذ وغیرہ پر یقین ہوتا ہے، انھیں اس سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔ تعویذ وغیرہ پر یقین کرنے والے دل کے ساتھ پیدا ہونے والوں کو ہی تعویذ پھلتے ہیں۔ انھوں نے یہی کوئی نو دس تعویذ باندھ رکھے ہیں۔ اور ان کو یقین ہے کہ یہ کبھی ٹھگے نہیں گئے۔"
وینئے نے پوچھا۔ "اور آپ ٹھگی گئی ہیں کیا۔؟"
"میں؟" لالٹین کی روشنی کی طرف دیکھتے ہوئے شوبھنا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ "میرا تعویذ تو یہ ہے۔ آٹھ دس سال سے اس تعویذ کو پہنے ہوں۔ پر ابھی تک سمجھ نہیں پائی کہ جیت گئی ہوں یا ہار گئی ہوں۔"
وینئے زور سے ہنس پڑا۔ شوبھنا بولی "آپ بیٹھیے، چائے کا پانی کھول رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ اس کے ہاتھ پیروں میں آج جیسے پر لگ گئے ہیں۔
واماپد نے پوچھا "آپ کو معلوم ہے ادھر بجلی کب تک آ سکے گی۔؟"
"دکھائی دے بھی چل تو رہی ہے۔ کئی جگہ کی ناپ جوکھ بھی ہو گئی ہے۔"
"دیکھیے صاحب، ہم ٹھہرے بہو بازار کے باشندے۔ ایسے کھلے میدان، گھاس پھوس اور سڑتے گلتے تالاب یہ سب ہم نے کبھی نہیں دیکھے۔ بچپن میں کبھی چڑیا گھر میں گیدڑ دیکھا تھا۔ اور آج شام کو دیکھا۔ اس طرح کے کھیت کھلیان، جنگل، جھاڑ جھنکاڑ نہیں دیکھے۔

سچ کہتا ہوں۔ مجھے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ کلکتہ کے آس پاس یہ جگہ ہے۔ اپنے ماموں کے ذریعے سے شوبھنا نے، دو سال ہوئے یہ زمین خریدی تھی۔ اب مکان بھی خود ہی کھڑے ہو کر بنوایا ہے۔ میں تو صاحب آج تک کبھی بھی کلکتہ سے باہر نہیں گیا۔"

"وہاں کیا آپ لوگوں کا ذاتی مکان ہے؟"

"ہاں ہماری سات پشتیں وہاں رہ چکی تھیں۔ ہمارے پردادا کے زمانے میں، ان لوگوں کے دیکھتے دیکھتے کلکتہ شہر بسا۔ اگر امپرومنٹ ٹرسٹ والے مکان نہ توڑتے تو شاید ہماری تین نسلیں آج بھی وہیں رہتیں۔ اب آپ کو کیا بتاؤں۔ میرے دادا کی تین بیویاں تھیں۔ اور میرے باپ کی دو۔ ہمارے دادا آٹھ بھائی تھے۔ اور اکیلے میرے دادا کے کل تیرہ بچے تھے۔ ادھر اب ہم لوگ نو بھائی ہیں کل ملا کر کافی بھرا پرا گھر ہے۔"

اندر سے شوبھنا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وینئے بابو! اگر قانونی بندشیں نہ ہوتیں تو یہ بھی شاید ایک دو شادیاں اور کر لیتے!"

واماپد بولا۔ "یہ سنئے۔ اسی ماحول کی عورتیں ہیں یہ۔ اسی ہوا پانی میں پلی ہیں۔ مگر کیسے اتنی ناستک ہو گئی ہیں، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ارے شادی کیا میں اپنی غرض کو کرتا۔ چھوٹا پن ہونے کا کتنا جھمیلا ہے، یہ کیا تم نہیں جانتیں۔؟"

وینئے حیرت سے یہ سب سن رہا تھا۔ اتنے میں شوبھنا ایک ٹرے میں رکھ کر چائے اور بسکٹ لے آئی۔ ٹرے ان لوگوں کے سامنے رکھ کر وہ اندر گئی۔ اپنی مٹی کے تیل کی شیشی لے آئی۔ اور اس میں ٹین سے انڈیلنے لگی۔

واماپد نے یہ دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے، میں سمجھا نہیں۔؟ یہ ٹین لے کر آئے ہیں۔ اور تم نے اس میں سے تیل نکال لیا۔ یہ کیا بات ہے بھئی۔؟"

شوبھنا بولی۔ "بات یہ ہے کہ اسٹیشن کے پاس بازار میں ان سے میری ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے تیل خریدا تو دیکھ کر مجھے بھی یاد آیا کہ میں تیل کی شیشی بھول گئی ہوں۔ اور ہاں دیکھئے وینئے بابو پیسے میں آپ کو ابھی نہیں دوں گی۔ پیچھے گووند کے ہاتھ بھیج دوں گی۔"

مسکرا کر وینئے نے کہا۔ "اور اگر قرض اتارنے پر بھی نیند نہ آئی تو۔؟"

ان لوگوں کا چائے پینا تب تک ختم ہو چکا تھا۔ کپ نیچے رکھتے ہوئے وینئے نے کہا۔ "تو میں سمجھوں گا آپ کو بھی کھلی ہوا لگ گئی ہے۔ اور آپ کے لئے بھی ایک تعویذ کی ضرورت ہے۔"

اس پر دونوں ایک ساتھ ہنس دیئے۔ تو واماپد کے لئے بھی چپ رہنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ بھی ہنسا۔ وینئے نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں۔ آپ لوگوں کو خوب تنگ کیا ہے آج میں نے۔ گووند سے اکیلے سب ہوتا نہیں۔ تھوڑا اسکا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ اچھا، نمسکار۔"

شوبھنا بولی۔ "وینئے بابو، میں آپ کے مستری سے کچھ کام لینا چاہتی ہوں۔"

"ہاں ہاں آپ جب چاہیں لے سکتی ہیں۔"

لالٹین اٹھا کر شوبھنا وینئے کے پیچھے پیچھے گئی۔ وینئے نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ شاید اچھا ہی کیا۔ شوبھنا چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہی۔

اس رات واماپد سے چھپ کر شوبھنا بغیر کسی وجہ کے ہی کافی دیر تک روتی رہی۔

لڑکا آج پھر صبح سے رو رہا ہے۔ نہ جانے کیوں جب سے اس مکان میں آئے ہیں، عموماً ہر وقت روتا رہتا ہے۔ دن بھر اس کے اس طرح رونے پر پن پنانے سے وہ تنگ آ گئی۔ ہر وقت کسی نہ کسی بات کی ضد لگائے رہتا ہے کبھی کبھی شوبھنا بے زاری اور نفرت سے بھر اٹھتی ہے۔

چولھے پر سے ہنڈیا اتار کر شوبھنا نے دال میں بگھار دیا۔ پھر چائے کے برتن دھو کر رکھے۔ اور گیلے کپڑے کو دھوپ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "ذرا جا بیٹا مت رو۔ اور ایک بسکٹ لے گا۔؟ بسکٹ نہیں، اچھا تو کیا لے گا۔؟ آم پاپڑ۔ پر دیکھو روتے نہیں۔ میں ابھی دیتی ہوں میرا رادھو بڑا اچھا لڑکا ہے۔"

شوبھنا اسے جتنا بہلانا چاہتی ہے، وہ اتنا ہی ضد کرتا ہے۔ آم پاپڑ لا کر دیا تو ہاتھ میں لے کر پھینک دیا۔ بسکٹ دیا، اسے چھوا تک نہیں۔ دودھ کے کرائی تو اور بھی زور شور سے ہاتھ پاؤں پٹخ کر رونے لگا۔ آخر میں تنگ آ کر شوبھنا نے اسے گود میں اٹھا کر چپ کروانا چاہا تو وہ اور بھی چیخنے لگا۔ روتے روتے بولا۔ "میں نہیں رہوں گا تمھارے پاس۔"

"کیوں نہیں رہے گا میرے پاس؟ میں تمھاری ماں ہوں نا۔!"

"میں بابا کے پاس رہوں گا۔ میں بابا کے پاس رہوں گا۔" اور اتنا چھٹپٹانے لگا کہ مجبور ہو کر شوبھنا نے اسے نیچے اتار دیا۔

ابھی بھی بہت کام باقی ہے۔ شوبھنا پھر سے کام میں لگ گئی۔ ساتھ ہی اس نے واماپد کے دفتر میں پہن جانے کے لئے کپڑے نکال کر رکھے۔ اس کے جوتے صاف کئے۔ نہانے کا پانی، تیل، صابن، تولیہ سب ایک جگہ رکھ دیئے۔

ابھی وہ کڑھائی چولھے سے اتار ہی رہی تھی کہ واماپد بازار سے لوٹ آیا۔ پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ چہرہ بھی تمتمایا ہوا تھا۔ تھیلا ایک طرف پھینک دھم سے برآمدے میں بیٹھ گیا۔ پنکھا لے کر شوبھنا اسے ہوا کرنے لگی۔ آنکھیں پھاڑ کر واماپد نے کہا۔ "جانتی بھی ہو آنے جانے میں پورے دو میل کا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔!"

شوبھنا مسکرائی۔ "ہاں تھوڑی تکلیف تو ہوتی ہے۔"

"تھوڑی! اب پھر ایک میل پیدل چل کر آفس جانا پڑے گا۔ لوٹتے وقت پھر ایک میل۔ یہاں کوئی سائیکل رکشہ تک نہیں چلتی۔ تم اسے تھوڑی سی تکلیف کہتی ہو۔ دیکھ لینا تم بھی۔ یہاں بے موت نہ مرنا پڑا تو میرا نام واماپد نہیں۔"

رادھو آ کر باپ کے گلے سے لپٹ گیا۔ اور لاڈ دکھاتے ہوئے بولا "بابا میں بھی تمھارے ساتھ آفس جاؤں گا۔"

پونے آٹھ بج گئے تھے۔ ساڑھے نو والی ٹرین سے واماپد دفتر جاتا تھا۔ شوبھنا تیزی سے باقی کام نبٹانے میں لگ گئی۔ بہت سی چیزیں تو اس گھر میں بنتی ہی نہیں۔ کیونکہ تعویذ کی وجہ سے انھیں واماپد کھا نہیں سکتا۔ سو وہ سب چیزیں صرف شوبھنا کے لئے بھی بے مصرف ہو جاتی ہیں۔

ویشنے بابو کی مہربانی سے ان کے راج مستری کام کر رہے تھے۔ چاروں طرف کی منڈیر تھوڑی تھوڑی اٹھ چکی تھی۔ آج پیچھے کی منڈیر بھی بن جائے گی۔ ایک کمرہ بھی آٹھ دس دن میں تیار ہو جائے گا۔ اس طرف بھی نظر ڈال کر شوبھنا اپنے کام میں لگ گئی۔

رادھو نے پھر کسی بات پر مچلنا شروع کر دیا تھا۔ مچھلی بھونتے ہوئے شوبھنا نے کہا۔ "میں تمھارے ساتھ رادھو کو بھی کھانے بیٹھا دوں گی۔ اسے تھوڑا سا کھلا دینا۔ میری بات تو یہ ذرا نہیں سنتا۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں، میری جگہ اب دفتر بھی تم ہی چلی جایا کرنا۔ میں سارا دن اسے سنبھالا کروں گا۔"

شوبھنا ذرا سی ہنسی۔ "ہاں یہ بھی شاید کبھی کر لوں گا۔ کچھ کام کرنا برا تو ہے نہیں۔ اس دن سے پھر کچھ نہ سوچوں گی۔"

"میں پہلے بھی جانتا تھا، اچھی طرح جانتا تھا۔ دھیرے دھیرے تمھاری صفت ظاہر ہو گی۔ دل ہی دل تم کیا چاہتی ہو، یہ کیا میں سمجھ نہیں پاتا۔؟"

شوبھنا یہ سن کر ہنس پڑی۔ "اچھا بتاؤ میں دل ہی دل میں کیا چاہتی ہوں۔؟"

واماپد منو سہلا کے چپ رہا۔ شو سبھنا نے پھر کہا۔ "دیکھو تم سے تو کچھ کہتے ڈر لگتا ہے۔ پر آج اگر آفس سے لوٹنے کے بعد راج مستری کا حساب لے کر بیٹھ سکو تو بہت اچھا ہوگا۔"

"میں؟ بس کرو، بن چکا تب تو تمھارا مکان۔ اب بلاتیں کیوں نہیں اپنے اس ماما کو جس نے تمھیں زمین خرید وا کر دی تھی۔؟ میں کہہ دیتا ہوں، وہ حساب کتاب میرے بس کا روگ نہیں۔ ہمارے تین پشتوں میں سے کسی نے راج مستری سے کام نہیں لیا۔ تم جانو، تمھارا گھر جانے۔"

شو سبھنا اب ذرا جھنجھلا سی گئی۔ "میں تو سب کروں گی ہی۔ پر را دھو دن بھر رقا مچلتا رہتا ہے۔ اسی لئے کہا تھا۔"

"اس پر بھی لڑکی کو تم نے اس کے ماما کے یہاں رکھ چھوڑا ہے۔ اسی سے اتنا برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد جب ا... دو چار ہوں گے تب مجھے بالکل نوکر ہی بنا کر رکھو گی۔"

"کیا کہا۔" شو سبھنا نے مڑ کر واماپد کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں آگ کی سی لپٹیں دہک اٹھی تھیں۔

"میں جانتا تھا، بڑی اچھی طرح جانتا تھا، تم ہماری نسل کو پھلتا پھولتا دیکھنا نہیں چاہتیں" غصے میں بڑبڑاتا واماپد وہاں سے نہانے کے لئے اٹھ گیا۔ اتنے میں گوونددہاں ہاتھ میں دو کچے ناریل لئے آ پہنچا۔

"دیدی جی، دونوں ناریلوں کا دام آٹھ آنہ باقی کے اٹھنی یہ رہی۔ جب آپ کو ضرورت ہو، مجھے کہئے گا میں لا دوں گا۔"

"ڈاکٹر صاحب کی چٹھی مل گئی تھی۔؟"

"جی ہاں! وہ لوگ اب جلد ہی آنے والے ہیں۔ اچھا دیدی جی اب میں جاؤں۔"

اچھا کہہ کر شو سبھنا نے اٹھنی اور ناریل اٹھا لئے۔ پھر زمین پوچھ کر وہاں پتی کے لئے پیڑھا بچھایا۔ گھڑی اس وقت ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ سچ ہی تو، صبح صبح اتنی دور جا کر پھر آنا اور پھر جانا، تکلیف تو ہوتی ہے۔ یہ بھی صرف تازہ مچھلی کے لئے اتنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے ورنہ ساگ بھاجی پہلے سے بھی لا کر رکھی جا سکتی ہے۔ ایک نوکر رکھنا ہی پڑے گا۔ مگر نوکر کو سلانے لائق جگہ بھی کہاں ہے۔"

نہا دھو کر واماپد را دھو کے ساتھ کھانے کے لئے بیٹھا۔ پر را دھو ایک ہی رٹ لگائے جا رہا تھا کہ میں بابا کے ساتھ آفس جاؤں گا۔ روتے روتے اچانک اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر پھینک دیا۔ تھالی میں سے چاول، آلو، بھات اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگا۔ شفیق باپ نے اس پر بھی کچھ نہ کہہ کر اسے برابر کھلانے کی کوشش کی۔ مگر جب کسی طرح کھلا نہ سکا تو کہا۔ "لگتا ہے اس کا پیٹ خراب ہونے کی وجہ سے یہ اتنا رو رہا ہے۔ روز ایک ناریل کا پانی پلانے سے ٹھیک رہے گا۔"

شو سبھنا بولی۔ "اس کا پیٹ ویٹ کچھ خراب نہیں۔ جو کچھ بھی خرابی ہے، وہ یہ ہے کہ تم اسے ڈانٹتے ڈپٹتے تک نہیں۔"

"اس کو ڈانٹوں!" واماپد نے چونک کر کہا۔ "میں چار سال کے بچے کو دھمکاؤں؟ ارے بھئی، تم وہ بات بھول گئیں جب اسے نظر لگ گئی تھی۔ اور بہت جھاڑ پھونک کروانے کے بعد ٹھیک ہوا تھا۔ ایسے ڈانٹنے سے سب ٹھیک ہو جائے گا کیا۔؟ جانتی ہو مجھے تو دس سال کی عمر تک نظر لگا کرتی تھی۔"

ترکاری اور لانے کے لئے اٹھتی ہوئی شو سبھنا بولی۔ "شاید تمھیں ابھی بھی نظر لگ جاتی ہے۔"

"کیا معلوم! اس پر بھی تم گھر میں آنگن بنوانے پر تلی ہو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ کھلی جگہ چھوٹے بچے کے لئے ٹھیک نہیں ہوتی۔ ہم لوگوں کا بہو بازار والا مکان بالکل صندوق کی طرح تھا۔ کبھی کوئی شام کو چھت پر بھی نہیں جاتا تھا۔"

شو سبھنا چپ رہی۔ ان سب باتوں سے مرعوب ہونا تو دور رہا الٹے نفرت سے اس کا دل بھر اٹھتا تھا۔!

آفس جاتے وقت ہر دن جو جھیلے سامنے آتے تھے، آج ان میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد جیسے ہی واماپد نے کپڑے بدلنے شروع کئے، رادھو نے پھر سے رونا اور پاؤں پٹکنا شروع کر دیا۔ اس لڑکے کے خون میں بھی بہو بانار کے اس خاندان کا وہم بھوت پریت کا خوف رچا بسا ہے، جیسے تعویذ اور جھاڑ پھونک کے بغیر زندہ رکھ سکنا مشکل ہے۔ یہ لڑکا بھی باہر کی طرف دیکھنا نہیں چاہتا۔ درخت کے پھول، پودے، ہوا، روشنی، ان سب سے اسے ڈر لگتا ہے۔ شوبھنا کی آنکھیں شوہر کی طرف سے لڑکے کے لئے بے پناہ نفرت سے بھر کر جل رہی تھیں۔

جب رادھو واماپد کا کوٹ پکڑ کر اور بھی زور زور سے چیخنے لگا، تب شوبھنا اسے کھینچے بغیر نہ رہ سکی۔ واماپد بگڑنے لگا۔

"دیکھو میں تمہیں سمجھا بجھا کر تھک گیا ہوں۔ کہ یہ نئی جگہ ہمیں راس نہ آئے گی۔ کیا رادھو یوں ہی بے مطلب روتا ہے۔ اسے یہاں اچھا نہیں لگتا۔ اسے اس چاروں طرف کی کھلی جگہ میں ڈر لگتا ہے۔ دوسرے وہ اپنی دادی اور بند و پھوپھی کے لئے روتا رہتا ہے جو اسے ہر وقت اٹھائے رہتی تھی۔"

"تو میں کیا اس کی کچھ نہیں لگتی۔؟"

"ماں کچھ نہیں لگتیں۔ ہم لوگوں کے خاندان میں ماں کی کوئی اہمیت نہیں۔ کوئی قیمت نہیں۔ ہم لوگوں نے کبھی ماں کو جانا ہی نہیں۔ ماں ہمارے لئے صرف ایک نہار اجن سے زیادہ کچھ نہیں۔ کیا یہاں رادھو کبھی تمہارے پاس رہتا تھا۔؟ وہ ہمیشہ اپنی دادی، پھوپھی کی گود میں رہا۔ ان ہی کو وہ اپنا سمجھتا ہے۔؟"

جانے کے وقت شوہر سے الجھنے کی خواہش شوبھنا کو نہ تھی۔ آخر وہ چپ رہی۔

باہر نکلتے ہوئے واماپد نے پھر کہا۔ "میں ابھی بھی کہہ رہا ہوں کہ اگر لڑکے کو خوش دیکھنا چاہتی ہو تو ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ اس مکان کو کرائے پر لگا دو۔ یہاں کی گرمی اسے برداشت نہ ہوگی۔ اس سے تو اچھا ہے کہ چلو، اُدھر ہی کہیں دو کمرے کرائے پر لے لیں۔ چھوٹی بہن کو بلا کر اپنے پاس رکھ لیں گے۔ وہ رادھو کو سنبھال لیا کرے گی۔"

شوبھنا ابھی تک سب کچھ چپ چاپ سن رہی تھی۔ لیکن اب چپ نہ رہ سکی۔ کڑوے انداز میں بولی۔ "کیا تم یہی چاہتے ہو کہ میں پھر اسی غار میں جا کر رہوں۔؟"

"لیکن لڑکے کی زندگی، میرا بھلا، انکی کوئی اہمیت نہیں تمہاری نظر میں۔؟"

کڑوی نظر سے رادھو کی طرف دیکھتی ہوئی شوبھنا چپ چاپ کھڑی رہی۔

آنگن میں اتر کر واماپد پھر ٹھہر گیا۔ شوبھنا کی طرف دیکھ کر مغموم لہجے میں بولا۔ "میں پہلے ہی جانتا تھا۔ میں نے اسی وقت چھوٹی ماں سے کہا تھا کہ دیکھو مالدہ ضلع کی لڑکی گھر میں لا رہی ہو، ہر سنبھل کر رہنا۔ آج اس کا نتیجہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔"

واماپد چلا گیا تو رادھو اٹھ کر باپ کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ شوبھنا چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہی۔ آج اس نے رادھو کو روکا نہیں۔ دیکھا جائے کیا ہوتا ہے۔ وہ کمرے کی کھڑکی میں سے لڑکے کی طرف دیکھتی رہی۔ دیکھا کہ ایک مستری اسے کافی دور سے پکڑ کر لا رہا ہے۔

گھر کا ابھی بہت سا کام باقی پڑا تھا۔ چپ چاپ کھڑے رہنے سے کیسے ہوگا۔ رادھو پھر اسی طرح برآمدے میں لوٹ پوٹ کر رو رہا ہے۔ شوبھنا پھر اسے چپ کرانے کے لئے آگے بڑھی۔

"رادھو، اٹھ بیٹے، چپ ہو جاؤ۔ میرا چاند سے منا نہیں روئے گا اب۔ آؤ چلو، بھات کھا لو۔ اونہہ ۔۔ بھات نہیں۔ اچھا تو بولو کیا لوگے۔؟ مان جاؤ منا۔ دیکھو میں ناریل کاٹ کر تمہیں اس کا پانی دیتی ہوں پی کر تو دیکھو کتنا میٹھا ہے۔"

کٹاری ہاتھ میں لے کر شو بھنا ناریل کاٹنے بیٹھی تو رادھو غصہ ہو کر اور بھی زور سے چلا چلا کر گلا پھاڑنے لگا۔ بہ ظاہر لڑکے کے دل میں ماں کی خدمت اور اس کی محبت کا کوئی اثر نہیں۔ ماں سے اس بچے کو نفرت ہے۔

"ارے بیٹا، کیوں اتنا روتے ہو؟ حد کر دی رونے کی تم نے۔ دیکھو تو پی کر اس کا پانی کتنا میٹھا ہے۔ تو تھوڑا سا پی لو۔"

رادھو چلایا۔ "نہیں نہیں، میں نہیں پیوں گا۔ پھینک دو اسے۔ مجھے میرے بابا کے ساتھ کیوں نہیں جانے دیا۔ میں نہیں پیوں گا۔"

شو بھنا ہنس دی۔ ابھی تک وہ کچھ ایسے ہی سوچتی سی لاجواب ہو گئی تھی۔ اچانک اس کا دھیان کٹاری کی دھار پر گیا۔ بہت تیز دھار ہے۔ اس کی نگاہ پھر رادھو پر مرکوز ہو گئی۔ ہاتھ سے دھیرے دھیرے ناریل کاٹ رہی تھی۔ کٹاری کا بینٹ بھی بہت مضبوط ہے۔ اور اس کا پھل مہاکالی کی کھڑگ کی طرح چمک رہا تھا۔ شو بھنا نے ترچھی نظر سے بہو بازار کے اس بہت قدیم خاندان کے لاڈلے کی طرف دیکھا ماں کی طرف سے کیسی ایک ذاتی نفرت رادھو کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ شو بھنا ہاتھ میں کٹاری پکڑے کھوئی کھوئی سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ناریل کا اسے خیال نہ رہا۔ اسے یہ بھی نہ یاد رہا کہ وہ کس کے لئے ناریل کاٹ رہی تھی۔ نہیں، ادھر کوئی نہیں۔ اسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ کٹاری کے تیز دھار کو پرکھ رہی تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔

دفعتاً اس کی نگاہ پھر رادھو کی نگاہ سے ٹکرائی۔ رادھو اب ذرا بھی نہیں رو رہا ہے۔ چپ چاپ بغیر ہلے ڈولے، سہمی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی اس کا رونا بند ہو گیا ہے۔ اور اس کی ساکت نگاہ شو بھنا پر ٹکی ہوئی تھی۔

کٹاری ایک طرف رکھ کر شو بھنا، جلدی سے اُٹھ کر کمرے میں جا پلنگ پر اوندھی لیٹ گئی اور لامحدود جذبے سے مغلوب ہو کر اس نے تکیے میں منھ چھپا لیا۔ اس کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔

نسیم درّانی (ایڈیٹر، پبلشر) نے انجمن پریس (پرنٹرز) سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الفاظ، بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸ سے شائع کیا

کملیشور

مترجمہ

بھرے پورے ادھورے

گھر میں موٹر سائیکل کے آنے سے ایک نئی رونق آگئی تھی۔ موٹر سائیکل کے آتے ہی سب سے پہلے بیٹھک کی کھڑکیوں پر نئے پردے پڑ گئے تھے۔ جے پرکاش بابو نے یہ ہی محسوس کیا تھا کہ رادھا اب ساڑھی تبدیل کرکے اور بال سنوار کے ہی باہر نکلنے لگی ہے۔ سبزی والا بھی آتا ہے۔ لیکن رادھا مول تول پر اس سے اتنا تکرار نہیں کرتی۔ جتنا کہ پہلے کیا کرتی تھی۔

برآمدے میں موٹر سائیکل کھڑی رہتی تو یوں معلوم ہوتا رہتا جیسے گھر میں کچھ بانکپن آگیا ہے۔ رادھا کی نظر اس بات پر بھی رہنے لگی کہ چاروں بچوں میں سے کوئی بھی ننگے پاؤں باہر نہ نکل جائے۔

کروشیئے سے اس نے بیٹھک کی میز کے لئے جالی دار ٹیبل کلاتھ بھی بن لیا تھا اور ہر روز بچوں کے اسکول جانے سے قبل ان کے جوتوں پر پالش بھی کر دیا کرتی تھی۔

جے پرکاش بابو کو اس سے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔ سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خریدلانے کے بعد سے گھر میں عجیب سا ڈھب اور ترتیب آگیا تھا۔ بچے شیر ہو گئے تھے بیوی پڑوسیوں کو گھر بنانے کی ہدایات دینے لگی تھی، اور دوسروں کے گھروں کی حالت دیکھکر اب ذرا زیادہ دکھی ہونے لگی تھی۔

پڑوس والوں کی مشین پر وہ جے پرکاش بابو کے لئے دھاری دار نائٹ سوٹ سِلا لائی تھی اور ہر رات ان کو زبردستی پہنا دیتی تھی۔ "سلیقہ تو تم نے سیکھا ہی نہیں!" رادھا بعض اوقات انھیں ڈانٹ دیتی۔ "ایسے اچھا نہیں لگتا کہ دھوتی اور بنیائن پہن کر صبح سویرے گھومنے لگو۔۔۔ صبح سویرے بھی کئی لوگ آہی جاتے ہیں۔۔۔" اور اپنے پیروں کے ناخنوں پر وہ نیل پالش بھی لگانے لگی تھی۔

جے پرکاش بابو سو کر اٹھتے اور غسل خانہ سے واپس آتے تو انھیں اسٹول پر شیو کا سامان رکھا ہوا ملنے لگا تھا۔

اور یکایک اس تبدیلی سے بعض اوقات وہ حیران سے رہ جاتے تھے۔ لیکن دل میں کہیں یہ اطمینان اور گہرا ہو جاتا کہ اب گھر کچھ اوپر اٹھ رہا ہے۔ ان کے معیار زندگی میں سدھار ہو رہا ہے۔

موٹر سائیکل کا اتنا گہرا اور براہ اہم اثر ان کے رہن سہن پر پڑ جائے گا۔ یہ انھوں نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا۔

اور پڑوسی عورتوں کے درمیان رادھا بڑے یقین اور خودداری سے کہتی "سب سے پہلی چیز تو گھر ہے! آدمی گھر بنالے تو سمجھو سب کچھ بنالیا۔ ماڈھری کے بابا کہہ رہے تھے کہ ایک کھانے کی میز اور لائیں گے۔۔ آجکل کون کھاتا ہے۔ باورچی خانہ میں بیٹھ کر۔۔۔"

جے پرکاشس بابو کو اپنا ہنستا ہوا گھر دکھائی دیتا تو بڑی خوشی سے بھر جاتے۔ یوں معلوم ہوتا جیسے رادھا میں ایک مرتبہ پھر سے آ گئی ہے۔ اُس نے بچوں کے سونے کا انتظام دوسرے کمرے میں کر دیا تھا اور دو گوشوں میں پڑی چار پائیوں کو ساتھ جوڑ کے بچھا دیا تھا جو چار پائی نیچی پڑتی تھی اُس کے نیچے اینٹیں لگا کر برابر کر لیا تھا۔ اُن دونوں چار پائیوں سے بنے ڈبل بیڈ پر جو بیس گھنٹے بستر بچھا رہتا اور جے پرکاش بابو کا نائٹ سوٹ وہ بلا ناغہ سرہانے رکھ لیتی تھی . . .

گھر میں خواہ اور کچھ نہ آیا ہو مگر موٹر سائیکل کے آ جانے سے ایک عجیب سی خوشحالی لگنے لگی تھی۔

"کچھ دنوں بعد نئی خرید لانا!"

"اور کیا اس پرانی پر کچھ اچھی طرح چلانا سیکھ جاؤں گا۔ تب تک نئی کا نمبر آ جائے گا . . ."

"ایک روز ذرا ہم کو بھی گھما لائیں۔ کتنے ماہ ہو گئے ہیں گھر سے باہر گئے ہوئے . . . ."

"اب تم اپنے جھنجھٹ سے فارغ ہو لو۔ تب گھومنے لے جایا کریں گے . . . ذرا سے کہیں جھٹکا وٹکا لگ گیا تو تکلیف میں پڑ جاؤ گی"

"یہ جھنجھٹ تم ہی لگا دیتے ہو کھسکو اُدھر . . ." رادھا بڑی محبت سے طعنہ دے کر آہستہ سے بغل میں لیٹ کر سو جاتی۔

ایک دن جے پرکاش بابو دفتر سے لوٹے تو دیر بھی ہو گئی تھی اور موٹر سائیکل بھی ساتھ نہیں تھی۔ رادھا نے دیکھا تو حیرت میں پڑ گئی۔ قبل کہ وہ کچھ پوچھے۔ جے پرکاش بابو نے کہا۔ ذرا سا تیل گرم کر دینا . . .

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"وہ سالی موٹر سائیکل سلپ ہو گئی۔ پرانی تو ہے ہی۔ پرزے چست درست نہیں ہیں۔ وہ تو کہو۔ جان بچ گئی۔ ورنہ ہڈی چور ہو جاتی . . ."

"موٹر سائیکل کہاں ہے؟"

"مرمت کے لئے ڈال آیا ہوں۔ چین سالی ٹوٹ گئی۔ اگلا پہیہ الگ ہو گیا۔ سالا دُھری سے اُڑ گیا . . ."

"بڑی خیریت ہوئی،" رادھا نے دہشت بھرے لہجہ میں کہا۔

اور رات میں جے پرکاش بابو اپنی کمر پر مالش کرواتے رہے۔

"دھمک لگ گئی ہے!" رادھا نے مالش کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"درد تو اس قدر ہو رہا ہے کہ لگتا ہے سالی ہڈی ٹوٹ گئی ہے . . ."

"تم موٹر سائیکل بیچ ڈالو . . . لینا تو اب نئی لینا۔ پرانی چیز آخر پرانی ہی ہوتی ہے۔"

اور جب میکینک نے مرمت کا خاصا خرچہ بتا دیا تو جے پرکاش بابو نے بارہ سو میں خریدی ہوئی موٹر سائیکل آٹھ سو میں بیچ دی روپیہ بینک میں جمع کرا آئے۔

"یہ تم نے اچھا کیا . . . . رادھا نے سنا تو بولی۔" اب اس روپے سے کوئی ضرورت کی چیز خرید لیں گے۔ ما دُھری ریڈیو کی لائے ہوئے ہے . . . نہ ہو تو . . ."

"نہیں! نہیں! اس میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا۔ آٹھ سو میں روپیہ جوڑتے جائیں گے۔ تب نئی موٹر سائیکل خرید لائیں گے"

لیکن چوتھے مہینے ہی جب گھر میں نیا بچہ آیا تو اخراجات یکا یک اُٹھ کھڑے ہوئے اور آٹھ سو کی رقم کم ہو کر جب پانچ سو کے آ گئی تو جے پرکاش بابو فوراً بازار جا کر ساڑھے چار سو کا ریڈیو خرید لائے۔ جو پچاس باقی بچے تھے ان سے کچھ اور چھوٹی موٹی ضرورت

کی چیزیں خریدی گئیں۔

اور تب رادھانے پڑوسنوں سے ایک دفعہ پھر کہنا شروع کیا کہ دن بھر گھر میں جی اکتا جاتا تھا۔ ریڈیو سے ذرا تنہائی دور ہو جاتی ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔ قسطوں پر نہیں۔ نقد لائے ہیں۔ یہ قسط وسط کا جھنجھٹ کون پالے بہن جی!"

دن بھر گھر میں ریڈیو چہکتا رہتا۔ جے پرکاش بابو کو اطمینان ہوتا کہ چلو یہ بھی ایک کام کی چیز آگئی۔

ثابت گو بھی گھر میں پکی دیکھ کر تو وہ حیران ہی رہ گئے کہ تب ہی رادھانے گود کی منی کو لٹاتے ہوئے فخر سے پوچھا۔ "کیسا لگا؟"

"بہت بڑھیا۔۔۔ کہاں سے سیکھا؟"

"ریڈیو پر تعلیم موسیقی کا پروگرام بھی آتا ہے۔ گھر میں ہارمونیم ہو تو مادھری سیکھ لے۔۔۔ اگلے ماہ سے ہارمونیم سکھانے کا سبق شروع کر رہے ہیں ریڈیو والے۔۔۔ مادھری کا بڑا دل چاہتا ہے سیکھنے کو۔۔۔" رادھانے آہستہ آہستہ کہا۔

"پیسے کہاں ہیں؟ جے پرکاش نے سیدھا سا جواب دیا۔ ایک پائی نہیں بچتی۔

"یہی دن ہیں اس کے سیکھنے کے۔۔۔ کل کو پرائے گھر چلی جائے گی۔"

"دیکھو۔" جے پرکاش بابو نے کہا اور ان کو یکایک لگا کہ اوپر اٹھتا ہوا گھر اچانک کہیں پر اٹک گیا ہے۔ رادھا کے ناخنوں پر پالش ہے۔ چارپائیوں کے ڈبل بیڈ بنے ہوئے ہیں۔ بچے بھی دوسرے کمرہ میں سوتے ہیں۔ نائٹ ڈریس بھی ایک آدھ روز چل جائے گی مگر کہیں کچھ ہے جو رک گیا ہے اور وہ تمام گھر کی خوشحالی کو قید کئے ہوئے ہے۔ زیادہ افسوس ان کو نہیں ہوا مگر دل میں برا ضرور لگتا رہا۔

"دیکھ رہے ہو۔ کتنے بال ٹوٹنے لگے ہیں!" اپنے بال سنوارتے ہوئے رادھانے انکو دکھلایا تھا۔ "اتنی سی چوٹی رہ گئی!" اس نے چھاتی پر بال لاکر اپنے انداز میں ناپتے ہوئے کہا تھا۔

"گھنے بھی اتنے نہیں رہ گئے" جے پرکاش بابو نے اسکی بات کی تائید میں کہا۔ "یہ یکایک کیوں جھڑنے لگے؟"

جب سے منی ہوئی ہے۔ تب ہی سے جھڑنے لگے ہیں۔۔۔ گانٹھ برابر جوڑا رہ گیا ہے!" اس نے بال لپیٹ کر چھوٹا سا جوڑا بنالیا تھا۔

ایک دن بچوں کی ہڑبونگ میں ریڈیو دھڑام سے نیچے آگرا کیبنٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ نالبس کی ڈنڈیاں بری طرح اندر گھس گئیں اور مرمت کرنے والے نے قریب ۹۰ روپے کی مرمت بتائی تو جے پرکاش بابو ہچکچا گئے۔ تنخواہ میں سے ۹۰ روپے کاٹ کر نکال دینا ممکن نہیں تھا۔ آخر سوچ سوچ کر وہ ڈھائی سو روپے لے آئے اور ان کو پھر بینک میں جمع کر دیا تھا۔

"اس میں سے اب ایک پیسہ نہیں نکالا جائے گا۔۔۔ ڈیڑھ سو اور جوڑ کے نیا ریڈیو ہی آئے گا!" انھوں نے اعلان کر دیا۔

بچے بھی خوش ہو گئے کہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔ جے پرکاش بابو کو یہ اطمینان تھا کہ گھر کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ رادھا کے پیر کے ناخنوں پر اب بھی پالش چمکتی ہے۔ بچے دوسرے کمرہ میں سوتے ہیں۔ نائٹ ڈریس ضرور پھٹ گئی ہے لیکن چارپائیاں اب بھی ڈبل بیڈ بنی ہوئی ہیں۔ صرف یہ ہوا کہ گھر اپنی جگہ پر رکا ہوا ہے۔ رہن سہن جیسے ٹھہر کے رہ گیا ہے۔

"پھر مصیبت میں ڈال دیا نا!" رادھانے جب ایک دن کہا تو جے پرکاش بابو بے خود ہو کر سنتے رہ گئے۔ انھیں خاموش دیکھکر اس نے پھر طعنہ دیا۔ کہتی تھی کہ انتظام کر لو۔۔۔ مگر نہیں۔ اب بھگتنا۔۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی شوخی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"یہ تو تم کو خیال رکھنا چاہیئے۔۔۔"

"یہ خوب رہی!"

"بڑی مشکل ہو جائے گی۔۔۔" جے پرکاش بابو نے کہا۔

"پڑوس والی بہن جی کو بھی ضرورت پڑ گئی تھی۔ خطرہ بھی کوئی نہیں ہوا۔ اسّی روپے میں ایک عیسائی نرس ہے۔ وہ کر دیتی ہے۔"
"دکھا دو۔" جے پرکاش بابو نے بہت آسانی سے کہا اور خاموش بیٹھ گئے۔
اگلے ہفتے ہی انھیں بینک سے سو روپے لانا پڑا اور سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔
اور باقی بچے ہوئے روپیوں میں سے ایک سو بیس کا جب ہارمونیم لا کر انھوں نے مادھری کے سامنے رکھ دیا تو رادھا بہت خوش ہوئی۔ "چلو۔ پیسہ ضرورت کی چیز میں لگ گیا۔۔۔ مادھری کا بہت دل چاہتا تھا۔۔۔"
جے پرکاش بابو کو بھی خوشی ہوئی اور باقی بچے ہوئے تیس روپیوں کی وہ چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں خرید لائے۔
وہ ہارمونیم بہت دن بجتا رہا۔ لیکن جب مادھری کا شوق ختم ہو گیا تو اُسے لپیٹ کر میز کے نیچے رکھ دیا گیا۔
کئی ہفتوں بعد ایک دن مادھری نے پھر آواز کی سادھنا شروع کرنا چاہی تو دیکھا کہ اُسکی دھونکنی کی کھال چوہوں نے کاٹ ڈالی ہے۔ لکڑی بھی وہ جگہ جگہ سے کُتر گئے تھے۔
"مادھری کے لئے کچھ سوچا؟" ایک روز رادھا نے کہا تو جے پرکاش بابو نے تھوڑی فکر سے اُسے دیکھا۔
"دیکھا تو ہے ایک آدھ جگہ۔" انھوں نے کہا۔
"میں آج دوپہر ادھر بازار گئی تھی تو گوا جی ملی تھیں ایک لڑکا بتایا ہے انھوں نے۔۔۔" رادھا بولی۔
"اچھا۔۔۔ دیکھ لیں گے۔"
"اور سنو۔ یہ ہارمونیم بیچ دو۔ مادھری بجاتی وجاتی بھی نہیں۔ بس پڑا ہے۔۔ بغیر باجا ماسٹر کے سیکھے بھی تو کیسے۔ کیوں؟"
"کتنے روپے مل جائیں گے۔۔۔ پڑا رہنے دو۔۔" انھوں نے کہا۔
"کیا فائدہ؟"
"اچھا"
اور تیسرے چوتھے روز جے پرکاش بابو ہارمونیم لیکر گئے اور ستر روپے لے کر لوٹ آئے۔ روپے لا کر انھوں نے رامائن میں رکھ دیئے اور بولے۔ "اس میں سے کوئی خرچ مت کرنا سمجھیں۔۔۔ ضرورت کے لئے پڑے رہیں گے۔۔۔"
"ہاں۔۔۔ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں آ ہی جاتی ہیں!" رادھا نے کہا۔ "چار پیسے پاس ہوں تو اچھا ہی ہے۔"
اُنھوں نے غور سے رادھا کو دیکھا۔ اُسکے ناخنوں پر پالش چمک رہی تھی۔ بچے دوسرے کمرے میں ہی سوتے ہیں۔ نائٹ ڈریس کے ٹکڑے گھر میں صفائی کے کام آ رہے ہیں۔ چارپائیاں ویسی ہی ڈبل بیڈ بنی ہوئی ہیں۔
"کل میں ذرا اُون خرید لاؤں؟" کئی روز بعد رادھا نے کہا تھا۔ اس میں سے لے لوں۔ یہ بھی تو ضروری ہی ہے۔۔ منّے کے پاس سوئٹر کہاں ہے!" اپنے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے رادھا نے پھر افسوس سے اپنے جوڑے کو دیکھا اور خاموش ہو گئی۔
"تمھارے بال واقعی بہت گر گئے ہیں۔۔۔" جے پرکاش بابو نے بڑی محبت سے کہا۔
"شادی کے وقت گھر بھر میں سب سے لمبے بال تھے ہمارے۔۔۔" رادھا بولی۔
"وقت کتنی جلدی گزرتا جاتا ہے۔" جے پرکاش بابو نے حسرت سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"تمھارے بال بھی تو بہت سفید ہو گئے ہیں۔۔۔" رادھا بولی۔
"عمر کا تقاضہ ہے۔"

"اتنی ابھی کہاں سے ہو گئی ہے.. تم سے زیادہ عمر والوں کے سیاہ کالے بال رکھے ہوئے ہیں"
"تمھیں آنولے کے تیل سے کچھ فائدہ ہوا؟" جے پرکاش بابو نے پوچھا۔
"کچھ بھی تو نہیں ہوا..." رادھا کی آواز میں ہلکی سی مایوسی تھی۔
"اور کوئی تیل استعمال کر کے دیکھو..."
"کچھ ہوگا نہیں... تیئس نمبر والی ہیں نا.. گپتا جی کے گھر میں... وہ سب استعمال کر کے دیکھ چکی ہیں..."
"اُنکے بال تو بہت اچھے ہیں..."
"نقلی لگاتی ہیں..."
"اُون خریدنے جانا تو تم بھی لیتے آنا.."
"میں نہیں لاتی۔ مُردہ عورتوں کے ہونگے۔ کون جانے..."
"ارے نہیں بھئی۔ نائیلون کے بھی ہوتے ہیں۔ اِس میں کیا بات ہے۔
سمجھیں.. لیتی آنا.. تم کو جوڑا اچھا لگتا ہے۔ بال یا دانت خراب ہو جائیں تو آدمی کس قدر بوڑھا لگنے لگتا ہے..."
اور دوسرے ہی دن رادھا بازار جا کر تین بچوں کے لئے ۵۴ روپے کی اُون خرید لائی۔ گھر لوٹی تو جے پرکاش بابو چارپائی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔
"ٹھیک ہے!" اُون دکھاتے ہوئے رادھا نے پوچھا۔
"اچھے رنگ ہیں!" جے پرکاش بابو بولے۔ "یہ تو ہم نے دیکھا ہی نہیں تھا۔
"اچھا لگتا ہے؟" رادھا نے اپنے بھرے جوڑے میں پنوں کو دباتے ہوئے کہا۔
"تم تو بدل ہی گئیں" اُنکی آنکھوں میں محبت کی مدھم سی لو چمک اُٹھی تھی۔
"سولہ روپے بچ گئے تھے۔ بلسوران سے ایک یہ لیتی آئی ہوں" یہ کہتے ہوئے رادھا نے ایک پیکٹ جے پرکاش کے ہاتھ میں تھما دیا۔
سوچا کہ کوئی ضرورت کی ہی چیز لیتی چلوں... ورنہ یہ سولہ بھی یوں ہی اُٹھ جاتے۔"
"ہے کیا؟"
"دیکھ لینا"
"ارے یہ تو خضاب ہے!" ڈبہ کھول کر شیشی دیکھتے ہوئے جے پرکاش بولے۔ "اس سے کہیں پوری طرح بال کالے ہوتے ہیں؟ ہمیشہ کالے تھوڑا رہتے ہیں"
"بار بار لگانے سے ہو جاتے ہیں" رادھا بولی۔ "لاؤ۔ رکھ آؤں۔ کل چھٹی ہے۔ لگا لینا"
"سب خرچ کر آئیں؟"
"سات روپے بچے ہیں... پانچ سات دن تو نکل جائیں گے۔ مہینہ بھی ختم ہونے والا ہے۔ اور اب فی الحال کوئی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں ہے۔ چل جائے گا.." کہتی ہوئی رادھا اُون اور خضاب کی شیشی لیتی ہوئی اندر چلی گئی۔
جے پرکاش اُسے غور سے دیکھتے رہے... ناخنوں پر پالش ہے۔ کمرہ میں چارپائیاں بھی ڈبل بیڈ بنی ہوئی ہیں۔ بچے دوسرے کمرہ میں سوتے ہیں... گھر بھی جیسوں کا توں ہے۔ تب ہی انھیں یکایک خیال آیا اور وہیں سے بولے۔ "سنتی ہو۔ وہ تصویر کے پیچھے رکھ دینا..."

ڈونلڈ برتھیلم

ہرچرن چاولہ

تشریح

سوال :۔ کیا تم یقین کرتے ہو کہ یہ مشین   بدلنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے؟

جواب :۔ حکومت بدلنے میں ......

س :۔ اسے لوگوں کی ضرورتوں کے مطابق زیادہ زودعمل بنانے کے لئے؟

ج :۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے۔ یہ کرتی کیا ہے؟

س :۔ اچھا۔ اسے دیکھو۔

ج :۔ یہ کوئی اشارے پیش نہیں کرتی۔

س :۔ اس میں کچھ ..... اعتدال ہے۔

ج :۔ پتہ نہیں یہ کرتی کیا ہے

س :۔ مشین میں وشواس کی کمی!

س :۔ کیا ناول مر چکا ہے؟

ج :۔ جی ہاں۔ تقریباً بالکل۔

س :۔ اس کی جگہ کس چیز نے لی؟

ج :۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے آنے سے پہلے جو کچھ تھا اُسی نے اُس کی جگہ لے لی ہے۔

س :۔ وہی چیز؟

ج :۔ کچھ ویسی ہی۔

س :۔ کیا بائیسکل بھی مر چکا ہے؟ تم مشین پر بھروسہ نہیں رکھتے؟

ج :۔ کیوں رکھوں؟

س :۔ (مشینوں میں اپنی دلچسپی کی کمی بیان کرتا ہے۔)

س:۔ کتنا خوبصورت سے مؤثر ہے۔

ج:۔ شکر یہ! میں مشینوں کے متعلق زیادہ فکر نہیں کرنا نہیں چاہتا۔

س:۔ تم کس چیز کے متعلق فکرمند ہو؟"

ج:۔ میں کنارے پر بتی بدلنے کے انتظار میں کھڑا تھا۔ جب میں نے دوسرے لوگوں کے بیچ ایک بہت ہی خوبصورت لڑکی کو بتی بدلنے کا منتظر دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہماری نظریں ملیں۔ میں نے نظریں گھمالیں۔ میں نے دوبارہ دیکھا تو دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور بتی بدل گئی۔ وہ ایک گلی میں مڑی تو میں بھی اُدھر مڑ گیا۔ پہلے ایک بار پھر اُسے میں نے دیکھا یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا وہ ابھی بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ میری طرف متوجہ ضرور تھی۔ میں نے سوچا میں مسکراؤں میں ہنسا مگر عجیب انداز سے۔ مسکراہٹ ایسی ہونی چاہیئے جس سے پتہ چلے جیسے میں اس میں دلچسپی لے رہا ہوں، لیکن یہ بھی کہ میں حالات کے عجیب ہونے سے بھی باخبر ہوں۔ میں بڑے اناڑی پن سے حماقت بھری ہنسی ہنسا۔ مجھے تو ایسی احمقانہ ہنسی سے ہی چڑ ہے۔ تم جانو۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہم ایک دوسرے کے قریب سے گذرے۔ میں نے تہیّہ کر لیا کہ اُسی پل سیدھا اس کی نظروں سے نظریں ملا دوں گا۔ میں نے کوشش کی مگر وہ ذرا میری بائیں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ چودہ انچ میری آنکھوں کے بائیں جانب دیکھ رہی تھی۔

س:۔ یہ ایسی چیز ہے کہ ـــ

ج:۔ میں ایک بار پھر جا کر کوشش کرنا چاہتا ہوں۔

س:۔ اب جبکہ تم اسے کچھ دیر دیکھتے رہے ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ کیسے کام کرتی ہے؟

ج:۔ یقیناً (تشریح)

س: کیا وہ ابھی تک اپنا بلاؤز اُتار رہی ہے؟

ج:۔ ہاں۔ ابھی تک۔

س:۔ کیا تم اپنی تصویر میرے ساتھ کھنچوانا پسند کرتے ہو؟

ج:۔ مجھے اپنی تصویر بنوانا پسند نہیں۔

س: کیا تمھارا خیال ہے کہ انسان مستقبل میں کسی نقطے پر جنسی آسودگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مکمل جنسی آسودگی جیسے کوئی گولی کھا کر؟

ج: میرا خیال ہے یہ ناممکن ہے۔

س:۔ تمہیں یہ خیال پسند نہیں؟

ج:۔ نہیں۔ میں سمجھتا ہوں ان حالات میں ہمارا علم کم ہو گا۔ اس سے بھی جتنا ہم اب جانتے ہیں۔

س: ایک دوسرے کے متعلق کم علم ہو گا۔

ج: بالکل:

س: اس میں خوبصورتیاں ہیں۔

ج:۔ مشین:

س:۔ ہاں۔ ہم یہ مشین اس لئے نہیں بناتے کہ وہ وہ 'کچھ' کریں جس کے لئے وہ بنائی گئی ہیں۔ اسی وقت گورنمنٹ کو بدل ڈالیں۔

بلکہ ہم مشین کا ذہن اس طرح مشاہدہ کرتے ہیں ۔ ایک شاپنگ سنٹر کی طرح دیکھتے ہوئے۔

ج۔ ہمیں کامیابی کی تاریخ سے جدوجہد کرنی آتی ہے۔

س:۔ جس نے تمہیں کہیں کا نہیں رکھا۔

ج۔ (دلاسہ دیتا ہے)

س:۔ پھر تم نے کیا کیا؟

ج:۔ میں درخت پر چلتا گیا۔ بیس قدم۔

س۔ کس قسم کا درخت؟

ج:۔ ایک مردہ درخت۔ میں ایک سے دوسرا نہیں بتا سکتا۔ وہ شاہ بلوط کا درخت ہوگا۔ میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا

س۔ کیا کتاب تھی؟

ج۔ میں نہیں جانتا۔ میں ایک سے دوسری نہیں بتا سکتا۔ وہ فلموں کی طرح نہیں ہوتیں۔ فلمیں یاد رہتی ہیں۔ کم از کم اس حد تک اداکار کون کون تھے؟

س۔ وہ کیا کر رہی تھی؟

ج:۔ اپنا بلاؤز اتار رہی تھی۔ سیب کھا رہی تھی۔

س:۔ درخت کافی بڑا ہوگا۔

ج:۔ درخت کافی بڑا ہوگا۔

س:۔ وہ کہاں تھا۔

ج: سمندر کے پاس۔ میں نے رسی کے تلوے والے جوتے پہنے ہوئے تھے۔

س: میرے پاس کئی غلط پیام ہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم ان کا بغور مطالعہ کرو۔ ان پر نمبر لگے ہوئے ہیں۔ میں انہیں تمہارے ساتھ دیکھ سکتا ہوں ۔ غیر معین مختلف ۔ کرنے والوں کا نامکمل سلسلہ..... درجہ وار ترتیب کا نامناسب استعمال غیر حاضر کام کرنے والے..... ملا جلا طریقۂ کار۔ وہ اس کا خاص طور پر قابلِ غور..... ایک طے شدہ نقطے کے فرض منصبی کی منطق..... ناموزوں طے شدہ نقطے کا رُخ.....ناموزوں نقطے پر ثابت قدمی.....چھوٹے سے پروگرام میں ڈالا ہوا نامکمل کردار، وہ ایک کیٹیلہے ۔ بنا اختتامِ بیان

ج۔ میں انہیں بہت پسند کرتا ہوں۔

س:۔ اور بھی سینکڑوں ہیں ۔ سینکڑوں اور سینکڑوں۔

ج۔ تم بالکل حساس نہیں لگتے۔

س: یہ سچ نہیں ہے۔

ج: تمہارے احساسات کس طرف..... ہیں۔ اگر میں اس طرح سے پوچھوں؟

س: تم دیکھتے ہو وہ کیا کر رہی ہے؟

ج: بلاؤز اتار رہی ہے۔

س۔: وہ کیسی لگتی ہے؟

ج۔ ...... اپنے آپ میں ڈوبی ہوئی۔
س۔ کیا تم سوال و جواب کے طریقے سے اکتا گئے ہو؟
ج۔ میں اس سے اُکتا گیا ہوں، مگر میں جانتا ہوں کہ اس سے کافی بیش قیمت فروگذاشت بھی نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ کیسا ہے یہ ــــ
ہمیں نے کیا پہن رکھا ہے ــ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ یہ کافی قابل غور فائدہ ہے۔ میں کہوں گا۔
س۔ یہ ٹھیک ہے۔

س۔ وہ گاتی رہی ہم سنتے رہے۔
ج۔ میں ایک سیاح سے باتیں کر رہا تھا۔
س، ان کی کرسی یہاں ہے۔
ج: میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ بند تھا۔
س: سپاہیوں نے قلعے کی طرف مارچ کیا۔
ج، میرے پاس ایک گھڑی تھی۔
س: اس نے مجھے مارا۔
ج، میں نے اُسے مارا۔
س،۔ ان کی کرسی یہاں ہے۔
ج،۔ ہمیں دریا کو عبور نہیں کرنا چاہیئے۔
س،۔ کشتیاں پانی سے بھری ہوئی ہیں۔
ج: اُس کا باپ اُسے مارے گا۔
س: اپنی جیبیں پھل سے بھر رہا ہے۔

س:۔ چہرہ .... مشین کا ایک چہرہ ہے۔ یہ کاٹھی ادھر.....
ج: وہ ؟
س: بالکل جیسے انسانی چہرے کی تکمیل ہوئی .... مچھلی سے... یہ قابلِ تلاش ہے' سے 'جیسے' ..... پہلا منہ جیسے مچھلی کا سا تھا۔ میں نام یاد نہیں کر سکتا۔ وہ لاطینی نام ..... لیکن ایک منہ ــ نہ صرف منہ بلکہ اور بھی کچھ۔ صرف منہ چہرہ تو نہیں ہوتا ــ پھر یہ گھڑیالی تک ہوتا رہا۔
ج: گھڑیال تک....
س: .... سانپوں تک....
ج: ہاں۔

س: چہرے کے تین خاص کام ہیں۔ مطلوبہ طاقت کے ذرائع کو ڈوکنا۔ لوکوموٹر مشینری کو اس کی منزل کی طرف لے جانا اور گرفت۔

ج: ہاں۔

س: گرفت اور کھانا پکانے کی ابتدائی تیاری۔ کیا یہ بھی.....

س: چہرہ۔ ایک چہرہ۔ حصّوں کے جوڑ ملانے میں ایک کشش کا کام بھی کرتا ہے۔ کھلا۔ آگے بڑھی، ستواں ناک۔

ج: مجھے یہ کاٹھی پر تو نظر نہیں آتا۔

س: اسے دیکھو۔

ج: نہیں۔

س: اس میں ایک تناسب ہے۔ مانو چاہے نہ۔ مگر.....

ہم صنعتی نقاشوں کو سامنے کے حصے بنانے کیلئے استعمال کرتے ہیں اور کنٹرول کرنے کے لئے۔ نقاش اور فن کار، امکانی گاہکو کے لئے مشینوں کو دلکش بنانے کے لئے۔ خالص خوشبویات کی طرح۔ ہمیں بتایا گیا کہ چاقو قسم کے سوئچ مذکر ہیں، مرد لوگوں نے محسوس کیا... تو ہم نے چاقو قسم کے بہت سارے سوئچ استعمال کئے.....

ج: میں جانتا ہوں کہ اس معاملے پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر میں جب اس قسم کے خط میں دیکھتا ہوں۔ رسالوں اور اخبارات میں تو میں انھیں نہیں پڑھتا، مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

س: تمہاری دلچسپیاں کیا ہیں؟

ج: میں شو مان فیسٹیول کا ڈائریکٹر ہوں۔

س: وہ اب کیا کر رہی ہے؟

ج: اپنی جینز اتار رہی ہے۔

س: کیا اس نے اپنا بلاؤز اتار دیا ہے؟

ج: نہیں وہ اسے ابھی تک پہنے ہوئے ہے۔

س: پیلا بلاؤز؟

ج: نیلا۔

س: اچھا اب وہ کیا کر رہی ہے؟

ج: جینز اتار رہی ہے۔

س: اس نے نیچے کیا پہن رکھا ہے؟

ج: پینٹس۔ پینٹی ز۔

س: مگر اس نے بلاؤز تو پہنا ہوا ہے۔
ج: ہاں۔
س: کیا اس نے اپنی بینٹی ز اتار دی ہیں؟
ج: ہاں۔
س: بلاؤز ابھی پہنا ہوا ہے۔
ج: ہاں۔ وہ ایک لٹھ کے پاس چل رہی ہے۔
س: بلاؤز میں۔ کیا وہ کتاب پڑھ رہی ہے؟
ج: نہیں۔ اس نے سن گلاسز لگا رکھے ہیں۔
س: وہ سن گلاسز لگائے ہوئے ہے؛
ج: ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔
س: کیسی لگتی ہے وہ ؟
س: ماڈازم کا نفس مضمون کیا ہے؟
ج۔ ماڈازم کا نفسِ مضمونِ خلوص ہے
س:۔ کیا خلوص ممکن المتعین ہے۔
ج: خلوص کبھی متعین نہیں کیا جا سکتا۔
س:۔ ساری دنیا میں خلوص کا حلقہ اثر کیا ہے؟
ج: خلوص تمام معاملات میں ۱۰۰ فی صد دا قع ہوتا ہے۔
س: خلوص اپنی پاک حالت میں کس سے ہم آہنگ ہے۔
ج:۔ پاک اور پوتر حالت میں خلوص اکثر دیوانگی سے ہم آہنگ ہے۔
س: یہ دیوانہ پن کو بدنام کرنے کے لئے نہیں ہے۔
ج: یہ دیوانہ پن کو بدنام کرنے کے لئے نہیں ہے۔ دیوانگی اپنی پوترتا میں سوچنے کے سیدھے انداز کا بدل ہے۔
س: سوچنے کے سیدھے انداز کا مضمون کیا ہے؟
ج: سوچنے کا سیدھا انداز پُر تاثیر ہے۔
س: اور تاثیر کا مضمون؟
ج: تاثیر کا مضمون پھر وہی خلوص ہے۔
س: کیا خلوص قابلِ متعین ہے؟۔
ج: خلوص قابلِ متعین نہیں ہے یہ بڑھایا بھی نہیں جا سکتا۔
س:۔ اثر دوسرے اثرات سے کیسے محفوظ کیا جا سکتا ہے؟
ج: تاثیر ہمارے چنیدہ اثرات کے ذریعہ محفوظ رہتی ہے۔ اُن کے سروں کی چربی ہیں۔

س :۔ اس بات پر کہ مشین بالکل کامیاب ہے بحث کرنے میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن اس میں کچھ صفات ضرور ہیں
میں ان مشینوں سے متعلق تشبیہی زبان استعمال نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن ایک گن ان میں ہے ....

ج : کیا ؟

س : یہ دلیر ہے ۔

ج : مشینیں فن سے زیادہ دلیر ہوتی ہیں ۔

س : جب سے بائیسکل کی موت ہوئی ہے

س : مشین کو چلانے کے دس قوانین ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ اسے چلادو۔

ج : چلادو ؟

س : دوسرا قانون ہے حدوں کو تبدیل کرنا۔ تیسرا قانون ہے کام میں لگی اشیاء کو گردش میں رکھنا ۔ چوتھا قانون ہے۔ تم نے ایک بڑی سخت غلطی کی ہے ۔

ج : میں نے کیا کیا ہے ؟

س : تم نے غلطی کا پیغام بالکل مناسب اور برمحل بھیجا ہے ۔

ج : میں یہ قوانین نہیں یاد رکھ پاؤں گا۔

س : میں انھیں سو بار دہراؤں گا ۔

ج : میں پہلے بہت خوش تھا ۔

س : تم نے ایسا سوچ لیا ہے۔

ج : نتیجہ حقیقت نہیں ہے ۔

س : نتیجے اس لئے سچ نہیں لگتے کیونکہ وہ چھوئے جا سکتے ہیں ۔ یہاں اٹھائے گئے معاملات ہم نتیجہ ہیں ۔
وجوہات اور نتائج قائم ہیں اگرچہ وہ یہاں موجود نہیں۔ وجوہات اور نتائج ہوا میں موجود ہیں اور وہ لوگ بھی انھیں بڑی آسانی سے ملاحظہ کرسکتے ہیں جن کے پاس اتنی بھی فرصت نہیں کہ خاص اصولوں کی اشاعت کو پڑھ سکیں یا ملاحظہ کرسکیں۔

ج : تو حالت مشکلات سے پٹی پڑی ہے ۔

س :۔ حالت مشکلات سے پٹی پڑی ہے لیکن آخر نوجوان لوگ اور کام کرنے والے ایک ہی سطح پر رہیں گے جیسے پرانے لوگ اور سرکاری ملازمین تمام لوگوں کی آپسی بہتری کے لئے ۔ عوام کا اصول زیادہ تعداد کے لوگوں کے قانون سے پیچھے چلنے میں پوشیدہ ہے اس سے خاص قسم کے اور ڈھنگ ڈھنگ کے واقعات ظہور پذیر ہونے ممکن ہوسکتے ہیں جو کہ ـــ

ج : پھر میں نے اُسے بلایا اور اسے بتایا کہ مجھے اُسی کے خواب آتے ہیں ۔ کہ وہ خواب میں برہنہ تھی اور ہم محبت میں گم تھے ۔ اس نے کہا کہ وہ نہیں چاہتی کہ اس کے خواب لئے جائیں ۔ نہ اب ' نہ بعد میں ' نہ کبھی ۔ میں کب خواب لینے چھوڑ دوں گا ۔ میں نے کہا یہ ایسی چیز ہے جس پر میرا کوئی زور نہیں ۔ وہ بولی اب کافی زمانہ ہوگیا ۔ اب وہ ولیم سے شادی شدہ ہے ' جیسا کہ میں جانتا ہوں اور وہ نہیں چاہتی ..... اس قسم کا دھاوا ـــ ولیم کا سوچو وہ بولی ۔

س: اُس نے مجھے مارا ہے۔
ج: میں نے اسے مارا ہے۔
س: ہم نے انھیں دیکھا ہے۔
ج: میں کھڑکی کو دیکھ رہا تھا۔
س: کرسی یہاں ہے۔
ج: اُس نے گایا اور ہم نے اُسے سُنا۔
س: سپاہی قلعے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔
ج: میں نے ایک سیاح سے بات کی۔
س: میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔
ج: ہمیں دریا کو عبور نہیں کرنا چاہیئے۔
س: دریا نے کشتیوں میں پانی بھر دیا ہے۔
ج: میرا خیال ہے میں نے اسے اپنے چچا کے ساتھ دیکھا ہے۔
س: اپنی موٹر کار میں گھستے ہوئے' میں نے انھیں سُنا۔
ج: وہ اُسے پیٹے گا اگر وہ اسے گم کر بیٹھا ہے۔
ج: (نتیجتاً) میرے دل میں کوئی شک نہیں ہے کہ بال (گیند) سے کھیلنے والے آج پہلے سے کہیں زیادہ ہیں۔ وہ کامیاب کھلاڑی ہیں۔ انتہائی اچھی طرح تربیت شدہ، ہر محکمے میں بے انتہا۔ گیند کھیلنے والے آج اتنے شاندار ہیں کہ سکور کرنا نسبتاً ایک عام سی بات ہو کر رہ گیا ہے۔
س: مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ۔

س.... تمہیں اپنی بیٹی کی فوٹو دکھاؤں
ج: بہت خوب
س: میں تمہیں مزید پڑھنے کے لئے کچھ حوالے دے سکتا ہوں۔
ج: ناک میں سے خون بہنے لگتا ہے۔
س: وہ اب کیا کر رہی ہے؟
ج: اس کی ران پر ایک خراش ہے۔ دائیں پر۔

ہرمن ہیس
محمد اسحاق میر

نروان

عنفوان شباب سے چینی شاعر ہان فوک کے دل میں صرف ایک ہی لگن تھی وہ شاعری میں کمال حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تک وہ دریائے زرد کے کنارے آبائی شہر میں رہتا تھا ہان فوک کی خواہش پر اس کے شفیق والدین کوشش کر کے اس کے لئے ایک معزز گھرانے کی لڑکی کا رشتہ بھی حاصل کر چکے تھے۔ منگنی کی رسم ادا ہو چکی تھی اور اب صرف شادی کا دن مقرر کرنا باقی رہ گیا تھا۔ ہان فوک کی عمر بیس سال تھی فطرت نے اس کو مردانہ حسن اور شرافت سے بھی نوازا تھا۔ نوجوانی ہی میں اس کے کلام کا ہر طرف شہرہ تھا۔ مروجہ علوم سے بھی بہرہ ور ہو چکا تھا۔ وہ دولت مند تو نہ تھا۔ مگر خوشحالی اس کا مقدر بن چکی تھی اس کے والد کی معقول جائیداد تھی اور اس کے علاوہ اس کی منگیتر بے حد حسین اور کم سن تھی بظاہر خدا نے ہان فوک کو ہر نعمت سے نوازا تھا۔ مگر ہان فوک کے دل میں خلش سی تھی۔ وہ مثالی شاعر بننے کے جنون میں مبتلا تھا۔

ایک شام دریا کے کنارے سالانہ میلہ چراغاں منایا جا رہا تھا۔ لیکن ہان فوک دریا کے دوسرے کنارے پر ٹہل رہا تھا۔ وہ ستانے کیلئے ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا یہ درخت دریا کی سطح کی جانب جھکا ہوا تھا۔ پانی میں ہزاروں روشنیاں جل رہی تھیں۔ ہر طرف کشتیاں ناچ رہی تھیں۔ عورتیں لڑکے اور لڑکیاں خوشیاں منا رہے تھے پانی کے بہاؤ سے ایک لطیف سرسراہٹ کی آواز پیدا ہو رہی تھی ساری فضا نغموں اور موسیقی سے معمور تھی اور اس منظر پر نیلگوں رات کسی قصبے کی گنبد کی طرح سایہ فگن تھی۔

ایک طرف لوگ رنگ رلیوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف ہان فوک اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اپنے دوستوں اور منگیتر کے ساتھ میلہ چراغاں منانے سے کہیں زیادہ تنہائی کو پسند کرتا تھا۔ وہ ان ساری رعنائیوں کو جذب کر کے اپنے تاثرات کو شعروں کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ نیلگوں رات، سطح آب پر روشنیوں کا دلفریب رقص انسانی مسرتیں دور ایک تنہائی پسند شاعر کے جذبات جو صرف دور سے سیر منظر کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

ہان فوک نے محسوس کیا کہ عالم رنگ و بو کی ساری رعنائیاں اسے اطمینان قلب کی نعمت غیر مترقبہ سے نہیں نواز سکتیں۔ کیونکہ وہ دنیا کے ہنگاموں اور میلے ٹھیلوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور اجنبی محسوس کرتا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کا دل مغموم ہو گیا۔ لیکن یہ سلسلہ خیال نہ ٹوٹ سکا وہ دنیا کے سارے حسن کو اپنے شعروں میں سمو کر اس لازوال آرٹ کا حقیقی وارث بننا چاہتا تھا۔ جب تک وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر لے اس کے دل کو کبھی اطمینان نصیب نہ ہو سکے گا۔

اسی ادھیڑ بن میں ہان فوک پر بیداری اور خواب کی درمیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے کسی کے پاؤں کی چاپ سنی سر اٹھایا تو ایک

عمر رسیدہ بزرگ کو کھڑے پایا وہ ارغوانی رنگ کی قبا پہنے ہوئے تھے اور ان کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ ہان فوک نے گھبرا کر مودّبانہ انداز میں سلام کیا۔ اس پر بزرگ نے مسکرا کر چند شعر پڑھے ان شعروں میں ہان فوک کی قلبی واردات کی ترجمانی کی گئی تھی۔ بڑے خوبصورت اور ساحرانہ انداز میں کہ ہان فوک کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

"جناب آپ کون ہیں؟" ہان فوک نے تعظیماً جھک کر پوچھا۔ "آپ مجھے بہت بڑے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اتنے حسین شعر تو میں نے آج تک نہیں سنے حالانکہ سارے اساتذہ کا کلام مجھے تقریباً ازبر ہے۔"

وہ بزرگ مسکرائے لیکن ان کی مسکراہٹ میں ایک عجیب وقار تھا۔ اگر تم شاعری میں کمال حاصل کرنا چاہو تو میرے پاس آسکتے ہو۔ میں ان شمالی پہاڑیوں میں رہتا ہوں۔ عین اس چشمے کے قریب جس سے یہ دریا نکلتا ہے۔ میرا نام تادرا لکلام ہے۔" یہ کہہ کر وہ بزرگ درخت کے سائے میں غائب ہو گئے۔ ہان فوک نے بعد میں انھیں بہت ڈھونڈا مگر کہیں نہ پایا۔ اس نے سوچا شاید تھکاوٹ کی وجہ سے اس پر غنودگی طاری تھی۔ اور یہ نظارے درحقیقت اس نے عالم خواب میں دیکھے تھے۔

چند دنوں کے بعد جب ہان فوک کے والد نے شادی کی تاریخ مقرر کرنے کیلئے عزیزوں اور دوستوں کو بلانا چاہا تو ہان فوک نے خلاف توقع اس تجویز کی بھرپور مخالفت کی۔

"یہ بات آپ پر اچھی طرح واضح ہے کہ مجھے شاعری سے عشق ہے اور میں اس فن میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میرا کلام کافی مقبول ہو چکا ہے لیکن میں ابھی اپنے آپ کو مبتدی ہی سمجھتا ہوں۔ مجھے مشق سخن کیلئے کافی وقت چاہیئے اگر آپ نے مجھے ابھی سے گرہستی کے چکر میں ڈال دیا تو میں پھر میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ اور میری ساری امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔"

باپ بیٹے کی یہ باتیں سن کر بہت حیران ہوا۔

پھر اس کے بعد اس نے اپنے باپ کو اپنا خواب سنایا جو اس نے میلہ کھا غاں کی شام کو دریا کے کنارے پر دیکھا تھا۔ اس نے باپ کو بتایا کہ میں ان بزرگ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔

"ٹھیک ہے" باپ نے رضامند ہو کر کہا۔ "میں تمہیں اس کام کیلئے ایک سال کی مہلت دیتا ہوں۔ اس عرصے میں تم اپنے خواب پر عمل کر سکتے ہو ہو سکتا ہے اس خواب کے پیچھے دست غیب کارفرما ہو۔"

"ممکن ہے مجھے اس کام میں دو سال لگ جائیں۔" ہان فوک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میں اس بارے میں ابھی قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

باپ نے بادل نخواستہ بیٹے کی بات مان لی۔ ہان فوک نے فوراً اپنی منگیتر کے نام ایک خط لکھا۔ والد سے سفر کی اجازت مانگی اور اپنی منزل کی تلاش میں چل پڑا۔

طویل مسافت طے کرنے کے بعد وہ اس چشمے پر پہنچا جہاں سے دریا نکلتا تھا۔ قریب ہی اسے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جس کے سامنے وہی بزرگ ایک چٹائی پر بیٹھے ستار بجا رہے تھے۔ بزرگ نے ہان فوک کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ مگر خاموش رہے۔ البتہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر آگئی اور انگلیاں بدستور تاروں پر کھیلتی رہیں۔ بے خودی کے عالم میں ہان فوک چلتے چلتے رک گیا۔ بزرگ نے ستار چٹائی پر رکھا اور جھونپڑی کے اندر چلے گئے ہان فوک نے بھی استاد کی پیروی کی اور یوں وہ ان بزرگ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔

ایک ماہ کے بعد ہان فوک کو خود اپنے کلام سے نفرت ہو گئی۔ وہ اپنے سارے اشعار بھول گیا تھوڑے دنوں بعد اساتذہ کا وہ کلام بھی جو اس نے حفظ کر رکھا تھا حرف غلط کی طرح اس کے ذہن سے مٹ گیا۔ استاد اپنے شاگرد سے کبھی نہ بولتا تھا۔ اسنے ہونٹ کی زبان سے شاگرد کو ستار بجانے کی تعلیم دینی شروع کر دی اور رفتہ رفتہ موسیقی ہان فوک کے رگ و ریشے میں سما گئی۔

ایک مرتبہ ہان فوک نے ایک چھوٹی سی نظم کہی ۔ موضوع تھا موسم خزاں میں دور جانے والے پرندوں کا سفر ؛ یہ نظم ہان فوک کو بہت پسند تھی، مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ استاد کو اپنا تازہ کلام سنائے چنانچہ وہ جھونپڑی سے تھوڑی دور جا کر بیٹھ گیا اور با آواز بلند اپنے اشعار پڑھنے لگا۔ جب استاد نے ہان فوک کی آواز سنی تو اس نے اپنا ستار اٹھایا اور اسے بجانے لگا۔ ایک لطیف نغمہ عدم سے وجود میں آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے خنکی پیدا ہو گئی شام کے سائے پھیلنے لگے پھر سرد ہوائیں بھی چل پڑیں اس کے بعد آسمان پر دو خوبصورت پرندے نمودار ہوئے جو اپنی منزل کی طرف محو پرواز تھے۔

جو منظر کشی ہان فوک نے اپنے شعروں کے ذریعے کی تھی وہ اس حقیقی نظارے کے سامنے بالکل ماند پڑ گئی۔ وہ احساس ندامت سے خود بخود خاموش ہو گیا اسے اب اپنی سمجھ ای کا اچھی طرح علم ہو گیا یہ دراصل استاد کی طرز تعلیم کا ادنیٰ نمونہ تھا۔

ایک سال کے بعد ہان فوک نے ستار بجانے میں مکمل مہارت حاصل کر لی لیکن شاعری اس کے لئے دن بدن مشکل تر ہوتی چلی گئی دو سال بعد ہان فوک کو وطن کی یاد نے تڑپا کر رکھ دیا۔ مجبور ہو کر اس نے استاد سے اجازت مانگی۔ استاد نے کہا تم آزاد ہو۔ واپس آنا یا نہ آنا یہ بھی سراسر تمہاری مرضی پر موقوف ہے۔

ہان فوک وطن کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں اس نے نہ تو کوئی پڑاؤ ڈالا اور نہ ہی آرام کیا۔ مسلسل چلتا گیا۔ دریا کے کنارے کنارے ایک دن صبح صادق کے وقت اسے دریا کے دوسرے کنارے پر اپنا آبائی وطن دکھائی دیا۔ اس نے پل پار کیا اور چھپ کر اپنے باغیچے میں داخل ہوا۔ باپ کے کمرے کی کھڑکی سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی اس کے بعد وہ اپنی منگیتر کے باغ میں داخل ہوا جو اس کے مکان سے ملحق تھا۔ ہان فوک نے ایک پیڑ پر چڑھ کر مکان کے اندرونی حصے میں نگاہ ڈالی سامنے اس کی منگیتر اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی مگر اس نظارے میں وہ جاذبیت نہ تھی جو اس کے ذہنی تصور میں پائی جاتی تھی جو ہان فوک کے تخیل نے پردیس میں بنایا تھا۔ حقیقی مشاہدے اور تخیل کے شاہکار میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہان فوک کو حقیقت سے تخیل زیادہ دلفریب معلوم ہوا تو وہ سمجھ گیا کہ اس کی فطرت میں شاعری کا خمیر ہے درحقیقت جو حسن اور سحر شاعر کے خوابوں میں ہوتا ہے وہ حقیقی دنیا میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا۔

ہان فوک مایوس ہو کر فوراً درخت سے اتر آیا۔ اس نے دریا عبور کیا۔ وادی کے پہاڑوں پر چڑھا اور دوبارہ اپنے استاد کے پاس پہنچ گیا۔ استاد چٹائی پر بیٹھا تھا اور اس کی انگلیاں ستار کے تاروں پر جادو جگا رہی تھیں۔ ہان فوک کو دیکھ کر استاد نے کچھ نہ کہا صرف چند اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ کمال فن دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ یہ اشعار سن کر ہان فوک کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

اب پھر ہان فوک اپنے استاد کے ساتھ رہنے لگا۔ اس مرتبہ استاد نے اسے بربط بجانے کی تعلیم دینی شروع کر دی۔

وقت برق رفتاری سے گذرتا رہا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہان فوک کے دل میں وطن کی یاد ٹیس بن کر اٹھیں اور وہ رات کی تاریکی میں استاد کی اجازت کے بغیر عازم وطن ہوا۔

ابھی وہ زیادہ دور نہ پہنچا تھا کہ تیز و تند ہوائیں چلنے لگیں۔ بربط جو اس نے دروازے سے لٹکایا تھا خود بخود بجنے لگا۔ موسیقی کی لہروں نے ہان فوک کو گھیر لیا اور اسے واپس چلنے کی تلقین کرنے لگیں۔ مجبوراً ہان فوک واپس لوٹ آیا۔ کیونکہ وہ اس سحر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک بار ہان فوک نے ایک خواب دیکھا۔ وہ اپنے باغ میں پودا لگا رہا تھا۔ اس کی بیوی بھی پاس کھڑی تھی۔ جب وہ پودا لگا چکا تو اسکے بچوں نے اس پودے کو شراب اور دودھ سے سینچنا شروع کر دیا اس کے بعد ہان فوک کی آنکھ کھل گئی۔

جھونپڑی میں چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ استاد گہری نیند سو رہا تھا اسکی داڑھی سانس کی آمد و رفت کی وجہ سے ہل رہی تھی استاد کو دیکھ کر ہان فوک کے دل میں دفعتاً نفرت کا آتش فشاں پہاڑ پھٹ پڑا۔ اس شخص نے میری زندگی تباہ کر کے رکھ دی مجھے جھوٹی امیدوں کے بھنور میں ڈال رکھا ہے۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔ یہ سوچ کر ہان فوک استاد کی جانب بڑھا۔ لیکن استاد نے فوراً آنکھیں کھولیں اور مسکرانے لگا۔ ہان فوک کی نفرت خود بخود سرد پڑ گئی۔ "ہان فوک"، استاد نے کہا "یاد رکھو! تم میری طرف سے آزاد ہو۔ جو چاہو کر سکتے ہو۔ وطن جا کر پودے لگانا چاہو تو

تمہیں اس کا پورا پورا اختیار ہے۔ اگر مجھے نفرت کرنے کو جی چاہتا ہے تو میری طرف سے تمہیں اس کی بھی اجازت ہے اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کروں گا۔"

"استاد!" ہان توک نے استاد کے پاؤں پکڑ لیے۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اور آپ سے نفرت؟ آپ سے نفرت کرنا تو میرے نزدیک خدا سے نفرت کرنے کے برابر ہے۔"

ہان توک نے بربط بجانے میں کمال حاصل کر لیا تو استاد نے بانسری بجانے کے طریقے بتائے۔ جب وہ بانسری بجانا سیکھ گیا تو استاد نے اسے شاعری کے فن سے متعارف کرانا شروع کر دیا۔ ہان توک آہستہ آہستہ شعر کہنا سیکھتا رہا۔ شاعری کیا ہے؟۔ موزوں اور سادہ الفاظ جو دلوں میں حرکت پیدا کر دیں۔ جیسے نسیم سحری سطح آب پر لطیف سا تموج پیدا کر دیتی ہے۔ بالکل اسی طرح شعر انسانی روح میں موجیں برپا کر دیتے ہیں۔ پھر ہان توک نے ایک نظم کہی۔ سورج دلہن کی طرح پہاڑوں کی اوٹ سے سراپا حجاب بن کر جھانک رہا ہے۔ پانی میں مچھلیوں کا خاموش رقص۔ سائے کی بے آواز حرکت، باد بہاری کی بید مجنوں کی شاخوں سے اٹکھیلیاں۔ یہ سب آوازیں ایک موسیقی کی، زمین کی ساری کائنات اور آسمان کی ساری پہنائیاں مل کر ایک نغمہ گاتی ہیں جو اس موسیقی کو سنے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہر ایک اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس سحر کو محسوس کرتا ہے۔ جس کے دل میں محبت ہو اسے بے اختیار اپنا محبوب یاد آ جاتا ہے۔ بچوں کا کھیلنے کو جی چاہتا ہے اور بوڑھوں کو موت نظر آنے لگتی ہے۔

اب ہان توک کو وقت کا مطلقاً احساس نہ رہا تھا۔ بعض اوقات وہ محسوس کرتا کہ شاید وہ کل ہی یہاں آیا تھا اور استاد نے ستار بجا کر آؤ بھگت کی تھی۔ لیکن کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے اسے یہاں سالہا سال بیت چکے ہیں۔ کئی صدیاں دنیا سے گذر کر ماضی کے سمندر سے جا ملی ہیں۔

ایک دن صبح کے وقت ہان توک بیدار ہوا تو استاد کو جھونپڑی سے غائب پایا۔ اس نے اسے بہت ڈھونڈا مگر کہیں نہ پایا۔ چیخ چیخ کر پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا الغرض استاد کا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسم میں بھی زبردست تغیر پیدا ہو گیا۔ خزاں خلاف توقع وقت سے پہلے آ پہنچی۔ تیز و تند ہواؤں نے جھونپڑی کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ فضا میں شدید خنکی چھا گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پہاڑوں کی اوٹ سے خانہ بدوش پرندوں کا ایک غول نمودار ہوا۔ وہ اپنی منزل مقصود کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر ہان توک نے بھی اپنا ستار اٹھایا اور پہاڑ سے اتر کر اپنے وطن کی جانب بڑھنے لگا۔ راستے میں جو بھی اسے ملتا وہ اسے واجب التعظیم بزرگ سمجھ کر ادب و احترام سے سلام کرتا۔

جب ہان توک اپنے شہر میں پہنچا تو یہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا والدین، منگیتر، دوست رشتے دار سب مر چکے تھے اب ان کے مکانوں میں اجنبی لوگ رہ رہے تھے۔ اتفاق سے اسی دن شام کو دریا کے کنارے میلۂ چراغاں منایا جانے والا تھا۔ ہان توک دریا کے دوسرے کنارے پر چلا گیا وہاں روشنی کے بجائے تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اسی سطح آب پر جھکے ہوئے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور ستار چھیڑنے لگا۔ جب یہ موسیقی کی آواز دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچی تو عورتیں سرد آہیں بھر کر دریا کے دوسرے کنارے کی جانب اندھیرے میں جھانکنے لگیں۔ نوجوان زور زور سے چلا کر اس ستار نواز جادوگر کو بلانے لگے۔ ہر ایک بے اختیار کہہ رہا تھا بخدا ایسی موسیقی میں نے آج تک نہیں سنی

یہ آواز سن کر ہان توک مسکراتا رہا۔ دریا کی سطح پر ہزار ہا چراغوں کے عکس رقص کر رہے تھے۔ لیکن لوزا در پر تو اب ہان توک کیلئے ایک ہی شے تھی۔ ایک بار پہلے بھی اس درخت سے ٹیک لگا کر روشنیوں کا انعکاس دیکھ چکا تھا۔ اور آج پھر وہ صدیوں کے بعد عین اسی مقام پر کھڑا تھا لیکن کل کے ہان توک اور آج کے ہان توک میں کتنا فرق تھا یہ کوئی نہ جان سکا۔

اپنے عہد کی بہترین اور نمائندہ تحریروں کے ساتھ شائع ہو کر
ہر پیسے قیمتی پہ بک اسٹال پر دستیاب ہے
سیپ

ماہنامہ
الفاظ

اپنی محنت کی کمائی کو بلبلوں کی طرح
مت اُڑائیے
این آئی ٹی یونٹ میں اپنا روپیہ لگا کر
ٹھوس سرمایے میں تبدیل کیجئے
اور سال بہ سال سُود سے پاک معقول مُنافع کمایئے
غیر ضروری خریداری سے خود کو بچایئے۔ آپ کو اپنی محنت کی کمائی سے محروم کرنے کے لئے فضول خرچی کی ترغیب ہر قدم پر ملے گی۔ اسے قبول کرنا آئندہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے حق میں کانٹے بونا ہے۔ جب تک دم میں دم ہے ایمانداری سے کمایئے اور جس قدر بچا سکیں۔ بچایئے۔
این آئی ٹی یونٹ خرید کر بڑے بڑے کاروباری اداروں میں شرکت کا منافع گھر بیٹھے حاصل کیجئے۔ یونٹ خریدنا بھی آسان ہے، وقت پر بھنانا بھی۔
این آئی ٹی یونٹ روپیہ بچانے کا محفوظ اور منافع بخش ذریعہ۔
این آئی ٹی ۔ سرمایہ کاری کا قابلِ اعتماد ادارہ
نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ
(امانیہ قومی سرمایہ کاری)

چہرے کا نور، دل کا سرور

بچے یہ تحفہ پاکر نہال ہوجاتے ہیں۔ رُوح افزا انہیں جی جان سے عزیز ہے

بے مثل ذائقے اور بے مثال تاثیر والا رُوح افزا بچوں اور بڑوں کو یکساں مرغوب ہے۔
یہ دل کو ٹھنڈک اور رُوح کو راحت پہنچاتا ہے۔ رُوح افزا ہماری ثقافت کا آئینہ دار، مشرقی روایات کا حصہ اور ذوقِ لطیف
کے حامل ہر شخص کا پسندیدہ مشروب ہے۔

جدید ادب کا نمائندہ

ماہنامہ

الفاظ

شمارہ : مئی، جون ۱۹۸۳ء

مدیر

جمیل اختر

قیمت فی پرچہ ——— چار روپے

ایک سال کے لئے ——— پینتالیس روپے

پوسٹ بکس نمبر ۷۵۹۶ صدر کراچی ۳

فون: ۲۹۰۸۴۷ ——— ۶۸۰۱۰۲ ——— ۶۸۴۸۸۸

ترتیب

سرورق کی تصویر ، صبا اکبر آبادی

اپنی بات

جمیل اختر

الفاظ کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ ہم نے جب 'الفاظ' کی اشاعت میں تواتر اور تسلسل کا التزام کیا تو رفتارِ ادب اور معیارِ ادب کے بظاہر دو سیدھے سادے مگر پیچیدہ لفظوں میں اپنا مافی الضمیر اپنی طرح ادا کر دیا تھا۔
موجودہ ادبی اور تخلیقی فضا میں جو گروہ بندی کی وحشت خیزی بلکہ دہشت گردی کی حدود میں داخل ہو چکی ہے یہ خیال صرف خیال ہی محسوس ہوتا ہے۔ مگر ایک خیال تو ہے؟
سوچا تھا نئے اور پرانے لکھنے والوں کی تازہ دم اور تر نفس تحریریں اتنی تو مزید ہوں گی کہ ہم اس تواتر اور تسلسل کو قائم رکھ سکیں گے، مگر اندازہ ہوا کہ

ایں خیال است و محال است و جنوں

بہر حال ہماری کوشش جاری ہے اور جاری رہے گی۔ آیندہ شماروں میں آپ چند نئے سلسلے ملاحظہ فرمائیں گے۔ کچھ ادب کے سنجیدہ اور مخلص قارئین کے لئے اور کچھ اُن "پہلوانوں" کے لئے جو قلم پکڑتے ہی اپنے آپے میں نہیں رہتے۔ اور ہمارے ایک دوست کے بقول جن کو 'محرری' مصنف ہونے کی خوش فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور کچھ اُن ادھیڑ عمروں کے لئے بھی جو اپنے آپ کو اربابِ قلم میں شمار کرتے ہیں۔ اچھا ہے ذرا اِن سے بھی حساب کتاب ہوتا رہے۔
ہاں ایک بات اور ــــ الفاظ میں تبصروں کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، بے لاگ نہیں۔ کیونکہ یہ لفظ اچھا خاصا بدنام ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

چراغِ بہار کا شاعر

"چراغِ بہار" صبا اکبرآبادی کا تازہ شعری مجموعہ ہے۔ شعری مجموعے اب بہت شائع ہونے لگے ہیں اور بہت خوبصورت، اب اردو کے شعری مجموعوں کی طباعت، کتابت، جلد بندی، سرورق کے متعلق وہ شکایت نہیں رہی جو دہلی میں گھومتے ہوئے فاسٹر نے راس مسعود مرحوم سے اردو کے سب سے بڑے شاعر کا نام پوچھا اور جواب میں غالبؔ سن کر اُس کے کلام کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ ظاہر ہے فاسٹر اردو نہیں جانتا تھا، وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ قوم اپنے سب سے بڑے شاعر کے کلام کو کس آن بان سے شائع کرتی ہے۔ سو اُس بے چارے نے دہلی کی جامع مسجد کے سامنے اردو کے کتب فروشوں سے چار آنے والا دیوانِ غالب خریدا تو سکتے میں رہ گیا۔ سب سے بڑا شاعر اور اُس کا دیوان اور یہ حشر، عجب قوم ہے۔

اور اب معاملہ کچھ برعکس ہے۔ بہت خوبصورت کتابت، حسین و جمیل سرورق، اعلیٰ درجے کا گیٹ اپ، بہترین درآمد شدہ کاغذ، نادر آفسٹ کی چھپائی۔ غرض کتاب سولہ سنگھار سے آراستہ اور پیراستہ، لیکن ذرا گھونگھٹ اٹھا کر دیکھیں اور بس.....

لیکن صبا اکبرآبادی کے اس مجموعے کی بات ذرا مختلف ہے، ایک تو یہ کہ اُن کی شاعری کی عمر کم و بیش اتنی ہے جتنی خود میری عمر ہے۔ انھیں ساٹھ برس شعر کہتے ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا، میں اُس وقت چار برس کا تھا۔ رسمِ بسم اللہ خوانی ہوئی ہو گی وہ یاد نہیں، ہاں یہ یاد ہے کہ ۱۹۲۲ء میں اکبرآباد میں مولوی سلامت اللہ مرحوم کے مکتب میں ٹاٹ کے فرش پر بیٹھ کر ابجد خوانی کرتا تھا ـــــ اکبرآباد کا ذکر آگیا تو بقولِ غالبؔ۔ ع

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

"چراغِ بہار" کے آغاز میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے لکھا ہے کہ وہ اکبرآبادیوں کے کشتۂ لطف و ستم ہیں کہ غالبؔ اور میرؔ دونوں اکبرآبادی تھے اور اب قصہ تازہ ہو رہا ہے کہ ایک اور اکبرآبادی سے اُن کا سابقہ آن پڑا، اور وہ ہیں صبا اکبرآبادی ـــــ سید صاحب نے ٹھیک ہی لکھا، غالبؔ کے عاشق کم لیکن میرؔ کے کشتۂ لطف و ستم زیادہ ہیں اور جس نے کبھی اس کوچہ میں آوارہ گردی کی ہے وہ میرؔ کے لطف و ستم کا مارا ہی ملا ہے ورنہ صدی سے اوپر ہونے کو آئی، ۱۸۱۰ء میں انتقال

ہوا تھا مگر ۱۸۵۷ء تک اُن کے کُشتہ باقی ہیں، وہ شاعر نہیں، شاعری کی ایک روایت ہیں۔ جن کا سکہ ہر دور میں معیار ٹھہرا اور جب تک اردو زبان ہے ٹھہرے گا۔

لیکن اکبرآباد میں صرف میر و غالب ہی نہیں تھے، یہ اکبرآباد تاج محل بھی ہے اور نظیر اکبرآبادی بھی۔ نظیر کو تو ہم نے نہیں دیکھا لیکن تاج محل کے سحر کا اثر اب تک باقی ہے کہ ہمیں بھی اکبرآباد چھوڑے کوئی نصف صدی ہونے کو آئی اور اسی محلہ میں ہم نے بھی آنکھ کھولی، جس میں اُن کا گھر تھا، یعنی مرزا غالب کا۔ مرزا نے تو اپنی جوانی کے آغاز کی کچھ حرف و حکایت اشاروں کنایوں میں بیان کر دی ہے، میر بیچارے نکلے تو کسی کی یاد لے کر کہ عمر بھر اُس سے دامن نہ چھڑا سکے، مہتاب میں اس کی تصویر نظر آنے لگی۔ دیوانگی نے ہاتھ پکڑا، اور عشق کی چوٹ شعر بن کر اُبھر آئی۔ نظیر اس طرح کے جھمیلوں میں نہیں پڑے۔ انھوں نے اکبرآباد کا دوسرا رُوپ دیکھا۔ یہ رُوپ شاید سید عبداللہ صاحب نے صرف نظیر کی شاعری میں جھلکتا دیکھا ہوگا۔ ان آنکھوں نے تو جمنا کے میلے ٹھیلے اور اکبرآباد کے بُتانِ سادہ کے رنگ آہنگ دیکھے۔ اس کی نظروں میں وہ اکبرآباد بھی ہے جس نے نظیر اکبرآبادی کو نظیر بنایا، غالب یا میر نہ بننے دیا۔

سو اسی دھنک کے رنگ والے اکبرآباد کے صبا اکبرآبادی بھی ہیں۔ اُن کی شاعری پر کچھ لکھنا بس ایک رسم اور ایک روایت کو پورا کرنا ہے، جس کے مطبوعہ کلام کا نقشِ اول ۱۹۳۵ء میں آیا ہو۔ ذکر و فکر اور اس کے بعد غزلوں اور نظموں، مرثیوں کے مجموعے، رباعیات عمر خیام کا اردو رباعی میں ترجمہ جیسی تخلیقات شامل ہوں اس کے بارے میں کیا کہا جائے، کبھی بچپن میں شعر پڑھا تھا۔ صحیح یاد بھی نہیں کہ ؎

اگر اس پہ پانی پڑے مستقل   یقیں ہے کہ گھس جائے پتھر کی سِل

تو یہاں تو ماضی اور حال کا سیلِ رواں پتھر کی سل پر سے نہیں، ایک شاعر کے دل پر سے کوئی ساٹھ برس سے گزرتا رہا ہے اور یہ زمانہ جیسا پُر آشوب رہا ہے وہ میرے اور آپ کے علم میں ہے۔ ایک سیلابِ خاک و خوں تھا جس نے افراد اور قوم سب کو متاثر کیا، پُرسکون آبادیوں کو آگ اور خون میں غرق کر دیا گیا۔ بستیاں ویران ہوگئیں، گھر لُٹ گئے، عصمتیں لُوٹی گئیں، سہاگ اُجڑے، ماؤں کی گودیں ویران ہوگئیں، جوانوں کے دست و بازو اور بوڑھوں کے سہارے ٹوٹ گئے، وہ گلیاں اور کھیت و کھلیان چھوٹ گئے جہاں لوگوں نے سہانا بچپن اور دیوانی جوانی گزاری تھی، جہاں اُن کے بزرگوں کی ہڈیاں دفن تھیں اور جہاں اُن کی آرزوؤں اور تمناؤں کے مزار تھے۔ اور یہ سب کیوں ہوا، یہ سب کچھ کس لئے گوارا اور قبول کیا، ایک نئے سفر کا آغاز تھا، ایک نئی منزل سامنے تھی، نئے حوصلے اور تازہ ولولے تھے، نئے مرحلے دعوتِ عمل دے رہے تھے۔ ایک آشیاں کو چھوڑنے والوں کے سامنے ایک تازہ چمن تھا، امیدیں اور آرزوئیں تھیں، تمنائیں تھیں ——— کیا یہ سب تجربے ایک عام انسان کو بھی متاثر کئے بغیر رہ سکتے ہیں — نہیں — آج کی نسل کی تحریریں اس داستان کو رقم کر رہی ہیں اور کرتی رہیں گی۔ ہاں لب و لہجہ اپنا اپنا الگ ہوگا۔ تجربے ذاتی بھی ہوں گے اور انفرادی بھی اور یہی بات مجھے صبا صاحب کے مجموعے میں نظر آئی۔

عجب بات ہے کہ اس مجموعے کی پہلی غزل نے ہی میر سے رشتہ قائم کر دیا۔ محض یہ نہیں کہ ردیف 'میاں' کچھ 'میریت' لئے ہوئے ہے۔ یہ تو اس دور کے اور لوگوں نے بھی باندھی ہے۔ یہ یہاں بات مولوی مدن کی سی ہے، مجھے میر کے دیوان کا مطلع یاد آگیا ؎

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا　　خورشید میں بھی اس کا ہی ذرّہ ظہور تھا

صبا کا شعر ہے ؎

شمع کا نور عارضی ہے میاں　　روشنی دل کی روشنی ہے میاں

پہلا مصرع بالکل میر کا خیال ہے لیکن اندازِ بیان اور لہجہ نے وہ کیفیت پیدا کر دی جو غزلیت کہلاتی ہے اور پھر "روشنی دل کی روشنی ہے میاں" کے ساتھ اگلا شعر پھر میر کی طرف لے جاتا ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں　　معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

اور صبا کا شعر ہے ؎

ماہیت پر کسی کی غور نہ کر　　جو نظر آئے بس وہی ہے میاں

اسی غزل میں میر نے دو نظم بند شعر کہے ہیں ؎

کل پانوں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا　　یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر　　میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

انسان کی انسانیت پر ہمارے شاعروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ نظیر کا آدمی نامہ ہماری شاعری کی زندۂ جاوید نظموں میں ہے۔ میر صاحب ایک پہلو پر نظر ڈالتے ہیں ؎

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا　　اس رند کی بھی رات گئی جو کہ عور تھا

اور یہ شعر صبا کا ہے ؎

آدمیت ہے جس سے شرمندہ　　وہ بھی دراصل آدمی ہے میاں

ایک اور شعر میں میر کے فیض کو خود تسلیم کرتے ہیں ؎

میر صاحب بتا گئے سب کو　　تیرے لب کی جو نازکی ہے میاں

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ صبا نے میر کی غزل کو سامنے رکھ کر ایک نئی غزل کہہ دی۔ یہ اشعار بھی اسی غزل کے ہیں اور صبا کے اپنے انداز اور اپنے لب و لہجے کے ہیں ؎

بے سبب انتظار ہے تیرا　　ایک عادت سی ہو گئی ہے میاں
میری دنیا میں اور سب کچھ ہے　　بس فقط آپ کی کمی ہے میاں
میکدے بند ہو گئے جب سے　　مستقل دورِ سرخوشی ہے میاں
ہمیں کیا مستیاں دکھاتے ہو　　ہم نے برسوں شراب پی ہے میاں
جیب و داماں کی خیر مانگ صبا　　آمد آمد بہار کی ہے میاں

یہ مقطع غزل کے خاص ایمائی انداز اور اشارے کا شعر ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کس بہار کی آمد آمد ہے اور کیوں جیب و داماں کی خیر مانگنے کی ضرورت ہے۔ شاعر مستقبل کا دیدہ ور ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہے وہ لب پر آہی جاتا ہے، ہاں انداز وہی ہے جو غزل نے صدیوں سے اپنایا ہوا ہے۔

اور آیئے اب کچھ باتیں غزل کی روایتی اور رسمی تنقید کی بھی ہو جائیں، کہتے یہ ہیں کہ غزل کے معنی عورتوں سے ہم کلام ہونے کے

ہیں، لیکن ساری فارسی شاعری میں، جس سے اردو نے بہت کچھ لیا، بجائے عورتوں سے ہم کلام ہونے کے مردوں سے ہم کلامی کچھ زیادہ ہی ہے اور محبوب کے ترکِ شیرازی ہونے میں کیا شبہ، جس کے خالِ ہندو پر شاعر سمرقند اور بخارا کی حکومت بخشنے کو تیار تھا۔ یہ اس بے چارے سے پوچھئے جس نے اپنے زورِ بازو سے سمرقند اور بخارا فتح کیا ہو اور اس کی یہ قیمت لگ رہی ہو۔ ہاں عربوں میں یہ تشبیب دوسری جنس کی ہے اور یہ عربی شاعری کا مزاج ہے۔ مقامی شاعری جسے ہم اکثر محض ہندی شاعری کے مبہم نام سے پکارتے ہیں وہاں تو ایک فراق زدہ ہجر کی ماری جوگن عاشق کے رُوپ میں نظر آتی ہے، بلکہ مرد بھی اپنے جذبات کے اظہار میں اسی کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں، افضل جھنجھانوی کا 'بارہ ماسہ' موجود ہے لیکن اُسے آپ ریختہ کے جواب میں ریختی سے نہ ملا دیجئے، جس میں زبان اور محاورہ تو بیشک عورتوں کا ہوتا ہے لیکن جذبات افضل عورتوں کے نہیں صرف کوٹھے والیوں کے ہوتے ہیں، اور پھر یہ سلسلہ نثر تک پھیل جاتا ہے کہ سعادت یار خاں رنگین، انشاء اللہ خاں انشا، اور جان صاحب سے لے کر آغا حیدر دہلوی تک چلتا ہے۔ سو اس بحث کو میں طول نہیں دیتا، غزل محض عورت سے بات کرنا نہیں، نہ صرف آہ و بکا ہے، نہ صرف سوزِ ہجر و سازِ وصال، بلکہ ایک آرزوئے مسلسل اور ایک تمنائے ناتمام ہے۔ صبا کے ان شعروں کو آپ کیا کہیں گے ؎

اُن سے دُوری میں ہوئیں یوں باتیں — دل سے دل بول رہا ہو جیسے

ہمہ تن گوش ہوا جاتا ہے عشق — حُسنِ پہیم بول رہا ہو جیسے

اُس کے آتے ہی یہ محسوس ہوا — وقت پَر تول رہا ہو جیسے

ہے تری یاد خود فراموشی — کس کو سوچیں ترے خیال کے بعد

تھا ملال اختیار میں اپنے — اور اب کیا کروں ملال کے بعد

دل میں کب تک رہے امید کا ویران محل — اب تو یہ کہنہ عمارت بھی گرا دی جائے

تجھے نہ سمجھے تھے جب تک تجھے نہ دیکھا تھا — ترا جمال ہمارے گماں سے بہتر ہے

انھیں کا نام لئے جاؤ تاکہ سو جاؤں — وہ ایک نام ہر اِک داستاں سے بہتر ہے

یوں تو ملنے کے ٹھکانے ہیں بہت — تم نہ چاہو تو بہانے ہیں بہت

اِک ترے نام کی دُھن ہی کیوں ہو — گنگنانے کو ترانے ہیں بہت

کیا اُن پہ نظر پڑے کسی کی — دیوار کھڑی ہے روشنی کی

آغوش مہک رہا ہے اب تک — خوشبو ہے بسی ہوئی کسی کی

بندوں کو خدائی بخش دی ہے — کیا بات ہے بندہ پروری کی

یہ چند اشعار میں نے بغیر کسی خاص اہتمام یا التزام کے 'چراغِ بہار' کے ابتدائی پچاس صفحوں میں سے جستہ جستہ لے لئے ہیں۔ معلوم نہیں ان کو پڑھ کر مجھے کیوں غزل میں وہ رنگ و آہنگ نظر آتا ہے جو حسرت موہانی کی غزل کا ہے۔ عشق کی پاکبازی بھی ہے اور وہ بھی جسے حسرت خود فاسقانہ شاعری کہتے تھے۔ یہاں محبت ایک عظیم پاکیزہ جذبہ اور کیفیت بھی ہے، اور دو گوشت پوست کے انسانوں کے درمیان ایک فطری تعلق بھی، لیکن جو چیز غالب ہے وہ مضمون اور بیان دونوں کی 'شائستگی' ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہماری غزل کی تنقید میں بالخصوص کسی نے یہ اصطلاح استعمال کی ہے یا نہیں۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ خواجہ

میر درد کے اپنے ایک منفرد رنگ و آہنگ اور لب و لہجہ کو چھوڑ کر، ہمارے کم شاعروں نے اس شائستگی کو ملحوظ رکھا ہے۔ شاید گنے چنے نام ہیں، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی اور بس۔ میں اُن شاعروں کا ذکر نہیں کر رہا جنھوں نے حمد و نعت، منقبت اور مرثیہ کو شاعری کا موضوع بنایا ہے، یا قرآنِ حکیم کا منظوم ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے یا اخلاقی شاعری کے نام سے وعظ و پند کے دفتر بے معنی کھول دیے ہیں۔ یہاں بات صرف غزل کی ہو رہی ہے، اور میرے خیال میں اِس صنف میں آپ صبا اکبرآبادی کو ضرور شامل کر سکتے ہیں۔

غزل کے بعض نقادوں نے جن میں حالی سے لے کر کلیم الدین تک اور ان کی تقلید میں چبائے ہوئے لقمے دوبارہ چبانے والے نقادوں نے غزل کے خلاف ایک بڑا محاذ کھولا اور سب سے بڑا اعتراض اس پر یہ تھا کہ موضوعات کے اعتبار سے اس میں عشق و عاشقی اور گل و بلبل کے سوا رکھا ہی کیا ہے، یا پھر گور و کفن اور تابوت و میت، کا نوحہ اور وہاں کے مضمون ہیں۔ مُردے قبروں سے فریاد کرتے ہیں، نے چراغ نے گلے، نے صدائے بلبلے، غزل کیا گورستان کا نقشہ معلوم ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا شاعر بھی یوں کہنے لگتا ہے :

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ اور وہ اُٹھا چاہتی ہے لاشِ فانی دیکھتے جاؤ

بچپن میں ہم نے سڑک پر یکّہ تانگے والوں اور ٹھیلے والوں کو یہ شعر گاتے سُنے تھے۔ کوئی عالم فانی پر ایسا گزرا ہوگا کہ انھوں نے یہ غزل لکھی، ورنہ اُن کا عام رنگ اس سے الگ ہے اور بڑے شاعروں میں میر کے بارے میں تو مشہور ہی ہے کہ جس لونڈے پر مرتے ہیں اسی عطّار بچّہ سے دوا لیتے ہیں، اور مرزا غالب تو ڈومنی کے پیرد ہو کر پینے کو تیار نظر آتے ہیں، اور میاں انشا :

تو نہ رکھوائے مری جان سے پیاری روزہ بندی رکھے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

سو غزل کو ان شاعروں کے ایسے اشعار سے نہ ناپیے، اگر اُن شعرا کا کلام ایسا ہی ہوتا تو میر و غالب کبھی کے ختم ہو چکے ہوتے، میر کی تو قبر کا پتہ نہیں، کلام اب تک زندہ ہے۔ غالب کی قبر غالب پرستوں نے بنالی، اب غالب کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بے چارے کو عمر بھر نصیب نہ ہوا، لیکن کلام اس کا اب بھی باقی اور زندہ ہے۔

اس قسم کے مضامین اور ایسے اشعار صبا کے اس مجموعے میں شاید تلاش سے مل جائیں، میں نے ابھی حسرت کی بات کی تھی، حسرت کے یہاں بھی اِدّعائے عشق میں پاکیزگی کے علاوہ کہ ع

اُن کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

وہ پوری غزل جیسی شوخ ہے :

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے

اور ؎

حائل تھی درمیاں جو رضائی تمام رات واللہ مجھ کو نیند نہ آئی تمام رات

معاملات کی شاعری ہے لیکن غزل کی شاعری بھی صرف معاملات کی شاعری نہیں، اس کی بدولت جرأت زیادہ اور مومن کچھ کم ملعون ہوئے۔ صبا کی شاعری اس عیب سے بھی پاک ہے۔

اور اب غمِ جاناں کے علاوہ کچھ باتیں غمِ دوراں کی بھی سن لیجئے ؎

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

ڈاکٹر عبادت بریلوی

صبا اکبر آبادی کی غزل

حضرت صبا اکبر آبادی کا شمار اردو کے بزرگ شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ ساٹھ سال سے شاعری کر رہے ہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں اپنے اس سفر کا آغاز کیا اور آج بھی کہ انھوں نے زندگی کی بہتر تہتر منزلیں طے کر لی ہیں، وہ اس راستے پر رواں دواں ہیں۔ وہ زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ جولانی ان کی شخصیت اور شاعری میں نمایاں نظر آتی ہے۔ انھوں نے غزلیں کہی ہیں، مرثیے لکھے ہیں، قطعات و رباعیات کی تخلیق کی ہے۔ غرض یہ کہ وہ ہر صنفِ شاعری میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ قادر الکلامی اُن کے ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک لفظ کے استعمال میں نمایاں ہے۔ وہ زندگی کے مزاج داں ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں زندگی کے اَن گنت پہلوؤں پر اُس کے بے شمار مسائل سموئے ہوئے ہیں۔ ان سب کی ترجمانی میں آزاد خیالی اور عقلیت پرستی، میانہ روی اور اعتدال پسندی ہر جگہ اپنے آپ کو رونما کرتی ہے اور اسی کی دین ہے کہ ان کی شاعری میں گہرائی اور گیرائی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ زندگی کو سمجھتے ہیں۔ اُس کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا گہرا شعور رکھتے ہیں، اور ان سب کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی باتیں دلوں میں کھُب جاتی ہیں، اور ان کا ہر پڑھنے والا اُن کی شاعری سے اپنے دلوں میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا کر لیتا ہے۔

صنفِ غزل صبا صاحب کا خاص میدان ہے۔ اس صنف کو انھوں نے باوقار بنایا ہے۔ اس میں نئے پہلو پیدا کئے ہیں۔ نئے موضوعات کو اس میں داخل کیا ہے۔ نئے احساسات کو اس میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ ایک نئے شعور سے بھی اس کو آشنا کیا ہے۔ روایت کی اہمیت کا احساس ان کے ہاں شدید ہے لیکن انھوں نے روایت ہی تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا ہے، تجربات کی حدوں کو بھی چھونے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ مضبوط بنیادوں پر استوار ہے، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے تئیں جنوں کے لئے نئے نئے ویرانوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اس میں صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے تنوع نظر آتا ہے، وسعتیں دکھائی دیتی ہیں، ان کا اثر دل اور دماغ دونوں پر ہوتا ہے، ان سے جذبے اور شعور دونوں میں ایک ارتعاش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اور مجموعی طور پر ان سے احساسِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم ہوتا ہے۔

یہ تمام پہلو صبا صاحب کی غزل میں اس لئے نمایاں ہوئے ہیں کہ وہ اپنے عہد کی ترجمان ہے۔ اس ماحول کی عکاسی

ہے، جس کے سائے میں وہ پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے۔ وہ زمانہ جس میں صبا صاحب کی غزل نے اپنا رنگ روپ نکھارا ہے اور اپنے آپ کو بنایا سنوارا ہے، وہ کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں غزل نے اپنے آپ کو اس اداسی اور سوگواری کے غاروں سے باہر نکالا ہے، جہاں دبستانِ لکھنؤ کے دورِ آخر کے شعراء نے اُسے پابہ زنجیر کر دیا تھا اور وہ ایک ایسے اضمحلال کا شکار ہوگئی تھی جس سے نکلنا اس کے لئے بظاہر مشکل معلوم ہوتا تھا لیکن حالی نے اپنے فکر و عمل سے اس کے جسم میں نیا خون دوڑایا اور اس میں زندگی پیدا کی۔ اقبال نے اپنے فکری میلانات سے اُس میں وسعتیں پیدا کیں، اور ایسی گہرائی اور گیرائی سے اس کو ہمکنار کیا، جس کی مثال اردو غزل کی روایت میں نہیں مل سکتی۔ حسرت نے اس میں اپنی رومانی افتادِ طبع کے باوجود ایک ایسی بے باکی اور جولانی پیدا کی جس نے اس کو واقعیت اور حقیقت سے ہمکنار کر کے اس عہد کی نئی نسل کا صحیح ترجمان اور عکاس بنا دیا۔ اصغر اور جگر نے اس میں ایسی رندی و سرمستی پیدا کی کہ غزل خود ایک لغزشِ مستانہ اور جراتِ رندانہ بن گئی۔ فانی نے اس میں غم اور عرفانِ غم کو داخل کر کے اس کو ایک ایسے انسانی رنگ و آہنگ سے ہمکنار کیا کہ وہ اعلیٰ و ارفع فکری اور فلسفیانہ شاعری کی یاد تازہ کرنے لگی، اور فراق نے اس میں انسانی زندگی کے مزاج دانی کے شعور کو اس طرح سمویا کہ اس میں خود زندگی کی سی وسعتیں پیدا ہوگئیں۔ اور سیماب اکبر آبادی اور آرزو لکھنوی نے اپنی قادر الکلامی سے اس میں وہ پختگی پیدا کی، جس نے بندشِ الفاظ کو مرصع سازی کا روپ دے دیا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس برسوں میں غزل کے ان رجحانات و میلانات نے مجموعی طور پر جو فضا قائم کی اس کے سائے میں صبا صاحب کی غزل نے آنکھ کھولی۔ اسی فضا کے سائے میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ اور اسی کے سائے میں اس نے ترقی کی اتنی منزلیں طے کیں کہ اس نے اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اس فضا کے اثرات مختلف زاویوں سے صبا صاحب کی غزل میں اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔ صبا صاحب کی بڑائی ہی اس بات میں ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو غزل کے ان جدید رجحانات کے ہاتھوں پیدا ہونے والی فضا سے علیحدہ نہیں رکھا۔ برخلاف اس کے وہ ان رجحانات کے علمبرداروں کے ہم آواز ہوگئے، اور انھوں نے اپنی غزل کو اس فضا کا ترجمان بنا دیا۔ یہی سبب ہے کہ اس مخصوص فضا کے علمبرداروں کی آوازیں صبا صاحب کی غزل میں جگہ جگہ سنائی دیتی ہیں۔ صبا صاحب وقت کے نبض شناس ہیں۔ انھوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کا وہ شعور رکھتے ہیں۔ انھیں انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی، جذباتی اور عقلی، داخلی اور خارجی معاملات سے دلچسپی ہے۔ چنانچہ وہ اس نوعیت کے تمام تجربات کو اپنی غزل میں کچھ اس طرح سموتے ہیں کہ ان کی انفرادیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

تغزل غزل کی جان اور اس کی روح کی پہچان ہے۔ صبا صاحب کی غزل میں بھی یہ تغزل جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتا ہے لیکن یہ تغزل ان کے ہاں جذبے کی اس شدت سے تعلق نہیں رکھتا جس کا منبع وہ جوانی ہے، جو دیوانی ہوتی ہے۔ صبا صاحب کے ہاں اس معاملے میں خاصا توازن نظر آتا ہے، خاصے اعتدال کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ حسرت کی سی بات ان کے تغزل میں نہیں ہے، جگر کے تغزل کی سی سرمستی بھی اُن کے ہاں نہیں ہے، اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ عقل و شعور نے اُن کے جذبے کو کھل کھیلنے سے باز رکھا ہے، اس کو بے لگام نہیں ہونے دیا ہے۔ بہر حال یہ توازن اور اعتدال صبا صاحب کے تغزل میں خاصے کی چیز ہے اور انھیں ہمیشہ ہر قسم کے جذبات کے اظہار میں لئے دیئے رہنے پر مجبور کرتا رہا ہے۔ اس سے ان کے تغزل میں نہایت صحت مندانہ سی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اور اس میں ایک تہذیب کا احساس ہوتا ہے، اور اس مہذب فضا ہی کا یہ اثر ہے کہ صبا صاحب کا تغزل جذبات کو اکساتا نہیں، ان کو

ہیجان پیدا نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے اُن کی تہذیب کرتا ہے۔ انھیں اپنے حدود میں رکھتا ہے۔ یہ چند اشعار اس رُجحان کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں ؎

بات کیا ہے کہ بات بھی ہم سے — آپ کو دیکھ کر نہیں ہوتی

ہم اشاروں ہی اشاروں میں ہوں صدقے تم پر — تم ہنسی ضبط کئے جاؤ خفا ہونے تک

ہوس کی راہ بھی تھی کوچۂ فریب بھی تھا — بچا کے لائی محبت کہاں کہاں سے مجھے

یاد آتی ہیں جوانی کی کرم فرمائیاں — ذہن میں بکھری ہیں کچھ ٹوٹی ہوئی انگڑائیاں

آہ وہ ویرانۂ صحرا میں یادِ روئے یار — ہائے وہ دشت و بیاباں میں چمن آرائیاں

میں دیارِ حُسن کے آداب سے واقف نہیں — تم کبھی آنا تو اپنے ساتھ لے جانا مجھے

اُن کی شوخی پہ جو لب تک مرے آجاتی تھی — اب وہ محتاط ہنسی یاد تو کرتے ہوں گے

وہ محبت کے اشارے وہ نگاہوں کے پیام — شوق کی نامہ بری یاد تو کرتے ہوں گے

کوچہ گردی کا مری دھیان تو آتا ہوگا — پا کے سنسان گلی یاد تو کرتے ہوں گے

اے صبا صرف یہی سوچ کے زندہ ہوں میں — نہ ملیں وہ نہ سہی یاد تو کرتے ہوں گے

ہوئی ہیں تیرے تصوّر میں آہٹیں کیا کیا — نگاہِ شوق نے بدلیں ہیں کروٹیں کیا کیا

ان کی ہر اِک جفا کو نوازش سمجھ لیا — انعام وہ وفا کے ملے ہیں کہ کیا کہوں

دنیا سمٹ کے آگئی آغوشِ شوق میں — کچھ اس طرح گلے سے ملے ہیں کہ کیا کہوں

سخن طراز ہے ان کی نگاہِ بیگانہ — تمام حرف و حکایت تمام افسانہ

جو حادثات دل پہ اچانک گزر گئے — میرے خیال میں تھے نہ اُن کے خیال میں

بیانِ شوق کی مجبوریوں کو کیا کہئیے — زبان کھل نہیں سکتی ہے دل دھڑکتا ہے

کوئے جاناں کی رُت نرالی ہے — دھوپ ہوتی ہے چاندنی معلوم

سمجھاؤں تو کیا سمجھ سکو گے — وہ لطف جو عرضِ حال میں ہے

یہ کس کی حنائے پا کی خوشبو — خاکِ دلِ پائمال میں ہے

خاموش صبا کو دیکھتے ہو — ہر وقت کسی خیال میں ہے

ان اشعار میں کاروبارِ شوق کی باتیں ضرور ہیں لیکن وہ ہیجانی کیفیت اِن میں نہیں ہے جو عام طور پر غزل گو شعرا کے ہاں اس قسم کے معاملات کی ترجمانی میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اِن میں معاملات نہیں ہیں، معاملہ بندی نہیں ہے، لاگ ڈانٹ نہیں ہے، کھل کھیلنے والی کیفیت نہیں ہے۔ ان میں تو نہایت مہذّب اور ستھری فضا ہے یہ تو ایک ایسے شخص کے کاروبارِ شوق کی رُوداد ہے جو گرم و سردِ زمانہ کو دیکھ کر زندگی اور اُس کے معاملات کے مسائل کو سمجھنے کے قابل ہو گیا ہے۔ جو حیاتِ انسانی کا شعور بھی رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صبا صاحب کے آہنگِ تغزّل میں بہاؤ کی پُر شور کیفیت نظر نہیں آتی بلکہ ایک آہستہ روی کا احساس ہوتا ہے اور ایک غنائی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس منزل سے ہمکنار ہو کر تغزّل ترنّم سے ہمکنار ہوتا ہے۔ صبا صاحب کے تغزّل میں بھی یہ ترنّم دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

صبا صاحب کی غزل بہ اعتبارِ مضامین بہت وسیع ہے۔ انھوں نے غزل کے مخصوص رنگ و آہنگ میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اَن گنت تجربات کو اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اُن کی غزلوں کا تقریباً تین چوتھائی حصہ ایسے مضامین پر مشتمل ہے جن کی نوعیت خارجی اور اجتماعی ہے۔ سیاسی معاملات، معاشرتی اور تہذیبی حالات، علمی اور فکری حالات، انسانی نظریات، غرض یہ کہ یہ تمام پہلو صبا صاحب کی غزل میں اپنے آپ کو رونما کرتے ہیں۔ اِن موضوعات پر حقیقت سے کتنے بھرپور اور انسانی زاویۂ نظر سے معمور کتنے دلکش و دلفریب اشعار کی تخلیق صبا صاحب نے کی ہے۔

جو کلیاں کھلنے والی ہیں منہ ڈھانپے ہوئے ہیں شاخوں پر	وہ پھول چمن میں ہنستے ہیں جن پھولوں کو مرجھانا ہے
سایۂ دولتِ دنیا میں نہ بیٹھو لوگو!	یہ تو گرتی ہوئی دیوار ہے تم کیا جانو
کیا خبر کس کے لئے ہے یہ طلسمِ رنگ و بُو	باغ میں کھلنا بھی ہے کلیوں کو مرجھانا بھی ہے
اے صبا ہم چھوڑ کر گلزار کو ہیں مطمئن	خاک اُڑانے کے لئے موجود ویرانہ بھی ہے
دراصل ایک خوابِ پریشاں ہے کائنات	جو سو گیا وہ نیند سے بیدار ہو گیا
کیا نئے سال کی خوشی ہو صبا	زیست کا ایک سال جاتا ہے
کارواں کیا ہے رہ گزر ہی ہے	کارواں رہ گزر کا دھوکا ہے
کاش سمجھو معانیٔ خطِ شوق	ہر ورق اِک کتاب ہوتا ہے
کانپ جاتا ہے اہرمن بھی صبا	آدمی جب خراب ہوتا ہے
اِس جراحت کدے میں دنیا کے	مسکرانا کمال ہے شاید
وہ کہیں تو پہنچیں گے جو بہک کے چلتے ہیں	گمرہی سے بھی اکثر راستے نکلتے ہیں
وقت جب بدلتا ہے آدمی بدلتے ہیں	زندگی کے سانچوں میں انقلاب ڈھلتے ہیں

اِس قسم کے اشعار کی صبا صاحب کی غزلوں میں خاصی فراوانی ہے، اور یہ فراوانی اِس لئے ہے کہ صبا صاحب ایک باشعور شاعر ہیں۔ وہ زندگی کے شیدائی ہیں۔ انھیں انسانی زندگی کے معاملات و مسائل سے دلچسپی ہے۔ وہ اُس کے معاملات کو سمجھتے ہیں۔ اس کے مسائل کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں۔ اس کی پیچیدگیوں کو حل کرتے ہیں۔ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان اس زندگی میں اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ وہ عظیم ہے۔ اس نے زندگی کو سنوارا اور نکھارا ہے، اور ایسا کرنے کے لئے انقلابات برپا کئے ہیں، اور ان انقلابات نے اُسے آسمانوں پر پرواز کرنا سکھایا ہے۔ اس نے زندگی کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ مجبور اور معذور رہے۔ اور یہی زندگی کا المیہ ہے، تغیّر اور تبدیلی اس کا مقدر ہے۔ فنا اور موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندہ رہا ہے اور اب تک زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ غرض اِس طرح کے بے شمار خیالات و تصوّرات تجربات کے سانچے میں ڈھل کر صبا صاحب کی غزلوں کے اشعار کا رُوپ اختیار کرتے ہیں۔

صبا صاحب نے اس طرح اپنی غزل کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا ہے، اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا کی ہے لیکن اِس کے باوجود فنّی اور جمالیاتی اعتبار سے غزل کی صنف اُن کے ہاں اپنے اصل اور حقیقی رنگ و رُوپ کو بھی برقرار رکھ سکی ہے۔ اور یہی اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی

ترا رنگِ سخن الگ ہے صبا

وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔ اس طرح دبے پاؤں گزر جاتا ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا لیکن وقت اپنی برق رفتاری کے باوجود یادوں کا ایک ایسا خوشگوار سلسلہ چھوڑ جاتا ہے جسے حاصلِ زندگی کہنا بجا معلوم ہوتا ہے۔ یادوں کے اس خوشگوار سلسلے کا جائزہ لیتا ہوں تو ۱۹۵۱ء کی ایک شام میرے ذہن میں اُبھرتی ہے۔ سالِ اوّل کا ایک کم سواد طالب علم بڑے ادب، قاعدے اور قرینے سے بیٹھا "دیارِ تاج" کے اس خوشگوار شاعر کا کلام سُن رہا تھا جو سِن و سال کے اعتبار سے جوانِ رعنا، "نہ پیئے اور جھومتا جائے" لیکن بہ اعتبارِ کلام و کمالِ پختہ کار، لہجے پر صبح صادق کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی روشنی کا گمان، انداز میں شگفتگی، حوصلہ اور خلوص کا بے پایاں اظہار۔ اِس کے باوجود نہ بہکنے کی ادائیں، نہ پندار کا شائبہ۔ سادگی اور خلوص کا یہ امتزاج ایک نوخیز ذہن کے لئے بڑا نیا اور انوکھا تھا۔ مجھے صبا صاحب کی یہ سادگی اور معصومیت بڑی عجیب معلوم ہوئی تھی۔ کیونکہ اُس وقت تک مجھے جن جن ادیبوں اور شاعروں سے نیاز حاصل ہوا تھا اُن میں سے بیشتر ایسے تھے جنھوں نے اپنی ذہنی برتری اور ادبی مرتبے کے اظہار میں خاصے مبالغے سے کام لیا تھا۔ صبا صاحب وہ پہلے فنکار تھے جو عام روش کے برعکس بالکل اس طرح پیش آئے جیسے وہ کسی خورد سے نہیں اپنے برابر والے سے مل رہے ہوں۔ ملاقات ختم ہونے کے بعد میں نے مغیث الدین فریدی سے کہا۔ صبا صاحب تو واقعی صبا ہیں، نرم، لطیف، شگفتہ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شاعرانہ پندار یا مصنوعی آنا کے حامل نہیں۔ صبا صاحب کے بارے میں میرا یہ تاثر آج تک برقرار ہے۔ زندگی میں بے شمار لوگوں سے واسطہ پڑا۔ بہت سے دوستوں اور جاننے والوں کے بارے میں رائے میں ترمیم کی ضرورت بھی محسوس کی لیکن صبا صاحب میں جو لطافت، نرمی، انکساری اور وضعداری اُنتالیس برس پہلے دیکھی تھی وہی آج بھی قائم ہے۔

دیرینہ نیازمندی کے باوجود مجھے یہ اعتراف ہے کہ صبا صاحب کی شخصیت کے سلسلے میں میرا حصہ دُور کا جلوہ رہا ہے۔ زیادہ تر ملاقاتیں، مشاعروں اور ادبی نشستوں میں ہوئیں۔ یہ احساس ہمیشہ موجود رہا کہ صبا صاحب کی شخصیت میں وقار اور سادگی ہے وہ نہ کسی کو مرعوب کرتے ہیں نہ کسی سے مرعوب ہوتے ہیں۔ بلند آہنگی اُن کا شِعار نہیں۔ نرم لہجے سے دل موہ لیتے ہیں۔ میں نے صبا صاحب کے لہجے کی یہ نرمی بزمِ سخن میں بھی دیکھی ہے اور دفتر میں بھی اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ ایک زمانے میں صبا صاحب نے ٹاور کے قریب ایک دفتر قائم کر رکھا تھا۔ یہاں بھی وہ بڑے مطمئن، شگفتہ اور پُراعتماد نظر آتے تھے۔ میں نے ذاتی طور پر یہ محسوس کیا ہے کہ صبا صاحب کاروباری حلقوں میں بھی اپنی دلآویز شخصیت کی وجہ سے مقبول ہیں۔

میں نے صبا صاحب کی پُرگوئی اور قادر الکلامی کی شہرت اکبرآباد میں بھی سُنی تھی۔ مجھے اس بات کا علم ہے کہ صبا صاحب نے غالب کی ہر غزل کو تضمین کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تضمین پُرانے زمانے کی چیز ہے۔ اس کا دور گزر چکا ہے۔ غالب کی ہر نئی تضمین تفہیم غالب کے ایک نئے رُخ کی نشاندہی کرتی ہے۔ شاعرانہ قدرتِ کلام سے قطع نظر غالب کو سمجھنے اور سمجھانے کے سلسلے میں تضمین بھی ایک مثبت کردار ادا کر سکتی ہے۔ لیکن غالب کی تضمینوں کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی اور نہ صبا صاحب کے اس کارنامے کا جو اب تک غیر مطبوعہ ہے سنجیدگی سے جائزہ لیا گیا، اسی ضمن میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ صبا صاحب کی شاعری کی عمر تقریباً ساٹھ برس ہے اور وہ اب تک ایک لاکھ 'ابیاتِ غزل' لکھ چکے ہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ایسے شعراء بہت کم ہیں جن کے ابیاتِ غزل کی تعداد ایک لاکھ ہو۔ ساٹھ برس کی مشقِ سخن کو دیکھئے، ایک لاکھ اشعار کی تعداد پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ ایسے قادر الکلام شاعر کا صرف ایک مجموعہ اب تک اشاعت پذیر ہوا ہے اور وہ بھی 'سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم' کے مصداق انتہائی مختصر۔ فنکار اپنا خونِ جگر اس لئے تو فن کی نذر نہیں کرتا کہ اس کی تخلیقات گمنامی کی نذر ہو جائیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ اس صورتِ حال کا سبب کس کس کی بے توفیقی ہے۔ ماحول، معاشرے یا اُن مدعیانِ علم و دانش کی، جو ہمیشہ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں کہ ان کی سرپرستی میں سارے جوہر قابل آشکارا ہو چکے ہیں۔ یہ ہم سب کا مسئلہ ہے اور ہمیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا کہ شعرا شعر کہنے کے ساتھ ساتھ اپنے مجموعے بھی خود کب تک شائع کرتے رہیں گے۔

صبا صاحب نے اوراقِ گل میں اپنی شاعری کو شرحِ تمنا سے تعبیر کیا ہے

اک شرحِ تمنا ہوتا ہے جو شعر صبا ہم کہتے ہیں
سادہ سادہ لفظوں میں دنیائے معانی ہوتی ہے

یہ شرحِ تمنا حسین بھی ہے اور قیامت خیز بھی ہے، اور یہی صبا صاحب کی شاعری کا کلیدی نکتہ بھی ہے لیکن اس نکتے کی بابت گفتگو کرنے سے پہلے میں اس امر کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں کہ اوراقِ گل کے دیباچے میں صبا صاحب نے اپنا مقصدِ حیات 'انتظارِ اجل' قرار دیا ہے۔ انتظارِ اجل ہم سب کا مقدر ہے لیکن میری دانست میں مرنے کی حسرت میں جینا صبا صاحب کے شعری مزاج سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ وہ زمزمۂ حیات کے شاعر ہیں، اُن کا نعرہ یہ ہے ؎

موت کی خاطر جینے والو موت نہیں انجام تمہارا
میرا عزم زندگانی دیکھ کر موت کے منہ پر پسینہ آ گیا

اور "وہ نہیں مرتے ہیں جو کرتے ہیں مر جانے کی بات"۔ احساسِ غم کی ایک ہلکی سی لہر صبا صاحب کے کلام میں جگہ جگہ اُبھرتی پھیلتی اور بڑھتی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ لہر صبا صاحب کے شعری مزاج کی بنیاد اور ان کے طرزِ احساس کی اساس نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کا مزاج و منہاجِ احساسِ غم میں بھی نشاطِ عشق کی وہ سرمدی کیفیت ڈھونڈ نکالتا ہے جس سے زندگی کی تیرہ و تاریک راتوں میں ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیل جاتی ہے۔ اِس کیفِ سرمدی کا بھرپور اور دل نواز اظہار صبا صاحب نے اپنی ایک غزل میں اس طرح کیا ہے ؎

احتیاطِ شوق کے عالم میں بھی تشہیرِ شوق وہ سسکتی نیک نامی وہ جواں رسوائیاں
وہ ہوائے صبح گاہی میں سکوتِ مستقل وہ سکوتِ شام میں بجتی ہوئی شہنائیاں
وہ محبت کا جھجکنا احتیاطِ شوق میں وہ نگاہِ شرمگیں کی حوصلہ افزائیاں
وہ حریمِ حسن میں اندازِ استقبالِ عشق اک گدائے حسن کے تیور کی وہ دارائیاں
وہ سسکتی، کسمساتی، ڈوبتی نبضِ حیا وہ کھنکتی، گنگناتی، بولتی رسوائیاں

یہی کھنکتی، گنگناتی اور بولتی رسوائیاں صبا صاحب کی غزل میں کہیں عزم و یقین کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں ؎

موت سے چھیڑ چھاڑ جاری ہے　　　زیست کا نوحہ خواں نہیں ہوں میں

اور کہیں شوخی اور بے تکلفی کے رُوپ میں ڈھل کر یوں نمایاں ہوتی ہیں ؎

کیا مزا ہے مرا ایمان ہے محبت تیری　　　اور تجھ سا تو کوئی دشمنِ ایماں بھی نہیں

کہیں نعرۂ مستانہ بن کر اِس طرح گونجتی ہیں ؎

جناب خضر جہاں سے گزر نہ سکتے تھے　　　وہاں سے لغزشِ مستانہ وار گزری ہے

اور یہ احساس بھی اس کا مرہونِ منّت ہے ؎

حُسن کے جَور میں بھی شعر کی رنگینی ہے　　　جو سمجھتے نہیں تعریف نہیں کر سکتے

ظاہر ہے کہ انتظارِ اجل کو مقصدِ حیات بنا لینے کے بعد اِس نوع کے خیالات اور وارفتگی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ نہ مجھے اوراقِ گل میں وہ اضمحلال اور افسردگی کہیں نظر نہیں آئی جسے انتظارِ اجل سے تعبیر کیا جا سکے۔ اجل کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہی سہی لیکن محض اس حقیقت کی خاطر زندگی کی عظمت و لطافت کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ صبا صاحب بھی اِس عظمت و لطافت کے قائل ہیں اگرچہ وہ شکایتاً یہ کہتے ہیں ؎

تری عطا کا بڑا شکریہ، صبا نے مگر　　　اجل کا لطف اُٹھانے کو زندگی پائی

صبا صاحب کو اس پر بھی اصرار ہے کہ وہ تلخیٔ الم کے امین ہیں ؎

تلخیٔ الم ہوتی ہے اشعار میں اس کے　　　لوگوں میں مگر شُہرۂ شیریں سخنی ہے

مگر ہوا یہ کہ تلخیٔ الم شیرینیٔ سخن میں اس طرح حل ہو گئی ہے کہ تلخی کا کوئی احساس باقی نہیں رہا۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے ؎

تو تو عالم شناس ہے شاید　　　مجھ کو پہچان میرے عالم سے

نظر اُٹھا کے نہ دیکھا نیاز مندوں کو　　　حضور ایسے بھی اندازِ بے نیازی کیا؟

ان اشعار کو پڑھ کر عمر بھر کی ناکامیوں کے ماتم اور سوز میں ڈوبی ہوئی آواز کے بجائے لہجہ کی نرمی اور لطافت و خلوص کا احساس اُبھرتا ہے۔ تلخ حقیقت کے غماز ہونے کے باوجود یہاں شیریں سخنی، معصومیت اور نرمی کی کارفرمائی ملتی ہے۔ تلخیٔ الم کی وہ شدّت نہیں ملتی جس نے شاعر کے ذہن میں آگ لگا رکھی ہے۔ اس نرمی اور شیریں سخنی کا سہارا لے کر صبا صاحب نے تلخ سے تلخ حقیقت کو گوارا بنا دیا ہے۔ انھوں نے اپنے مسلک اور مزاج کو اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

یہ ہمیں ہیں کہ ترا درد چھپا کر دل میں　　　کام دنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں

میں جب بھی یہ شعر پڑھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ صبا صاحب نے بڑی نرمی اور سادگی کے ساتھ ایک آفاقی صداقت کو ہم تک پہنچا دیا ہے۔ غم کو پہلو میں چھپا کر دنیا کے کاموں میں مصروف رہنے اور تمام فرائض کو بدستور انجام دینے میں جتنی ذہنی اور روحانی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ بہ آسانی ممکن نہیں۔ نہ کسی معمولی دل و دماغ رکھنے والے آدمی کا یہ حوصلہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان آزمائشوں میں پڑے۔ بظاہر صبا صاحب کے اس شعر میں سکون اور اطمینان کی فضا اور کسی حد تک احساس برتری کا مظاہرہ ملتا ہے لیکن یہاں بھی انھوں نے اپنی شیریں سخنی سے تلخی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

لہجے کی نرمی اور معصومیت سے صبا صاحب نے اپنی غزلوں میں بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ طنز ہو، تعریف ہو، شکوہ ہو، شکایت ہو، ہر جگہ وہ اسی سے کام لیتے ہیں اور ایک کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ؎

ملی غموں سے جو فرصت تمہیں بھی دیکھیں گے　　ذرا سکون ہو دل کو ذرا نظر ٹھہرے

اس کے دعدے میں کچھ خلوص تو تھا　　ہاں ارادہ بدل گیا ہوگا

اس نوع کے اشعار اوراقِ گل میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ جس شاعر کے مجموعۂ کلام میں اس طرح کے اشعار کی کثرت ہو اُس کا شعری مزاج اور مرتبہ ظاہر ہے۔

اوراقِ گل صبا صاحب کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یوں تو وہ نظم، نعت، سلام، مرثیے اور نوحے وغیرہ بھی کہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ غزل ہماری شاعری کی مقبول ترین اور شاید مشکل ترین صنف ہے۔ غزل کی روایت، فضا اور مزاج کی پیروی کرتے ہوئے نئی راہ نکالنا اور اپنی انفرادیت کو واضح کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ غزل فنکار کو بدلتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی ہے:
"یاراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست" والی بات ہے، لیکن صبا صاحب نے غزل کو، اور غزل نے صبا صاحب کو اس طرح پہچان لیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل میں شامل ہو گئے ہیں۔ غزل زندگی کے ہر پہلو پر حاوی اور زندگی کے ہر پہلو کی ترجمان ہے۔ رنگ نشاط ہو، بزمِ دلبراں ہو، زندگی کے مصائب و مسائل ہوں، آفاقی صداقتیں اور جذباتی قریب ہوں، غزل ہر ایک کی آواز ہے۔ صبا صاحب کی غزل میں بھی، وسعت اور ہمہ گیری ملتی ہے۔ کہیں کہیں شوخی اور تجاہلِ عارفانہ کا یہ انداز ملتا ہے ؎

میرے پہلو میں کبھی اک چیز نہیں ملتی ہے　　تیری شرمیلی نگاہوں کو خبر ہو شاید

جو خوب جانتا تھا مجھے وہ زمانہ ساز　　ایسے ملا کہ جیسے مجھے جانتا نہیں

اور کہیں تاسف کی جھلک اس طرح نظر آتی ہے ؎ :

عجب جگہ ہے یہ دنیا جہاں خلوص کے ساتھ　　نہ دوستی نظر آئی نہ دشمنی پائی

کہیں کہیں ہنر ناشناسی شکوے کا رنگ اختیار کر لیتی ہے ؎

سمجھے گا آدمی کو وہاں کون آدمی　　بندہ جہاں خدا کو خدا مانتا نہیں

اور جب وہ زندگی کے فکری پہلو کی طرف آتے ہیں تو ان کی غزل میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں ؎

طوفانِ انقلاب کا ساحل نہ تھا کوئی　　جتنے سفینے ڈوب گئے پار اُتر گئے

اس ضمن میں جب میں نے یہ مصرع پڑھا "سو انقلاب پلتے ہیں اک انقلاب میں" تو پھر یہ احساس ہوا کہ صبا صاحب نے اپنے نرم اور سادہ لہجے میں کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک انقلاب نہ جانے کتنے انقلابوں کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ شاعر نے کتنی خوبصورتی سے اس کا احساس بیدار کر دیا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر ؎

شاید وہی تھا حاصلِ صحرائے زندگی　　کانٹا جو میرے پاؤں کے چھالے میں رہ گیا

ذہن میں فکر کے کتنے دریچے وا کر دیتا ہے۔ حاصلِ صحرائے زندگی میں تو کسی قدر شک و شبہ کی گنجائش بھی ہے لیکن رہروِ صحرائے زندگی کے بارے میں صبا صاحب کے اس خیال میں ؎

افسانۂ حیات کا سادہ ورق ہوں میں　　آغاز بھی نہیں مرا انجام بھی نہیں

کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اوراقِ گل میں فکر کے اس انداز کی فراوانی بھی ہے۔ یوں کیوں نہ کہا جائے کہ اوراقِ گل ہر اعتبار سے اوراقِ گل ہے۔ صبا صاحب نے ایک جگہ کہا ہے ؎

نیرا رنگِ سخن الگ ہے صبا　　کہیں چھپتا ہے بات کا انداز

اوراقِ گل میں یہ رنگِ سخن اور بات کا انداز ہر جگہ نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر شمس الدّین صدّیقی

غزل کا شاعر

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے اردو غزل نے ۱۹۴۷ء کے بعد ایک نئی زندگی پائی ہے۔ جس میں ایک نیا شعور، نئی کیفیت، نیا رنگ ڈھنگ، نیا رُوپ اور آہنگ جلوہ دکھا رہا ہے۔ یہ غزل ایسی ہے جس میں معنیٰ آفرینی بھی ہے اور عکّاسیٔ حیات و کائنات بھی، جس میں دنیا و ما فیہا کا ہر منظر جھلکتا نظر آتا ہے۔ اس جدید غزل کی معنویت اور فلسفیانہ دقّتِ نظر میں بالکل نئی ذہنیت اور نیا طرزِ فکر و احساس کارفرما ہے۔ یہ نئی جراحتوں کا پیغام بھی لا رہی ہے اور عصری اور لازمانی مسائل کو بھی پوری سرد آفرینی اور کیف انگیزی کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔ گذشتہ تیس بتّیس برسوں میں جن بدلتے ہوئے حالات سے ہم گزرے ہیں اُن کی پوری ترجمانی ہمارے غزل گوؤں نے اشاروں، کنایوں، علامتوں اور تمثیلوں کے پیرائے میں کر دی ہے۔ جدید غزل کو قدیم غزل کے لوازمات، تشبیہات و استعارات، علامات و اشارات کو نئے مفاہیم اور نئی معنویتوں کے ساتھ استعمال کر کے غزل کے پیکر کو رعنائی و زیبائی بخش رہے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اب اردو غزل کے تار و پود اس قدر ہمہ گیر اور لطیف ہیں کہ حیات و کائنات کی تمام تر گہماگہمی اور معاشرے کی تمام تر ہماہمی اس میں سموئی ہوئی ہے۔ غزل اب محض حُسن و عشق کی واقعیت و رنگینی اور اس کی داخلیت و دروں بینی تک ہی محدود نہیں رہی ہے بلکہ زندگی کے خارجی مظاہر اور بیرونی عوامل کے شعور کو بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ آج کی غزل بلاشبہ پہلے کے مقابلے میں زندگی سے نزدیک تر آگئی ہے، اس میں اصلیت، واقعیت اور حقیقت کا شعور بہت بڑھا ہوا ہے۔ اس میں نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ وسعت، گہرائی اور شدّتِ احساس بھی موجود ہے۔ اب عشق کا تصوّر بھی محض روایتی اور افلاطونی نہیں رہا بلکہ اس میں عقل کی کارفرمائی شامل ہو گئی ہے۔ چنانچہ آج کا غزل گو حُسن و عشق کو سماجی پس منظر سے ہم آہنگ کر کے پیش کرتا ہے۔ نئی غزل کی شدّتِ احساس ان حالات اور اس ماحول کی پیداوار ہے جس میں نیا غزل گو سانس لے رہا ہے۔ نئی غزل میں وہی کسک اور خستگی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو موجودہ سماجی زندگی کی ابتری و انتشار، اقدار کی ناہمواری، روحانی سکون کے فقدان اور ذہنی ناآسودگیوں کی وجہ سے آج کے ہر باشعور اور حسّاس انسان کے دل و دماغ میں موجود ہے۔ آج کا معاشرہ آج کے شاعر کے لئے ایک جراحت سے کم نہیں ہے۔ یہ احساسِ شکست و ریخت، اجتماعی شعور کا رُوپ دھار کر آج کی غزل میں بخوبی منعکس ہو رہا ہے۔ ہماری نئی اردو غزل دورِ حاضر کی روح کی بھرپور عکاسی و ترجمانی کرتی ہے۔

جدید اردو غزل کی جن خصوصیات کا سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے انھیں سمجھنے اور پہچاننے کے لئے صبا اکبرآبادی کی غزلوں کا مطالعہ بہت مفید اور مددگار ثابت ہوگا کہ ان کی غزل میں زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ وہ سب کچھ ملتا ہے۔ ان کی غزل میں عاشق اگرچہ

روایتی عاشق کے مانند محروم و مہجور ہے۔ ؎

ساقی نے سب کو جام دیا سب پہ کی نگاہ   محرومِ التفات ہمیں تھے ہمیں رہے
بہت خراب کیا اہلِ عشق کو تو نے   ترا مآلِ جہانِ خراب کیا ہوگا
جس کے دم سے زندگی تھی زندگی   آج پہلو میں وہی باقی نہیں

لیکن اس آخری شعر سے اشارہ ملتا ہے کہ صبا کو قرب و وصلِ محبوب اور نوازشاتِ محبوب کا بھی تجربہ ہے۔ چنانچہ ایک اور شعر میں کہتے ہیں

عجب سیلِ انوار تھی وہ تجلی   مرے دل کو نہلا گئی روشنی سے
اب ان کا اور ہی عالم ہے دیکھئے کیا ہو   بڑی نوازشِ پیہم ہے دیکھئے کیا ہو

صبا کا محبوب بھی ستمگار ہے لیکن پیارا ہے بلکہ عاشق کی نظر میں نہایت معصوم اور سادہ ہے۔

ایسے انسان سے بھی واسطہ پڑتا ہے کبھی   دشمنِ جاں ہو مگر جان سے پیارا ہو جائے
میرے قاتل کو دیکھ اے دنیا   کتنا معصوم کیسا سادہ ہے

عشق کی اہمیت اور اس کے آداب پر صبا اس طرح توجہ دلاتے ہیں۔

عشقِ برباد اگر انجمن آرا ہو جائے   حُسن مغرور بھی مجبورِ نظارہ ہو جائے
تھی طلب آدابِ الفت کے خلاف   ان کو پا کر بھی انھیں کھونا پڑا

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صبا عاشق کو عجز و انکسار سے عاری قرار دیتے ہیں ؎

اندازِ عاجزی کا پسند آگیا انھیں   میں اپنے انکسار پر مغرور ہو گیا

دیکھئے کہ ان کے انکسار میں بھی ایک طرح کا فخر پنہاں ہے۔ عاشق کو وفادار ہونا ہی چاہیئے، لیکن صبا کی غزل کے عاشق اور اس کی وفا کا یہ رنگ ملاحظہ ہو۔

مت پوچھ ہے کیا لذتِ آزارِ وفا سے   جو درد میں خوش رہتے تھے درماں میں ہیں ناخوش
رسمِ وفا نباہ کے ہر بے وفا کے ساتھ   دل نے بڑے فریب دیئے عمر بھر مجھے
داخل ہیں حدِ کفر میں پاسِ وفا سے ہم   کہنا جو تم سے ہے نہیں کہتے خدا سے ہم

اپنے محبوب کا تبسم صبا کو خاص طور پر پسند ہے۔

مجھ سے کیا پوچھ رہا ہے مرے دل کی قیمت   اک تبسم ہے ترا ورنہ دو عالم بھی نہیں
یہ بھی انداز ہے زخموں پہ نمک پاشی کا   پرسشِ درد بعنوانِ تبسم تو نہیں

علاوہ تبسم کے محبوب کے ناز و ادا اور اس کی خفگی و ناراضگی کا لطف وہ یوں لیتے ہیں۔

ہیں ناخوشئ حسن پہ اربابِ وفا خوش   اللہ اسے خوش رکھے جو ہم سے ہے ناخوش
جو دیکھئے تو کرم عشق پر ذرا بھی نہیں   جو سوچئے کہ خفا ہیں تو وہ خفا بھی نہیں
اُن پھول سے لبوں کا یہ ارشاد الاماں   سارے جہاں سے خوش ہیں خفا ہیں صبا سے ہم
تم اسی کے نہیں ہوتے جسے اپنا کہہ دو   وہ کسی کا نہیں رہتا جو تمھارا ہو جائے

لیکن صبا کو حسن کا غرور کچھ پسند نہیں آتا۔ چنانچہ پردے پردے میں انتباہ کرتے ہیں:

نیرنگیٔ خزاں نے دکھایا اک آئینہ | جب پھول اپنے حسن پہ مغرور ہو گیا

اس کے باوجود وہ حسن پر فدا ہیں کہ جمال پرست ہیں اور اسی لئے اپنے زخم دل کو ہر وقت ہرا دیکھنا چاہتے ہیں۔

دل کے داغوں کی تازگی نہ گئی | بارہا یہ چمن ہوا تاراج

میرے تلووں کا لہو دیکھ کے صحرا میں صبا | خار بھی حسرتِ گل پیرہنی کرتے ہیں

غم دیئے جاؤ، غم دیئے جاؤ | دامنِ دل بہت کشادہ ہے

نہ ان کو فرصتِ درمانِ زخمِ دل ہے ابھی | نہ زخم قابلِ مرہم ہے دیکھیے کیا ہو

محبوب سے جو کچھ بھی مل جائے اُسے غنیمت سمجھتے ہیں خواہ سزا ہو کہ زخم یا غم۔

آپ سزائیں دے کے دیکھیں | نازاں ہوں گی خود تقصیریں

مجھ کو تو یہ بتائیے بخشش ہے یا سزا | میں سادہ دل سمجھ نہ سکوں گا حساب کو

چلا ہوں کوئے تمنا کو اور یہ علم نہیں | بہشت ہے کہ جہنم ہے، دیکھیے کیا ہو

قدیم تصور یہ ہے کہ کانٹے پھول کے نگہبان ہوتے ہیں لیکن صبا نے پھولوں کو کانٹوں کا نگہبان قرار دیا ہے اور کانٹے کو عشق کی علامت بنا دیا ہے۔

حسن خود عشق پہ نازاں ہے یہ معلوم نہ تھا | پھول کانٹوں کا نگہباں ہے یہ معلوم نہ تھا

عاشق کی حیثیت سے بعض اوقات ان پر وہ کیفیت بھی طاری ہوتی ہے جسے بے دلی قرار دیا جا سکتا ہے، ایسے عالم میں وہ پکار اٹھتے ہیں ؎

یہ مرا کفرِ محبت ہے کہ وحشت، کیا ہے | نہ خدا سے ہے نہ بندوں سے سروکار مجھے

غم کدے میں شمع روشن کیا کروں | شمع میں بھی روشنی باقی نہیں

یہ کہہ کر طبیعت کو دیتا ہوں دھوکا | مجھے اب محبت نہیں ہے کسی سے

وہ بادہ خوار شناسا نہ مہرباں ساقی | جو یوں پئیں گے تو کیفِ شراب کیا ہوگا

حسن و عشق کے موضوع پر صبا کے ان اشعار سے اُن کا رویہ اور اُن کے تاثرات کی نوعیت واضح ہو گئی ہوگی، اب آئیے دوسرے موضوعات پر بھی نظر ڈالیں۔

صبا انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کے بھی بہت اچھے نباض ہیں اور اس سلسلے میں نہ صرف خود اپنے باطن میں جھانک کر دیکھتے ہیں بلکہ اپنے اردگرد اپنے ہم جنسوں کے رویے اور اس کے پیچھے کام کرنے والے محرکات کا بھی بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی لئے ہم اُن کی غزل میں ایسے ایسے لطیف نفسیاتی نکتے اور اشارے پاتے ہیں کہ غالب کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً مسلسل قید و بند سے انسان کی ذہنیت پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے اس کا بیان دیکھیے ؎

مٹ گئی طولِ اسیری سے رہائی کی امید | دوِر زنداں نظر آنے لگا دیوار مجھے

بھلا دی طولِ اسیری نے سمت گلشن کی | پلٹ کے آئے قفس سے تو باغ بھی نہ ملا

ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کی شکست و نامرادی کا تماشائی کوئی نہ ہو کہ اس طرح اسے خفت کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس فطری جذبے کا اظہار صبا کے یہاں دیکھیے ؎

ابھی ساحل پہ تماشائی نظر آتے ہیں ڈوب جاؤں گا، ذرا دور کنارا ہو جائے

اپنا مقصود حاصل کرنے کے لئے انسان کو کس کس طرح رنگ بدلنا پڑتا ہے اور وہ بدلتا ہے۔ اِس نکتے کو صبا یوں ادا کرتے ہیں ؎

کبھی حرم، کبھی بت خانہ اور کبھی درِ یار جہاں میں چوٹی پڑتی ہیں چوکھٹیں کیا کیا

ایک اور اہم نفسیاتی نکتہ یہ ہے کہ جب تک کوئی پُرعظمت شخص ہمارے درمیان گھل مل کر بے تکلف انداز میں رہتا ہے۔ ہم اس کی عظمت کو نہیں پہچانتے۔ البتہ اگر وہ ہم سے دور ہو جاتے یا بچھڑ جاتے تو یہ فصل اُس کی عظمت کو ہماری نگاہوں میں نمایاں کر دیتا ہے۔ صبا اِس بات کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں ؎

کارواں میں تھا تو اہلِ کارواں تھے بے نیاز اب بھٹکتا پھر رہا ہے کارواں میرے لئے

جو آدمی کسی موقف یا کسی اصول پر سختی سے قائم نہیں رہتا بلکہ ہر شخص کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا ہے وہ آخرکار ہر شخص کو ناراض کر دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ شیطان بھی ناخوش نہ راضی ہو خدا بھی۔ صبا کہتے ہیں ؎

ہر ایک کو خوش رکھنے میں کوئی نہ ہوا خوش میرے دلِ مخلص سے نہ بندے نہ خدا خوش

اسی طرح یہ ہم میں سے ہر ایک کا روزمرہ تجربہ ہے کہ کسی بھی معاملے میں لوگ ہمیں مشورہ دینے میں پیش پیش رہتے ہیں کہ اِس کے لئے صرف زبان ہلانی پڑتی ہے۔ لیکن عملاً ہاتھ پاؤں ہلانے کی نوبت آئے تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ صبا کا شعر اس بارے میں سنیئے۔

راستے دور سے بتائے مگر کوئی دنیا میں ہمسفر نہ ہوا

اور یہ تجربہ کسے نہیں ہوا کہ اپنوں ہی میں سے کوئی کسی بلند مقام یا منصب پر پہنچ گیا تو اپنے قریبی دوستوں اور ساتھیوں کو فراموش کر دیا۔

پا کر عروج مجھ سے شناسا نہیں رہے برسوں جو مجھ غریب کے ہمدوش رہے

انسان نے خود اپنے کرتوتوں سے دنیا کو جہنم بنا لیا ہے اور الزام تقدیر کو یا خدا کو دیتا ہے۔

لوگ کرتے رہے آشوبِ جہاں کی تاویل وجہِ آشوب خود انساں ہے یہ معلوم نہ تھا

صبا نے ہر طرف آزادی کے فقدان کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دنیا ایک زنداں خانے سے کم نہیں۔

وسعتِ کائنات کیا کہنا ایک زندانِ بے در و دیوار

وسعتِ دہر میں تو سا کئے آزادی کو ایک پھیلا ہوا زنداں ہے یہ معلوم نہ تھا

ایک اور موضوع جو ہر حساس اور ہوشمند شخص کو پریشان کرتا رہتا ہے صبا اکبرآبادی کے دل کو ماغ پر بھی چھایا رہتا ہے، یہ ہے موت و حیات کا معمہ۔ زندگی بھی ایک جبر ہے اور موت سے بھی کسی کو مفر نہیں، کبھی تو موت آسان لگتی ہے اور کبھی زندگی، کیا زندگی موت کے انتظار کا نام ہے؟

اجل کے بھروسے پہ گزرے جو ہر دم صبا اپنی توبہ ہے اس زندگی سے

دھیان پائے اجل کی چاپ پہ ہے کون سنتا ہے زندگی کی پکار

کتنے سامان کئے زیست کی آسانی کے موت جینے سے بھی آساں ہے یہ معلوم نہ تھا

زیست کی چاپ سے کوئی کا دل ہلتا ہے موت کے پاؤں کی آواز نہیں ہوتی ہے

موت سے چھیڑ چھاڑ جاری ہے زیست کا نوحہ خواں نہیں ہوں میں

انسان اپنی زندگی کے مختلف لمحات میں اس قسم کے متضاد تاثرات کا شکار رہتا ہے کہ کبھی اپنی ذات کو اہم محسوس کرتا ہے اور کبھی

بے وقعت۔ یہی کیفیت صبا کی بھی ہے، کہتے ہیں ۔

ناز ہے مجھ پہ میرے صانع کو   زحمتِ رائیگاں نہیں ہوں میں
یوسفوں کا ہے کارواں میرے ساتھ   یوسف کارواں نہیں ہوں میں

پھر یہ بھی کہتے ہیں ؂

روبستِ چمن کو کیا جانوں   پھول ہوں باغباں نہیں ہوں میں
آشیاں کیا بناؤں گلشن میں   قابل آشیاں نہیں ہوں میں

اپنے دور اور اپنے ملک اور قوم کے تجربات و مشاہدات اور عصری حالات و واقعات پر غزل کی زبان میں صبا اکبرآبادی نے کس قدر بھرپور اور بجا تبصرے کئے ہیں ۔ اس کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے ؂

رہزن بھی چل رہے ہیں اسی قافلے کے ساتھ   ڈر ہے کہ لوٹ لیں گے مرے ہمسفر مجھے
سب چل رہے ہیں راہزنوں کو لئے ہوئے   ہر قافلے کا ایک ہی دستور ہو گیا
ہائے اک شخص جسے جانِ تمنا سمجھا   وہ مری جان کا خواہاں ہے یہ معلوم نہ تھا
جب انقلاب کی ہم نے دعائیں مانگی تھیں   خبر نہ تھی اثرِ انقلاب کیا ہوگا
خزاں کی دھوپ امیدِ بہار میں سہہ لی   ہمیں تو سایۂ دیوارِ باغ بھی نہ ملا
بارہا بابِ قفس کھول چکا ہے صیاد   خود ہمیں ہمتِ پرواز نہیں ہوتی ہے
کیسے مقابلہ کریں موجِ بلا سے ہم   پتوار چھین سکتے نہیں ناخدا سے ہم

وہ زمانے کے جور وستم کے آگے اپنے آپ کو بے بس تو محسوس کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی اتنی ہمت اُن میں ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ زمانے کو للکار بیٹھتے ہیں اور اپنے ساتھیوں سے کہتے ہیں ؂

سر جھکانے سے کچھ نہیں ہوگا   اُٹھ کے قاتل سے چھین لو تلوار

لیکن یہ جرأت اُن کی طبیعت کا خاصہ نہیں بلکہ محض استثنائی کیفیت ہے۔ ورنہ وہ تو کہتے ہیں کہ "خیرُ الامورِ اوسطُہا" ہمیشہ میرا مسلک رہا ہے۔" کچھ اسی قسم کی بات وہ اس شعر میں بھی کہتے ہیں ؂

زہے حیات، طبیعت ہے اعتدال پسند   نہیں ہیں رند اگر ہم تو پارسا بھی نہیں

صبا اکبرآبادی پامال علامتوں میں کس طرح نئی جان ڈال دیتے ہیں یہ دیکھنا ہو تو شمع، پروانہ، غنچہ، پھول، چمن اور دام کی علامتیں حسبِ ذیل اشعار میں دیکھئے ؂

ہم سے تو شاخِ گل پہ بھی ٹھہرا نہیں گیا   صحنِ چمن میں پھیلے ہوئے دام دیکھ کر
نہیں سمجھا کسی پتنگے نے   شمع کرتی رہی اشارے کیا
ٹوٹے پڑتے ہیں سارے پروانے   شمع کا بھی ذرا خیال نہیں
غمکدے میں شمع روشن کیا کروں   شمع میں بھی روشنی باقی نہیں
اپنی نزاکتوں سے خود افسردہ ہو گئے   پھولوں سے دشمنی تو نہ تھی آفتاب کو
ہم سے کلیوں کا چٹکنا نہیں دیکھا جاتا   ہائے وہ لوگ جو خاطر شکنی کرتے ہیں

وہم فانوس نے دھوکا دیا پروانوں کو — شمع اک شعلۂ عریاں ہے یہ معلوم نہ تھا

اب آخر میں چند متفرق شعر مختلف موضوعات اور مختلف تاثرات کے دیکھئے، جن سے صبا کی غزل گوئی کی خصوصیات مزید واضح ہو جائیں گی ۔

تجھ سے دامن کشاں نہیں ہوں میں — اے زمیں، آسماں نہیں ہوں میں

کسی نمرود سے جب تک نہیں ٹکرائے تھے — آگ کا نام گلستاں ہے یہ معلوم نہ تھا

ہوتے ہیں دست کش ابھی سعیٔ دعا سے ہم — تم بخش دو جو مانگ رہے ہیں خدا سے ہم

داخل ہیں حدِ کفر میں پاسِ وفا سے ہم — کہنا جو تم سے ہے نہیں کہتے خدا سے ہم

ہم سیہ کاروں میں کیا وضع کی پابندی ہے — توبہ کرتے ہیں نہ توبہ شکنی کرتے ہیں

آدمیت کس قدر مایوس ہے — جیسے کوئی آدمی باقی نہیں

میں جہاں جاؤں ترے نقشِ قدم ملتے ہیں — لئے پھرتی ہے تری شوخیٔ رفتار مجھے

رک نہ سکتا تھا کوئی کارِ جہاں میرے لئے — تھک گیا تھا میں نہ ٹھہرا کارواں میرے لئے

خوئے شاہانہ عطا کی، دلقِ درویشی کے ساتھ — میرے مالک، خوب سوچا امتحاں میرے لئے

بقیہ : چراغِ بہار کا شاعر

ہائے یہ آسماں نہیں تھکتا — گردشِ روز و ماہ و سال کے بعد

ایسے بندے بھی ہیں خدائی میں — جو خدا سے لڑیں نہیں تو کیا

شمع ویرانے میں جلائی تھی — جل گئی تو کیا، بجھ گئی تو کیا

چھوٹا تھا جن کا ساتھ وہ سب ہم نفس ملے — یہ اور بات ہے کہ اسیرِ قفس ملے

دیکھا جسے وہ قُرب کا خواہاں نظر پڑا — عشاق کی صفوں میں بڑے بوالہوس ملے

گلشن کی راہ بھول کے صحرا میں آ گئے — پھولوں کی تھی تلاش مگر خار و خس ملے

یادِ گلشن میں ہیں مشغول اسیرانِ چمن — ذہن پابندِ سلاسل نہیں ہونے پاتے

خبر نہیں کہ جلے یا بجھے چراغِ امید — ہوا کے کوچۂ جاناں ہے دیکھئے کیا ہو

بس اتنا واسطہ ہے کارواں سے — لُٹا ہوں، میں نے کچھ لوٹا نہیں ہے

یہاں آکر بگاڑے گی خزاں کیا — چمن میں کوئی گل بوٹا نہیں ہے

میں 'چراغِ بہار' سے طویل انتخاب دے کر قاری حضرات کے ذوق و شوق کو منہدم کرنا نہیں چاہتا، ان مثالوں سے اگر آپ کو 'چراغِ بہار' کے مطالعہ کی خواہش پیدا ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ اس تحریر کا مقصد حاصل ہو گیا۔

ڈاکٹر انور سدید

صبا اکبر آبادی کی غزل

میں نے جب صبا اکبر آبادی کا یہ شعر پڑھا کہ

کون سنتا ہے صبا کون سمجھتا ہے صبا　　میر کی طرح کہو، شعر، کہ سودا کی طرح

تو مجھے کچھ یوں احساس ہوا کہ صبا اکبر آبادی زمانے کو خاصے سرگراں ہو کر دیکھ رہے ہیں اور ان کے پیروں تلے جو راستہ ہے وہ مایوسی اور قنوطیت کے زیرِ اثر طے ہو رہا ہے تاہم جب میری نظر ان کے اس شعر پر پڑی کہ

طوفانِ سخن میں ہے قلم ساتھ ہمارے
اپنی یہی ٹوٹی ہوئی تلوار بہت ہے

تو مجھے خوشی ہوئی کہ شعری سفر کی اس جانکاہ مسافت میں ان کی روح زخمی نہیں ہوئی اور گھمسان کے اس رن میں انہیں اعتماد ہے تو صرف اپنے قلم پر۔ اور حد یہ ہے کہ وہ اس سے تلوار کا کام بھی لیتے ہیں۔ اس زاویے سے دیکھئے تو بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ صبا جنگ و جدال کے شاعر ہیں۔ بلاشبہ مرثیہ نگاری میں ان کے قلم نے تلوار کے جوہر بھی بڑی خوبی سے دکھلائے ہیں اور غزل میں ان کی زد میں جب زمانہ آ جاتا ہے تو ان کے لہجے میں بڑی کاٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ لفظ کو خوں آشام کرنے کی بجائے صبا اکبر آبادی روح کے نازک بندھنوں کو جذبے کی طاقت عطا کرتے ہیں۔ سانس کے تار ہر دل کی صدا جگاتے ہیں اور رغمِ زمانہ کو آہستہ قدمی سے عشق کی جذباتی سرگرمی کے ساتھ چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ انہوں نے روشنی کی جالا تو پیدا کی ہے لیکن اس میں خود کو شرابور نہیں کیا بلکہ مثالِ چراغِ جہاں طاقِ ابد پر جلنے کی کوشش میں اپنے آپ کو اندھیرے کی قوس میں محیط رکھنا قبول کیا ہے۔

روشنی پھیلانے کے باوجود صبا اکبر آبادی کو اپنی ذات پر ٹوٹے ہوئے آئینے کا گمان ہوا ہے۔ انہوں نے سوزِ دل سے گوشۂ تنہائی کو منور نہیں کیا بلکہ چراغِ راہ گزر بن کر راستوں کو جگمگایا ہے۔ چنانچہ صبا اکبر آبادی مجھے ایک ایسے شاعر نظر آئے جو لفظوں کو چُننے اور ان سے غزل کی ایک خوش رنگ اور خوش نظر عمارت ہی نہیں بناتے بلکہ وہ اس عمارت کے خوبصورت در و دیوار کے داخل سے جذبے کی نقاب بھی اٹھاتے ہیں۔ ان کی غزل ایک ایسی دھنک ہے جس کے رنگ آنکھوں کو علیٰحدہ علیٰحدہ نظر آتے ہیں لیکن جب شاعر اپنے روح کی پاتال میں اُترتا ہے تو اس کا جذبِ عمیق دھنک کے سب رنگوں کو ملا کر صرف ایک رنگ

پیدا کرتا ہے اور یہ عنصر ان کا وہ مخصوص رنگ ہے جسے میرؔ نے اپنی درد مندی سے، سوداؔ نے اپنی تمکنت سے اور غالبؔ نے اپنے آنسوؤں سے پیدا کیا ہے۔

صباؔ اکبر آبادی کی غزل کلاسیکی آواز کی مرصع اور باوقار غزل ہے۔ لفظوں کا انتخاب دلکش، جذباتی زاویہ تہذیب یافتہ، آہنگ متوازن اور معتدل، اظہار میں سلیقہ، ابلاغ میں استقامت۔ بلاشبہ انہوں نے غزل کو میرؔ، سوداؔ اور غالبؔ کے انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے لیکن اس امتیاز کے ساتھ کہ اس آئینہ صفت صنف سے صرف ان کا چہرہ جھانکتا ہے۔ چنانچہ وہ میرؔ، سوداؔ یا غالبؔ کے سلسلے کے شاعر نہیں بلکہ اپنا ایک الگ سلسلۂ ادب بھی رکھتے ہیں۔ یہ سلسلۂ ادب اس طرزِ احساس سے نمو پاتا ہے جو بیسویں صدی کے انسان کی عطا ہے اور اب غزل میں کثرت سے رونما ہو رہا ہے اور ایسے تمام تضادات کو جن کی نشو و نما موجودہ زمانے کے گہوارے میں ہوئی ہے ابھار کر سطح پر لا رہا ہے۔ غزل گوئی صباؔ اکبر آبادی کے سخن کا پردہ ہے۔ وہ اس شیوۂ پیغمبری سے درحقیقت قاری کو اس تجربے میں شامل کرنے کے آرزومند ہیں جو ان کے چاروں طرف پھیلی ہوئی آبادیوں سے ابھرتا ہے اور ساحلوں پر سے بیاباں بن کر بکھر جاتا ہے۔ اس تجربے میں درد کی ایک گہری لہر شامل ہے اور جب قاری اس تجربے کو ان کی غزل سے بازیافت کرتا ہے تو وہ متذکرہ درد مندی کا کسیلا ذائقہ بھی محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ صباؔ کے ہاں آواز کا جو لہرا ابھرا ہے اس میں تجربہ صیقل شدہ اور متدد صورت میں سامنے آتا ہے اور انہوں نے اس قسم کے اشعار بھی کہے ہیں ؎

بلندی سے اسے گرنا پڑے گا
جو چشمِ خاک سے چھوٹا نہیں ہے

جب کسی سے پیش قدمی ستم کی رکتی نہ ہو
اس جگہ لازم ہے خود سینہ سپر ہو جائیے

اہلِ نظر کو آئینہ خانہ ہے کائنات
خود اپنے عیب اپنے ہنر دیکھتے چلیں

اک دعا اور بھی تاثیرِ دعا ہونے تک
شغل جاری رہے آہوں کے رسا ہونے تک

تلواروں سے جو ملتے ہیں اہلِ وفا کے دل
ان کو کچل دیا ہے گردشِ روزگار نے

لذتِ سعی رائیگاں ہی سہی
جو نہیں ملتا اس کا وہ حاصل کر

صباؔ اکبر آبادی کی غزل میں غمِ عشق اور غمِ زمانہ دونوں بیک وقت زندگی کا خصوصی تجربہ بن کر رونما ہوتے ہیں۔ انہوں نے عشق کو خمارِ گندم تصور نہیں کیا اور غمِ جہاں کو آزار بانٹنے کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔ ان کے ہاں عشق اور زمانہ دونوں بامعنی سرگرمیاں ہیں اور انہوں نے زندگی کو انہیں دو کلیدوں سے آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزل میں جو محبت ہے وہ بلاشبہ سراپا ناز ہے لیکن وہ ڈھول بجنے کا شیوۂ دلبری اختیار نہیں کرتا۔ یہ محبوب لجاتا اور شرماتا بھی ہے لیکن ننگے پاؤں کوٹھے پر چل کر نہیں آتا۔ وجہ شاید یہ ہے کہ صباؔ اکبر آبادی کے عہد میں دانتوں تلے آنچل دبانے کا انداز ابھی متروک ہو چکا تھا۔ عاشق ایک ایسا شجرِ سایہ دار ہے جو اپنے عہد کی تمام دھوپ اپنے سر پر گزار لیتا ہے اور اس بات پر بھی مطمئن ہے کہ اس کا محبوب قریب ہی بہار کی صورت اس کے قرب سے گزر کر دوبارہ دیکھنے کی حسرت کو برانگیختہ کر گیا ہے۔ اس قسم کے مقامات پر صباؔ کے ہاں لطافت کیفیت ان کے توازنِ خیال کو سامنے لاتی ہے ؎

سو بار ہم تو دیکھ کے حیران ہو چکے
جی چاہتا ہے پھر اسے اک بار دیکھنا

تمام دھوپ کو سر پہ گزار لیتا ہوں
زمیں پہ ہوں شجرِ سایہ دار کی صورت

وہ بے پردہ ہیں لیکن کیسے دیکھیں | حجابِ کم نگاہی درمیاں ہے
کسی نے آکے صبا کا مزاج پوچھ لیا | صبا اب اور پریشاں ہے دیکھئے کیا ہو
کبھی کبھی وہ ہمارے قریب آکر بھی | گزر گئے ہیں نسیمِ بہار کی صورت
دل پر ہوس نے وار کیا تھا مگر صبا | مجھ کو بچا لیا مرے پروردگار نے

صبا اکبرآبادی نے غزل میں اپنے محبوب کا سراپا بہت کم کھینچا ہے۔ انہوں نے بے پردہ ہونے اور کراچی کی گزرگاہوں پر محوِ خرام ہونے کے باوجود اس محبوب کے خدوخال دکھانے کی کاوش نہیں کی۔ اس کے باوصف یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اس محبوب سے ناواقف نہیں اور یہ ہمارے دلوں کے قریب ہی جاگزیں ہے اور حجابِ کم نگاہی جو کہ درمیان ہے اس لئے ہم اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ نہیں سکتے چنانچہ صاف نظر آتا ہے کہ صبا کے ہاں عشق ایک تہذیبی عمل ہے۔ وہ کسی مقام پر بھی جذبے کو ہوس سے آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعلۂ احساس جب لو دینے لگتا ہے تو دل و جان کو بھسم نہیں کرتا بلکہ اپنی حرارت آہستہ آہستہ بکھیرتا ہے اور پھر حرارتِ عزیزی کے ساتھ مل کر جزوِ زندگی بن جاتا ہے۔

صبا اکبرآبادی چونکہ آج کے زمانے کے شاعر ہیں اس لئے انہوں نے بہت سی باتیں پسِ غزل بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ تشبیہہ ان کے بیان کا حسن ہے۔ استعارہ ان کے سخن کا پردہ ہے۔ وہ بڑی سے بڑی بات اس بے نام سادگی سے کہہ ڈالتے ہیں کہ بعض اوقات قاری اس بے نام سادگی پر ہی فدا ہونے لگتا ہے۔ ان کے ہاں اپنے عصر کی آگہی کا گہرا شعور موجود ہے لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ترقی پسند شعراء کی طرح نالہ و شیون نہیں کیا بلکہ اپنے گہرے تاثر کو غزل کے ظروف سے جھانکنے کی پوری اجازت بھی دی ہے اور ثابت کیا ہے کہ زمانہ جیسا بھی ہو روحِ عصر سے اغماض برتنا ممکن نہیں۔ اور یہ غزل کی بُنت میں شامل ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ایسے مواقع پر صبا نے غزل کے اشعار تخلیق نہیں کئے بلکہ تجربے اور مشاہدے کو وہ معنوی صورت عطا کی ہے جو بے ساختہ ضرب المثل کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ہمارے عہد کا پرتو موجود ہے ؎

ہوسِ اقتدار کیوں ہے صبا | عبرتِ اقتدار حاصل کر
کتنا مخلص تھا مٹانے والا | کس محبت سے مٹایا ہم کو
سبھی کو دعوائے دوستی ہے | میں اپنے دشمنوں کو دیکھتا ہوں
ڈھونڈنے نکلے تھے جمعیتِ خاطر لیکن | شہر کا شہر پریشاں ہے یہ معلوم ہوا
کسی بندے کی خدائی ہو تو پوچھیں اس سے | کتنے دن لگتے ہیں بندے سے خدا ہونے تک
پھولوں کی روشنی میں نشیمن ہوئے تباہ | لوٹا چمن چراغ جلا کر بہار نے

اس قسم کے مقامات پر صبا اکبرآبادی کے ہاں اپنی قدروقیمت کا احساس زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ وہ زمانے کے خس و خاشاک کے ساتھ اڑ جانے کی بجائے اپنی انفرادیت کی اور اپنی ذات کی حفاظت زیادہ کرتے ہیں اور ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس عمل میں پورے زمانے کو اپنی ذات کے محیط میں لینے کی سعی کرتے ہیں۔ ؎

پھیل سکتا ہوں، چھپ نہیں سکتا
روشنی ہوں دھواں نہیں ہوں میں
زندگی پر بہار ہے مجھ سے
زندگی کی خزاں نہیں ہوں میں
جن سے انسانیت کو خطرہ تھا
وہ منارے گرائے ہیں ہم نے
نکھار دی چمنِ روزگار کی صورت
جلا کیا ہوں چراغِ بہار کی صورت
میں کبھی وقت کی تلاش میں تھا
وقت کو اب مری ضرورت ہے

صبا اکبر آبادی کی شاعری میں جذبہ رومانی جست نہیں بھرتا۔ وہ زندگی کے تجربے کو کلاسیکی پیکر میں منتقل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ انہیں زبان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ چنانچہ صبا لفظ کی داخلی لرزشوں کو قاری تک مجسّم صورت میں پہنچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے غزل کے علائم و رموز کو ایک قادر الکلام شاعر کی طرح استعمال کیا ہے۔ تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اس عمل میں اہمیت جذبے کی صداقت کو دی ہے اور غزل کو بے جان اینٹوں کا محل بننے نہیں دیا۔ صداقت تو وہ ممتاز محل ہے جو اس عمارت کے غرفوں سے ہمہ وقت جھانکتی ہے۔ چنانچہ عہدِ حاضر کے سماجی زاویے جب فنی التزام کے ساتھ ان کی غزل میں در آتے ہیں تو ایک عالمگیر تجربہ بن جاتے ہیں اور صاف نظر آتا ہے کہ شاعر اپنی آگ میں جل ہی نہیں رہا بلکہ اس کے بطون سے روشنی بھی ابھر رہی ہے۔ یہ روشنی کبھی چراغ کی صورت میں ابھرتی ہے اور کبھی آئینے سے منعکس ہونے لگتی ہے۔ دونوں صورتوں میں صبا نے باصرہ کو اہمیت دی ہے۔ چراغ کے استعارے سے وہ پورے ماحول کو منور کر دیتے ہیں اور آئینے کی معاونت سے وہ کبھی اپنا اور کبھی زمانے کا چہرہ دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کی ایک آنکھ زمانے کی طرف اور دوسری اپنی ذات کی طرف کھلی ہوئی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ روشنی جب عقب سے ظاہر ہوتی ہے تو سایوں کو ابھارتی ہے اور جب بالائی سطح پر اُترتی ہے تو پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔ آئینہ جب ان پر منکشف ہوتا ہے تو نرگسیت پیدا نہیں کرتا بلکہ اس گرد کو اجاگر کر دیتا ہے جو صعوبتوں نے چہرے پر ڈال رکھی ہے اور اب جسم کا حصہ بن چکی ہے۔ دونوں صورتوں میں صبا نے انتہا پسندی کا شکار ہونے کی بجائے توازن اور اعتدال کا رویہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے قاری کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی بجائے اس کے حیدل پر دستک دے کر سوچ کی لہکتی ڈال پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ صبا اکبر آبادی کے کمالِ فن کا یہ زاویہ انفرادیت کا حامل ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُردو غزل کے فروغ میں ان کی اس انفرادیت کا اعتراف برملا کیا جائے گا۔

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی

صبا اکبر آبادی اور ان کی شاعری

صبا اکبر آبادی کا کلام تو میں گزشتہ چالیس سال سے سنتا اور پڑھتا رہا ہوں لیکن یہ اب سے تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے جب مجھے اردو غزل میں میر اور غالب کے اثرات پر ایک مقالہ لکھ کر حلقۂ ارباب ذوق راولپنڈی میں پڑھنا تھا اس موضوع میں غالب کے معاصرین اور متقدمین کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے غزل کی روایت پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ صبا اکبر آبادی کے تغزل میں میر اور غالب کی روایت بہت زیادہ نمایاں ہے۔ جستہ جستہ اُن کی چند غزلیں ہی میرے سامنے آئی تھیں۔ مزید کلام کا تجسس ہوا اور بعض دوستوں کی مہربانیوں اور تقریباً دس بارہ سال کے تمام ادبی رسائل کی فائلوں کا مطالعہ کر ڈالا جو راولپنڈی میں کہیں نہ کہیں موجود تھے۔ اس طرح صبا اکبر آبادی کی پندرہ غزلیں فراہم ہو گئیں جن کی مدد سے میں نے اپنا مقالہ مکمل کر لیا اس زمانہ تک میں نے صبا صاحب کو دیکھا تک نہیں تھا۔ اس واقعہ کے دس بارہ سال کے بعد ان کا پہلا مجموعۂ کلام "اوراق گل" میری نظر سے گزرا۔ اس میں ان کی دو سو سے زیادہ غزلیں ہیں۔ ان غزلوں کے مطالعے کے بعد صبا اکبر آبادی کا جو مقام میرے دل میں پہلے سے تھا اس سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ انہوں نے واقعی غزل کی روایت کا نہ صرف تحفظ کیا ہے بلکہ اسے آگے بڑھایا ہے۔

صبا اکبر آبادی کی غزلیں کلاسیکیت اور رومانویت کے ایک ایسے رچاؤ کی حامل ہیں جس میں صبا صاحب نے اپنے مشاہدات و تجربات بلکہ اپنے عہد کی تمام خصوصیات کو سمو کر اردو غزل کی روایت میں نیا رنگ اور آہنگ پیدا کر دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں قدیم اور جدید انداز تغزل کا بہت ہی دلکش امتزاج ملتا ہے۔

صبا اکبر آبادی اس دور کے شاعر ہیں جب غزل کے مقابلہ میں دیگر اصناف سخن کو آگے بڑھانے کی بھرپور کوشش جاری تھی اور غزل کو وحشی صنف سخن کہنے والوں کا طوطی بول رہا تھا لیکن انہوں نے غزل کی روایت کو اپنے سینہ سے لگائے رکھا اور اس کی حفاظت اور ارتقاء میں سرگرم عمل رہے۔ وسائل کی کمی اور حالات کی مساعدت کے باوجود صبا اکبر آبادی نے غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی عظمت اور دوامی قدر کا ادبی حلقوں سے جس طرح اعتراف کرایا ہے وہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے

بہت سے مفکرین اور ناقدین نے غزل کے دفاع میں مقالات اور کتابیں لکھی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صبا اکبرآبادی نے اپنی غزلوں کے ذریعہ غزل کے خلاف ہر قسم کی جارحیت کا جس طرح مقابلہ کیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ جدید کے زلزلہ خیز دور میں بھی اردو غزل کو بیساکھیوں کی ضرورت نہیں پڑی۔

صبا اکبرآبادی کا اصل نام خواجہ امیر محمد ہے۔ وہ ۱۴ اگست ۱۹۰۸ء کو اکبرآباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۰ء سے ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ بقول ان کے تقریباً ایک لاکھ شعر انہوں نے ۱۹۷۰ء تک کہہ لئے تھے لیکن جنوری ۱۹۷۱ء میں ان کا پہلا مجموعہ "اوراق گل" شائع ہوا تو اس میں تقریباً دو ہزار اشعار ہمارے سامنے آئے۔

میر تقی میر سے لے کر خواجہ الطاف حسین حالی تک غزل جن ارتقائی تجربات سے گزری ہے اور اس میں جو روایت ابھر کر سامنے آئی ہے اس کا شعور "اوراق گل" کے مطالعہ سے ہو جاتا ہے۔ صبا اکبرآبادی کی غزلوں میں حالی کی سادگی اور حقیقت نگاری موجود ہے لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق صبا اکبرآبادی نے اس میں پرکاری کا تناسب زیادہ کر کے حالی کی روایت کو زیادہ جاندار بنا دیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیے ؎

خاموش حضور دوست صبا اس فکر میں بیٹھے رہتے ہیں
جو بات ضروری کہنی ہو اس بات کو کیسے کہتے ہیں

جب تک نہ دیا تھا دل ہم نے فرعون تھے ہم سردار تھے ہم
دل دے کے کریں کیا سرتابی جو پڑتی ہے وہ سہتے ہیں

داغ کی معاملہ بندی اور شوخی کو انہوں نے اس طرح اپنایا ہے کہ اس میں ایک طرح کا وقار پیدا ہو گیا ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

چھلکے دو پیالے نازیہ لب ہائے شوق کو	دل کا مزاج پوچھ لیں رنگِ حنا سے ہم
پی کر شراب سایۂ ابرِ سیاہ میں	کھیلے ہیں مدتوں کسی زلفِ رسا سے ہم

تیرے نقشِ قدم کی خبر نہ پوچھ	پڑھ چکا ہوں کہاں کہاں میں نماز

آپ کے لب پہ اور وفا کی قسم	کیا قسم کھائی ہے خدا کی قسم
مرگِ عاشق پہ یوں بھی روتے ہیں	ہنس تو دینا تمہیں صبا کی قسم

رنگ بدلتے رہے اور زیر دستی بھویں تانے ہوئے	آج وہ آئے ہیں اپنے دل میں کچھ ٹھانے ہوئے
اب سے پہلے منزلِ ہستی سے کب گزرے تھے ہم	ہر قدم پہ راستے ملتے ہیں پہچانے ہوئے

صبا اکبرآبادی نے داغ کے اثرات کو قبول کر کے محض ان کی روایت کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ اس روایت کو تازہ بجی شعور سے ہم آہنگ کرتے ہوئے آگے بڑھایا ہے اور اس طرح اپنی انفرادیت کا لوہا بھی منوایا ہے۔ مومن خاں مومن کی ایمائیت اور رمزیت کو بھی صبا صاحب نے بڑے حسین رچاؤ کے ساتھ برتا ہے۔ مثال کے طور پر "اوراق گل" کے یہ اشعار دیکھئے۔

وہ لالہ لب جو مائل گفتار ہو گیا ‌ ‌ ‌ برسائے اتنے پھول کہ انبار ہو گیا

دل سے ان کا خیال جاتا ہے ‌ ‌ ‌ روز و شب کا وبال جاتا ہے

جن میں وفا کا رنگ نہ الفت کا نور تھا ‌ ‌ ‌ ان آنسوؤں پہ آنکھ کو کتنا غرور تھا
دل راہگزار دوست میں ہم چھوڑ آئے ہیں ‌ ‌ ‌ رستہ میں اک چراغ جلانا ضرور تھا

اک بار اٹھ گئی تھی ان پہ نظر ‌ ‌ ‌ پھر کوئی جاذب نظر نہ ہوا
تم کو میری خبر نہیں اب تک ‌ ‌ ‌ میں کبھی تم سے بے خبر نہ ہوا

صبا اکبرآبادی کی غزل میں مرزا اسداللہ خاں غالب کی روایت بھی بروئے کار آتی ہے اور غزل میں معاشرتی شعور اور ہمہ گیر ادراک کے ساتھ معنوی عمق اور انتخاب الفاظ میں خصوصی اہتمام بھی ملتا ہے مثلاً یہ اشعار دیکھئے۔

اگر شعور محبت نہ درمیاں ہوتا ‌ ‌ ‌ کوئی کسی کو زمانہ میں پوچھتا ہی نہیں

یہ جوانی یہ عشق کا آزار ‌ ‌ ‌ بس خدا حافظ اے دل بیمار
مستی عشق سے ہوئے بیکار ‌ ‌ ‌ عقل کا زعم ہوش کا پندار
وسعت کائنات کیا کہنا ‌ ‌ ‌ ایک زندان بے در و دیوار

رکنا نہ سایہ ہائے در و بام دیکھ کر ‌ ‌ ‌ ہاں اے مسافران سبک گام دیکھ کر
تھا شوق بے پناہ سزاوار بے رخی ‌ ‌ ‌ خوش ہو رہا ہوں عشق کا انجام دیکھ کر
رستہ الگ نکال لیا فکر کا صبا ‌ ‌ ‌ چلتا نہیں ہوں روش عام دیکھ کر

صبا اکبرآبادی نے واقعی روش عام سے ہٹ کر اپنے لئے ایک الگ راہ نکالی ہے لیکن اس کا احساس صرف

ان حضرات کو ہوسکتا ہے جو غزل کی تقلیدی روش اور غزل کی روایت میں اجتہادی کدوکاوش کی تاریخ سے واقفیت رکھتے ہیں ہیں۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے لیکن میرا خیال ہے کہ صبا کے کلام میں میر کا رنگ جس انداز سے شامل ہے اس کو دیکھ کر میرے نظریہ کی تائید تو ایک عام قاری بھی کر سکتا ہے ؎

رات مرنے کی تمنا میں گزر جاتی ہے ۔۔۔ موت بھی جا کے شب غم میں مرجاتی ہے
یوں پریشاں ہے وفا تیری توجہ کے بغیر ۔۔۔ جیسے ٹوٹی ہوئی تسبیح بکھر جاتی ہے

غمخوار صبا میں جو آتی ہے چاندنی ۔۔۔ تاریکیوں کے ناز اُٹھاتی ہے چاندنی
وہ رات اشکِ غم کی جوانی کی رات ہے ۔۔۔ جس رات کو شباب پہ آتی ہے چاندنی

صبا اکبرآبادی نے مشق سخن اور طبع آزمائی کے تقریباً پچاس سال گزارنے کے بعد اپنا پہلا مجموعۂ کلام "اوراق گل" پیش کیا تھا۔ انہوں نے جو زمانہ دیکھا ہے اس میں حسرت موہانی، سیماب اکبرآبادی، نواح ناردی، بیخود دہلوی، بزم اکبرآبادی، سائل دہلوی، فراق گورکھپوری، یاس یگانہ، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، نجم اکبرآبادی، آرزو لکھنوی، فانی بدایونی، قمر جلالوی، آل رضا اور ناصر کاظمی جیسے شعراء نے بھی غزل کے چمن کی بہاروں کے لئے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے لیکن صبا اکبرآبادی کی جگر کاوی بھی مجھے کسی سے کمتر نظر نہیں آتی۔

صبا صاحب سے میری پہلی ملاقات غالباً پانچ سال قبل لاہور میں ایک مجلس میں ہوئی اور مجھے پہلی بار ان کا مرثیہ سننے کا موقع ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے اُردو غزل کی روایت کا جس طرح تحفظ کیا ہے بالکل اسی طرح اُردو غزل کے مرثیے کی روایت کو بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ صبا صاحب نے جو مرثیہ پڑھا تھا وہ ایک سو سے زیادہ بندوں پر مشتمل تھا اور اس میں کلاسیکی مرثیہ کے تمام عناصر ترکیبی موجود تھے۔ اس کے باوجود حاضرین مجلس کا یہ عالم تھا کہ کسی کو سیری نہیں ہوئی تھی اور ہر ایک مشتاق تھا کہ صبا اکبرآبادی کے اور بھی مرثیے سننے کا موقع ملے لیکن صبا صاحب کا قیام مختصر تھا اس لئے جب تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد وہ دوبارہ لاہور آئے تو خورشید فرید آبادی صاحب نے محتشم جعفری صاحب کے دولت کدہ پر صبا صاحب کے تو تصنیف مرثیے کی مجلس کا مژدہ پہنچایا۔ میں بھی اس مجلس میں شریک ہوا اور یہیں صبا صاحب سے ان غزلوں اور مرثیوں پر بہت مختصری گفتگو بھی ہوئی۔ صبا اکبرآبادی تو لاہور سے دو چار دن کے قیام کے بعد رخصت ہو گئے لیکن خورشید فرید آبادی سے اکثر ان کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ خورشید صاحب ہی نے مجھے بتایا کہ صبا صاحب نے دیوان غالب کے پہلے شعر سے آخری شعر تک ہر ایک کی تضمین کی ہے اور ان کا یہ کارنامہ تقسیم برصغیر سے پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا کہ صبا اکبرآبادی نے عمر خیام کی تقریباً ایک ہزار رباعیات کا منظوم ترجمہ مکمل کر لیا ہے اور یہ ترجمہ ان کی اپنی تحریر میں عکسی صورت میں بالاقساط شائع ہو رہا ہے۔ ان کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ "چراغِ بہار" کے نام سے طبع ہو رہا ہے لیکن اس کے بعد بھی چار پانچ سو غزلیں غیر مطبوعہ رہ جائیں گی۔ ان کے دو مرثیے "سربکف" کے نام سے شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کئے ہیں۔ ایک مرثیہ بصورت کیسٹ طارق عزیز کی آواز میں بازار میں آگیا ہے۔ اس کیسٹ میں ایک جانب قدیم اُردو مرثیہ کے نمونہ کے طور پر کلام انیس ہے اور دوسری جانب جدید مرثیہ کے نمونہ کے طور پر کلام صبا

ہے۔ خورشید فرید آبادی کے قول کے مطابق صبا اکبر آبادی نے اب تک پینتیس مرثیے کہے ہیں۔ جب تک ان کے مرثیوں کا مجموعہ شائع نہیں ہو جاتا۔ ان کی مرثیہ نگاری کے بارے میں تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ میں نے سنا اور پڑھا ہے اس کے پیش نظر صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ صبا اکبر آبادی نے اردو مرثیے کی اس روایت کو جو میر انیس اور مرزا دبیر نے قائم کی تھی بڑے سلیقے سے دورِ حاضر میں پیش کیا ہے۔

صبا اکبر آبادی نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا اصل میدان غزل گوئی ہے اس میں ان کی تخلیقات سب سے زیادہ ہیں۔ وہ غزل کی قدیم روایت کو نظر انداز نہیں کرتے بلکہ اس کا تحفظ کرتے ہوئے جدید تقاضوں کو پورا کرتے ہیں مثلاً ان کے یہ شعر دیکھئے۔

ان کی نظریں جب مرے اشعار میں حل ہو گئیں — ناممکل تھیں جو غزلیں وہ مکمل ہو گئیں
رکھ لیا وحشت نے پردہ اضطراب شوق کا — کتنی بامعنی تھیں وہ باتیں جو مہمل ہو گئیں
سر کو ٹکرانے سے اس چوکھٹ پہ دردِ سر گیا — ہم نے جو جو ٹیں جبیں پہ کھائیں صندل ہو گئیں
جانے کیا کیا ان کو لکھنا چاہتا تھا جوشِ دل — خط ادھورا رہ گیا اور انگلیاں شل ہو گئیں

صبا اکبر آبادی نے شعر کے فن پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اور معانی، بیان، بدیع اور عروض کی تمام خصوصیات کو حسب ضرورت بروئے کار لائے ہیں۔ اگر وضاحت سے ہر پہلو کو پیش کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ صبا اکبر آبادی کی ہر غزل کو ذرا غور سے پڑھئے تو میرے نظریے کی خود بخود تائید ہو جائے گی اور صبا اکبر آبادی کے اس دعویٰ کا ثبوت بھی مل جائے گا جو انہوں نے خود اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

جب سے کمالِ فن میرا معیار ہو گیا — اپنی دکاں پہ آپ خریدار ہو گیا

صبا اکبر آبادی نے زندگی کے تقریباً تمام مشاہدات اور تجربات کو غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں میں مضامین کی بظاہر یکسانیت نظر آئے گی لیکن گہری نظر سے دیکھئے تو بے حد تنوع کا احساس ہو گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ صبا اکبر آبادی نے بھی مرزا غالب کی طرح غزل کے مزاج اور غزل کی زبان کا خاص خیال رکھا ہے اور بقول غالب سے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

صبا صاحب کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو اس میں پورے ایک عہد کی جیتی جاگتی زندگی کی تصویریں نظر آجائیں گی۔ کہیں شرط یہ ہے کہ آپ الفاظ اور اشعار کے پردے میں چھپی ہوئی ان تصویروں کو دیکھنے والی نظر بھی رکھتے ہوں۔ انہوں نے عوام کے لئے شعر نہیں کہے اور نہ عوامی روش یا عوام پسند انداز نگارش اختیار کیا ہے۔ وہ بڑے واضع دار انسان ہیں۔ اپنے اسلاف کا سرمایۂ فکر و فن انہوں نے بہت سلیقے کے ساتھ نئے دور کے تقاضوں کو پورا کرنے میں صرف کیا ہے اور اپنی انفرادی فکری اور فنی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اس سرمائے میں مزید اضافہ بھی کیا ہے لیکن وہ اپنے زمانے والوں کے ہمدرد اور غمگسار بھی ہیں۔ خاص و عام سب کے لئے ان کا دل بے کل رہتا ہے اور اپنی مخصوص مزاجی افتاد کے ساتھ وہ اس

کیفیت کی ترجمانی بھی کرتے ہیں ؎

سب سے بے احتیاج ہیں ہم لوگ — کتنے نازک مزاج ہیں ہم لوگ
سب کا غم اپنے دل میں رکھتے ہیں — سب کے غم کا علاج ہیں ہم لوگ
کل کا کیا غم ہے کچھ نہ ہو گا کل — آج دیکھو کہ آج ہیں ہم لوگ
اگلے لوگوں کو بھولتا نہ صبا — کل تھے وہ لوگ آج ہیں ہم لوگ

صبا اکبرآبادی ایک عہد ہیں ایک روایت ہیں۔ ان کے کلام میں میر تقی میر سے خواجہ الطاف حسین حالی تک ہر قابلِ ذکر شعری روایت اور فکری تجربہ نئے انداز سے جلوہ گر ہوا ہے۔ صبا اکبرآبادی کے دور کی کوئی سیاسی اور سماجی تحریک اور کوئی تاریخی حقیقت ایسی نہیں ہے جس کی نشاندہی انہوں نے اپنے مخصوص اندازِ بیان اور منفرد لب و لہجہ کے ساتھ غزل کے اشعار میں نہ کردی ہو۔ انہوں نے غزل میں مابعدالطبیعاتی باتیں بھی کی ہیں۔ الوہیت اور ربوبیت کا تعارف بھی کرایا ہے تصوف کے مدارج اور مسالک کو بھی پیش کیا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ تاریخ کے بدلتے ہوئے نقشوں اور تہذیب و تمدن کی پے بہ پے آویزش کی عکاسی بھی کی ہے لیکن یہ تمام باتیں غزل کے مخصوص لب و لہجہ میں ملتی ہیں۔ صبا اکبرآبادی کے اشعار میں تہہ داری ہے۔ الفاظ کا انتخاب اس طرح کیا گیا ہے کہ ایک لفظ کی مترادف تبدیلی بھی ممکن نہیں ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ اپنے تمام حدود و قیود اور معنوی ہبوط و صعود کے ساتھ مزین نظر آتا ہے۔

صبا اکبرآبادی کو بعض لوگ روایتی شاعر کہتے ہیں لیکن یہ حضرات وہ ہیں جنہوں نے روایت سے بغاوت کر کے اپنی حیثیت کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے غالباً اس لئے کہ روایت کے ساتھ آگے بڑھنے میں ان حضرات کی اپنی حیثیت برقرار نہیں رہ سکتی تھی لیکن صبا اکبرآبادی کی عظمت کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے روایت سے بغاوت نہیں کی بلکہ روایت کو آگے بڑھایا ہے اور اپنی فکری اور ذہنی انفرادیت کا ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے بلکہ صبا اکبرآبادی نے روایت سے بغاوت کرنے والوں سے بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔

صبا اکبر آبادی

خیال میں ہے ترے حسن کی بہار اب تک
نگاہِ شوق ہے فردوس درکنار اب تک

کھٹکتی ہے رگِ گل دل میں مثلِ خار اب تک
نہیں ہے موسمِ گل ہم کو سازگار اب تک

ہمارے سوزِ محبت ہی نے لگائی تھی
وہ آگ جس سے جہنم ہے شعلہ زار اب تک

لہو کو رنگ سمجھتے ہیں زخمِ دل کو بہار
انھیں نہیں ہے محبت کا اعتبار اب تک

ذرا سی دیر گریباں پہ ہاتھ رکھے تھے
جنوں کے دیتی ہے طعنے نگاہِ یار اب تک

کبھی تو رخ کو بدل کے چل اے ہوائے وطن
کوئی غریب نہ کرتا ہو انتظار اب تک

یہ چار تنکے نہ ملتے تو برق و باراں نے
چمن اجاڑ دیئے ہوتے بے شمار اب تک

بہت زمانہ ہوا دل پہ چوٹ کھائی تھی
جگر میں ٹیس سی اٹھتی ہے بار بار اب تک

نہ اپنی موت پہ قابو نہ اپنے جینے پر
یہی ہے مسئلۂ جبر و اختیار اب تک

خلوصِ عشق کا صدقہ ترے فریبوں پر
پڑے ہوئے ہیں حباباتِ اعتبار اب تک

اسیرِ دورِ خزاں نے جو بد دعا دی تھی
قفس سے بچ کے نکل جاتی ہے بہار اب تک

حرم میں آ گیا بت خانے سے خفا ہو کر
کوئی ملا ہے صبا سا خدائی خوار اب تک

صبا اکبرآبادی

جہاں میں محبتِ اہلِ جہاں ضروری ہے
مسافروں کے لئے کارواں ضروری ہے

مرے خیال کی رفعت پہ نقشِ پا ہوں ترے
اِس آسمان پہ اِک کہکشاں ضروری ہے

پسند آئے گی یک رنگیٔ بہار کسے
چمن کے واسطے فصلِ خزاں ضروری ہے

یہ سوچ سوچ کے رکھتے ہیں وہ زمیں پہ قدم
کہاں ہے غیر ضروری، کہاں ضروری ہے

چھٹیں قفس سے تو اُجڑے چمن کو دیکھ آئیں
طوافِ خار و خسِ آشیاں ضروری ہے

مآلِ کار اَجل ہو کہ زندگی دل کی
نگاہِ یار ترا امتحاں ضروری ہے

بغیر دوست نہ جنت میں خوش نہ دوزخ میں
کوئی مقام ہو اِک ہم زباں ضروری ہے

جواب کیا دوں الٰہی سوالِ برق یہ ہے
چمن ضروری ہے یا آشیاں ضروری ہے

صلا ہے داغِ وفا تیرگیٔ دل کو صبا
وہیں چراغ جلا ہے جہاں ضروری ہے

پھر اُس نظر نے ہمارے جنوں کو چھیڑا ہے
ابھی تو بخیۂ زخمِ جگر اُدھیڑا ہے

جنوں کے زخم سے انگور سا اُدھیڑا ہے
مجھے خرد نے ترا نام لے کے چھیڑا ہے

تماشبیں ہیں بلاؤں کی سطحِ طوفاں تک
جو تہ نشیں ہوں تو منجدھار ہے نہ بیڑا ہے

یہ عشق تھا کہ مصیبت کو خوشگوار کیا
نہ ہو جو عشق تو جینا بڑا بکھیڑا ہے

تجھے خبر نہیں اے دل گرفتۂ موسم
خزاں بہار کے سیلاب کا تھپیڑا ہے

گزر گئے ہیں اسی شغل میں بہار کے دن
رفو کیا کبھی، دامن کبھی اُدھیڑا ہے

بڑے حسین پریشان خواب دیکھے ہیں
صبا نے آپ کی زلفوں کو جب سے چھیڑا ہے

صباؔ اکبرآبادی

سب اُٹھ گئے ہمیں نہ اُٹھے جلوہ گاہ سے
بیٹھے رہے نگاہ ملائے نگاہ سے

انسان کے زوال پہ کچھ ایسا دُکھ ہوا
ہم جیسے گر گئے ہیں خود اپنی نگاہ سے

انبوہِ خواہشات نے پسپا کیا مجھے
میں نے شکست کھائی ہے اپنی سپاہ سے

اب میرے عشق کا ہے دماغ آسمان پر
اب آپ کام لیجئے نیچی نگاہ سے

آوارگانِ عشق کی حدِ سفر کہاں
منزل ہو سامنے تو پلٹ جائیں راہ سے

دنیا نے آج اپنی نگاہوں سے دیکھ لیں
تیری عنایتیں مرے حالِ تباہ سے

اس طرح کوئے ہوش سے جاتا ہوں جس طرح
غازی پلٹ رہا ہو کوئی رزم گاہ سے

عشقِ تنک مزاج کی اصلاح بھی کرو
عادت بگڑ گئی کرم گاہ گاہ سے

ہم وہ گناہگارِ وفا ہیں جو دہر میں
رحمت کا اعتبار بڑھا دیں گناہ سے

میرا مزاجِ شعر وہاں ہے جہاں صباؔ
خاموشیوں سے غم نہ خوشی واہ واہ سے

ذہن میں سلسلۂ عشق کی روداد نہیں
یاد رکھنے کی تھی ہر بات مگر یاد نہیں

بیڑیاں ٹوٹ کے ٹوٹے نہیں زندانِ رسوم
جسم آزاد ہیں روحیں ابھی آزاد نہیں

خود فراموشیٔ امید کے صدقے، خوش ہوں
اے مرے بھولنے والے مجھے کچھ یاد نہیں

اُس محبت کا ہوس نام مناسب ہوگا
جس محبت کی کسی درد پہ بنیاد نہیں

مطمئن حُسن نے سمجھا ہے مصیبت پہ صباؔ
بات یہ ہے کہ مجھے عادتِ فریاد نہیں

صبا اکبر آبادی

عذابِ ہجر سے مجھ کو اگر چھڑا دے گی
مری اجل کو مری زندگی دعا دے گی

بجا کہ آتشِ الفت مجھے جلا دے گی
یہ آگ اور مری روشنی بڑھا دے گی

ترے نفس کی مہک سے بسا ہوا ہے دماغ
کہیں بھی جا، تری خوشبو ترا پتا دے گی

اٹھاؤں دستِ طلب کیا میں جانبِ دنیا
یہ خود ہی ہے مری محتاج، مجھ کو کیا دے گی

کسی کی یاد ستارہ ہے دل کی دنیا کا
چراغ تو نہیں جس کو ہوا بجھا دے گی

بھلا دیا ہے زمانے نے جیسے اوروں کو
اسی طرح سے یہ دنیا مجھے بھلا دے گی

اسیر میں ہوں تو زنداں میں خامشی کیسی
میں چپ رہوں گا تو زنجیرِ پا صدا دے گی

اٹھاؤ پردۂ رخ، ہے جو ذوقِ خود بینی
نگاہِ شوق تمھیں آئینہ دکھا دے گی

پہنچ ہی جاؤں گا منزل پہ ٹھوکریں کھا کر
غلط روی ہی مجھے راستہ بتا دے گی

میں ایک شعلۂ صحرا ہوں اور بھڑکوں گا
نہیں ہوں شمع کہ جس کو ہوا بجھا دے گی

کچھ اس ادا سے اٹھی ہے نگاہِ ناز صبا
کہ جیسے میری نظر سے مجھے گرا دے گی

اُس ہوا سے ہمیں نے پیار کیا
جس ہوا نے ہمیں غبار کیا

اتنے مجبورِ زندگی تو نہ تھے
ہم نے خود جبر اختیار کیا

جل رہا تھا خوشی سے پروانہ
شمع کو کس نے اشکبار کیا

میرے سینے کے زخم گن لیتے
اپنے تیروں کا کیوں شمار کیا

لوگ انھیں بت بنا کے پوجتے ہیں
ہم نے جن پتھروں سے پیار کیا

تشنہ کامی نے ہوش کھوئے تھے
مے کے چھینٹوں نے ہوشیار کیا

دستِ گل چیں کی انگلیوں نے صبا
دامنِ گل کو داغ دار کیا

صبا اکبرآبادی

پردے میں اب حکایتِ بزمِ جہاں کے
افسانے رہ گئے ہیں دلِ پُرملال کے

اب تم قدم زمیں سے اُٹھانا سنبھال کے
ذرّے بکھر نہ جائیں دلِ پائمال کے

اب آرزوئے دوست میں جینا محال ہے
پچھتا رہا ہوں دل میں قیامت کو پال کے

آئے تھے چارہ سازِ محبت کے بھیس میں
تیروں کے ساتھ لے گئے دل بھی نکال کے

تجھ کو خبر نہیں کہ تری اِک نگاہ سے
کتنے طلسم ٹوٹ گئے ہیں خیال کے

یہ کیا خبر تھی، دل کو کہ رہزن بھی ساتھ ہے
ہم چل رہے تھے چاروں طرف دیکھ بھال کے

ہم چھک کے پی چکے تو کسی سے غرض نہ تھی
میخانے سے نکل گئے ساغر اُچھال کے

اِس زندگی کے دورِ ترقی پسند میں
مبعوث ہو رہے ہیں پیمبر زوال کے

اک نور تھا ازل میں جسے کردگار نے
انساں بنا دیا ترے سانچے میں ڈھال کے

اُس حد تک آنے گا نہ صبا طائرِ مُراد
پھندے پڑے ہوئے ہیں جہاں تک خیال کے

جو نظر ہے وہ موجِ بادہ ہے
آج محفل میں کیا اِرادہ ہے

ہو خبر اُن کی کم نگاہی کو
درد دل میں بہت زیادہ ہے

حدِ دل پہ ٹھہر گئے ہیں ہم
اب نہ منزل ہے اور نہ جادہ ہے

اتنی رنگین ہے مری وحشت
جس قدر حُسن اُن کا سادہ ہے

غم دیئے جاؤ، غم دیئے جاؤ
دامنِ دل بہت کشادہ ہے

دل جو آنکھوں کا ساتھ دے جائے
تیرے دیدار کا ارادہ ہے

میرے قاتل کو دیکھ اے دنیا
کتنا معصوم کیسا سادہ ہے

عشق پر التفات رہنے دے
یہ عنایت بہت زیادہ ہے

غم سے لیتا ہوں انتقام صبا
ورنہ کیا مجھ کو شوقِ بادہ ہے

صبا اکبرآبادی

وہ جوش وہ شباب وہ صورت نہیں رہی
جس پر کبھی تھا ناز وہ دولت نہیں رہی

وجہِ سکونِ دل جو عبادت نہیں رہی
سجدوں کی اب جبیں کو ضرورت نہیں رہی

جتنی تھیں تیرے عشق میں سب کام آگئیں
اب زندگی میں کوئی مصیبت نہیں رہی

جس دن سے ترکِ سیرِ چمن کر چکے ہیں ہم
کلیوں کو مسکرانے کی عادت نہیں رہی

جب سے سمجھ لیا کہ تمھیں سب عزیز ہیں
اس دل میں اب کسی سے عداوت نہیں رہی

وہ دن بھی تھے کہ صرف محبت تھی اور دل
اب داغ رہ گیا ہے محبت نہیں رہی

جس سے کیا سوال، بہاریں کب آئیں گی
اُس نے سمجھ لیا مجھے وحشت نہیں رہی

اس جذبۂ عبث میں بھی کیا ساری کائنات
کچھ بھی نہیں رہا جو محبت نہیں رہی

تم نے بھی کب حجاب اُٹھایا کہ جب ہمیں
اک جنبشِ نگاہ کی مہلت نہیں رہی

نا آشنائے رسم و رہِ دوستی ہیں ہم
یا دوستوں میں رسمِ مروّت نہیں رہی

تو عرضِ مدعا پہ خفا ہو رہے ہیں وہ
اب عرضِ مدعا کی بھی حسرت نہیں رہی

عہدِ فراق تھا کہ پریشان خواب تھا
جب آنکھ کھل گئی شبِ فرقت نہیں رہی

مانا بہت شراب ہے اُس چشمِ مست میں
کیسے پیوں کہ پینے کی عادت نہیں رہی

ہم جیسے کچھ غریبوں کے گھر جل گئے تو کیا
یہ تو ہوا کہ شہر میں ظلمت نہیں رہی

تھی دولتِ الم دلِ بے آرزو کے پاس
وہ بھی ترے کرم کی بدولت نہیں رہی

خونِ جگر سمٹ کے تبسّم میں آگیا
آنکھوں کو آنسوؤں کی ضرورت نہیں رہی

چھٹ کر وطن سے اتنے غریب الوطن ملے
آزردگیٔ عالمِ غربت نہیں رہی

بس اک صبا نہیں ہے تو کوئی کمی نہیں
دنیا نہیں رہی کہ محبت نہیں رہی

الفاظ کراچی ۵۴

صبا اکبرآبادی

پرسشِ غم کا زمانے میں سہارا بھی نہیں
پوچھ لے حال ہمارا کوئی اتنا بھی نہیں

جستجو ترک ہو ان کی یہ گوارا بھی نہیں
وہ کہیں مل بھی سکیں گے یہ بھروسا بھی نہیں

واقعہ یہ ہے کہ آئینہ حیرت ہوں میں
یہ الگ بات کہ اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں

ہمت افزائے تگ و دو تھی ترے شہر کی دھوپ
میں کسی سایۂ دیوار میں ٹھہرا بھی نہیں

اس غلط فہم سے اب ترکِ تمنا کے سوا
کوئی پیرایۂ اظہارِ تمنا بھی نہیں

میں وہ تحریرِ مشیت ہوں سرِ لوحِ حیات
سب جسے پڑھتے ہیں اور کوئی سمجھتا بھی نہیں

تو ذرا سوچ کہ میں تیرے علاوہ کیا ہوں
تو جو میرا نہیں اے دوست تو اپنا بھی نہیں

عرش سے تم نے کبھی پاؤں زمیں پر نہ رکھا
سر پہ کیا ڈالیں کہیں خاکِ کفِ پا بھی نہیں

خیر گزری کہ نظر تم سے دوبارہ نہ ملی
بہک اٹھتا تو کسی سے میں سنبھلتا بھی نہیں

ہم سے منہ پھیر کے گزری ہے جوانی جب سے
آئینہ ہم نے اٹھا کر کبھی دیکھا بھی نہیں

غالباً ان کے تلوّن کا اثر ہے یہ صبا
ورنہ یوں رنگ زمانے کا بدلتا بھی نہیں

کچھ تو اِس عشرتِ باطل کا سہارا ہوتا
غم گوارا جو نہ ہوتا تو گوارا ہوتا

اِک نظر اور بھی جاتی ہوئی دنیا دیکھی
کاش موجوں نے ڈبو کر نہ اُبھارا ہوتا

ان کو پایا ہے تو اب سوچتے رہتے ہیں یہی
وہ نہیں ملتے تو کیا حال ہمارا ہوتا

تم نے یہ نام بتا دینے کی زحمت کیوں کی
ہم تو جو نام بھی لیتے وہ تمھارا ہوتا

کوئی آواز پہ آواز بھلا کیا دے گا
اپنے ہی آپ کو دنیا میں پکارا ہوتا

باغباں دیکھ تو یہ خاک پہ بکھرے ہوئے پھول
ان سے میرے ہی نشیمن کو سنوارا ہوتا

غمِ کہنہ کی صبا قدر کرو غور کرو
اس زمانے میں کوئی اور تمھارا ہوتا؟

صبا اکبرآبادی

کس کا جلوہ نظر آیا ہم کو
سب سے بیگانہ بنایا ہم کو
وحشتِ دل نے سہارا بخشا
ہوش جب راس نہ آیا ہم کو
دولتِ بزمِ محبت ہم تھے
آپ نے مفت گنوایا ہم کو
زندگی بخش جنوں تھا اپنا
عقل نے زہر پلایا ہم کو
دُور رہنے میں بڑی راحت تھی
تم نے کیوں پاس بُلایا ہم کو
اس کی آنکھوں میں چھپے بیٹھے تھے
اس نے ڈھونڈا تو نہ پایا ہم کو
وجہِ آزار فقط تم ہی نہ تھے
جو ملا اُس نے ستایا ہم کو
چین کیا ملتا گلی میں تیری
دھوپ لگنے لگا سایا ہم کو
اے صبا آنکھ میں آنسو بھر آئے
اُس نے اس طرح ہنسایا ہم کو

دامانِ دوست کا مجھے پاسِ ادب رہا
اپنے ہی دل پہ خود مرا دستِ طلب رہا

اللہ رے کسی کی امانت کی احتیاط
جتنا ملا تھا غم وہ مرے دل میں سب رہا

شامِ شباب صبحِ اجل پر تمام تھی
میں منزلِ حیات میں بس ایک شب رہا

ان سے نہ کہہ سکا کہ تمھیں چاہتا ہوں میں
آسودۂ بیاں مرا ذوقِ طلب رہا

آدابِ بزمِ ناز اسے خود سِکھاؤ تم
یہ دل کہ باوجود ادب بے ادب رہا

تیرے بغیر نزع میں گزری ہے زندگی
میں تو تمام عمر یونہی جاں بلب رہا

دنیا کی ہم نے شکل بھی دیکھی نہیں صبا
دنیا جسے ملی وہی دنیا طلب رہا

طارق بشیر

ادب اور ادیب

شاید یہ مسئلہ اِسی دور کی عطا ہے کہ ادیب کو کیسا ادب لکھنا چاہیئے، ورنہ ماضی کے کسی بھی دَور میں کبھی یہ بات رہنمائی کے طور پر کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ادیب کو ادب کن کن ماخذوں سے چُننا چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ شاعر یا ادیب خود کسی یک ڈگر سے چمٹ گیا تو مدتوں تک وہ ڈگر ایک روایت کی طرح لازم خیال بن گئی۔ مثلاً قصیدہ گو شاعروں کی کئی نسلوں پر اِسی ذریعۂ معاش کا احسان رہا ہے یا بادشاہوں کے وظیفہ خوار تاریخ دانوں کی زندگی تھی جو منشی گیری کی صف میں گزری۔ بگران سب ادوار کے اہم شعراء اور اپنی اپنی صنف کے تخلیق کار کبھی اس عذابناک نعرہ بازی کی زد میں نہیں رہے کہ دیکھو فلاں بے حسابا چل رہا ہے یا فلاں شاعر پتہ نہیں کس کے لئے لکھ رہا ہے۔

آج ادیب کے اظہار میں سماجی سطح پر اتنی رکاوٹیں ہیں کہ پہلے تو اُسے بات کرنے ہی پر اتنا تامّل کرنا پڑتا ہے کہ بات ہی رہ جاتی ہے اور اس کی حالت اس شعر کے مماثل ہو جاتی ہے کہ ؎

چُپ جو رہتا ہوں رات جاتی ہے   بات کہتا ہوں، بات جاتی ہے

پھر ہر نئے دَور میں یا کسی ڈھانچے کے سراسر بدل جانے کے سبب وہی نعرہ از سرِ نو دُہرایا جانے لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے کی نہج کو بدل لینے کے لئے ضروری ہے کہ ادیب کو یوں لکھنا چاہیئے۔ اور اس "یوں" میں کبھی عوامی ادب کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے تو کبھی پاکستانی ادب کے پرچم لہرائے جاتے ہیں، کبھی اسلامی ادب کے پوسٹر لگائے جاتے ہیں تو کبھی سیاست کے راستے سوشلزم کی مٹی پلید کی جاتی ہے، اور ادیب بے چارہ چاروں جانب گنگ نظروں سے دیکھتا رہ جاتا ہے کہ وہ کرے تو کیا کرے؟

اس ضمن میں ان اشتہاروں کا ذکر بھی ضروری ہے جو وقتاً فوقتاً چند منشن یافتہ ادیب وابستگی (COMMITMENT) کے سلسلے میں لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی مسلسل رَٹ یہی رہتی ہے کہ ریاست کا وفادار ہونا چاہیئے، اُسے دھرتی اور وطن کی محبت کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ اُس کی نظریاتی سرحدیں وطن کی سرحدوں سے باہر نہ جانے پائیں، نیز اُس کی وابستگی کا ذکر اُس کے تخلیقی کاموں میں زور وشور سے پایا جانا از بسکہ ضروری ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب حالات مبدل ہوتے ہیں، معاشرے کا سیاسی ڈھانچہ بدل جاتا ہے، لوگوں کی ذہنی کیفیت متغیر ہو جاتی ہے تو نقادانِ ادب پھر ایک بار کمر بستہ ہو کر اپنے پُرانے مسوّدوں کی گرد جھاڑ

صبا اکبر آبادی

کس کا جلوہ نظر آیا ہم کو
سب سے بیگانہ بنایا ہم کو

وحشتِ دل نے سہارا بخشا
ہوش جب راس نہ آیا ہم کو

دولتِ بزمِ محبت ہم تھے
آپ نے مفت گنوایا ہم کو

زندگی بخشِ جنوں تھا اپنا
عقل نے زہر پلایا ہم کو

دُور رہنے میں بڑی راحت تھی
تم نے کیوں پاس بُلایا ہم کو

اُس کی آنکھوں میں چھپے بیٹھے تھے
اس نے ڈھونڈا تو نہ پایا ہم کو

وجہِ آزار فقط تم ہی نہ تھے
جو ملا اُس نے ستایا ہم کو

چین کیا ملتا گلی میں تیری
دھوپ لگنے لگا سایا ہم کو

اے صبا آنکھ میں آنسو بھر آئے
اُس نے اس طرح ہنسایا ہم کو

٭

دامانِ دوست کا مجھے پاسِ ادب رہا
اپنے ہی دل پہ خود مرا دستِ طلب رہا

اللہ رے کسی کی امانت کی احتیاط
جتنا ملا تھا غم وہ مرے دل میں سب رہا

شامِ شباب صبحِ اجل پر تمام تھی
میں منزلِ حیات میں بس ایک شب رہا

ان سے نہ کہہ سکا کہ تمھیں چاہتا ہوں میں
آسودۂ بیاں مرا ذوقِ طلب رہا

آدابِ بزمِ ناز اسے خود سکھاؤ تم
یہ دل کہ باوجود ادب بے ادب رہا

تیرے بغیر نزع میں گزری ہے زندگی
میں تو تمام عمر یونہی جاں بلب رہا

دنیا کی ہم نے شکل بھی دیکھی نہیں صبا
دنیا جسے ملی وہی دنیا طلب رہا

طارق بشیر

ادب اور ادیب

شاید یہ مسئلہ اسی دور کی عطا ہے کہ ادیب کو کیسا ادب لکھنا چاہیئے، ورنہ ماضی کے کسی بھی دور میں کبھی یہ بات رہنمائی کے طور پر کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ادیب کو ادب کن کن ماخذوں سے چننا چاہیئے۔ یہ الگ بات ہے کہ شاعر یا ادیب خود کسی ایک ڈگر سے چمٹ گیا تو مدتوں تک وہ ڈگر ایک روایت کی طرح لازم خیال ہو گئی۔ مثلاً قصیدہ گو شاعروں کی کئی نسلوں پر اسی ذریعۂ معاش کا احسان رہا ہے یا بادشاہوں کے وظیفہ خوار تاریخ دانوں کی زندگی تھی جو منشی گیری کی صف میں گزری۔ بگران سب ادوار کے اہم شعراء اور اپنی اپنی صنف کے تخلیق کار کبھی اس عذابناک نعرہ بازی کی زد میں نہیں رہے کہ دیکھو فلاں بے حسایا چل رہا ہے یا فلاں شاعر پتہ نہیں کس کے لئے لکھ رہا ہے۔

آج ادیب کے اظہار میں سماجی سطح پر اتنی رکاوٹیں ہیں کہ پہلے تو اُسے بات کرنے ہی پر اتنا تامّل کرنا پڑتا ہے کہ بات ہی رہ جاتی ہے اور اس کی حالت اس شعر کے مماثل ہو جاتی ہے کہ ؎

چپ جو رہتا ہوں رات جاتی ہے بات کہتا ہوں، بات جاتی ہے

پھر ہر نئے دور میں یا کسی ڈھانچے کے سراسر بدل جانے کے سبب وہی نعرہ از سر تو دُہرایا جانے لگتا ہے کہ ہمارے معاشرے کی ہیئت کو بدل لینے کے لئے ضروری ہے کہ ادیب کو یوں لکھنا چاہیئے۔ اور اس "یوں" میں کبھی عوامی ادب کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے تو کبھی پاکستانی ادب کے پرچم لہرائے جاتے ہیں، کبھی اسلامی ادب کے پوسٹر لگائے جاتے ہیں تو کبھی سیاست کے راستے سوشلزم کی مٹی پلید کی جاتی ہے، اور ادیب بے چارہ چاروں جانب گنگ نظروں سے دیکھتا رہ جاتا ہے کہ وہ کرے تو کیا کرے؟

اس ضمن میں ان اشتہاروں کا ذکر بھی ضروری ہے جو وقتاً فوقتاً چند نشین یافتہ ادیب وابستگی (COMMITMENT) کے سلسلے میں لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی مسلسل رٹ یہی رہتی ہے کہ ریاست کا وفادار ہونا چاہیئے، اُسے دھرتی اور وطن کی محبت کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ اُس کی نظریاتی سرحدیں وطن کی سرحدوں سے باہر نہ جانے پائیں، نیز اُس کی وابستگی کا ذکر اُس کے تخلیقی کاموں میں زور شور سے پایا جانا ازبکہ ضروری ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب حالات مبدل ہوتے ہیں، معاشرے کا سیاسی ڈھانچہ بدل جاتا ہے، لوگوں کی ذہنی کیفیت متغیر ہو جاتی ہے تو نقادانِ ادب پھر ایک بار کمر بستہ ہو کر اپنے پُرانے مسودوں کی گرد جھاڑتے

ہیں اور ادب کے لئے کوئی دُم چھلا گھڑ کے نئے عنوان سے پُرانی تحریر کسی رسالے کو ارسال کر دیتے ہیں اور اُنہی کے ہمراہ وہ پنشن یافتہ طبقہ بھی اپنے اپنے مضمون کی ایک فوٹو کاپی کسی روزنامے کو اشاعت کی غرض سے بھجوا دیتا ہے کہ ادیب کی وابستگی واضح ہونی چاہئیے۔ ادیب کو کولہو کا بیل جانتے والے یہ جُغادری عام طور پہ واضح وابستگی کی صراحت گول مول کرتے ہیں کہ اس کی تشریح ان کا کام نہیں یعنی ذمہ داری سے خود کو مستثنےٰ بھی جانتے ہیں۔

ایسی صورت میں جب کہیں سے اسلامی ادب کی آواز بلند ہوتی ہے، کہیں سے پاکستانی ادب کا نعرہ لگتا ہے۔ کہیں سے عوامی ادب کی لگام ادیب کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، ادیب کی صورتِ حال اُس طالب علم کی سی ہوتی ہے جو ایک سال اپنے نصاب میں قائداعظم کو پڑھتا ہے، دوسرے سال قائدِ ملت کا باب پڑھتا ہے، تیسرے سال مادرِ ملت دوسرے باب کی جگہ لیتی ہیں، چوتھے سال قائدِ عوام اُسے پڑھایا جاتا ہے اور پھر اگلے سال دوبارہ قائداعظم کا باب پڑھنا پڑتا ہے۔ اور یوں ششم و ہفتم میں وہ میٹرک تک ان سب شخصیات کے بارے میں کوئی واضح IMAGE نہیں بنا سکتا۔ یہی حال اس کا اسلامیات، سوشلزم، اسلامی سوشلزم، مساواتِ محمدی اور پھر اسلامیات پڑھنے کے باعث ہوتا ہے۔ ایسا طالب علم اور ایسا ادیب کہاں ٹھہر سکتا ہے؟

بعض اوقات ادب کے لئے سمت مقرر کرنے والی آوازوں میں اتنی گھمبیرتا پائی جاتی ہے اور اُن آوازوں کے ہجوم کا ردِ عمل اوپر کی سطحوں پر بھی اتنا شدید دکھائی دیتا ہے کہ عام آدمی یوں محسوس کرتا ہے جیسے عنقریب حکومت تعلیمی اور زرعی پالیسیوں کی طرح کوئی شعری یا ادبی پالیسی بھی نافذ کرنا چاہتی ہے۔ گو اس طرح کا کوئی باقاعدہ اعلان کبھی نہیں ہوا۔ مگر مقتدر ادیبوں کے ٹولے نے خود سے ایسی پالیسیاں ضرور مرتّب کئے رکھی ہیں جن کے تحت وہ صرف پسندیدہ ادیب یا پسندیدہ لوگوں ہی کی تخلیق کو معیاری ادب قرار دیتے رہے ہیں۔ اور یہ معیار پذیری اخباروں سے لے کر ٹی وی تک گھن گرج کے ساتھ برستی رہی ہے۔

نظامِ تعلیم کے مزاج یافتہ نقّاد ادیب کے لئے نئے دائرے وضع کرتے رہتے ہیں اور ہر نئے دور کی سطحی ضرورتوں کے مطابق اس میں ترمیم بھی کرتے رہتے ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے کہ اسلامی اُمنگوں کا ادب قابلِ ترجیح ہے یا پاکستانی اُمنگوں کا ترجمان ادب۔ آیا ادیب پہلے مسلمان بنے یا پہلے پاکستانی۔ پھر مسلمان ہونے کے ناطے اُس کا جو تعلق عرب، عجم کی ریاستوں کے مسلمانوں سے ہے، اس رابطے میں ہندوستانی، چینی اور روسی مسلمانوں سے رشتہ داری میں کیا فرق اُسے ملحوظ رکھنا چاہئیے۔ عوامی ثقافتوں کے ترجمان ادب پر پورا اترنے کے لئے کیا وہ اسلوب میں عوام کی سطح کا خیال رکھے یا عوام کی تفریح کو مدِّ نظر رکھے یا عوام کی اصلاح اور فلاح و بہبود کا بیڑا اٹھائے۔ اور یہیں سے ادب کے 'زندگی یا محض فن کے' دائرے میں داخل ہونے کا مسئلہ شروع ہوتا ہے کہ ادب برائے ادب ہونا چاہئیے یا ادب برائے زندگی!

ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کا معاملہ بھی اس سے آگے قطعاً نہیں بڑھتا کہ ادب برائے زندگی ہی اصل ادب ہے۔ یعنی جیسے لکھنے والے کی وابستگی کا صاف اور عیاں ہونا نہایت ضروری ہے، اسی طرح ادب کو بھی زندگی سے واضح اور عیاں واسطہ برقرار رکھنا چاہئیے اور لکھنے والے کی تخلیقوں میں زندگی کے اعلانات بھی متواتر آنے چاہئیں۔ ایسے لمحے پر وہی پنشن یافتہ بزرگانِ ادب یہ یاد دلانا ہرگز نہیں بھولتے کہ ادیب کو ادب برائے زندگی (مقصدیت) کے تحت ایسا ادب تخلیق کرنا چاہئیے جو زندگی کے جیتے جاگتے حقائق کی عکّاسی کرے، اور چونکہ ادیب زندوں میں شمار کیا جاتا ہے اور چوں کہ وہ زندوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتا اور چونکہ اُس کی سوچ خلاء میں نہیں رہ سکتی اور چونکہ وہ خلاء کا باشندہ نہیں۔ لہذا اس ہزار رنگ چونکہ کا جواب ایک ہی ہے کہ ادیب کو اپنے سامنے کی بات کرنی چاہئیے۔ جب کہ ایسی طول طویل شرطیں باندھنے والے ادیب

زندگی بھر سامنے والی اکثر باتوں پر خاموش رہتے ہیں اور اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ یہ سب شرائط دنیا میں کسی بھی تخلیق کار کے لئے تحریری دستور یا مسوّدۂ آئین کی حیثیت کبھی اختیار نہیں کر سکیں۔ گو ان شرائط کا اصل خمیر ہی ادیب کا خمیر ہے۔ اور وہ اُسے ان پیش پا اُفتادہ حد بندیوں کے بارے میں بتائے جانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہاں البتہ یہ بات کہ وہ ان شرائط کو کس انداز سے ملحوظ رکھتا ہے، اس کے اسلوب فکر پر منحصر ہے۔ بے شک اگر کوئی ادب پارہ، ادب برائے ادب کی ذیل میں آتا ہے اور اس سے انسانی طرز حیات کے کسی پہلو کی نفی نہیں ہوتی تو وہ بھی اعلیٰ ادب ہو سکتا ہے۔

ادبی وابستگی (COMMITMENT) کے بارے میں یوں طول طویل تقریریں کرنے والوں کا اصل مطمح نظر ادیب کی سیاسی حیثیت متعیّن کرنے کی کوشش ہے کہ ادیب کو واضح طور پر یہ اعلان کرنا چاہئیے کہ وہ دائیں بازو سے ہے یا بائیں بازو سے، اور پھر وہ دائیں یا زد یا بائیں یا زد کا نمائندہ بن کر لکھے۔ یہی سبب ہے کہ اردو کے جتنے مؤقر جریدے شائع ہوتے ہیں اُن میں بہت کم ایسے ہیں جو اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ یہ غزل دائیں طرف کی ہے یا بائیں طرف کی اور بعض جگہوں پر تو مسلسل وہی ایک سے نام پڑھ پڑھ کر لگتا ہے کہ ان سب ادیبوں نے مل کر چندے سے یہ شمارہ شائع کیا ہے۔ یہی وابستگی جب عوامی دور میں، عوامی ادب کی یہ چارک تھی تو جگہ جگہ سے عوامی ادیب برساتی مینڈکوں کی طرح ٹرّانے لگے تھے۔ اب حالات بدل گئے ہیں تو پھر آج کل بے شمار لوگ پاکستانی ادب، پاکستانیت، اسلامی ادب اور اپنی تہذیب و ثقافت کے جھنڈے لہرانے لگے ہیں، اور ادیب کی حالت اُس شیر کی سی ہو گئی ہے جو آدم خوری سے تائب ہو کر شہر آ گیا تھا۔ مگر ہنگامی حالات کے پیش نظر اس کیفیت سے دوچار ہے کہ واپس چلا جائے یا سرکس میں بھرتی ہو جائے!

خلاصۂ کلام یہ کہ کیا ادیب کو خارجی حالات کا رُخ دیکھ کر داخلی حالات کا تعین کرنا چاہئیے اور کیا کسی سماجی، مذہبی یا سیاسی ادارے کو قطب نما سمجھ کر ادب کی سمت مقرر کرنی چاہئیے یا اندر کی آواز کو بھی کچھ اہمیت حاصل ہے؟

نسیم درّانی (پبلشر) نے انجمن پریس (پرنٹر) سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ "الفاظ" بلاک "ڈی" شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸ سے شائع کیا —
(اشاعت: مئی جون ۱۹۸۳ء چوتھا شمارہ)

سیپ
ہر بار
پرانے اور نئے
ناموں کے ساتھ
معیاری اور اچھی
تحریریں
پیش کرتا ہے
سیپ
فکرِ نو کا ترجمان
مدیر
نسیم درانی

سُلطان جمیل نسیم

ویران دیواریں

فائر کی آواز سنتے ہی اس نے پر تولے اور اُڑ گیا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ خالی دیوار نے مجھ پر قہقہوں کے ہنٹر برسا دیئے ہیں۔ میں دیوار کی ویرانی کے درد سے چیخنے لگا۔ اس کو آوازیں دینے لگا۔ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ اس کو بتانے لگا کہ یہ فائر اس کے لئے نہیں تھا۔ میں نے تو دشمن کو نشانہ بنایا تھا لیکن اس نے ایک نہ سُنی اور ایسا دہشت زدہ ہو کر اڑا کہ پلٹ کے دیکھا بھی نہیں۔

ایک دن . . . بس اتفاق سے اس پر میری نظر پڑ گئی تھی۔ دیکھتے ہی اس کی صورت دل میں اُتر آئی۔ اتنا حسین تھا کہ اس کے بیٹھنے سے دیوار میں سجاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ دیوار کس کی ہے۔ اس کے پیچھے کون رہتا ہے اور کیا کرتا ہے بلکہ وہ دیوار بھی مجھے اسی لئے دکھائی دی کہ وہ بیٹھا تھا۔

میں اس کو دیکھ کر ایسا دیوانہ ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔ ہر وقت ایک ہی خیال رہنے لگا کہ کسی طرح وہ میری دیوار پر آن بیٹھے۔

ایسا سفید بھک . . . ایسا خوبصورت پرندہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی مصروفیتوں میں ایسے حسن کا خیال تک نہ آیا تھا۔ میں تو ہر لمحے اپنے دشمن کو زک پہنچانے اور زیر کرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ بندوق اور بارود میں ہر وقت گھرے رہنے کے باعث میں نے کبھی سوچا تک بھی نہیں تھا کہ دُنیا میں ایک پرندہ ایسا بھی ہے جس کو دیکھنے سے سکون مل سکتا ہے اور جس کے بیٹھنے سے دیوار سج سکتی ہے۔

اسے ایک اجنبی دیوار پر بیٹھے دیکھ کر مجھے یہ دُھن لگی کہ کسی طرح وہ اب میری دیوار پر بھی آن بیٹھے۔ میں نے بارود کا کھیل بند کیا۔ بندوق کو ایک طرف ڈالا۔ اپنی دیوار کو پودوں اور پھولوں سے سجایا۔ طرح طرح کا اناج ڈالا کہ کسی سبب تو وہ میری دیوار پر چلا آئے۔

مجھے خبر نہیں کہ میری اس دیوانگی پر میرے ساتھیوں نے کتنی ناک بھوں چڑھائی . . . کیسی باتیں بنائیں . . . کیا کیا طعنے دیئے میں تو ہر بات سے بے نیاز، اسی ایک خیال کی چادر اوڑھ کر بیٹھ گیا کہ بس وہ میری دیوار پر آن بیٹھے۔ پھر اس پاس والے میری دیوار دیکھیں اور رشک کریں۔

جب سے میں نے اسے دیکھا اس وقت سے یہ معلوم ہوا کہ لوگ اُونچی دیوار کی پہچان یہ بھی بتلاتے ہیں کہ اس پہ پنکھ پکھیرو بیٹھے ہوں۔۔۔ اس کو دیکھنے سے پہلے تو دیوار کی مضبوطی میرے پیش نگاہ رہتی تھی کہ دشمن کسی صورت بھی ڈھا نہ سکے۔۔ مگر اب۔۔۔ ہر لمحے۔۔۔ مجھے اپنی یہ خواہش دیوار پر بیٹھی نظر آنے لگی کہ وہاں جب تک دُودھ کا دھویا سفید پرندہ موجود نہ ہو اس وقت تک دیوار کی بلندی واضح ہوسکتی ہے۔ نہ اس کے خوبصورت ہونے کا احساس پیدا ہوسکتا ہے اور نہ دوسرے برتری تسلیم کر سکتے ہیں۔

اس کے خیال میں گم ہوتے مجھے کتنا عرصہ لگا۔۔۔ میری دیوار نے موسموں کی کتنی چادریں بدلیں۔ میرے دشمن نے کتنی تیاریاں کیں میری بندوق نے کتنا زنگ کھایا۔۔ مجھے خبر نہیں۔۔۔ مجھے تو وہ دن یاد ہے جب خواہشوں کے پردے ہٹا کے خوشبوں کا سورج طلوع ہوا اور تعبیروں کی دُھوپ پھیلی اور میں نے اس کو اپنی دیوار پر بیٹھا دیکھا۔

بہت دن تک میں اس کی آمد کا جشن مناتا رہا۔ میرے کچھ ساتھیوں نے اظہارِ مسرت کے لئے ہوائی فائر کئے تو میں نے ان کو جھڑک دیا اور سمجھایا کہ اگر ان آوازوں سے پریشان ہو کر وہ اُڑ گیا تو دیوار پھر سونی ہو جائے گی۔ خوشیوں کا اظہار کرنا ہے تو گیت گاؤ۔۔۔ رقص کرو۔۔۔ محفلیں سجاؤ۔۔۔ پھول سمیٹو۔۔۔ خوشبو پھیلاؤ۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کو دیکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا۔ ہر وقت یہ احساس رہتا کہ جیسے زمانے بھر کی دولت حاصل ہوگئی ہے۔ ایک دن جب میں ایسی ہی طمانیت کے احساس کو آنکھوں سے دل میں اتار رہا تھا کہ مجھے کسی نے خبر دی کہ دشمن کا ایک قافلہ دیوار کے پاس سے گزرنے والا ہے۔ خدا معلوم وہ کونسی قاتل ساعت تھی کہ میں اس طرح چونک پڑا جیسے نیند سے بیدار ہوا ہوں۔۔۔ سوئی ہوئی دشمنی جاگ اُٹھی۔ میں نے۔۔۔ بندوق صاف کی۔۔۔ میگزین بھرا۔۔۔ نشانہ لیا اور پہلا فائر داغ دیا۔

دشمن کا کوئی آدمی ہلاک ہوا یا زخمی۔۔۔ مجھے خبر نہیں۔۔۔ مجھے تو صرف اتنی خبر ہوئی کہ فائر کی آواز سنتے ہی اس نے پر تولے اور اُڑ گیا۔

دیوار کی ویرانی دیکھ کر میرے سینے میں پچھتاوے کے بگولے اُٹھنے لگے۔ اس کے اُڑنے کا دُکھ مجھ پر ایسا چھایا کہ میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ دشمن بچ نکلا۔ میری آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔۔۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دُوربین لگا کر دیکھا۔ مجھے ایک دھچکہ سا لگا۔ وہ میرے دشمن کی دیوار پہ بیٹھا تھا۔

میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ دشمن کی دیوار آنکھوں میں کھٹکنے لگی میں نے وسل بجائی۔

اٹینشن۔

فارورڈ مارچ۔

جب ہم دشمن کی دیوار کے پاس پہنچے اور جنگ کا بگل بجایا تو تب بھی وہ خاموش بیٹھا ہمیں تکتا رہا۔

جب ذہن کے گوشے سے یہ خیال ابھرا کہ اس کے بیٹھنے کی وجہ سے دشمن کی دیوار بھی اچھی لگ رہی ہے تو میں نے محض اس کو اُڑانے کے لئے پہلا فائر کیا۔

وہ منقار زیر پر کئے بیٹھا رہا۔

میں نے دوسرا فائر کیا۔

اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا پھر بے نیازی سے پَر کریدنے لگا۔
میں نے تیسرا فائر کیا۔
وہ پھر بھی نہیں اُڑا۔
پھر میں نے اپنے دشمن کو للکارا۔ اس کی جانب سے بھی خاموشی بولتی رہی۔
تب میں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ اس دیوار کو ڈھا دو۔
دیوار میں شگاف پڑ گیا اور اینٹیں دشمن پر گرنے لگیں مگر وہ اسی بے نیازی کے ساتھ بیٹھا رہا۔
مجھے حیرت ہوئی کہ میرے فائر سے بدک کر میری دیوار سے اُڑنے والا . . . اتنی گھن گرج ہونے کے باوجود اب تک دشمن کی دیوار پر بیٹھا ہے۔
پھر مسلسل بندوقیں چلتی رہیں۔ توپیں داغی جاتی رہیں۔ بم پھٹتے رہے۔ دیوار میں شگاف پر شگاف پڑتے رہے مگر وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔
دھماکے اور بڑھے . . . دشمن ہراساں ہو کر چیخنے لگا۔ اس کی عورتیں گریہ کرنے لگیں۔ بچے چلّانے لگے مگر وہ اپنے سکوت میں گم . . . سارے ہنگامے سے بے پرواہ اپنے خوبصورت پَروں کو چونچ سے ٹٹولتا رہا۔
اس کا اطمینان ہی میرے اضطراب کا سبب بن گیا۔
مجھے اس وقت اپنے دشمن کو ختم کر دینے سے زیادہ یہ خیال تھا کہ وہ اس دیوار سے اُڑ جائے مگر وہ ایسا جم کر بیٹھا تھا کہ میری بندوقوں، توپوں، بموں اور بارودی دھماکوں سے کوئی اثر لے رہا تھا نہ دشمن کے زخمی ہونے والے لوگوں کی کراہیں فریادیں اور ماتم کی صدائیں اس کو چونکا . . . . رہی تھیں۔ گرتی ہوئی دیوار کی دھول، پھیلتی ہوئی آگ کا دھواں بھی اُسے ہراساں نہیں کر رہا تھا۔
اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی موجودگی کے باعث اتنے شگاف پڑنے کے باوجود دشمن کی دیوار کا حسن جوں کا توں برقرار تھا اور یہی بات میرے اشتعال کے لئے کافی تھی۔
جنون کی دُھند میرے دماغ میں پھیلتی جا رہی تھی۔ غصّے کا دھواں میرے سینے میں بڑھتا جا رہا تھا پھر مجھے دشمن کی حیرت ناک خاموشی بھی اپنی بندوق کی نال پر بیٹھی ایسے لگ رہی تھی جیسے وہ اس مسمار ہوتی ہوئی دیوار پر . . . بیٹھا تھا۔
دیوار ڈھے گئی مگر وہ اس کے ملبے کے ڈھیر پر بیٹھا رہا۔
اب مجھے اس کے ساتھ اپنے دشمن کی خاموشی بھی کھلنے لگی کہ وہ کس حکمتِ عملی سے کام لے رہا ہے جو دیوار گرنے کے باوجود اپنے اتنے سارے لوگوں کے مرنے اور زخمی ہونے پر بھی خاموش ہے۔ کہیں اس کی خاموشی بھی بم کی طرح نہ پھٹ پڑے اس لئے میں نے حکم دیا کہ اس خاموشی کو بھی ریزہ ریزہ کر دو۔
اس سے قبل کہ میرے حکم کی تعمیل ہو۔ دشمن کی جانب سے بندوق کا پہلا دھماکہ ہُوا۔ گولی میری طرف آئی۔ میں نے اپنے بازو سے آگ جیسے نکلتے ہوئے خون کو دوسرے ہاتھ سے دبایا اور اس ملبے کی جانب نگاہ اٹھائی جہاں سے گولی آئی تھی کہ میرے زخم کی کسک خوشی بن کر میرے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔
وہ دشمن کی دیوار سے بھی اُڑ گیا تھا۔

جب سے میں نے اسے دیکھا اس وقت سے یہ معلوم ہُوا کہ لوگ اُونچی دیوار کی پہچان یہ بھی بتلاتے ہیں کہ اس پہ پنکھ پکھیرو بیٹھے ہوں۔۔۔ اس کو دیکھنے سے پہلے تو دیوار کی مضبوطی میرے پیشِ نگاہ رہتی تھی کہ دشمن کسی صورت بھی ڈھا نہ سکے۔۔۔ مگر اب۔۔۔ ہر لمحے۔۔۔ مجھے اپنی یہ خواہش دیوار پر بیٹھی نظر آنے لگی کہ وہاں جب تک دُودھ کا دھویا سفید پرندہ موجود نہ ہو اس وقت تک دیوار کی بلندی واضح ہو سکتی ہے۔ نہ اس کے خوبصورت ہونے کا احساس پیدا ہو سکتا ہے اور نہ دوسرے برتری تسلیم کر سکتے ہیں۔

اس کے خیال میں گم ہوتے مجھے کتنا عرصہ لگا۔۔ میری دیوار نے موسموں کی کتنی چادریں بدلیں۔ میرے دشمن نے کتنی تیاریاں کیں۔ میری بندوق نے کتنا زنگ کھایا۔۔۔ مجھے خبر نہیں۔۔۔ مجھے تو وہ دن یاد ہے جب خواہشوں کے پردے ہٹا کے خوشیوں کا سورج طلوع ہُوا اور تعبیروں کی دُھوپ پھیلی اور میں نے اس کو اپنی دیوار پر بیٹھا دیکھا۔

بہت دن تک میں اس کی آمد کا جشن مناتا رہا۔ میرے کچھ ساتھیوں نے اظہارِ مسرت کے لئے ہوائی فائر کئے تو میں نے ان کو جھڑک دیا اور سمجھایا کہ اگر ان آوازوں سے پریشان ہو کر وہ اُڑ گیا تو دیوار پھر سونی ہو جائے گی۔ خوشیوں کا اظہار کرنا ہے تو گیت گاؤ۔۔ رقص کرو۔۔ محفلیں سجاؤ۔۔ پھول سمیٹو۔۔ خوشبو پھیلاؤ۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کو دیکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا۔ ہر وقت یہ احساس رہتا کہ جیسے زمانے بھر کی دولت حاصل ہو گئی ہے۔ ایک دن جب میں ایسی ہی طمانیت کے احساس کو آنکھوں سے دل میں اتار رہا تھا کہ مجھے کسی نے خبر دی کہ دشمن کا ایک قافلہ دیوار کے پاس سے گزرنے والا ہے۔ خدا معلوم وہ کونسی قاتل ساعت تھی کہ میں اس طرح چونک پڑا جیسے نیند سے بیدار ہُوا ہوں۔۔۔ سوئی ہوئی دشمنی جاگ اُٹھی۔ میں نے۔۔۔ بندوق صاف کی۔۔۔ میگزین بھرا۔۔۔ نشانہ لیا اور پہلا فائر داغ دیا۔

دشمن کا کوئی آدمی ہلاک ہُوا یا زخمی۔۔۔ مجھے خبر نہیں۔۔۔ مجھے تو صرف اتنی خبر ہوئی کہ فائر کی آواز سُنتے ہی اس نے پَر تولے اور اُڑ گیا۔

دیوار کی ویرانی دیکھ کر میرے سینے میں پچھتاوے کے بگولے اُٹھنے لگے۔ اس کے اُڑنے کا دُکھ مجھ پر ایسا چھایا کہ میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ دشمن بچ نکلا۔ میری آنکھیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔۔۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے دُوربین لگا کر دیکھا۔ مجھے ایک دھچکہ سا لگا۔ وہ میرے دشمن کی دیوار پہ بیٹھا تھا۔

میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ دشمن کی دیوار آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ میں نے وسل بجائی۔

اٹینشن۔

فارورڈ مارچ۔

جب ہم دشمن کی دیوار کے پاس پہنچے اور جنگ کا بگل بجایا تو تب بھی وہ خاموش بیٹھا ہمیں تکتا رہا۔

جب ذہن کے گوشے سے یہ خیال ابھرا کہ اس کے بیٹھنے کی وجہ سے دشمن کی دیوار بھی اچھی لگ رہی ہے تو میں نے محض اس کو اُڑانے کے لئے پہلا فائر کیا۔

وہ منقار زیرِ پر کئے بیٹھا رہا۔

میں نے دوسرا فائر کیا۔

اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا پھر بے نیازی سے پَر کریدنے لگا۔
میں نے تیسرا فائر کیا۔
وہ پھر بھی نہیں اُڑا۔
پھر میں نے اپنے دشمن کو للکارا۔ اس کی جانب سے بھی خاموشی بولتی رہی۔
تب میں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ اس دیوار کو ڈھا دو۔
دیوار میں شگاف پڑ گیا اور اینٹیں دشمن پر گرنے لگیں مگر وہ اسی بے نیازی کے ساتھ بیٹھا رہا۔
مجھے حیرت ہوئی کہ میرے فائر سے بدک کر میری دیوار سے اُڑنے والا . . . اتنی گھن گرج ہونے کے باوجود اب تک دشمن کی دیوار پر بیٹھا ہے۔
پھر مسلسل بندوقیں چلتی رہیں۔ توپیں داغی جاتی رہیں۔ بم پھٹتے رہے۔ دیوار میں شگاف پر شگاف پڑتے رہے مگر وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔
دھماکے اور بڑھے . . . دشمن ہراساں ہو کر چیخنے لگا۔ اس کی عورتیں گریہ کرنے لگیں۔ بچے چلّانے لگے مگر وہ اپنے سکوت میں گم . . . سارے ہنگامے سے بے پرواہ اپنے خوبصورت پَروں کو چونچ سے ٹٹولتا رہا۔
اس کا اطمینان ہی میرے اضطراب کا سبب بن گیا۔
مجھے اس وقت اپنے دشمن کو ختم کر دینے سے زیادہ یہ خیال تھا کہ وہ اس دیوار سے اُڑ جائے مگر وہ ایسا جم کر بیٹھا تھا کہ میری بندوقوں، توپوں، بموں اور بارودی دھماکوں سے کوئی اثر لے رہا تھا نہ دشمن کے زخمی ہونے والے لوگوں کی کراہیں فریادیں اور ماتم کی صدائیں اس کو چونکا . . . . رہی تھیں۔ گرتی ہوئی دیوار کی دھول، پھیلتی ہوئی آگ کا دھواں بھی اُسے ہراساں نہیں کر رہا تھا۔
اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی موجودگی کے باعث اتنے شگاف پڑنے کے باوجود دشمن کی دیوار کا حسن جوں کا توں برقرار تھا اور یہی بات میرے اشتعال کے لئے کافی تھی۔
حزن کی دُھند میرے دماغ میں پھیلتی جا رہی تھی۔ غصے کا دھواں میرے سینے میں بڑھتا جا رہا تھا پھر مجھے دشمن کی حیرت ناک خاموشی بھی اپنی بندوق کی نال پر بیٹھی لیے لگ رہی تھی جیسے وہ اس مسمار ہوتی ہوئی دیوار پر . . . بیٹھا تھا۔
دیوار ڈھے گئی مگر وہ اس کے ملبے کے ڈھیر پر بیٹھا رہا۔
اب مجھے اس کے ساتھ اپنے دشمن کی خاموشی بھی کھلنے لگی کہ وہ کس حکمتِ عملی سے کام لے رہا ہے جو دیوار گرنے کے باوجود اپنے اتنے سارے لوگوں کے مرنے اور زخمی ہونے پر بھی خاموش ہے۔ کہیں اس کی خاموشی بھی بم کی طرح نہ پھٹ پڑے اس لئے میں نے حکم دیا کہ اس خاموشی کو بھی ریزہ ریزہ کر دو۔
اس سے قبل کہ میرے حکم کی تعمیل ہو۔ دشمن کی جانب سے بندوق کا پہلا دھماکہ ہُوا۔ گولی میری طرف آئی۔ میں نے اپنے بازو سے آگ جیسے نکلتے ہوئے خون کو دوسرے ہاتھ سے دبایا اور اس ملبے کی جانب نگاہ اٹھائی جہاں سے گولی آئی تھی کہ میرے زخم کی کسک خوشی بن کر میرے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔
وہ دشمن کی دیوار سے بھی اُڑ گیا تھا۔

علی حیدر ملک

مختصر افسانہ اور نظریے کی پخ

مختصر افسانہ ایک فن ہے اور نظریہ اس کی پخ!

لیکن ٹھہریئے۔ مختصر افسانے کی باری تو بعد میں آتی ہے پہلے تو اسی بات پر غور اور بحث کی ضرورت ہے کہ کیا کسی فن یا فنون لطیفہ کا مقصد نظریئے کا اظہار ہوتا ہے اور کیا یہ دونوں یعنی فن اور نظریہ لازم و ملزوم ہیں؟ موجودہ دنیا میں تقریباً ہر جگہ اور ہر زبان میں جہاں کچھ ایسے فنکار نظر آئیں گے جنہوں نے اپنی نظریاتی بنیاد پر اصرار کیا ہے وہاں بے شمار ایسے فنکار بھی دکھائی دیں گے جن کے ہاں کسی نظریئے کا دور دور تک کوئی پتہ نہیں ہے اسی سے معاملہ الجھتا نظر آتا ہے لیکن ذرا غور کیجئے تو کم سے کم یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ نظریہ فن کی شرط میں شامل نہیں ہے اور یہ محض ایک اضافی چیز ہے ورنہ دوسری قسم کے فنکاروں کا سرے سے کہیں وجود نہ ہوتا۔

نظریہ کوئی بھی ہو اور کیسا بھی ہو مگر ہر نظریہ ساز یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے زندگی کی مکمل تشریح و تعبیر کر دی ہے مگر زندگی زبان حال سے ہر ایسے دعوے کو پیہم جھٹلاتی اور باطل قرار دیتی رہتی ہے کیونکہ زندگی تو بتوں کی مانند بلکہ ان سے بھی زیادہ بہت سارے ایسے شیوؤں کی خالق و امین ہے جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ زندگی کی بوقلمونی اور بے کرانی کسی فارمولے میں قید نہیں ہو سکتی۔ ہر جامہ اس پر تنگ نظر آتا ہے۔

اب آیئے مختصر افسانے کی طرف۔ مختصر افسانہ ادب کی ایک صنف ہونے کے باوجود اپنی ماہیت اور تقاضوں کے اعتبار سے دیگر اصناف سے مختلف ہے۔ اس میں فنی طور پر جتنی بھی تبدیلیاں رونما ہو جائیں لیکن اس کی اس بنیادی صفت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی کہ یہ زندگی کا صرف ایک رخ پیش کرتا ہے۔ اسی لئے افسانہ نگار کو زندگی کے ہر رخ ہر رنگ کی تصویر کشی پر آمادہ اور قادر ہونا چاہیئے۔ نظریئے کی عینک سے ایک طرف جہاں وہ کلر بلائنڈ ہو جاتا ہے وہاں دوسری طرف جان لیوا یکسانیت کا بھی شکار ہوتا ہے۔ افسانہ اپنے مزاج کے اعتبار سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس میں انسان کے ان اعمال اور زندگی کے ان مظاہر کا بھی احاطہ کیا جائے جو اپنی تفسیر یا جواز آپ ہی ہیں۔ ایک خدا پرست شخص کی خدا پرستی کے علاوہ اس کی زندگی میں در آنے والے لمحۂ کفر کو بھی موضوع بنایا جائے۔ ظالم کی زندگی کے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی جائے جس میں وہ مظلوم نظر آتا ہے۔ سرمایہ دار کی مزدور دشمنی کے ساتھ مزدور کی مزدور دشمنی کو بھی بے نقاب کیا جائے۔ گویا افسانے کی صنف اپنی نوعیت کے لحاظ سے جزو کو پیش کرتی ہے اور ضروری نہیں کہ جزو ہمیشہ کل سے مطابقت ہی رکھتا ہو۔

نظریہ سازی اور نظریہ بازی رواں صدی کی دین ہے مگر ہمارے ادب میں اس کا غلغلہ بعض وجوہ کی بناء پر چوتھی دہائی میں

بلند ہوا مگر پھر بہت جلد ہی اس کا طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

اردو افسانے کی تاریخ میں ہم نے دیکھا کہ منٹو، بیدی اور غلام عباس کو ابتدا میں خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی جس کا سبب ان کا نظریئے کی بجائے اپنی نظر پہ اصرار تھا۔ گرد ذرا بیٹھی تو یہی لوگ جو نظریہ پسندوں کی نظر میں معتوب تھے۔ اُردو افسانے کے بلند ترین مینار قرار پائے۔ پریم چند اور کرشن چندر کی تمام خوبیوں کے باوجود جس چیز نے انھیں نقصان پہنچایا وہ یہی نظریہ بازی تھی۔ اگر یہ اپنے نظریئے پر اس قدر اصرار نہ کرتے تو یقیناً ان کا فن زیادہ بلند اور رفیع ہوتا۔ اب بھی دراصل ان کی عظمت کا دارومدار بیشتر ایسی کہانیوں پر ہے جن میں انہوں نے اپنے نظریات کو یا تو بھلا دیا ہے یا انہیں پسِ پُشت ڈال دیا ہے۔

آج کل ہر طرف کومٹ منٹ کی اصطلاح سننے میں آ رہی ہے جس کو دیکھو نئے لکھنے والوں پر الزام لگا رہا ہے کہ ان کی کومٹ منٹ نہیں ہے۔ ہائے واویلا کر رہا ہے کہ دیکھو یہ کیسے ادیب و شاعر ہیں جو کومٹ منٹ سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ کومٹ منٹ بھی دراصل نظریئے ہی کا شاخسانہ ہے۔ ہُوا یہ کہ نظریئے کی اصطلاح جب ادب کے بازار میں پٹ گئی تو ایک ذرا نرم اور نئی اصطلاح کے ذریعے حصولِ مقصد کی کوشش از سرِ نو شروع کر دی گئی۔

نئی نسل کے لوگ جب اپنے نان کومیٹڈ ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سیاسی نظریئے یا جماعت سے وابستہ نہیں ہیں۔ نئی نسل نے یہ موقف تاریخ کے مطالعے اور تلخ تجربات کی روشنی میں اختیار کیا ہے۔

کومٹ منٹ کا واسطہ دینے والوں کا یہ کہنا کہ کومٹ منٹ کا اطلاق صرف سیاست پر نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے اور ہر بات پر ہوتا ہے کج فہمی کی دلیل ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ایک مثال پر غور کیجئے۔ کہا جاتا ہے کہ فیض مساوات کے قائل ہیں جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اقتصادی مساوات چاہتے ہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمام انسانوں کو ہر معاملے میں مساوی سمجھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کیا وہ شاعری میں بھی مساوات کے اُصول کے تحت غالبؔ اور داغؔ کو ایک ہی صف کا شاعر قرار دیں گے؟ ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہیں۔ مساوات کا تصور فیضؔ کے ہاں ایک خاص شعبے تک محدود ہے۔ اسی طرح کومٹ منٹ کا مفہوم بھی محدود ہے۔ بغیر سوچے سمجھے ہر جگہ اس کا استعمال اور مطالبہ کوئی دانشمندانہ بات نہیں۔

اس ضمن میں سیاسی شعور کا سوال اٹھانے والے حضرات کو بھی یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ سیاسی شعور اور چیز ہے اور سیاسی وابستگی اور چیز۔ ۔ اور نئے ادیبوں نے سیاسی شعور ہی کی بنا پر اپنا ذہن کسی سیاسی نظریئے یا جماعت کے پاس گروی رکھنے سے بھی انکار کیا ہے۔

یہاں تک تو گفتگو اُصولی بنیاد پر ہو رہی تھی۔ اب آیئے دیکھیں کہ مختصر افسانے اور نظریئے کے تعلق سے ہمارے افسانہ نگار کیا کہتے ہیں۔ سب سے پہلے انتظار حسین کو لیجئے۔ فرماتے ہیں۔ ۔ ۔

"حاصل کی پروا کرنے والے کہتے ہیں کہ صرف وہ عمل بامعنی ہے جس کا کچھ حاصل ہو اور کہانی کا کوئی مقصد ہونا چاہیئے لیکن میں اپنی کھوئی ہوئی مٹی کا اسیر ہوں۔ مجھے اس سے مفر نہیں۔" (فلیپ۔ شہرِ افسوس)

۔ جوگندر پال اعلان کرتے ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"میرے اَن گنت نظریات ہیں۔ تاہم میرا ادبی نظریہ ایک بھی نہیں۔ ادبی نظریوں سے ادیب تعصبات کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی زندہ افسانے میں نظریئے افسانہ نگار کے نہیں اس کے کرداروں کے ہوتے ہیں (پیش لفظ۔ رسائی)

محمد منشا یاد کا خیال ہے کہ ۔ ۔ ۔

"ادب کتابوں کا مطالعہ، علم اور مشق سے بھی لکھا جا سکتا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن تخلیقی ادب کے لئے ضروری ہے کہ وہ براہ راست زندگی کی کتاب کے مطالعہ کے نتیجہ میں پیدا ہو۔ اسے محض نظریات کے گملوں کی بجائے زمین پر آزادانہ نشوونما کا موقع ملے اور اس کی دیکھ بھال اور تراش خراش میں خون جگر شامل ہو۔" (کچھ باتیں۔ بند مٹھی میں جگنو)

تقی حسین خسرو کہتے ہیں کہ . . . . .

"اب یہ کہنا شاید ضروری نہیں کہ میں نے افسانہ نگاری کسی تحریک سے متاثر ہو کر یا محض بطور فیشن اختیار نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان افسانوں میں منصوبہ بندی کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے اور یہی "کوندے" کی وجہ تسمیہ بھی ہے۔ (حرف آغاز۔ کوندے)

اس طرح کے بے شمار اقتباسات اور بھی دیئے جا سکتے ہیں لیکن طوالت کے خوف سے اس سلسلے کو یہیں ختم کر دیتا ہوں۔

اب ایک فطری سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فنِ افسانہ کے عالمین جب نظریئے کے قائل نہیں ہیں تو پھر وہ کون لوگ ہیں جو اس پر اصرار کرتے ہیں؟ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ بیشتر صورتوں میں یہ وہ نیم ادیب صحافی اور سیاسی کارکن ہوتے ہیں جو تخلیق کی فنی نوعیت اور جمالیاتی قدروں سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور اپنی گھسی پٹی باتوں میں زور اور وزن پیدا کرنے کے لیے مستقل نظریہ نظریہ کی ہانک لگاتے رہتے ہیں۔

کبھی کبھی یہ لوگ اپنا اصل مدعا پوشیدہ رکھ کر بڑی دردمندی بلکہ رقّت کے ساتھ زندگی اور معاشرے کی دہائی دینے لگتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ادیب یا افسانہ نگار کو معاشرے کا ایک باشعور فرد ہونے کے ناطے یہ چاہیئے کہ وہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرے، انسانوں کے درمیان عدل و مساوات اور اخوت کو فروغ دے وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں بیشی یا اُفتادہ ہونے کے باوجود بہت صحیح ہیں لیکن کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ ادیبوں کے علاوہ بقیہ عام لوگ ظلم کے حق میں ہیں یا وہ بے دلی، عدم مساوات اور انسانوں کے درمیان عداوت کے پیرو ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں؟

بات یہ ہے کہ ادیب کے لئے جو صفات ضروری قرار دی جاتی ہیں۔ وہ اصل میں ہر انسان، ہر صحیح الدماغ اور باشعور انسان کے لئے لازمی ہیں۔ اس کے لئے ادیب یا افسانہ نگار ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے۔ افسانہ نگار بھی معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت میں دوسرے لوگوں کی طرح حق کا پرستار، ظلم کا مخالف اور امن کا خواہاں ہوتا ہے۔ افسانہ نگار ہونے کے ناطے اس پر کوئی اضافی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

انور آذر نے لکھا ہے کہ . . . .

"مجھے ظلم کی ہر شکل سے نفرت ہے خواہ وہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر، قومی سطح پر یا عالمی سطح پر" (شکایتیں۔ اُجلا انسان میلی روحیں)

بلاشبہ ان الفاظ کے ذریعہ انور آذر نے ایک باشعور فرد ہونے کا ثبوت دیا ہے لیکن کیا وہ لوگ جو نظریہ کی اہمیت کے قائل ہیں اس کی بنا پر اسے نظریاتی فنکار ماننے کو تیار ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ نظریئے سے مُراد وہ ہمیشہ سیاسی نظریہ لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آذر نے "شکایتیں" میں کسی سیاسی نظریئے کا نہیں اپنے ضمیر کا اظہار کیا ہے کیونکہ "کالن ولسن نے آؤٹ سائڈر میں فنکاروں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ خود کو کسی سے وابستہ نہ کریں بجز اپنے ضمیر کے" (جدیدیت کی فلسفیانہ اساس۔ شمیم حنفی)

اور ضمیر دُنیا کی ہر شے سے اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے۔
وہ ضمیر ہی کیا جو کسی نظریئے کا اسیر ہو؟

رضوانہ شمیم

دھول کا پھول

خدا خدا کر کے تو دن گزرے تھے، مہینے بیتے تھے، ایک ایک پَل انتظار میں گزرا تھا، مگر وہ آیا بھی تو یوں چلا گیا جیسے کوئی اُس کا منتظر ہی نہیں تھا۔ بے وفا، بے مروّت کہیں کا! مگر وہ تو شاید اِس کا مفہوم بھی نہیں جانتا تھا۔

وہ شاید کبھی بھی کچھ نہیں پا سکی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ بچپن میں تتلیوں کا تعاقب کرتی ہوئی، دُور، بہت دُور نکل جایا کرتی تھی۔ اور جب تتلی کسی شاخِ گُل پر بیٹھتی تو وہ ہولے سے اُسے پکڑنے کی کوشش کرتی۔ مگر وہ کبھی بھی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی، تتلی کا لمس یا رنگ ہی اُس کے حصّے میں آتا تھا۔ تتلی کے پروں کے نرم لمس کو وہ اکثر تصوّر میں سجائے سو جاتی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ تتلی کے پروں کے رنگ پھیلتے گئے، لمس کی ہیئت بدلتی گئی، مگر آج جو لمس اُس نے محسوس کیا تھا اُس کا نشہ یا کیف سب سے جداگانہ تھا۔ اُسے چوم کر اُس نے یوں محسوس کیا گویا کونین کی دولت اس کی جھولی میں آگئی ہو۔ مگر اُس کی جھولی میں شاید سوراخ تھا، جو وہ دولت پا کر بھی نہ پا سکی تھی۔ جیسے تتلی اُڑ گئی ہو اور وہ صرف اُس کا لمس ہی محسوس کر کے رہ گئی ہو۔

وہ آنکھیں موندے لیٹی تھی آنسو اُس کے رخسار کو بھگو رہے تھے۔ بچپن میں جب کبھی بھیا اُس کی گڑیا توڑ دیتا تھا تو وہ یونہی چُپ چاپ آنسو بہاتی رہتی تھی تا آنکہ اُسے نئی گڑیا نہ فراہم کر دی جاتی۔ اور تب لالی اُس کے چہرے پر شفق کی طرح پھیل جاتی تھی اور وہ پھول کی طرح کھِل جاتی۔

وہ وہاں جا تو گزشتہ کئی مہینوں سے رہی تھی مگر آج وہ ایک نئے عزم و ولولے کے ساتھ جا رہی تھی۔ کچھ پانے کے حصول میں، کچھ ملنے کی امید میں۔ امید کتنا دل خوش کُن لفظ ہے۔ اِسی ایک لفظ نے پوری دھرتی کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے۔ پوری دنیا اسی ایک لفظ پہ قائم ہے۔

کرفیو آرڈر ساڑھے بارہ بجے رات سے لاگو ہوتا تھا اور اس وقت گیارہ بجے تھے۔ قانون شکنی آنے والا کر رہا تھا نہ کہ وہ، مگر وہ قانون کو کیا سمجھے۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وہم جنم لے رہے تھے، جانے کب کیا ہو جائے..... گاڑی خراب تھی اور ٹیکسی مل نہیں رہی تھی۔ تن کا بوجھ بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ درد کی لہریں یوں لہرا لہرا کر اُٹھ رہی تھیں گویا اگر انھیں راہ نہ ملی تو وہ اُسے وہیں رات میں ڈھیر کر کے اپنا راستہ تلاش کر لیں گی..... سڑک کے خیال ہی سے اُس کا ذہن گھوم گیا۔ اُسے تماشہ بننا کبھی پسند نہ تھا۔ وہ چکرا کر گرنے ہی والی تھی کہ کسی بھلے مانس کی کار میں لفٹ مل گئی۔

وہ یہاں پچھلے کئی ہفتوں سے باقاعدگی سے آ رہی تھی۔ مگر آج اُس کا سواگت کسی مہمان کی طرح کیا گیا۔ اُسے فوراً اس کمرے میں

لے جایا گیا۔ جہاں آنے والوں کا انتظار ہوتا ہے ــــ انتظار ــــ انتظار ــــ عورت کی ساری زندگی یا پھر تین چوتھائی تو ضرور انتظار میں گزر جاتی ہے۔

انتظار تو اس نے شادی سے پہلے بھی کیا تھا اور شادی کے بعد بھی۔ تمام رات بھاری بھر کم غرارہ سوٹ پہنے، زیورات اور پھولوں سے لدی پھندی بیٹھی رہی۔ ہر ہر آہٹ پر چونک جاتی کہ شاید وہ آگیا ــــ مگر وہ آیا نہیں ــــ اور جب وہ آیا تو آدھی سے زیادہ شب بیت چکی تھی۔ اور ابھی تمہید ہی شروع ہوئی تھی کہ فجر کی اذان ہوگئی اور وہ بوکھلایا ہوا اس سے معذرت کرتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا (ایڈیٹ۔ اس نے دل میں کہا تھا)۔ تو گویا یہ تھی اس کی شبِ عروسی۔ جس کے خواب وہ کبھی کبھی دیکھتی تھی۔

لمحہ لمحہ بیت رہا تھا، قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ درد کی ایک ٹیس اٹھی اور اس کے جسم و جان کو ہلا کر رکھ گئی۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹ ڈالے۔ درد تھما تو اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ بھابھی اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں اور اس کی ماں تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ اور اس نے پہلی بار اسے ماں کی عظمت و تقدس کا اس شدت سے احساس ہوا کہ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر ماں کے پیروں کو چھو لے۔ بار بار دھڑکنیں سنی جارہی تھیں۔ وہی دھڑکنیں جو وہ کاشف کی عریاں بالوں بھری چھاتی سے چمٹ کر سنا کرتی تھی۔ اب وہی دھڑکنیں اس کے وجود میں حلول کر گئی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ جب کاشف اسے چمٹاتا تھا تو درمیان میں نائیلون کی باریک سی نائٹی کو بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اسے ہنسی آگئی وہ کیسی کیسی واہیات باتیں کرتا تھا۔ کیسی کیسی فرمائشیں کرتا تھا۔

درد پھر اٹھا ــــ بے تابی پھر بڑھی ــــ "اب کتنی دیر ہے؟" وہ چیخی۔

"ابھی ٹائم لگے گا۔" نرس نے اطمینان سے جواب دیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

یہ نرسیں بھی کتنی بے درد ہوتی ہیں۔ اس نے سوچا۔ مگر پھر خیال آیا، اس میں ان بے چاریوں کا کیا قصور، آنے والا ہی دیر کرے تو کوئی کیا کرے۔

اُس نے بہت سی بیماریاں اٹھائی تھیں، بہت سی چوٹیں کھائی تھیں، مگر اتنا کرب اس نے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ پتہ نہیں یہ کس قسم کی اذیت تھی، جس میں تسلسل نہیں تھا۔ درد کی لہریں لہرا لہرا کر ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ نرس نے اسے ایک انجکشن لگا دیا۔ انجکشن لگتے ہی درد کی موجوں کے یوں تابڑ توڑ حملے ہونے لگے گویا اب سائی چھٹ جائے گی۔ کائی ــــ سبز مخملی کائی ــــ اس کا رنگ و لمس، اسے دونوں ہی پسند تھے۔ جب وہ کسی ایسے علاقے میں پکنک منانے جاتی، جہاں کائی زدہ پتھروں یا ساحل پہ کائی ہو تو وہ ان پہ اپنے پیر رکھ کر اس کا لمس ضرور محسوس کرتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ایک بے نام سی لذت محسوس ہوتی تھی۔

چاند نظر آنے سے پہلے بادلوں جیسی سیاہی نظر آنے لگی تھی۔ لہٰذا اسے اب دوسرے کمرے میں منتقل کیا جارہا تھا۔ یہ کمرہ اسے کم کم ہوش میں دوسرا جہان لگا۔ اس نے لمحہ بھر میں پورے کمرے کا جائزہ لے ڈالا۔ کمرے میں ہر طرح کے جدید آلات موجود تھے۔ دیواروں پر کچھ تصاویر آویزاں تھیں۔ پہلے تو وہ انھیں تجریدی آرٹ کا نمونہ سمجھی۔ مگر پھر غور کرنے پر اسے معلوم ہوا کہ یہ سب ان مہمانوں کے انداز و طریقے ہیں جو اس بے ثبات دنیا میں وارد ہوتے ہیں۔

درد پھر اٹھا ــــ وہ چیخ پڑی، "خدا کے واسطے ڈاکٹر کو بلاؤ ---- میں مر رہی ہوں -----" تین بجے ڈاکٹر آنکھیں ملتی منہ بناتی آئی، تو معلوم ہوا کہ درد کی لہریں سمٹ گئی ہیں، یا سہم گئی ہیں، یا جوار بھاٹے میں کمی آگئی ہے۔ خموشی، سکوت ــــ کوئی درد نہیں ــــ کوئی ہلچل نہیں ــــ ڈاکٹر کی تیوریوں پہ بل ــــ نرسوں کی پریشانی ــــ وہ شدید کرب و اذیت میں مبتلا تھی۔ اس کی کوکھ

سے پھوٹنے والی کونپل نے اس کی رگ رگ کا لہو چوس لیا تھا، اُس کے تن دمن کی ساری قوتیں سلب کر لی تھیں۔ A.C. چلنے کے باوجود وہ پسینے سے شرابور تھی۔ وہ تھک چکی تھی۔

معلوم ہوا کہ آنے والے نے اپنی سی بڑی کوشش کی، مگر صحیح وقت پر بیرونی امداد نہ ملنے پر وہ دردوں کے بھنور میں گھٹ گیا۔ اس کی دھڑکنیں بہت مدھم ہو گئی تھیں —————— پھر وہ آیا تو اپنی آمد پر کوئی واویلا نہیں مچایا۔

دنیا میں آتے ہی اس کی ناک میں آکسیجن کی نلکیاں ٹھونس دی گئیں۔ موٹی موٹی سوئیوں نے اُس کے جسم کو چھید ڈالا۔ نت نئی دوائیوں کے ڈھیر لگ گئے۔

اُسے بچے سے علیحدہ رکھا گیا۔ دو دن ہو گئے تھے وہ بے قرار تھی —— اُسے چھو کر محسوس کرنا چاہتی تھی۔ اُسے گود میں بھر کر اُس کی گرمی محسوس کرنا چاہتی تھی۔ گود کے تصوّر سے اس کے سینے کا تناؤ بڑھ گیا —— اس کی قمیض گیلی ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ کتنے دلکش تجربوں کے بعد یہ پھول کھلا ہے، کتنی برساتیں دیکھنے کے بعد یہ موتی ملا ہے۔ وہ اس موتی کو اپنے دل کے آبگینے میں سجا لینا چاہتی تھی، اُسے پھول اور بچے بہت پسند تھے —— اس کا خیال تھا کہ اگر چمن میں پھول نہ ہوں اور گھر میں بچے نہ ہوں تو جہاں بھر کی رونقیں بے کیف ہیں۔ مگر ابھی تو اُس نے اپنی اور کاشف کی مشترک تخلیق کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر انتظار —— دو دن بعد کاشف بجھے ہوئے چراغ کو گود میں بھرے اُس کے سامنے ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ موت و زیست کی کشمکش سے وہ آزاد ہو چکا تھا۔

اُس نے پہلی بار اپنے بچے، اپنی تخلیق کو دیکھا۔ پھول جیسا اس کا چہرہ تھا، کالے اور گھنے بال اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں یوں بند تھیں گویا سو رہا ہو۔ اس نے کاشف سے کہا، "مجھے دیدو"، مگر اس نے نہیں دیا۔ پھر وہ اس کے نزدیک لے آیا، بہت نزدیک، کچھ دیر تک تو وہ سسک سسک کر روتی رہی۔ پھر اُس نے اپنے ہونٹ اُس کی برف جیسی پیشانی پر رکھ دیئے، اور اس لمحے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے دونوں جہان کی دولت اُس کے خزانے میں بھر گئی ہو۔ اس کا بوسہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ لہٰذا اس کی ماں نے بلکتے ہوئے اسے پرے کر کے کاشف سے کہا "جاؤ اب لے جاؤ۔"

آنسو ڈھلک ڈھلک کر اس کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔ اُس کے کانوں میں ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا، ڈاکٹر نے آنے میں دیر کی، کوئی کہہ رہا تھا، اللہ کی مرضی، اس میں بھی اس کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوگی، اور ڈاکٹر بڑے اطمینان سے آسے صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہہ رہی تھی: "ارے دو دن کے بچے کا کیا گریہ، شاخ سلامت رہے پھول اور بھی کھل جائیں گے۔"

پھول کے نام ہی سے اس کے ذہن میں بگولے اٹھنے لگے۔ اُس نے سوچا چند لمحوں بعد میرا پھول دھول کی نذر ہو جائے گا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس نے اٹھ کر بھاگنا چاہا —— کاشف سے اپنا مرجھایا ہوا پھول چھیننا چاہا —— مگر اس کی بھابی نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پھر وہ زار زار رونے لگی۔ ایسے ہی جیسے گڑیا کے ٹوٹ جانے پر روتی تھی۔ جلتی اڑ گئی —— پھول زمیں بوس ہو گیا۔ اور اس کے حصے میں لمس اور خوشبو ہی آ سکی۔ وہ شاید کبھی بھی کچھ نہیں پا سکی تھی۔

سیپ شمارہ ۴۵ کی تحریریں

افسانے، ۱۴

- رضیہ فصیح احمد • کلام حیدری • میرزا ریاض • جوگندر پال • رحمن شاہ عزیز • رشید امجد
- مشرف احمد • احمد جاوید • سلطان جمیل نسیم • مرزا حامد بیگ • فردوس حیدر • قدسیہ انصاری
- علی امام نقوی • رفعت کیانی

شخصیت، ۱

- جوش، کچھ یادیں کچھ باتیں ـــ سید مقصود زاہدی

مضامین، ۶

- قمر جمیل • فتح محمد ملک • محب عارفی • مستنصر حسین تارڑ • نجیب جمال • جمیل اختر

غزلیں، ۱۱۰

- فراق گورکھپوری • رئیس فروغ • شان الحق حقی • شمس زبیری • فارغ بخاری • احمد ہمدانی
- صبا اکبر آبادی • انجم اعظمی • جمیل ملک • محسن احسان • شاہد عشقی • نکہت بریلوی
- قمر نقوی • ساقی امروہوی • رفعت سلطان • افسر ماہ پوری • جمیل عظیم آبادی • جعفر شیرازی
- ندا فاضلی • شبنم مناروی • مظہر امام • انور حسن صدیقی • کیف انصاری • ع س سلام
- رام ریاض • احمد رئیس • سلیم کوثر • صابر وسیم • شاہدہ تبسم • شوکت ہاشمی
- خواجہ رضی حیدر • گلزار بخاری • تاجدار عادل • محمد فیروز شاہ • سیما احمد • لطیف ساحل
- احمد شریف • جان کاشمیری • ن۔م۔ دانش • عنبر زیدی • صفدر صدیق رضی • رفعت ظفر
- اختر ہوشیارپوری • رفعت القاسمی • جمال احسانی

نظمیں، ۴۲

- فارغ بخاری • زہرا نگاہ • احمد ظفر • انجم اعظمی • شاہد عشقی • سرشار صدیقی
- قمر جمیل • افسر ماہ پوری • ادیب سہیل • اظہر قادری • حسن اکبر کمال • پروین شاکر
- شاہین • انور زاہدی • جمیل عظیم آبادی • شاہدہ تبسم • احسن سلیم • ماہ طلعت زاہدی
- نجم الحسن عطا • احمد فاخر • ن۔م۔ دانش • شاہین ملک • شفیق احمد شفیق • رضیہ انوار رضی

تبصرے، ۵۵

- حسن اکبر کمال • مشرف احمد • اشتیاق طالب • صابر وسیم • علی حیدر ملک • نسیم نیشو فوز

ابراہیم خلیل

مولانا سلیمان ندوی کی شاعری

مولانا سید سلیمان ندوی بلند پایہ عالم، عظیم المرتبت مورخ، بے مثل محقق، بے بدل ادیب اور شعلہ بیان مقرر ہونے کے علاوہ خوش نوا شاعر بھی تھے۔ مولانا کی سیرت نگاری، تاریخ نویسی اور انشا پردازی کا تو عام شہرہ ہے لیکن یہ کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ندوۃ العلماء کا یہ گل سرسبد سیرۃ النبی، سیرت عائشہؓ اور ارض القرآن کا مصنف نہ صرف خوش نوا شاعر ہے بلکہ اسے رموز و نکات شعر سے کما حقہ آشنائی کے علاوہ انہیں برتنے کا بھی بھرپور سلیقہ ہے۔

کچھ لوگ کلام موزوں کو شعر کہتے ہیں۔ کچھ لوگ لطیف و نازک جذبات اور احساسات کی مصوری کو شعر سے تعبیر کرتے ہیں اور کچھ لوگ طرز ادا کو شعر کا ضروری جزو قرار دیتے ہیں نہ تو ان میں سے کسی بھی ایک یا ایک سے زیادہ چیزوں کی موجودگی عمدگی شعر کی ضمانت ہو سکتی ہے اور نہ ان میں سے کسی ایک چیز کا فقدان شعر کی حسن و خوبی کو برقرار رکھ سکتا ہے بلکہ عمدہ شعر کے لئے یہ تمام چیزیں اجزائے ترکیبی کا درجہ رکھتی ہیں، اور ان کا حسین اور باسلیقہ امتزاج شعر کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مولانا کا مختصر سا دیوان اس میزان پر پورا اترتا ہے۔ ان کے کلام میں جوش و خروش، جذبات کا تموج، احساسات میں گداز، رندی و سرمستی، سب ہی کچھ ہے۔ ان کے ابتدائی کلام میں اگر لکھنوی رنگ نظر آتا ہے جس میں الفاظ کا دروبست، لطف زبان، محاورہ کی چاشنی، نادر استعارات اور لطیف تشبیہات کی جلوہ گری ہے تو بعد کا کلام دلی کے دبستان شاعری کی نمائندگی کرتا ہے جو سراسر دل کی شاعری کے لئے مشہور ہے جس میں از دل خیزد بر دل ریزد والی بات ہوتی ہے۔ پہلے اول الذکر مکتبہ فکر کا کلام دیکھئے ؎

اس جہاں میں شادی و غم کی ہے صورت ایک ہی	پھول جو گلشن میں ہے وہ صورت ناسور ہے
بے درد و بے وفا و ستمگار و سنگدل	تو ہی بتا دے تجھ کو میں اے جان کیا کہوں
نگاہوں سے یہ دونوں کو یقیں باہم برابر ہے	میں اس کے دل کے اندر ہوں وہ میرے دل کے اندر ہے
چین سے بیٹھنے دے گی نہیں ہم دونوں کو	تجھ کو شوخی تیری مجھ کو یہ وحشت میری

یہ اشعار جرأت کی یاد دلاتے ہیں۔ ؎

پہلے تو چھپ چھپ کے آتے تھے تصور میں بار بار — اب کیوں شبِ وصال وہ شرمائے جاتے ہیں
اب دیں وہ یا نہ دیں انہیں یہ اختیار ہے — ہم ان کی بارگاہ میں سائل تو ہو گئے
وہ رفتہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں — ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہو گئے

شعر و سخن کی محفل میں بزرگی خوردی کا اہتمام نہیں ہوتا۔ سرتاپا سفید ہاتھوں میں رعشہ، کمر خمیدہ کمان کی صورت، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، اپنے پوپلے پوپلے منہ سے اسے خوش مزہ رنگین اور پھڑکتے ہوئے اشعار سناتے ہیں کہ جی پر ہزاروں جوانیاں قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ لوگ خمریات کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حافظ و خیام سے ساقی گری کرائیں گے۔ سیرۃ کے مولف، ارض القرآن کے خالق، سیرت عائشہ و حیاتِ مالک کے مصنف کے یہاں اگر جذبات کی سرشاری خیالات کی رنگینی، احساسات کی گداختگی تو یہ کوئی جرم نہیں۔

ع — این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

کیا سیرۃ النعمان، الفاروق، سوانح روم اور سیرۃ کے مصنف کے کلام میں شرابِ دو آتشہ کا لطف نہیں۔ مولانا کا دیوان گو مختصر ہے لیکن اس میں بھی خمریات کے اشعار خاصے موجود ہیں۔ دیکھئے ؎

ٹوٹ ہی جاتی ہے ہر موسمِ گل میں توبہ — جو نہ ٹوٹے میں کہ غفار کہاں سے لاؤں
رات کو خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی — ایسی بدمستیٔ توبہ سے الٰہی توبہ
آنکھ میں توبہ کے آنسو دل میں اس بت کی ہوس — ہائے گنگا جل کو کیسے زمزم و کوثر کروں

مولانا پر یہ پھبتی نہیں کسی جا سکتی ؎

رعنائی خیال کو ٹھیرا دیا گناہ — زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دُور

مولانا کی رعنائی خیال ملاحظہ کیجئے۔

نگاہِ شوق ذرا دیکھ بھال کر اُٹھے — چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہو جائے
الٰہی تاڑنے والوں کی آنکھوں سے بچا لینا — کہ دل کی بے کلی ہر ضبط کی طاقت سے باہر ہے

اس بے چارگی کے قربان جائیے ؎

حرفِ مطلب کہا نہیں جاتا — بے کہے بھی رہا نہیں جاتا
یہ کیسی بے کسی ضبطِ محبت کی الٰہی ہے — کہ اس کا نام بھی میری زباں تک نہیں آ سکتا

اس کشمکش کی داد نہ دینا بھی بڑی بے انصافی ہوگی ؎

دل ہے بت خانہ ہے آنکھ ہے کعبہ کی سمت — حیف اس مومن نما کافر کو گر رہبر کروں

لب پہ ہے نامِ خدا دل میں سودائے صنم
مجھ کو اللہ کرے دیکھتا اللہ نہ ہو

بُت پرستی بھی کروں اور بُت شکن بھی میں بنوں
کیشِ ابراہیم رکھ کر پیشہ آزر کروں

مولانا کے یہ اشعار جگر کو بہت پسند تھے ؎

دامن کو آنسوؤں سے جو نم کر رہا ہوں میں
شرحِ غمِ فراق رقم کر رہا ہوں میں

دیوانگانِ عشق کو دے کر صلائے عام
آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں

کہہ کہہ کے دلفریب و دل آرا و دل نشیں
تردیدِ قصّہ ہائے ستم کر رہا ہوں میں

آواز دے کے کوئی اُدھر سے ابھی گیا
ہر سو تلاشِ نقشِ قدم کر رہا ہوں میں

یہ غزل بھی خوب ہے ؎

دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں
جو نہ بے خود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں

نور ہی نور جدھر دیکھو نظر آتا ہے
تابِ نظارۂ انوار کہاں سے لاؤں

اُف ری دریائے معاصی کی تلاطم خیزی
وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں

قطرۂ اشک میں ہوں دل کے بھی قطرے شامل
فطرتِ دیدۂ خوں بار کہاں سے لاؤں

مدرسہ چھوڑ خرابات میں آ کر بیٹھا
دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں

ڈاکٹر اقبال کو یہ شعر بہت پسند تھا ؎

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

سب ہی یہ مانتے ہیں کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است اور شعراء نے تصوف کی آڑ میں خوب کھُل کھیلے ہیں لیکن مولانا کو اس گروہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ آپ کا تصوف سے تعلق برائے بیت نہیں تھا بلکہ آپ باقاعدہ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھے بلکہ اپنے مرشد کے خلیفہ بھی تھے۔ اس کے واضح اشارے ان کے کلام میں موجود ہیں۔ بیعت ہونے کے بعد فرماتے ہیں ؎

الٹا ہے ورق، آج سے افسانۂ نو کا
افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں
سب واردات عشق رقم کر رہا ہوں میں

قیلِ مقال مدرسہ کو چھوڑ کر
شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا

اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہوگی ؎

سمجھیں میرے کلام کو جو ہوش مند ہیں
مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

حریم عشق ہوس کے حدود سے ہے دُور — خلوص و پاکیٔ مشرب رقیب کیا جانے
رعنائے یار سے بھی حل نہ ہو سکی مشکل — ہوس پرست یہ رمزِ عجیب کیا جانے

یہ تو خالصتاً (صوفیانہ) جبر و قدر کا مسئلہ ہے۔ ؎

جو حجاب اُٹھتا گیا بنتا گیا وہ خود حجاب — جو نظر آتا ہے بے پردہ وہ بھی مستور ہے
وہم سے بڑھ کر نہیں ہے فرق جبر و اختیار — غور سے دیکھو کہ جو مختار ہے مجبور ہے

مولانا کے فضل و کمال اور علمی فتوحات کا مقابلہ ان کے مختصر دیوان سے کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ الندوہ، الہلال البلاغ اور البیان جیسے موقر جرائد میں جن کے شذرات، تنقیدات عالیہ اور علمی مقالات کی دھوم ہو، جسے اساتذہ کے ہزاروں اُردو، فارسی اور عربی اشعار ازبر ہوں جس کی سخن فہمی، سخن دانی اور سخن سنجی کے اکابر زمانہ اور مشاہیر روزگار معترف ہوں، جسے فنِ عروض پر پوری قدرت ہو اور طبع موزوں بھی رکھتا ہو۔ اس کا دیوان اور اتنا مختصر۔ اس گتھی کو مولانا نے اپنی آپ بیتی میں خود سلجھا دیا ہے۔ فرماتے ہیں علامہ شبلی کی وفات پر انہوں نے موصوف کا مرثیہ لکھا جسے اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، مولانا شیروانی، اور دیگر حضرات نے بہت سراہا، تعریفیں کیں اور ہمت افزائی کی لیکن نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے کہا "آپ شاعر نہیں ہیں"۔ انہوں نے یہ بھی نصیحت کی کہ جب تک انسان کسی فن میں کامل نہ ہو جائے اس کو دوسروں کے سامنے عرضِ ہنر نہیں کرنا چاہیئے۔" میں نے اسی دن سے بساط سخن لپیٹ دی اور شاعری سے توبہ کرلی۔ اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا اور اگر چھپ نہ سکا اور چھپ گیا تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا۔ اس نصیحت نے میرے رُخ کو تمام تر نثر کی طرف پھیر دیا۔

اس نصیحت کے بعد مولانا نے جو

«ارمغانِ سلیمان» مولانا کے مجموعہ کلام میں ان کا ۱۹۱۵ء تک کا کلام ہے

کہا اور بقول مولانا چھپایا بھی، اسے بھی ارمغان میں شامل کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں مصنف مسلم شعرائے بہار کے اس بیان سے بھی صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیئے کہ مولانا رمزی تخلص فرماتے تھے۔ گمان یہ ہوتا ہے کہ رمزی تخلص اس نصیحت کے بعد ہی اختیار کیا ہوگا چونکہ ارمغان میں رمزی تخلص کا کوئی مقطع نہیں۔ مولانا کے توبہ توڑنے کی تصدیق ان کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے جو بیدِ فرنگ میں شائع ہوا ہے اور مولانا نے لندن سے مولانا مسعود علی صاحب ندوی کو یکم اپریل ۱۹۲۰ء کو لکھا تھا۔ فرماتے ہیں یہاں طلبائے ہند مقیم انگلستان کا اجتماع بعنوان انڈین کانگریس ہوا مشاعرہ بھی اسی ذیل میں منعقد ہوا۔" اس میں سید سلیمان ندوی نامی غیر فطری شاعر نے بھی اپنی نظم پڑھی۔" گویا مولانا بلگرامی کی بات دل پر ایسی نقش ہوئی تھی کہ بھولتی ہی نہیں تھی۔

یہ نظم اور اسی طرح کا چھپا چوری کہا ہوا کلام اگر تمام و کمال سامنے آئے تو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، مولانا شیروانی، جگر مراد آبادی وغیرہ ہم نے مولانا کو جو داد دی تھی وہ غلط تھی یا مولانا بلگرامی سے تسامح ہوا تھا جس نے مولانا کو شعر گوئی سے باز رکھا۔

سخن

اقبال

خزاں میرا موسم

(آدم جی انعام یافتہ)

کے بعد

میرے موسم، میرے خواب

منفرد لہجے کے خوبصورت شاعر

حسن اکبر کمال

کا تیسرا شعری مجموعہ

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

سیپ پبلی کیشنز، کراچی ۲۸

ماہنامہ

جدید ادب کا نمائندہ

ماہنامہ

الفاظ

شمارہ: ۸/۱۹۸۳ء

اگست

مدیر

جمیل اختر

قیمت فی پرچہ ———— چار روپے

ایک سال کے لئے ———— پینتالیس روپے

پوسٹ بکس نمبر ۷۵۹۶ صدر کراچی ۳

فون: ۲۹۰۸۳۷ ———— ۶۸۰۱۰۶ ———— ۶۸۴۸۸۸

کراچی ۶

ترتیب

سرورق کی تصویر: سرشار صدّیقی

انجم اعظمی

میرا ہم عصر شاعر

غالباً ۵۶ء میں میری ملاقات سرشار صدیقی سے کراچی کے ایک مشاعرے میں ہوئی اور اس کے بعد اس سے گاہے گاہے ملتا رہا اور
کا کلام سنتا اور پڑھتا رہا۔ ۶۲ء میں "پتھر کی لکیر" شائع ہوئی۔ جو سرشار کی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس مجموعے کی تخلیقات
دو باتیں نمایاں تھیں زندگی اور زندگی کے مسائل سے گہری وابستگی اور سرشار کا لہجہ جو اس کے تمام ہم عصر اور ہم عمر شعراء سے الگ تھا
اس میں تلوار کی سی تیزی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ لہجہ فولاد کو بھی کاٹتا ہے اور کہیں کہیں ریشم کو بھی کاٹ دیتا ہے بیسویں صدی کی زندگی کے
تاب کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اس لہجے کا سفر اتنی دور تک دکھائی دیا کہ سرشار کی زندگی کے وہ آخری لمحے بھی اس میں شامل ہوگئے جن
فی الحال سرشار بھی واقف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا کونسا موڑ ہوگا اور اس وقت اس کے گہرے جذبے اس کے لہجے میں کس طرح پیوست ہونگے
"پتھر کی لکیر" میں غزل کے بعض اچھے اشعار کے باوجود سرشار کی نمائندگی نظم کرتی ہے۔ ۳۶ء کی ادبی تحریک کے اثرات اس کے
طرز اور زبان دونوں پر مرتب ہوئے لیکن اس کے جذبے انفرادی اور اس کی سوچ زندگی کا گرم لہو لے کر ساتھ چل رہی تھی نئی اور پرانی
روایتوں پر اس کی شاعری میں اسکی فکر اور جذبے کا دباؤ تھا اور اسی دباؤ نے اس کے لہجے کو نمایاں کیا تھا۔ اس لہجے کی کاٹ میں جوانی
کی طرازی بھی تھی لیکن اس کا غالب عنصر اس کی ذات کی اندرونی تہہ میں چھپی ہوئی کوئی قوت تھی جو اپنے اظہار کی طرف مائل تھی۔

اب جب یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں۔ سرشار پچاس سے اوپر ہے زندگی کے بیشمار تلخ و شیریں تجربات سے گزر چکا ہے اور اس کے یہاں
میں بھی ایک بنیادی تبدیلی آئی ہے کہ پہلے نظم نے اس کی نمائندگی کی تھی پختگی کے اس دور میں اس کی نمائندہ اس کی غزل ہے نظمیں وہ
لکھتا ہے اور ایسی نظمیں لکھتا ہے جن پر اچھے لکھنے والے رشک کریں لیکن اس کا بانکپن اس کی غزلوں میں سما رہا ہے میں سرشار سے کہتا ہوں
بھی لکھتے رہا کرو۔۔۔۔ پاکستان میں ادھر دس پندرہ سال میں غزل گوئی کے فن نے بے حد ترقی کی ہے لیکن اچھی نظمیں کم لکھی جارہی ہیں۔
لکھنے والے ہیں سرشار کی اس دور کی نظموں میں ابتدائی دور کی نظموں کی ر (DIRECTNESS) نہیں ہے اس کی نظمیں عموماً پہلے
گئی ہیں اور ان میں طنز، کنایہ اور اشاریت نے اپنا جادو جگایا ہے سے

دستک پر
بستر سے اٹھ کر
جب میں نے دروازہ کھولا

ایگل
EAGLE
NO.T-584
NO.71
NO.71-A
EAGLE
IRIDIUM
A PRODUCT OF
AZAD FRIENDS
ہر جگہ دستیاب ہے

انجم اعظمی

میرا ہم عصر شاعر

غالباً ۵۶ء میں میری ملاقات سرشار صدیقی سے کراچی کے ایک مشاعرے میں ہوئی اور اس کے بعد اس سے گاہے گاہے ملتا رہا اور
ں کا کلام سنتا اور پڑھتا رہا۔ ۶۲ء میں "پتھر کی لکیر" شائع ہوئی۔ جو سرشار کی نظموں اور غزلوں کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس مجموعے کی تخلیقات
ں دو باتیں نمایاں تھیں زندگی اور زندگی کے مسائل سے گہری وابستگی۔ اور سرشار کا لہجہ جو اس کے تمام ہم عصر اور ہم عمر شعراء سے الگ تھا
اس میں تلوار کی سی تیزی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ لہجہ فولاد کو بھی کاٹتا ہے اور کہیں کہیں ریشم کو بھی کاٹ دیتا ہے بیسویں صدی کی زندگی کے
چ و تاب کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اس لہجے کا سفر اتنی دور تک دکھائی دیا کہ سرشار کی زندگی کے وہ آخری لمحے بھی اس میں شامل ہو گئے۔ جن
ے فی الحال سرشار بھی واقف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا کونسا موڑ ہوگا اور اس وقت اس کے گہرے جذبے اس کے لہجے میں کس طرح پیوست ہونگے
"پتھر کی لکیر" میں غزل کے بعض اچھے اشعار کے باوجود سرشار کی نمائندگی نظم کرتی ہے۔ ۳۶ء کی ادبی تحریک کے اثرات اس کے
وضوع اور زبان دونوں پر مرتب ہوئے لیکن اس کے جذبے انفرادی اور اس کی سوچ زندگی کا گرم لہو لے کر ساتھ چل رہی تھی نئی اور پرانی
بی روایتوں پر اس کی شاعری میں اسکی فکر اور جذبے کا دباؤ تھا اور اسی دباؤ نے اس کے لہجے کو نمایاں کیا تھا۔ اس لہجے کی کاٹ میں جوانی
تیزی و طراری بھی تھی لیکن اس کا غالب عنصر اس کی ذات کی اندرونی تہہ میں چھپی ہوئی کوئی قوت تھی جو اپنے اظہار کی طرف مائل تھی۔

اب جب یہ مضمون لکھنے بیٹھا ہوں۔ سرشار پچاس سے اوپر ہے زندگی کے بیشمار تلخ و شیریں تجربات سے گذر چکا ہے اور اس کے یہاں
اعری میں بھی ایک بنیادی تبدیلی آئی ہے کہ پہلے نظم نے اس کی نمائندگی کی تھی پختگی کے اس دور میں اس کی نمائندہ اس کی غزل ہے نظمیں وہ
ب بھی لکھتا ہے اور ایسی نظمیں لکھتا ہے جن پر اچھے لکھنے والے رشک کریں لیکن اس کا بانکپن اس کی غزلوں میں سما رہا ہے میں سرشار سے کہتا ہوں
نظمیں بھی لکھتے رہا کرو ۔۔۔۔ پاکستان میں ادھر دس پندرہ سال میں غزل گوئی کے فن نے بے حد ترقی کی ہے لیکن اچھی نظمیں کم لکھی جا رہی ہیں۔
تی کے لکھنے والے ہیں سرشار کی اس دور کی نظموں میں ابتدائی دور کی نظموں کی (DIRECTNESS) نہیں ہے اس کی نظمیں عموماً پہلے
ے مختصر ہو گئی ہیں اور ان میں طنز، کنایہ اور اشاریت نے اپنا جادو جگایا ہے

دستک پر
بستر سے اٹھ کر
جب میں نے دروازہ کھولا

دروازے پر
میں خود ہی تھا
آنے والا

(مہمان)

میں لفظوں کا صورت گر ہوں
لیکن میں نے
جب بھی اس سے
اپنے دل کی باتیں کی ہیں
ان باتوں پر
لفظوں یا آوازوں کا احسان نہیں ہے
جذبوں کی گہری سچی، خاموش زباں میں
صرف مری آنکھیں بولی ہیں

(گفتگو)

غزلوں میں اس نے نہ میر تقی میر کا راستہ اختیار کیا ہے اور نہ غالب اور یگانہ کا۔ بلکہ اپنی راہ خود نکالی ہے اس کی غزلوں کے بہترین اشعار کا کوئی انتخاب کیا جائے تو ان میں بھی اکثر و بیشتر گہرے طنز سے واسطہ پڑے گا۔ دراصل زندگی کی تلخیوں کا احساس و ادراک اس کے یہاں طنز کی شکل اختیار کرتا ہے یہ طنز اسے اپنی زندگی اور اپنے گرد و پیش کی زندگی کے تضادات سے گذرتے ہوئے افسردگی سے بچائے رکھتا ہے غم کی بات اور ہے غم کا ذکر کرنے والے سینکڑوں شاعروں کا بے معنی جلوس ایک طرف اور اس کے طنز سے لپٹے ہوئے گہرے غموں کی روشنی ایسی ہے کہ اس روشنی میں قدم آگے بڑھانے کا سارا حوصلہ بیدار رہتا ہے

احباب کے خلوص کو پہچانتا ہوں میں	ہر زخم سر ہے سایۂ دیوار آشنا
منسوب آپ سے جو وفا کا فسانہ ہے	یہ بھی تو ایک طرز تپاک زمانہ ہے
میں نے جب جھوٹ اختیار کیا	سب نے سچ بولنا شعار کیا

سرشار رومانی شاعر نہیں ہے اس کی شاعری پر اعتبار کرنے کے لئے تو اتنی ہی بات کافی ہے۔ نہ تو وہ محبوب کی آنکھوں کا فلسفی ہے اور نہ چاندنی راتوں کا۔ یہ درست ہے کہ اسے محبوب بہت اچھا لگتا ہے۔ چاندنی راتیں بھی اسے بے حد پسند ہیں۔ آدھی رات کی نرم ہوا کی سرگوشیاں بھی سنتا ہے اور درختوں کے شام کے گہرے سایوں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے لیکن یہ سب باتیں اس کی اسی زندگی کا حسن ہیں جس میں بے شمار تلخیاں بھی ہیں شہروں سے سفر کرتا ہوا مکر و فریب کا سیلاب چھوٹی چھوٹی بستیوں تک پہنچ گیا ہے اور مکر و فریب سازش اور غارت گری کے نئے قافلے دنیا جہان سے ہمارے شہروں میں مسلسل برآمد ہو رہے ہیں، سرشار کی شخصیت اس شہر میں زندگی گذارتے ہوئے رومان پرست ہو ہی نہیں سکتی اس کے لہجے کے امکانات بھی ابتدا ہی سے کچھ اور رہے ہیں وہ ہمیشہ زندگی کے تضادات کے سامنے اپنی بھرپور قوت کو آزمانا چاہتا ہے اسی قوت سے اس کا لہجہ عبارت ہے

کوئی حد بھی ہے آخر طول شب کی — طنابیں کھینچ لو صبح طرب کی
یہ بھی کیا کم ہے اس زمانے میں — جی رہا ہوں بقید ہوش و حواس

زندگی کے اوراق بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں۔ میں چاہوں بھی تو سرشار کی زندگی کو بیان نہیں کرسکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس عہد کی پیچیدگی کو سرشار نے اپنے وجود اور شعور دونوں میں اتار لیا ہے اور اس طرح اس کی ذات میں خود ذات کے پیچیدہ مرحلے اور زندگی کی پیچیدگیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایسا جال بن چکے ہیں کہ اس کے اشعار کی صورت میں جب کبھی سرشار کو کوئی آرزو اور کوئی تمنا اس جال سے باہر، بے پناہ اڑان کے خواب آنکھوں میں بسا کر اڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ تو سرشار کے اندرونی بھیدوں پر سے کچھ کچھ پردہ اٹھنے لگتا ہے اور سمت کا بھی واضح تعین ہو جاتا ہے کہ وہ اندر سے باہر کی طرف اور سوچ سے دل کی طرف سفر میں ہے۔

وہ اکثر کہتا ہے کہ میں اب تک صوفی نہیں بن سکا کیوں کہ زندگی کا سخت گنہگار ہوں لیکن کون نہیں جانتا کہ زندگی کے گنہگار ہی صوفی بنتے ہیں آخری معرفت بھی زندگی کی معرفت سے ہی پیدا ہوتی ہے زندگی سے ناآشنا آخر کس خدا کی تلاش میں نکلے گا۔ تصوف سالے صفے کا نام نہیں ہے بلکہ اس ایمان کا نام ہے جو زندگی کے معرکے سے پیدا ہوتا ہے اور اس معرکے کے دوران سلامت رہتا اور فروغ پاتا ہے دلی تباہ ہوئی تو خواجہ میر درد دلی سے نہیں نکلے، ہمارا شہر اور شہر کے لوگ مکرو فریب، قتل و غارت گری اور سازش سے بہت بے حال ہوئے اس حال میں سرشار نے انہیں تنہا نہیں چھوڑا وہ بھی ساری زندگی بے حال رہا ہے اور اب اندر سے باہر کی جانب اپنے سفر میں وہ سوچ کے دائروں اور تشکیک کے طوفانوں سے گذرتا ہوا دل کے بہت قریب آپہنچا ہے۔ سچائی دیانت، امانت اور صحبت پر اس کا ایمان پہلے سے گہرا ہے اس نے وقت کے ساتھ الٹی چال چلی ہے۔ وقت میں گم ہو جانے کے بجائے وقت کو اس نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اس کی آواز نکھر گئی ہے۔ جذبوں کے سیل اس کے کناروں میں بہنے لگے ہیں۔ تتلیاں اس کے بازوؤں میں سونے لگی ہیں زندگی کسی نوکھے سلونے محبوب کی طرح اس کی آغوش میں سما گئی ہے اور اس کا خدا اس سے خوش ہے کہ وہ صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی معرفت کی کٹھن منزلوں سے گذر رہا ہے اور چلتے چلتے طنز کے چراغ روشن کرکے قریب و دور کی ان پیچیدگیوں کو دکھا دیتا ہے جن سے ہمیشہ اس کی حریفانہ چشمک رہی ہے وہ زندگی کی ساری پیچیدگیوں کو اپنے وجود میں اتار کر اپنے لئے معرفت کے دروازے کھول رہا ہے اس کی طریقت کی رگوں میں زندگی کے لہو کی سرخی اتنی نمایاں ہے کہ اس کی آب سے اس کے اشعار ستاروں کی طرح جگ مگ جگمگ کرتے ہیں۔

ہم کو نہ جگا سکی قیامت — ہم حشر کی نیند سو رہے تھے
کیا آنکھ اسی لئے ملی ہے — ہر لحظہ نیا عذاب دیکھوں
ایک اک غم کا لکھا ہے ورق جاں پہ حساب — ایک اک لمحے کو زنجیر کیا ہے میں نے
تشبیہ حسن ماہ دو ہفتہ کا ذکر تھا — اک فاقہ کش پکارا نان شبانہ ہے
مجھ سے ملنے والے لیکن مجھ سے کہاں مل پائے ہیں — جتنا میں معلوم ہوا ہوں اتنا نامعلوم ہوں میں

یہ اشعار سرشار کی غزلوں میں سے یہاں وہاں سے درج کرکے میں اپنی بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہم حشر کی نیند سو رہے تھے۔ ہر لحظہ نیا عذاب دیکھوں، ورق جاں پہ ایک ایک غم کا حساب لکھوں، جتنا معلوم ہوں اتنا ہی نامعلوم ہوں۔ ان سب میں ایک قدر مشترک ہے کہ وہ اپنی بات پوری شدت سے کہتا ہے۔ شدت کے ساتھ جذبے میں ٹھہراؤ ہے۔ ضبط کی یہ کیفیت اس کے فن میں گہری تاثیر پیدا کرتی ہے۔ یہ کیفیت "نان شبانہ" میں طنز کا بھرپور دار بن جاتی ہے اور ان سارے اشعار سے عصری سچائی کے مختلف پہلو ابھرتے اور جاگتے ہوئے صاف صاف نمایاں ہوتے ہیں۔

پہلے فطرت کی طاقتوں کے سامنے انسان اپنی بے بسی محسوس کرتا تھا آج انسان خود اپنی تعمیر کی ہوئی دنیا کے سامنے اتنا بے بس ہو گیا کہ اس کے المیوں کا سرا کسی نہ کسی طور اس دنیا سے جا ملتا ہے جہاں آنکھوں کا واقعی اس کے علاوہ اور کوئی مصرف نہیں کہ ہر لمحہ ایک نیا عذاب دیکھتی رہیں۔ حشر کی نیند سونے والے کتنے تھک کر سونے ہوں گے۔ مثال تھکن بھی ہمارے ہی عہد کا تحفہ ہے بھوک چودھویں رات کے چاند کو نانِ شبانہ سمجھتی ہے تو یہ بھوک اور قحط بھی ہمارے ہی مہذب دنیا کے معاشی دائروں میں موجود ہے۔ وہ زمانہ اور تھا کہ قحط کے زمانے میں دمشق کے لوگ عشق کرنا بھی بھول گئے اب قحط مسلسل ہے کہ عشق کرنے کے سارے آداب ہی جاتے رہے سرشار نے ان عصری صداقتوں کا دلسوزی کے ساتھ اظہار کیا ہے اور فن کے اس معیار تک اپنی راہ ہموار کی ہے جہاں شاعری زندہ رہ کر اپنے عہد کی نمائندگی کرتی ہے۔

غلوصِ دل میں حائل تھے عشق کے آداب　　سو ہم نے ریت کی دیوار ہی گرادی ہے

عاشقی ہجر سے عبارت تھی　　وصل ہے عشق میں مری ایجاد

میں خوش نصیب وہ وصل نصیب وہ وفا نصیب　　یارو بنامِ عشق مجھے بوالہوس کہو

اک شخص پارسا بھی حریصِ وصال ہے　　اب اس کو جذبِ عشق کہو یا ہوس کہو

جو گنہ گار بے گناہ ہی تھے　　ان پہ کھلتی ہی کیوں وصال کی بات

جسم تا جسم کوئی قرب نہ بُعد　　ہاں مگر جرأتِ سوال کی بات

آ گئی ساعتِ عبادتِ وصل　　روح کرنے لگی بدن کا طواف

عصری سچائی نے عشق کے تصور کو بھی بدلا ہے اس عہد کا عاشق، معشوق کی خیالی تصویر کے بجائے معشوق سے عشق کرتا ہے جو روح کے ساتھ ساتھ بدن بھی رکھتا ہے۔ ؎

واہمے کو نہیں بخشا ہے حقیقت کا مزاج　　اک تصور سے نہیں جسم سے الفت کی ہے

عشق کو فطرتِ انساں کی بلندی دے کر　　جیسے کی جاتی ہے اس طرح محبت کی ہے

(مسلک)

وعدہ کرنا اور نہ آنا　　جس کی ایک روایت ہے

وہ ٹھہری تصویرِ خیالی　　تو اک زندہ عورت ہے

(انتظار)

اس مرحلے میں جدید شعراء کے لئے عشق و ہوس کے فرق کو قائم رکھنا آسان نہیں ہے لیکن سرشار ان چند شعراء میں شامل ہیں جو بدن کی گفتگو کرتے ہوئے تمام فکری اور جذباتی پہلوؤں کو اپنے اشعار میں پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ کلاسیکی عشقیہ شاعری واقعی ہجر سے عبارت تھی۔ سرشار نے وصل کو اگر اپنے عشق کی ایجاد قرار دیا ہے تو غلط نہیں ہے۔ فراق اپنی تنقید میں ایسے عشق کے قائل نہیں جو جسم و روح کی تقسیم کرتا ہو لیکن جب وصال کے بعد معشوق کو آئینہ دکھانے لگتے ہیں تو لکھنوی شاعروں کے زیر اثر آجاتے ہیں لیکن سرشار کے یہاں وصال پیکر کی پاسداری کا نام ہے اک شخص پارسا بھی وصال کا حریص ہے کیوں کہ اس کے بغیر اسے اپنی پارسائی کھوکھلی محسوس ہوتی ہے۔ گویا فراق کے یہاں جو عشق کا فکری تصور تھا سرشار اور اس کے عہد تک آتے آتے وہ شاعری اور جدید طرزِ احساس میں بدل چکا ہے۔ صوفیائے کرام نے وصل کے موضوع کو بڑی ہوا دی تھی لیکن اس کا سارا ذکر اس کوچے میں تھا جہاں رسوائی کا ڈر

نہیں تھا سرشار اور اس کے عہد کے شعرا، وصل کے اس مضمون میں زندگی گذارنے کے ایک نئے دیے تک زندگی کے ہزار عذاب سہتے ہوئے آئے ہیں اس میں لذت اور مسرت کے ساتھ ساتھ عذاب سہنے کی قوت بھی ہے لکھنوی وصل جدید عہد کے موضوع وصل کے مقابلے میں بالکل نسوانی چیز ہے آپ سرشار صدیقی کے اشعار میں وصل کی سرشاری اور عہد جدید کی قوت کا ایک دقت ادراک کر سکتے ہیں۔

عہد جدید کی قوت و آگہی کو ایک اور روپ میں دیکھئے۔

شگفتِ گل جسے سنتِ نگاہ کہیں — مجھے تو وہ بھی عذاب ہو نظر آئے

پہچان لیا عشق کی صورت میں بھی تجھ کو — اب اور کسی شکل میں آ، اے غمِ دوراں

نہ ہوتے فاصلوں کے شہر میں ہم — تو پھر ملنا بہت آسان ہوتا

میرے سر کا ہو سراب نہ تھا — تشنگی بجھ گئی ہے پتھر کی

سرشار کے یہاں طنز کا کوئی ایک رخ نہیں ہے بلکہ وہ زندگی کی ساری فکر سے وابستہ ہے۔ شگفت گل کا منظر ہو یا عشق، فاصلوں کے اس شہر میں ملاقات کا مسئلہ ہو یا سر کے ہو سے پتھر کی تشنگی بجھ رہی ہو شعور کی تندیل برابر روشن ہے زندگی کے معاملات اور مسائل یکے بعد دیگرے سامنے آ رہے ہیں اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ۔ اس کی نظم "زود پشیماں" میں بھی طنز کا وار بہت گہرا ہے ؎

فصیلِ نفرت عبور کر کے

یہاں جو آیا

تو عبرتِ اعتبار ہوں میں

کہ اپنے خود ساختہ یقین کا

شکار ہوں میں

(زود پشیماں)

سرشار کے سلسلے میں بات کہتے کہتے اب مجھے غالب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

وہ حالِ دل میں مبتلا رہا ہے۔ نظموں اور غزلوں میں یکساں طور پر پوری فنی قدرت اور اپنے عہد کے گہرے شعور کے ساتھ اپنے حالِ دل کی ہنسی بھی اڑا چکا ہے۔ حالِ دل کی نئی تفسیر بھی کر چکا ہے۔ ؎

نیند ٹوٹی ہے تو احساس زیاں بھی جاگا — دھوپ دیوار سے آنگن میں اتر آئی ہے

اب ایک اور مرحلہ اس کی شاعری کے امکان کی صورت میں ابھر رہا ہے۔ طنز اور ہنسی اڑانے کی منزل سے ایک قدم آگے۔ وہ شہر دل میں در آنے والے صحراؤں اور اپنی روح کے سناٹے کو لکھنا چاہتا ہے اور لکھنے کا آغاز کر چکا ہے۔ ؎

مکاں کو جھوٹے مکینوں سے پاک کرنا تھا — سو میں نے دل سے ہر امید کو نکال دیا

یہ شعر نا امیدی کے بجائے روح کے اتھاہ سناٹے کا اظہار ہے۔ سرشار کے لہجے کی قوت اس شعر کی تہہ داری سے اور نکھر گئی ہے۔

یہ اس کی شاعری کی نئی جہت ہے۔

سرشار کی معتبر اور زندہ رہنے والی شاعری ہی نے اس جہت کو دریافت کیا ہے اور اس کے امکانات سارے کے سارے اعلیٰ اور بلند پایہ شاعری سے عبارت ہیں جن کو اپنی گرفت میں لانا سرشار کی ریاضتِ فن کا تقاضا ہے۔ لیکن میرے لئے فی الحال یہ خوشی

بہت ہے کہ میرا ایک دوست رفیق شاعر، رسمی روایتی اور فرسودہ شاعری کے تمام سلسلوں کو توڑ کر اعلیٰ شاعری کی حدود میں قدم آگے بڑھا رہا ہے اور اس میں زندگی کے عذاب سہنے اور روح کے سناٹے میں اترنے کی سکت موجود ہے وہ صوفی نہیں ہے لیکن زندگی کا گنہگار عرفانِ حیات کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا ہے اور اندر سے باہر کی طرف اس کا سفر آہستہ آہستہ مکمل ہو رہا ہے۔

مرے وجود کو اس نے عجب کمال دیا　　کہ مشتِ خاک تھا افلاک پہ اچھال دیا

زندگی کی معرفت کے ساتھ کمال دینے والے کی معرفت زندگی کے گنہگار سرشار صدیقی کے تصوف کا حصہ ہے اور نئی جہت میں اس کے شعری سفر کا سنگِ میل جس کے آگے جو کچھ کہنا ہے وہ سرشار کی مستقبل کی شاعری کہے گی۔

حمایت علی شاعر

شجرِ ممنوعہ کا شاعر

دنیا ابھی خالی تو نہیں مجتہدوں سے

زندہ ہے ابھی مجھ سا روایات کا پابند

یہ شعر پڑھ کر کسی مذہبی شخصیت کا تصور تو ذہن میں آسکتا ہے لیکن کسی ایسے شخص کا گمان تک نہیں ہوتا جو ہر وقت سوٹ پہنے رہتا ہو بات بات پر انگریزی بولتا ہو چہرے پر داڑھی رکھتا ہو نہ مونچھ جب دیکھو حلقہ یاراں میں موجود بذلہ سنج ، فقرہ باز، ہر مسئلہ میں پیش پیش ، خویش دیکھے نہ درویش ۔ ہر وقت ایسا نظر آئے گویا

سارے جہاں کا درد اسی کے جگر میں ہے

ظاہر ہے کہ یہ شعر کسی ایسے شخص کا نہیں ہو سکتا

مگر آپ کو حیرت ہو گی کہ یہ شعر ایک ایسے ہی شخص کا ہے ..... اور اس کا نام ہے سرشار صدیقی جس کا شمار اُس طبقہ شعراء میں ہوتا ہے جس پر روایت شکنی کا الزام ہے اور جو قدامت پسندوں میں اس لئے معتبر نہیں کہ جدت پسند بھی ہے۔

میں نے جب سرشار کا یہ شعر پڑھا تو لمحہ بھر کے لئے میں بھی چونکا کیونکہ شعر میں دعویٰ تو اجتہاد کا ہے مگر پیرایہ اظہار ہے روائتی پھر میں نے سوچا ممکن ہے اس نے یہ انداز بیان روایت پسندوں کو چھیڑنے کے لئے اختیار کیا ہو، اس کے مزاج کی شوخی سے یہ توقع کی جاسکتی ہے۔

چاہے یہ بات مذاق میں کہی گئی ہو مگر اس سے سنجیدہ گفتگو کا ایک پہلو نکل آتا ہے

کیا ایک جدت پسند روایت شکن ہوتا ہے ؟

میرے خیال میں نہیں ۔ جدت پسند اپنے اجتہادی عمل سے روایت میں نئے امکانات کا سراغ لگاتا ہے اور انہیں امکانات سے ایک نئی روایت جنم لے لیتی ہے۔

لیکن یہ بات ہمارے دور کے "جدیدیوں" پر صادق نہیں آتی اس لئے کہ وہ روایت آشنا ہوتے ہی نہیں ان کی جدت بھی تقلیدی ہوتی ہے اور شاید انہیں سے دامن بچانے اور ان سے اپنے آپ کو الگ جتانے کی خاطر سرشار نے ایک ایسا شعر بھی کہا ہے۔

جدت بھی تقلیدی نعرہ ٹھہرا میرے زمانے میں
مجتہدوں کی بستی میں تنہا پابندِ رسوم ہوں میں

یقیناً سرشار ان کھوکھلے مجتہدوں میں سے نہیں ہے اور اسی لئے وہ ان کی ناقدانہ کرم فرمائیوں کا بھی احسان اٹھانا نہیں چاہتا

اب ایسی شہرت رسوائی کی ہوس بھی نہیں
کہ ناشناس، مرا حرف آشنا کہلائے

اسے اپنے دور کی ادبی ملمع کاریوں کا احساس ہے۔ وہ حقائق کی روشنی میں صرف ایک آرزو کرتا ہے

لیجے اس دور میں سچائیاں کھو بیٹھے ہیں
میری آواز میں اب مجھ کو پکارے کوئی

اور اپنی آواز کی نشاندہی وہ ان شعراء کے حوالے سے کرتا ہے جن سے اس کا مزاج ہم آہنگ ہے اور جو اپنے لہجوں کی سچائی کے اعتبار سے روایت پسندوں میں بھی معتبر ہیں اور جدت پسندوں میں بھی۔

رنگ ہوں، بو ہوں، حرف و نوا ہوں، محسوس و معلوم ہوں میں
یاس یگانہ کا لہجہ ہوں، غالب کا مفہوم ہوں میں

اپنی ذات میں غالب و یگانہ کی یکجائی کا دعویٰ ۔۔ جسے میں آرزو سے بھی تعبیر کر سکتا ہوں، خود اس روایت کے احترام کی دلیل ہے جس میں اجتہاد سے کام لیتے ہوئے ان شعراء نے اردو شاعری میں ایک بلند اور منفرد مقام حاصل کیا

جس طرح یگانہ کی غالب شکنی، روایت شکنی کے مترادف نہیں، اسی طرح جدت پسندوں کا شخصیت پرستی سے انحراف معاشرے کی مریض اقدار سے گریز کی تعریف میں تو آسکتا ہے روایت سے بغاوت نہیں کہلا سکتا۔

مجھے گر عشق کا ارمان ہوتا
تو گھر میں میر کا دیوان ہوتا (سرشار)

سرشار کی غالب و یگانہ سے وابستگی کا راز اسی "عشق" میں پوشیدہ ہے۔ سرشار نے عشق کو اس معنی میں قبول ہی نہیں کیا جس معنی میں اردو شاعری کی روایت اسے اپنے گلے سے لگائے ہوئے ہے۔ سرشار کو "عشق حقیقی" سے دلچسپی ہے نہ اس "عشق مجازی" سے جو صرف آرزوئے وصال تک محدود ہے۔ جو کبھی وصل نصیب ہوتا بھی ہے تو اس حد تک کہ

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لے کر چھوڑ دیئے (میرؔ)

وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری کا عشق اپنے مخصوص تہذیبی آداب کا مارا ہوا ہے اور میرؔ سے لے کر حسرت موہانی جیسے وصل پسند شاعر تک، کم و بیش سب کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا (میرؔ)

دیکھنا اور اسے دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا (حسرتؔ)

یہ اور بات کہ جب وصل کی آرزو آتش سیال بن کر دل میں بھڑک اٹھتی ہے تو میرؔ آدابِ عشق کے قابو میں رہتے ہیں نہ مولانا،

حسرت موہانی۔

وصل اس کا خدا نصیب کرے
میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ (میر)

حائل تھی درمیاں جو رضائی تمام شب
اس غم میں مجھ کو نیند نہ آئی تمام شب (حسرت)

ان مثالوں سے مجھے صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اصل حقیقت، وصل ہے، ہجر نہیں ۔ اور سرشار وصل کا شاعر ہے۔
سرشار کی شاعری کا جائزہ لینے کے لئے اس پس منظر پر بھی ایک نگاہ ڈالنا ضروری ہے جس سے اس کی شاعری کا خمیر اٹھا ہے
اردو شاعری کا مطالعہ تاریخ و تہذیب کے متوازی خطوط کے درمیان کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقدار جنہیں روایت سے تعبیر کیا جاتا ہے اکثر بدلتے وقت کی زد میں آئیں اور ٹوٹ ٹوٹ گئیں کبھی گرہ لگا کر انہیں آگے بڑھایا گیا اور کبھی ان پر نیا چہرہ لگا کر نئے نام سے موسوم کردیا گیا۔
عشق ہی کو لے لیجئے ۔ ولی سے لے کر اقبال تک عشق کتنے مقامات سے گذرا اور اب اسکی کیا اوقات ہے۔

چست صدری پہن کے بیٹھے ہیں
دل کی مسند پہ عشق کے جذبات (سلیم احمد)

اسی طرح " آداب عشق " تہذیبی رفتار کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

خلوص وصل میں حائل تھے عشق کے آداب
سو ہم نے ریت کی دیوار ہی گرا دی ہے۔ (سرشار)

وہ فصیلیں جنہیں میر صاحب ساری عمر نہ پھلانگ سکے، سرشار تک آتے آتے "ریت کی دیوار" ہوکر رہ گئیں یعنی پردے کا وہ اہتمام بھی نہ رہا جس سے "چلمن" رنگین ہو جایا کرتی تھی۔ داغ "تانک جھانک کر لیا کرتے تھے اور فیض

ہائے اس جسم کے کم بخت دلآویز خطوط

کہہ کر۔ اقرار کر لیتے تھے کہ

اپنا موضوع سخن اس کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن اس کے سوا اور نہیں

طبع شاعر کا وطن ازل سے، جسم کے دلآویز خطوط کے اندر ہی رہا ہے۔ یہ اور بات کہ مخصوص تہذیبی اقدار نے جسم کو "شجر ممنوعہ" قرار دے کر شاعر کو "وطن بدر" کر رکھا اور ہجر کے صحرا میں خاک اڑانے کے لئے چھوڑ دیا۔ غالب پہلا شاعر ہے جس نے

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

کا احساس دلا کر اس ازلی وطن کو پھر سے آباد کر دیا۔
غالب نے اس شجر ممنوعہ کے سائے میں احساسِ گناہ کے ساتھ پناہ نہیں لی بلکہ بڑی طمانیت قلب کے ساتھ کہا کہ

نیند اسکی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

وہ ثوابِ طاعت و زہد کی حقیقت خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے معاملاتِ عشق کو کھل کھیلنے کی حد تک برتا

ہم سے کھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

محبوب سے بے تکلفی میں اس نے وصول و چھینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ دراصل وہ عشق میں فاصلے کا قائل ہی نہیں تھا۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غالب نے اردو کی ہجر زدہ شاعری کی روایت میں جس اجتہاد سے کام لیا۔ اس نے حسرتِ وصل میں بھی وصل کی سرشاری پیدا کر دی ہے۔

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا
صبح، موجۂ گل کو، نقشِ بوریا پایا!

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

اس نقطۂ نظر سے غالب کے بعد کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو داغ، حسرت، فراق اور فیض سب اسی اجتہاد کی پیروی کرتا نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے

ورنہ غالب کی شاعری میں:۔

عشق نبرد پیشہ طلب گارِ مردِ تھا

"پتھر کی لکیر"[1] تک سرشار عشق کے روایتی مفہوم کے زیرِ اثر نارسائی کے احساس میں مبتلا تھا۔

عشق تک اپنی دسترس بھی نہیں
اور ہم مائلِ ہوس بھی نہیں

دراصل ایک مخصوص تہذیبی ماحول میں پرورش پانے والا نوجوان "عشق و ہوس" دونوں ہی سے خوفزدہ رہتا ہے ایک ہجر کے عذاب کا خطرہ اور دوسرے میں اخلاق باختگی کا۔ مگر جیسے جیسے علم اور تجزیہ آگے بڑھتا ہے معاشرے کی حقیقتیں کھلتی جاتی ہیں۔ چنانچہ "پتھر کی لکیر" ہی میں سرشار اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ

جہاں صداقتِ جذباتِ عشق ہو مشکوک
وہاں خلوصِ ہوس بھی بہت غنیمت ہے

صداقتِ عشق کی توہین کا ردِ عمل غالب میں انحراف کی صورت نمایاں ہوا تھا۔

---

[1] سرشار کا پہلا مجموعہ کلام، مطبوعہ ۱۹۶۲ء

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

یہ ایک ایسا شدید ردِ عمل تھا کہ ہمارے عہد تک اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔

اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم پوجوں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں (اختر الایمان)

مگر ہم اپنے ہی عہد کے ایک اور شاعر حفیظ ہوشیارپوری کے شعر میں ناکامیِ عشق کو ایک اور انداز میں وصل آشنا پاتے ہیں۔

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

حفیظ چونکہ عشق کی روایت کے پاسدار شاعر تھے اس لئے ان میں انحراف کی جرأت نہ ہو سکی مگر سرشار جس نے غالب و یگانہ سے ایک ساتھ اپنا رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیتا ہے اور واضح الفاظ میں سچائی کا اظہار کرتا ہے۔

عشق ناکامیِ ہوس کا نام
ہجر محرومیِ وصال کی بات
جسم تا جسم کوئی قرب نہ بعُد
ہاں مگر جرأتِ سوال کی بات

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ شاعری کی تاریخ و تہذیب کے متوازی خطوط کے درمیان رکھ کر پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بدلتا ہوا وقت کس طرح شعری روایات کو بھی بدلتا ہے۔ میر کی ہجر نصیبی غالب کے خوابِ وصال میں کیسے ڈھل گئی اور فراق سے سرشار تک آتے آتے کس طرح اس خواب کی تعبیر ملی۔ یہ ایک سماجی موضوع بھی ہے اور اقتصادی بھی غالب نے کہا تھا

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

فرصت کا مسئلہ جواب ہمارے دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے سرشار کی ایک نظم "سفید خون" میں بڑے کرب کے ساتھ نمایاں ہوا ہے

مدت کے بعد
برسوں کا بچھڑا ہوا رفیق
بے التجا ملا تھا، بغیر آرزو ملا
لیکن وہ لمحے
"بس" کی تگ و دو کا رزق تھے
جن ساعتوں کو شہر کے عفریت کھا گئے
فرصت کی آرزو کی بھی فرصت نہیں رہی
یا پھر مجھے کسی سے محبت نہیں رہی۔

غالب کی زندگی میں وقت جو کروٹ بدل رہا تھا۔ اور جن سماجی اور اقتصادی مسائل کی کوکھ سے ایک نیا دور جنم لے رہا تھا۔ اس کی بنیاد میر ہی کے زمانے میں پڑ چکی تھی مگر میر کی نگاہ اس کے خارجی مظاہر پر رہی دلی کی تباہی امراء کا زوال شرفا کی دربدری وغیرہ . . . . میر کی شاعری میں یہ موضوعات بھی کہیں کہیں شعر کا موضوع بنے ہیں مگر وہ معاشرہ چونکہ تصوف زدہ معاشرہ تھا اس لیے انہوں نے صبر اختیار کیا۔ اور ہجر کو اپنا نصیب سمجھ لیا غالب کے عہد پر بھی تصوف کی پرچھائیاں تھیں مگر اتنی گھنی نہ تھیں کہ ان کے اندھیرے نگاہ کی روشنی چھین لیتے غالب اردو شاعری کا پہلا عقلیت پسند شاعر ہے۔ جس نے سوچا اور سوالات اٹھائے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں مابعد الطبیعاتی فضا ٹوٹتی جاتی ہے اور حقیقت کا ادراک اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکنے لگتا ہے

عشق میں، ہجر سے وصال کی طرف اقدام، روحانی اقدار سے سماجی اقدار کے تصادم کی علامت ہے پرانی روایت میں تبدیلی کا یہ رویہ رفتہ رفتہ ایک نئی روایت بن گیا فراق کے جمالیاتی احساس نے وصل کی شاعری کو جو "روپ" دیا وہ ہندوستانی دیومالا کے آئینے میں اور سنور گیا لیکن اردو غزل نے چونکہ اس دیو مالا سے کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا اس لیے حسن کے وہ زاویے نمایاں نہ ہو سکے۔ جو فراق کی رباعیات میں نظر آتے ہیں ویسے فراق کی غزل میں وصال کی جمالیاتی فضا ایک اور انداز میں چمکی ہے۔

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی معصومیاں نکھر آئیں

یہ معصومیت اس احساس گناہ کو رد کرتی ہے جو شجر ممنوعہ کو چھونے سے عبارت تھا اور اردو شاعری چونکہ اب تک وصل کی اس معصومیت سے نا آشنا رہی تھی اس لیے اس کا مجموعی رویہ ہجر پسندانہ ہی رہا چنانچہ سرشار کا یہ دعویٰ غالب سے وابستگی کے پس منظر میں کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہ

عاشقی ہجر سے عبارت تھی
وصل ہے عشق میں مری ایجاد

ایجاد کا سہرا کسی کے سر بندھے، نوشہ۔ مرزا غالب ہی کہلائیں گے۔ اور میرا خیال ہے سرشار کو اس پر اعتراض بھی نہیں ہوگا۔ سرشار نے ہمارے دور میں اس موضوع پر جس زاویے سے لکھا وہ سلیم احمد کی طرح چٹخارے دار تو نہیں مگر لطیف و شگفتہ ہے اگر اسے دیو مالا کی جمالیاتی فضا بھی مل جاتی تو اس کا حسن ہی کچھ اور ہوتا

کچھ اشعار سنیے •

کیا کیا نہ ان سے خواب میں گستاخیاں رہیں
میں سو گیا تو حوصلے بیدار ہو گئے

جو گنہگار بے گناہ ہی تھے
ان پہ کھلتی ہی کیوں وصال کی بات

عرفانِ لطافت ہی میسر نہیں ورنہ
یاں وصل کی ساعت بھی عبادت کی گھڑی ہے

جب وصل ہی ٹھہری ہے ترے عشق کی منزل
پھر کس لئے یہ جسم کی دیوار کھڑی ہے

مگر جب وصل کی روداد سرشاران الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ

رات بھر اک خدا کے بندے نے
مجھ کو کیا کیا گناہ گار کیا

تو مجھے گمان ہونے لگتا ہے کہ شجر ممنوعہ کا خوف ابھی تک اس کے دل میں دھڑک رہا ہے کیونکہ معاشرے کے ردعمل پر اس کے لہجے میں تلخی بھی آجاتی ہے۔

کس نے لکھی نہیں وصال کی بات
میں نے کہہ دی تو ابتذال کی بات

وصال کا موضوع اتنا نازک اور احتیاط طلب ہے کہ ذرا سا عدم توازن شاعر کو ابتذال کے گڑھے میں گرا دیتا ہے

زد رہ وہ اور ہے پاتا ہے بدن جس سے نمو
لاکھ کوئے کوئی راتوں میں دریا کہ موسل (سلیم احمد)

سرشار نے اپنے مزاج کی شوخی سے کام لے کر اپنے موضوع کو شگفتہ بنانے اور اپنے اشعار کو ابتذال سے بچانے کی ضرور کوشش کی ہے مگر اس کے باوجود یہ موضوع مزید احتیاط کا مطالبہ کرتا ہے۔

سرشار کی شاعری کے بیشتر موضوعات "شجر ممنوعہ" کی تعریف میں آتے ہیں ظاہر ہے کہ انہیں چھونا ہی بغاوت کے مترادف ہے۔ چاہے وہ سیاسی ہوں، سماجی ہوں یا نفسیاتی مگر وصال جس کے لئے شجر ممنوعہ کا استعارہ بطور خاص تخلیق ہوا ہے اس کا خاص موضوع ہے۔ نظموں میں یہ موضوع جس انداز سے برتا گیا ہے میرے خیال میں زیادہ پرکشش ہے۔

میرا عشق فرشتوں جیسا
میرا پیار بہت پاکیزہ
چھونا کیسا پانا کیسا
اسکو ہاتھ لگانا کیسا
سوچتے سوچتے بیت گیا دن
صبح سے سوچ رہا ہوں لیکن
رات اک خواب نظر آیا ہے
دل اس خواب پہ شرمایا ہے
(لاشعور)

ایک اور نظم جس کا عنوان ہی "وصال" ہے اسی شجر ممنوعہ کا کنایا ہے اس نظم میں "ترغیب" احساس گناہ سے آلودہ نہیں بلکہ اس حوصلے کا تقاضہ کرتی ہے جو غالب کے الفاظ میں "عشق نبرد پیشہ" کی پہچان ہے۔

بڑھاؤ ہاتھ اگر کچھ حوصلہ ہے
یہ پھل اب پک چکا ہے
توڑ بھی لو

اسی طرح "خوشۂ گندم" میں ایک ایسی خود سپردگی کی کیفیت ہے کہ جب نظم ختم ہوتی ہے تو "گناہ آدم" پر پیار آنے لگتا ہے۔

ہم کہ دانا تھے
زیرک تھے، ہشیار تھے
جانتے بوجھتے زیر دام آگئے۔
اور اک بار پھر
گندمی رنگ حوا کے کہنے میں
آدم علیہ السلام آگئے

لیکن یہی وصال جب استحصال بن جاتا ہے تو "انارکلی" جیسی نظم وجود میں آتی ہے جو ابنِ آدم کی کمینگی کی طرف اشارہ کرتی ہے
سرشار کی اکثر نظمیں مختصر علامتی افسانے انداز لئے ہوئے ہیں ایک چھوٹی سی نظم دیکھئے

دستک پر
بستر سے اٹھ کر
جب میں نے دروازہ کھولا

دروازے پر
میں خود ہی تھا
آنے والا (مہمان)

ایک اور نظم ہے

لیکن میں نے
آج سے پہلے خشک سمندر کب دیکھے تھے
آج ان آنکھوں میں جھانکا
تو صحراؤں کی پہنائی میں
گرد کا اک طوفان اٹھا تھا
اور بگولے ناچ رہے تھے۔ (ویرانے)

سرشار تاریخ کے مختلف کرداروں کو استعاروں کے طور پر بھی اپناتا ہے اور ان کے ہاتھوں اپنے عہد کی حقیقتوں کی نقاب کشائی کرتا ہے
"دیو مالا" میں یوسف زلیخا کی معرفت اور "نجات" میں گوتم کے حوالے سے اس نے اپنے عہد کے مسائل کا جائزہ لیا ہے بالخصوص "نجات" ایسی نظم ہے جو سرشار کے نظریہ حیات کی بھی تفسیر ہے اس نظم میں انسان دنیا کو تیاگے بغیر نروان حاصل کرتا ہے اور اپنی ذات میں بھگوان نظر آنے لگتا ہے۔

سرشار نے غالب کی طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی شاعری میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہ اپنے عہد کے جس جس تجربے سے گذرا ہے وہ اسکی شاعری میں غالب و یگانہ دونوں سے فیض حاصل کرتے ہیں مگر کہیں کہیں اس کی انفرادیت کا بھی سراغ دیتے ہیں
غزل کے کچھ اشعار دیکھئے جن میں سرشار اپنی آواز کو تلاش کرتا نظر آتا ہے۔

بستر پہ کچھ اس طرح سے بکھرا ہے مرا جسم
جیسے مری ٹوٹی ہوئی تصویر پڑی ہے

پہلے آئینہ سامنے رکھا
اور پھر آئینے کو پیار کیا

یہ کوئی مجھ ہی میں اک شخص ہے کہ جس نے مجھے
مرے ہی لہجہ و انداز میں صدا دی ہے

مجھ میں گم ہو، مری ہستی کی نفی بھی کر دے
کاش یوں بھی تو کسی روز نوازے کوئی

جیسے تحریر ہو عذابِ فراق
سلوٹیں پڑ رہا ہوں بستر کی

مرا خلوصِ سماعت بھی دیدہ ور ٹھہرا
جو سُن سکوں، مجھے وہ گفتگو نظر آئے

سرشار کی غزل کی گونج اس کے ہم عصر شعراء میں بھی سنائی دیتی ہے۔ میں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔

میں نے جس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن کبھی اس طرح گزارے کوئی

محسن بھوپالی کا شعر ہے

میں نے جس طرح زلیست کاٹی ہے
ایک دن ہی سہی بسر تو کر

دونوں اشعار میں حیرت انگیز مماثلت ہے
ہجرت ہمارے دور کی ایک نسل کا اجتماعی تجربہ ہے اس تجربے میں ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے سرشار کی شاعری بھی اس کا تجزیہ کرتی ہے۔

خوابوں کی جو فصل بو رہے تھے
تیار ہوئی تو رو رہے تھے

در و دیوار کو مکان کہا
یہی اوقات رہ گئی گھر کی
(زود پشیماں)

نظموں میں یہ تجربہ کہیں تقابل پر اکسا کر تسکین کا سبب بنتا ہے تو کہیں لا حاصل کا غم بن جاتا ہے

مگر آکے منزلِ شوق پر
یہ کھلا کہ اے دلِ معتبر
وہ تمام جذبے بکھر گئے
وہ تمام حوصلے مر گئے
یہ مآلِ شوق ہنر ہے
کہ جبینِ وقت پہ گرد ہے

نہ زمیں ملی نہ زماں ملی
جو اماں ملی تو کہاں ملی
(دیار بندہ نواز)

مگر سرشار تاریخ کے جدلیاتی عمل کا بھی شعور رکھتا ہے۔ "تنسیخ" اسی حقیقت کے ادراک سے عبارت ہے

جو لمحہ گذرے
وہ نکہتوں کی طرح سے
پھر پھول کا کوئی پیرہن نہ پائے
جو گھر کو چھوڑے
وہ پھر خدا کی زمیں پہ
میری طرح سے کوئی وطن نہ پائے
یہ وقت کا ایسا فیصلہ ہے
جو گلستاں میں
سند ہوا ہے
مگر یہی فیصلہ تو کل ایک پھول کے ہاتھ
رد ہوا ہے
وہ ایک لمحہ جو اس کو چھو کر گذر گیا تھا۔
ابد ہوا ہے

"برزخ" میں بھی وہ اسی جدلیاتی حقیقت کا انکشاف کرتا ہے۔

ایک لمحہ ماضی کی تھکن ہے
دوسرا مستقبل کی لگن ہے

یہ لمحہ ۔ یہ تیسرا لمحہ
دو لمحوں کے بیچ کا وقفہ
ماضی اور فردا کا رشتہ

برف کی صورت بہہ جائیگا
ماضی ہو کر رہ جائیگا
وقت سے لیکن کہہ جائیگا

لہرایا سورج کا پھریرا
مشرق سے جاگا ہے سویرا
یہ لمحہ خود جسم ہے میرا

سرشار کی شاعری کا سب سے توانا پہلو یہی ہے ۔ غالب نے کہا تھا ۔

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

سرشار کہتا ہے

جتنا میں معلوم ہوا ہوں
اتنا نا معلوم ہوں میں

وہ ایک سچے شاعر کی طرح اپنی جستجو کر رہا ہے ۔

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک ۔ (غالب)

سرشار صدّیقی
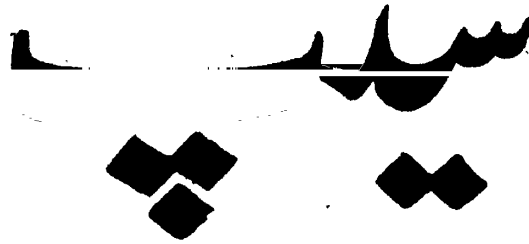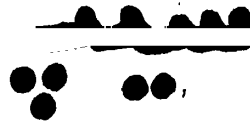
کچھ نثر میں......

مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ میں اپنی شاعری کے وسیلے سے کہہ چکا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر شاعر بہت زیادہ شخصی علامتوں، ذاتی استعاروں
[...]نی حوالوں کے بغیر شعر لکھے اور اپنے مشاہدات، تجربات اور محسوسات میں اپنے پڑھنے والوں کو شریک رکھے تو اس کا ضمیر اور ما فی الضمیر دونوں
[...]ی شاعری میں منکشف اور منعکس ہوتے ہیں۔ شاعر کے بارے میں اس سے زیادہ جاننا عام حالات میں بہت ضروری بھی نہیں، تاہم بعض ایسی
[...]ں کی صراحت کرتا چلوں جو ہر چند کہ میری شاعری میں براہ راست بیان نہ ہو سکی ہوں لیکن میرے طرزِ فکر، اندازِ نظر اور اسلوبِ حیات پر گہرے
[...]دور رس اثرات چھوڑ گئی ہوں۔

میری شاعری کا پورا سفر آپ کے سامنے ہے۔ اس سفر میں منزل کے تعین اور راستوں کے انتخاب میں جہاں جہاں ترمیم و تنسیخ اور
[...]و قبول کے پیچیدہ مراحل آئے ہیں اُن کی چھوٹ میرے لہجے، لفظیات، طرزِ احساس اور اسلوبِ اظہار سب پر پڑی ہے۔ یہ تبدیلی اعتماد کے تزلزل
[...]راج کے تلوّن کا نتیجہ نہیں بلکہ زندگی کے ایک تجربے سے دوسرے تجربے کی جانب تجسس کی جست ہے۔

میری شاعری کا خمیر غمِ عاشقی سے نہیں غمِ زندگی سے اُٹھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ معروف عصری مفہوم میں کاروبارِ عشق آسودہ حالی کا مشغلہ
[...]ہے جو مجھے کبھی میسر نہ آئی۔ عشق کی افلاطونی اصطلاح کا میں کبھی متحمل نہیں ہو سکا۔ تصوراتی اور مفروضہ قسم کے تصورِ عشق سے میری فعال زندگی کو کوئی
[...]پسی نہیں رہی۔

فکرِ معاش کی کوکھ سے جنم لینے والی شاعری، زندگی کے تلخ و ترش ذائقوں کا مزہ چکھتی ہے۔ ٹھوس حقیقتوں کے راستے پر قدم بڑھاتی
[...]ہے، پیداواری رشتوں کی تلاش اور امن و انصاف کی جستجو کرتی ہے، صداقت و انبساط کا سراغ لگاتی ہے۔ اور نتیجے کے طور پر تخلیق و اظہار کو زندگی
[...]اور ادب کے عصری تقاضوں سے مربوط رکھنے کا عمل آگے بڑھاتی ہے۔

میرا عہد غور و فکر، تحقیق و جستجو، ایجاد و اختراع اور جذبے کو عمل کی سطح پر دیکھنے، پرکھنے اور برتنے کا عہد ہے اور میں اپنے ضمیر
[...]ے مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی کم سواد شاعری کی کمزور اور چھوٹی آواز کو عالمگیر انسانیت اور عالمی معاشرے کے لئے بلند ہونے والی صداؤں
[...]سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک اور بات جو میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں وہ میرے ترکِ وطن کے سانحے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ایک غیر متنازعہ فطری امر ہے کہ
[...]انسان اپنی جائے پیدائش سے والہانہ محبت رکھتا ہے، مجھے بھی اپنی جنم بھومی (کانپور) سے ماں کی طرح پیار تھا، اور اب بھی ہے۔ اس

شہر نے مجھے زندگی کا شعور اور زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کیا، اسی کی مٹی میں میرے پیارے آسودۂ خاک ہیں۔ وہ شہر میرا ایسا ماضی ہے جو میرے مستقبل کا معمار ہے میں نے اپنے اس آبائی شہر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اپنے نظریاتی وطن میں رہنے کا فیصلہ اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہاں میرا عقیدہ، یا میرا نظریہ، یا میری آبرو، یا میرا معاش خطرے میں تھا، یہ اندیشے تو کرۂ ارض کے کسی بھی خطے میں معدوم نہیں۔ میں نے تو اپنے گھر کو اس لئے خیرباد کہا کہ میرے ہم وطن میری حب الوطنی پر شبہ کرنے لگے تھے اور میری وطن دوستی معرض خطر میں پڑ گئی تھی۔ ہر لمحہ وفاداری کے ثبوت کا تقاضہ ہونے لگا تھا اور ہر حرکت، ہر عمل کو مشکوک نظروں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ الزامات کے تسلسل میں صفائی پیش کرنے کے لمحے کی فرصت تک سلب کر لی گئی تھی۔ اگر اس نازک اور ناقابلِ اصلاح صورتِ حال سے میرے بوڑھے ماں باپ واقعی ہراساں نہ ہو گئے ہوتے تو شاید وہ کمزور لمحہ میری زندگی میں کبھی نہ آتا جس نے مجھے سبزۂ بیگانہ کی طرح اکھاڑ کر زمین کے رشتے سے محروم کر دیا۔

سنہ پچاس میں کانپور سے کراچی پہنچا اور ابھی قدم بھی نہ جمانے پایا تھا کہ سنہ باون میں صرف چند مہینوں کی مختصر مدت کے دوران یکے بعد دیگرے میرے باپ، میری ماں اور میری چھوٹی اکلوتی بہن کا سکریوں سیل دور کانپور میں انتقال ہو گیا۔ یہ متواتر اور غیر متوقع سانحے مجھے بے حال کر گئے۔ موت برحق لیکن آخری لمحوں کے کرب میں ان بچھڑنے والوں سے دورافتادگی کا غم میری زندگی کا کبھی نہ فراموش ہونے والا المیہ بن گیا۔ میں اپنی اس محرومی سے سخت جنگ کر رہا ہوں لیکن ان صدموں کے اثر سے آج تک نہیں نکل سکا۔ زیادہ سے زیادہ میں نے اس ذاتی غم کو اپنے جیسے بے شمار لوگوں پر گزرنے والے اجتماعی المیے کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ دوری، تنہائی اور بے گھری کے احساس نے جہاں جہاں میری شاعری میں راہ پائی ہے وہ اسی جذبے کی مختلف صورتیں ہیں۔

سنہ چون میں میری زندگی کا ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا۔ یہ میری ازدواجی زندگی کا آغاز تھا۔ شادی عموماً زندگی کے رخ بدل دیا کرتی ہے۔ لیکن میرے ساتھ یہ تبدیلی نہایت خوشگوار اور مثبت انداز میں ہوئی۔ غیر مستقل مزاجی اور غیر ذمہ داری کا رویہ جو ابتدا ہی سے عادت بن چکا تھا، مایوسی اور بے یقینی جو حالات کے طفیل فطرت کا حصہ ہو چکی تھی اور جس سے نجات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، وہ شریکِ حیات کی رفاقت میں بغیر کسی شعوری جدوجہد کے استقلال، فرض شناسی اور ٹھہراؤ میں بہ تدریج تبدیل ہوتی رہی — صداقت، محبت، خلوص، محنت، قناعت، الغرض زندگی کی تمام اعلیٰ اقدار پر مجھے آج جس قدر اور جس درجہ اعتماد حاصل ہے وہ سب اسی پیکرِ وفا کا اعجاز ہے۔

میں اپنی شاعری سے مایوس نہیں لیکن اس باب میں کسی خوش فہمی کا شکار بھی نہیں ہوں۔ زندہ روایات سے کٹے ہوئے معاشرے سے میں اکابر فراموشی کا شکوہ سنج نہیں ہوں۔ حال کے حوالے سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے کئی ہم عمر اور ہم عصر جو مجھ سے بہتر شعر لکھتے لکھتے حالیہ چند برسوں میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے انہیں بھلا دیا گیا۔ مصطفیٰ زیدی، نریش کمار شاد، قابل اجمیری، ابن انشا، شکیب جلالی وغیرہ کیا ایسی ہی بے اعتنائی کے مستحق تھے کہ صرف چند برسوں میں فراموش کر دیئے جائیں؟ جب ان کے ساتھ یہ سلوک اور یہ سفاکانہ رویہ دیکھ رہا ہوں تو اپنا اور اپنے جیسے کئی دوسروں کا انجام میری نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ خسارے کا یہ سودا میں نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ مجھے اچھی طرح علم تھا کہ اس کاروبارِ جنوں میں جسم و جاں کے زیاں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا، تو میں پھر اس عبادت میں جزا کی تمنا بھی کیوں رکھتا؟

(تازہ مجموعۂ کلام "بے نام" کا پیش لفظ)

■

سرشار صدیقی

........انجمنِ ساختہ اند

جو کل تھے رونق محراب و منبرِ مسجد
وہ آج بزمِ سیاست کی زیب و زینت ہیں
وہ جن کا قوم فروشی شعار تھا کل تک
خدا کی شان وہ اب غمگسارِ ملت ہیں

یہی نہیں کہ تجارت تھی قوم تک محدود
کوئی خریدے تو ایمان بیچ دیتے تھے
بہ شکل فتویٰ، یہ کاغذ کے چند ٹکڑوں پر
حدیث کیا ہے کہ قرآں بیچ دیتے تھے

مگر یہ خواہشِ دولت یہ حرصِ جاہ و جلال
خدا فروشی کی منزل پہ بھی نہ ختم ہوئی
یہ پیاس وہ تھی کہ مذہب کا خون پی کر بھی
منافقوں کی نگاہوں میں تشنگی ہی رہی

تو یہ ہوا، کہ نئی مسجدیں بنائی گئیں
جو انجمن کے دفاتر کے کام آتی ہیں
بجائے سجدہ و تسبیح و خطبۂ و اوراد
منافقانہ عناصر کے کام آتی ہیں

کوئی فریب و ریا کو خلوص لاکھ کہے
عوام اب مگر اس جال میں نہ آئیں گے
نہ راہبر سہی کوئی تو کیا، کہ یہ رہرو
بھٹکتے ڈھونڈتے منزل کو پا ہی جائیں گے

۱۹۵۲ء

(''ابجد'' سے)

سرشار صدیقی

وہ خوش نصیب جو چشمِ کرم سے دُور رہے
ہر اک نوازشِ عنوانِ غم سے دُور رہے

جنھیں نشیب و فرازِ حیات راس آیا
وہ زُلفِ دوست کے ہر پیچ و خم سے دُور رہے

خوشا وہ جرعۂ تلخابۂ حیات ـــــ کہ ہم
شرابِ معرفت و جامِ جم سے دُور رہے

ہمیں یہ کُفر مُبارک، کہ ہم اسی کے طفیل
ہر اک سیاستِ دیر و حرم سے دُور رہے

غمِ حبیب ہو سرشار یا غمِ دوراں
شراب خانے میں ہم ہوں تو ہم سے دُور رہے
(۱۹۴۶ء)

منسوب آپ سے جو وفا کا فسانہ ہے
یہ بھی تو ایک طرزِ تپاکِ زمانہ ہے

برہم مجھی سے صرف مزاجِ زمانہ ہے
یہ دشمنی بھی ہے تو بڑی دوستانہ ہے

چاکِ جگر نہ دیکھ، گریباں کی فکر کر
اے ہمنشیں یہ ہوش و خرد کا زمانہ ہے

تشبیہِ حسنِ ماہِ دو ہفتہ کا ذکر تھا
اک فاقہ کش پکارا کہ نانِ شبانہ ہے

تنہا نہیں ہے عشق ہی جہدِ حیات میں
حسنِ گریز پا بھی تو شانہ بہ شانہ ہے

کہتے ہیں جس کو عشق، بلا ہے بپاکِ نفس
ناکامیِ ہوس کا مقدس بہانہ ہے
(۱۹۵۸)

سرشار صدیقی

درد کا سورج

کیا زخم جگر کیا غنچہ لب
کیا چاند ستارے اور کلی
ہنستے جو کسی کو دیکھ لیا
آنکھوں میں نمی سی تیر گئی

مجھ اپنے کسے یہ زخم ملا
محسوس ہوا یہ درد کسے
کس شکل سے اس کو پہچانیں
کس نام سے دیں آواز اسے

تشبیہ و علامت کے سارے
دروازے ہم پر بند ہوئے
کس دکھ نے ہمیں اپنایا ہے
کس درد کے ہم پابند ہوئے

یہ زخم ہمارا اپنا ہے
یہ درد متاعِ عام نہیں
اس زخم کی کوئی شکل نہیں
اس درد کا کوئی نام نہیں

("پتھر کی لکیر" سے)

۱۹۶۰ء

سرشار صدیقی

مکافات

وہ اپنے ہی تارِ نفس سے
خود اپنا کفن بُن چکا ہے
اور اب اپنے ہی ناخنوں سے
خود اپنی لحد کھودنے کے
عذابِ شب و روز میں
مبتلا ہے

یہی زندگی
جس کو جنت بنانے کی دُھن میں
نہ معلوم کتنی بہشتوں کو
اس نے جہنم بنایا
یہی زندگی
آج اس کے لئے
اک سزا ہے

۱۹۸۲ء

سرشار صدیقی

نامانوس آوازوں سے آغازِ سفر تھا
اک اندیکھا چہرہ میرے پیشِ نظر تھا

بے گھر ہوں بے سایہ ہوں اب کسے بتاؤں
اک چھتنار درخت مرے دروازے پر تھا

گھر سے اک آواز جو آئی، میری ہی تھی
میں نے جہاں دستک دی تھی میرا ہی گھر تھا

ساری عمر سراب کے پیچھے بھاگا ہوں میں
اَب دیکھا تو دریا میرے ہی اندر تھا

خواب میں رویا، خواب کہیں سچے ہوتے ہیں
لیکن آنکھ کھلی تو میرا تکیہ تر تھا

کتنے خلوص سے سوچ رہے ہیں توڑنے والے
یہ دل تھا یا آئینہ تھا یا پتھر تھا

شہزادے نے ڈالی تھیں بن باس کی رسمیں
آخر آخر شہزادہ وہ بھی شہر بدر تھا

میرا ہی سر سجدے میں تھا مقتل میں بھی
اور جو خنجر بر تھا وہ بھی میرا سر تھا

پوچھ رہا تھا کوئی سبب میرے اشکوں کا
میں نے ہنس کر ٹال دیا، یہ میرا ہنر تھا

دو بوڑھے لب لرزے تھے ہنگام جدائی
اور وہ حرف دعا ہی میرا رختِ سفر تھا

(۱۹۸۲ء)

سرشار صدیقی

محیط

دیارِ طائف، گواہ رہنا
کہ تیری نامہرباں زمیں پر
وہ برگزیدہ ترین انسانؐ
جو شفقتوں کے پیام لے کر
محبتوں کے سلام لے کر
کلام و شرحِ کلام لے کر
مثالِ موجِ صبا گیا تھا
یہ چاہتا تھا
کہ ریگ زاروں کے بطن میں
جو کلی نمو آشنا نہیں ہے
جسے اپنے وجود کا کچھ پتہ نہیں ہے
وہ مسکرائے
وہ مسکرائے تو تپتے صحراؤں کو پیامِ بہار آئے

وہ برگزیدہ ترین انسانؐ
یہ چاہتا تھا
ضمیرِ شب میں جو روشنی کی کرن چھپی ہے
خود اپنے ادراک کی نفی ہے
یقین عرفانِ ذات پائے
سوادِ تاریک جگمگائے

جو پھول لے کر گیا تھا
اُس روشنی کو
تری زمین پر بسنے والے لوگوں نے
بارشِ سنگ سے نوازا
لہو لہو روشنی نے
تیری زمین پر بسنے والے لوگوں کے حق میں
پھر بھی دعائے توفیق و آگہی کی
کہ اس کی رحمت عظیم تر تھی

وہ آیۂ نور و نکہتِ مہرباں کی صورت
تری زمیں سے زماں میں پھیلا
مکاں میں اور لامکاں میں پھیلا
وہ روشنی کائنات ہے اب
وہ لوئے محلِ شش جہات ہے اب

سرشار صدیقی

راہِ فرار

چوتھی سمت کے جانے والو
اس رستے پر، حدِ نظر تک
جتنے نقشِ قدم دیکھو گے
سب جانے والوں کے ہوں گے
واپس آنے والا
ان میں نقش کفِ پا کوئی نہیں ہے
اس رستے کی آخری حد پر
یا تو دنیا بہت حسیں ہے
یا پھر وہ دنیا ہی نہیں ہے
جو بھی اس رستے پر گیا ہے
پھر واپس آیا ہی نہیں ہے

گفتگو

میں لفظوں کا سوداگر ہوں
لیکن میں نے
جب بھی اس سے
اپنے دل کی باتیں کی ہیں
ان باتوں پر
لفظوں یا آوازوں کا احسان نہیں ہے
جذبوں کی گہری سچی خاموش زباں میں
صرف میری آنکھیں بولی ہیں

سرشار صدیقی

مجھے گر عشق کا ارمان ہوتا
تو گھر میں میر کا دیوان ہوتا

کسی تقریب کا سامان ہوتا
کہ ہمسایہ مرا مہمان ہوتا

تو پھر میں کس سے پاتا وصل کی داد
جو تو بھی کمسن و نادان ہوتا

نہ ہوتے فاصلوں کے شہر میں ہم
تو پھر ملنا بہت آسان ہوتا

اگر سب لوگ ہوتے مجھ سے چھوٹے
تو میں سب سے بڑا انسان ہوتا

جسے بھی سونپ دیتے ہم خدائی
وہی فرعونِ بے سامان ہوتا

ہوئے لوح و قلم ایجاد، ورنہ
ابھی تک آدمی حیوان ہوتا

جسے دل میں چھپائے پھر رہے ہیں
اگر لب پر وہی طوفان ہوتا

نہ اپنی ذات سے باہر نکلتے
نہ اپنی ذات کا عرفان ہوتا

ہر اسرائیل کو تسلیم کرتا
اگر میں والیٔ ایران ہوتا

قلوپطرہ اگر قاتل ہی ہوتی
تو سارا روم قبرستان ہوتا

تری محفل میں آکر سوچتا ہوں
نہ آتا تو بہت نقصان ہوتا

خدا پر، آدمی پر، یا صنم پر
کسی پر تو ترا ایمان ہوتا

اگر میں بھاگ جاتا زندگی سے
تو گوتم کی طرح نروان ہوتا

لہو سے ڈھالتے خورشید کوئی
تو شاید صبح کا امکان ہوتا

میں اپنے سامنے آئینہ رکھتا
پھر اپنے عکس پر قربان ہوتا

جو ملتی رزق کے دھندوں سے فرصت
تو لکھ مرنے کا کچھ امکان ہوتا

جو میں سچی غزل لکھتا تو سرشار
وہی ہر شعر کا عنوان ہوتا

سرشار صدیقی

اب ایسی شہرتِ رسوائی کی ہوس بھی نہیں
کہ ناشناس، مرا حرفِ آشنا کہلائے

وہ دوست ہو کے بھی مخلص ہے کون مانے گا
کہ اس زمانے میں یہ بات معجزہ کہلائے

نیاز مندوں میں کیوں جراتِ سوال نہیں
یہ بے نیازی تو اس شخص کی ادا کہلائے

یہ راز تیرے سوا اور کون سمجھے گا
مرا سکوت ہی اظہارِ مدعا کہلائے

ہمارا جیسا کوئی بادہ خوار کیا ہوگا
کہ ساری عمر پیئے اور پارسا کہلائے

اگر بہار پہ ایماں ہو اہلِ گلشن کا
خزاں بھی موسمِ گل ہی کا سلسلہ کہلائے

ہم اب تک اپنے براہیم کی تلاش میں ہیں
جو راہزن بھی یہاں آئے رہنما کہلائے

بہا کے اشک، کچھ اس طرح آنکھ خشک ہوئی
کہ جیسے ابر چھٹا اور چاندنی چھٹکی

میں گھر سے بھاگ کے جاتا بھی تو کدھر جاتا
کہ گھر میں آگ تو باہر کی آگ ہی سے لگی

سراب ہی سے نہ سیراب ہو گئے ہوتے
مگر کسے تھا شعورِ خلوصِ تشنہ لبی

صلائے عام تھی مقتل میں سرفروشوں کو
مگر یہ خوش خبری مجھ کو دیر سے پہنچی

وہ بازگشتِ شکستِ صدائے دل ہی نہ ہو
کہ اس کے بعد وہ آواز پھر سنائی نہ دی

سرشار صدیقی

برزخ

حسین فردا کی آرزو میں
مرا یقیں
کب سے زندگی کی صلیب پر
انتظار کی گرد ہو چکا ہے
یہ شعلۂ اعتبار
فانوسِ زیست میں
سرد ہو چکا ہے

مرے خدا !
دل کی سرزمیں پر
کوئی مسیحا اتار
جو قتل گاہِ جاں میں
امید کا معجزہ دکھائے

نہیں تو اے آسمان والے
زمیں سے جس طرح تو نے
ساری مسرّتوں کو
صداقتوں کو اٹھا لیا ہے
مرے یقیں کی یہ بے کفن لاش بھی اٹھا لے

شمیم احمد

بے چہرہ شاعری کی پہچان

کچھ عرصہ ہوا میں نے جدید شاعری کے حوالے سے ضیا جالندھری پر لکھتے ہوئے کہا تھا : ضیا کی شاعری سامع کو اپیل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی . لیکن اس کے ساتھ بے دقعتی کا احساس کبھی پیدا نہیں ہونے دیتی اور اس میں ، اس کے جدید اسلوب کا کوئی ہاتھ نہیں ہے- میرآجی اور راشد اُن سے زیادہ جدید تھے مگر اُن کی شاعری میں اپیل کرنے کا جوہر زیادہ تھا- اسی طرح ہمارے آج کل کے جدید شعراء میرآجی اور راشد سے بھی زیادہ جدید ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ بے دقعتی کا احساس بھی فوراً دلا دیتے ہیں - اس سے قبل کہ میں جاذب قریشی کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے دوں مجھے اس شاعری کے خدوخال کو آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہئے جس سے جاذب قریشی کی شاعری کی پہچان کی جا سکتی ہے ، ورنہ اس کی شاعری کا ابلاغ اور شعری تجربہ دونوں ہماری دسترس سے دُور رہیں گے۔

ہمارے دَور کی جدیدیت ایک ایسے دَور کی پیداوار ہے جس میں تاریخی اور معاشرتی تغیرات کی بنا پر فرد کا رشتہ اس کی زمین ، اس کے ماحول اور اُس کے گھر سے خود بخود کمزور پڑ گیا ہے . فرد خود کو ہر تعلق اور نسبت سے آزاد محسوس کرتا ہے مگر وہ آزادی کے جوہری تصوّر کے بار کو کبھی اُٹھا سکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا- اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دَور کا یہ فرد اپنا کوئی اسلوب زیست پیدا نہیں کر سکا ہے - یہ صورتِ حال اور خلاء اُن تمام معاشروں کے جدید افراد میں زیادہ اُبھرا ہے ، جو بڑی حد تک پابند معاشرے کے شہری ہوتے ہوئے بھی اس سے شعوری طور پر خود کو لاتعلق محسوس کرتے ہیں - اس لئے پاکستان میں جدید شعراء کی اکثریت میں روایت سے آزادی دراصل بے جڑی کے احساس اور بے زمین ہونے کے شعور سے پیدا ہوتی ہے- پابند معاشرے سے تعلق رکھنے والا آدمی اپنی جڑیں اور زمین رکھتا ہے ، اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کے لئے بھی ایک نہ ایک نظامِ خیال یا مختلف ہی سہی مگر کچھ نئی اقدار سے گہرا شغف رکھتا ہے - چونکہ اس کی جڑیں معاشرے میں بڑی مضبوط اور گہری ہوتی ہیں- اس لئے وہ اپنے معاشرے سے بغاوت کر کے کبھی اس سے لاتعلق نہیں ہوتا - جب کہ موجودہ جدیدیت کے تمام مسائل آج کے معاشرے سے ایسے لاتعلق جدید ذہنوں کی پیداوار ہیں جن کو زمین کا احساس نہیں ہو رہا ہے - چنانچہ اس کا پورا شعور لاتعلق ، لایعنیت ، اجنبیت جلاوطنی اور بے جڑی کے احساس سے پیدا ہوتا ہے -

معاشرے کے روایاتی فلسفے ، سماجی ، مذہبی اور تہذیبی اقدار جدید ذہن کے لئے کوئی آسودگی نہیں رکھتے . آج کا یہ جدید فرد اپنے ماحول میں خود کو جس قدر تنہا ، بے بس ، ہر چیز سے کٹا ہوا اور اجنبی محسوس کرتا ہے . اتنا معاشرے سے باطنی تعلق رکھنے

والے افراد خود کو لا تعلق محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ ہماری آجکل کی جدید شاعری میں موت کا خوف، زندگی کی بے معنویت اور غیر محفوظ ہونے کا احساس عام ہے، اور یہی احساس جدید شاعری کی پہچان ہے۔

جاذب قریشی کی شاعری کی پہچان بھی یہی خصوصیت ہے۔ اردو کی اس جدید تر جدیدیت کی بیشتر جدید شاعری میں یہ بات نہیں تھی۔ میرا جی سے کر منیا جالندھری تک کی شاعری نئی حسیات کو ایک نیا اسلوب دینے کے تجربے سے ظہور میں آئی ہے۔ وہ اپنے معاشرے سے لاتعلق نہیں تھی بلکہ اس کو ایک الگ ذائقہ اور نئے طرزِ احساس میں بیان کرتی تھی، اسی لئے وہ اپنے اسلوب میں پہچانی جاتی تھی، لیکن جدید تر شاعری کے لئے یہ اسلوب اتنا مانوس ہوگیا کہ وہ نئے اسلوب کے ذائقے سے محروم ہوگئی۔ نئی حسیات کسی معاشرے میں ہر روز پیدا نہیں ہوتیں۔ اسی لئے موجودہ جدید شاعری ایک مُردہ تکرار سے زیادہ کسی قسم کا احساس نہیں دلا سکتی۔ اس ساری صورتِ حال کا تعلق جاذب قریشی کی شاعری سے بھی اتنا ہی ہے جتنا کسی نئے شاعر سے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا اپنا وجود اس صورتِ حال سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ جاذب کی شخصیت کی تعمیر ایک پابند معاشرے میں ہوئی ہے۔ وہ روایت سے، تہذیبی شعور سے اور معاشرتی تقاضوں کے لحاظ سے اسی ماحول سے تعلق رکھتی ہے جس سے برصغیر کی اکثریت کا تعلق رہا ہے ـــــ اگر جاذب کی شاعری کے پس منظر کے محرکات پر غور کیا جائے تو وہ معاشرے کے ان تمام تقاضوں، خواہشات، ردِ عمل اور پھر دوسری طرف اجتماعی دکھ، تضادات، زخموں کی کہانی سناتی چلی جائے گی جس سے برصغیر پچھلے پچاس سال سے گزر رہا ہے اور اسی لئے اس میں معاشرے کی تبدیلی کی خواہش، اس میں ناکامی کے درد اور ایک ایسی بے بسی کا سراغ ملتا ہے، جس کے تمام سرے بین الاقوامی مسائل اور بڑی طاقتوں کے مفادات کے طلسمی دھاگوں میں لپٹے ہوئے ہیں ـــــ مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس کی شاعری اِن سارے پس منظر کے باوجود ایک بے وقعتی کا احساس بھی دلاتی ہے۔ اس کا طرزِ احساس ہمیں یہ فوراً بتا دیتا ہے کہ اس کے پاؤں کے نیچے زمین نہیں ہے۔ وہ اپنی شاعری کے اسلوب، موضوع، لفظوں کے انتخاب میں اسی اجنبیت، لاتعلقی اور لایعنیت کو بیان کرتا ہے جو آج کے کسی بھی نئے شاعر کا اسلوب ہو سکتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاذب قریشی نے اپنی شخصیت سے اُگنے والے اور اپنی ذات سے نکلنے والے راستے کی تلاش نہیں کی اور نہ فطری عمل اختیار کیا۔ جب کہ اُس نے پاکستان کی جدید شاعری کی مقبولیت، فیشن اور خود کو ایک جدید شاعر ثابت کرنے کے لئے جدید اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس کی شخصیت اور شاعری کے اسلوب کے تضادات نے اُس کی شاعری کو بظاہر بے وقعتی اور مُردنی کے اسلوب میں ڈھال دیا ہے۔ مگر وہ اسلوب کا نہیں طرزِ احساس کا شاعر ہے۔ اس کا طرزِ احساس ہی اُسے جدیدیت کی لایعنیت سے بچا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاذب قریشی کی شاعری میں بے زمین ہونے اور بے جڑی کا احساس یا اجنبیت اور لاتعلقی کا وہ تجربہ پوری طرح اُجاگر نہیں ہوا ہے جو مغرب کی جدید شاعری کا بین الاقوامی مسئلہ ہے یا جسے پاکستان کے موجودہ شاعروں نے اوڑھ لیا ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ جاذب کے یہاں یہ اجنبیت یا لاتعلقی ذہنی یا شعوری نہیں ہے بلکہ اپنے معاشرے میں جڑیں نہ رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اُس کی شاعری میں اجنبیت کا احساس خاصا نمایاں ہے۔

اب اگر آپ اس پس منظر میں اُس کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش کریں تو اُس کی شاعری پانچ کلیدی لفظوں سے بھی جانی جا سکتی ہے۔ (درمیان میں یہ واضح کر دوں کہ یہ مضمون جس وقت لکھا گیا تھا، اُس وقت اِن لفظوں کی کہانی تازہ تھی مگر اب اس پر آنے والی تحریروں نے اس میں سے کچھ کو پامال کر دیا ہے) اور یہ لفظ اُس کی شاعری کے کل سرمایۂ شاعری کا احاطہ بھی کر لیتے ہیں۔ آیئے ایسے لفظوں کو باری باری اُس کی شاعری کے حوالے سے صرف ذہن میں تازہ کر لیں۔ جاذب قریشی نے ایک علامت کو اپنے پورے وجود کے لئے استعمال کیا ہے

الفاظ کراچی ۴۱

وہ ہے پرندہ

پرندے دھوپ میں پتھرا نہ جائیں
شہر تو جل گئے آبِ رواں سے

ہر پرندے کے بدن پر زخم کی تحریر ہے

میں روشنی میں رہ کے بھی زندہ نہیں رہا
پرچھائیں اُڑ رہی ہے پرندہ نہیں رہا

وہ پرندے بھی جزیروں میں اُتر جاتے ہیں
جن میں تقسیم نہ ہونے کی علامت دیکھوں

روشنی والے پرندے اُڑ گئے
پیڑ پر پرچھائیوں کی ڈار ہے

ہواؤں کا پرندہ ہوں مگر میں
چٹانوں کو کچلنا چاہتا ہوں

خوابوں کے جزیرے نہ خیالوں کے پرندے

میں ایک پرندۂ خوشبو میں ایک شعلۂ غم
پڑھی کتاب تو میں مدتوں اُداس رہا

وہ اُجالوں کا پیاسا پرندہ

پنجرے کا خوش رنگ پرندہ

میں بے عکس پرندہ

یہ خواب خواب پرندہ یہ جسم و جاں کی مہک

وہ پرندہ ہوں کہ صدیوں کی تھکن ہے مجھ میں
تو جو مل جائے تو میں اپنے نگر جاؤں گا

اب سائے میں جلتے ہیں پرندے بھی شجر بھی
اب دھوپ کے موسم یہ قیامت نہیں کرتے

کسی اُڑتے ہوئے طائر کا بدن ہو جیسے

اس میں جو غزل کے شعر ہیں، وہ تو اپنی جگہ مکمل ہیں مگر نظموں کے مصرعے پوری نظموں میں بنیادی استعارے کی طرح آئے ہیں اور کئی نظمیں ایسی بھی ہیں جہاں اس استعارے نے اپنی علامتی حیثیت کو برقرار بھی نہیں رکھا ہے، یعنی پرندہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ مگر اس کا پورا وجود اس استعارے میں پوشیدہ ہے۔ پرندہ کی طرح جاذب کی شاعری کا دوسرا کلیدی لفظ "بے چہرگی" ہے۔ جو کہیں چہرہ بن کر بھی بے چہرگی کی طرف سفر کرتا ہے۔

بے رنگ چاہتوں کا سبب کوئی کیا کہے
آنکھیں نہیں رہی ہیں کہ چہرہ نہیں رہا
چہرہ شناسیوں کے ہنر جس کو مل گئے
اس کے سفر میں نیند کا لمحہ نہیں رہا
بے چہرگی کے وار سے وہ عکس کیا ڈرے
جو آندھیوں کے گھر میں شکستہ نہیں رہا

وہ ایک چہرہ ہے
اُداس لفظوں کی خواہشوں میں

نئی آواز سے ڈرنے کی بھی حد ہے کوئی
میں کہاں تک وہی بے چہرہ سماعت دیکھوں

میرا فن چہرہ تراشی ہے مگر
برف کے سر، دھوپ کی دستار ہے

بے چہرہ اندھیروں میں آ جانے کی صدا ہوں

زرد گلاب
کہ جس کا چہرہ

بے چہرہ سماعت تجھے پہچان گیا میں
دریا کبھی سورج کا مکاں ہو نہیں سکتا

اور پگھل کر بے چہرہ ہو جاتے

ان جانے موسم کی چاہت ان دیکھے چہروں کی پیاس

تیرے چہرے پہ لکھا ہے

میں جو لکھوں تو چہرگی پائے
حرف کے اپنے خد و خال کہاں

تمام عمر کی بے چہرگی نہ دے مجھ کو
کہ میں ہوں آئینہ مجھ کو نظر بھی آتا ہے

کیوں زخم کی تحریر کو لکھتے ہو مقدر
کیوں ظلم کے چہروں کی اشاعت نہیں کرتے

میں تجھے اپنے چہرے پہ مل کے جیوں گا

گلی گلی اُسے پہچانتا ہے ہر چہرہ

چہرے بدل گئے ہیں مگر جرم ایک ہے
اس عہد کے گلاب کو پتھر کہا کرو

ہر ظلم کے چہرے پہ ہے کچھ ایسی علامت

بارش میں بھیگتے رہے چہرے غریب کے

کس نے چہروں پہ بے چہرگی ثبت کی
کون ہے جس نے ہر گھر کو صحرا کیا

جن پہ بکھرے ہوئے تیرے چہرے کے عکس تھے

پیاس لکھی تھی جن کے چہروں پر
بارشوں میں انھیں کے گھر بھی گرے

تیرے چہرے پہ ترے پیار کے خوش رنگ نشاں

مل کر جو نہ بچھڑے وہ شناسا نہیں ملتا
چہرے تو بہت ہیں ترا چہرہ نہیں ملتا

چہرہ چہرہ کتاب جیسا ہے

بے چہرگی جو جاذب کا دکھ بھی ہے اور احساسِ بے اطمینانی بھی۔ یہ اس کی نسل کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اسی طرح جاذب کے بنیادی استعاروں میں پرچھائیں، سفر اور بے سماعتی کو بھی کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اگر آپ ان لفظوں کی ماہیت اور ان کا استعمال جاذب کی شاعری میں دیکھیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ "بے جڑی" اور بے زمین ہونے کے احساس میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن وہ اس تنہائی، بے زمینی اور بے جڑی کے کرب کو ایک سوال بنا کر پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا ہے۔ وہ اس احساس کو زبان تو دے

سکا ہے مگر اس کے پیچھے وہ "جدید تجربہ" موجود نہیں ہے جو اُسے جدید شاعری کے عالمی فلسفے سے متعلق کر دیتا ہے۔ کیونکہ جاذب اپنے استعاروں کو اپنے معاشرے کے معاشی اور سیاسی مسائل کے ساتھ مربوط کر کے دیکھتا ہے۔ وہ اس کے لئے کسی طرزِ زندگی یا شعوری عمل کا نیا حسیتی فلسفہ نہیں ہے بلکہ اپنے معاشرے اور اپنی نسل کی کہانی کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جاذب کی شاعری میں ساری اجنبیت، بے چہرگی، بے سماعتی اُس کے اپنے معاشرے کے حوالے سے آتی ہے اور اس طرح جاذب کی شاعری خواہ کیسا بھی اشتباہ پیدا کرے مگر وہ پاکستانی معاشرے کے ایک مخصوص طبقے کے احساس کو بے زمینی کا استعارہ بنا دیتی ہے۔ اب بنیادی سوال یہ ہے کہ اُس کی شاعری اُس کی اپنی ذات اور معاشرے کی جس کشمکش کا اظہار ہے، جو احساسِ تنہائی، جو احساسِ بے چہرگی، جو احساسِ بے جڑی اُس کی شاعری کا سب سے موثر اظہار ہے (اور جو بنیادی استعارہ پرندہ میں از خود موجود ہے) کیا اس احساس کا کرب اس کی شاعری میں موجود ہے — میرا جواب اثبات میں ہے۔

اس مجموعۂ کلام میں کئی موثر نظمیں اور کئی دلکش غزلیں شامل ہیں۔ مگر مجھے جاذب کی شاعری کے بنیادی اسلوب کا پتہ چلانا تھا جو میں نے اپنی بساط کے مطابق پیش کر دیا ہے۔ وہ شاعر کیسا ہے — مجھے یہ یقین ہے کہ وہ اپنے ہم عصر اُن شاعروں سے، جن کا مسئلہ صرف جدید شاعری کا اسلوب اختیار کرنا ہے، نہ صرف مختلف ہے بلکہ زیادہ جاندار، زیادہ توانا محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس نے ابھی اپنی پہچان گم نہیں کی ہے۔

فکرِ نو کا ترجمان
اپنے عہد کی بہترین اور نمائندہ تحریروں کے ساتھ شائع ہو کر
آپ کے قریبی بک اسٹال پر دستیاب ہے
سیپ

سعدیہ نسیم

اندر کا آدمی

اس نے اپنے اردگرد نظر ڈالی۔ ہر طرف تاریکی تھی جو اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھی اس تیرہ و تار فضا میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ اندھیرے میں رہتے رہتے اس کی آنکھیں اگرچہ دیکھنے کی عادی تو ہو گئی تھیں مگر اس سے اس کی بینائی پر بہت زور پڑتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کے نور کو اس بے دردی سے ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اگر اندھیروں کا تسلط اسی طرح برقرار رہتا تو وہ بہت جلد اندھا ہو جاتا اور پھر اپنے اندھے پن کی صورت میں کوئی روشنی اسے راہ نہیں دکھا سکتی تھی۔ یہی سب سوچتے سوچتے اسے ایک دم ایک عجیب خیال نے آگھیرا۔ اگر اسے کہیں سے تھوڑی سی روشنی مل جاتی تو وہ اس اندھیرے سے بہتر طور پر لڑ سکتا تھا۔ کوئی ٹمٹماتا چراغ ہی سہی، جو گھور تاریکی کو ملگجے پن ہی سے بدل دے۔ پھر وہ زیادہ آسانی سے آگے بڑھ سکتا تھا۔ اسے خیال ہوا ممکن ہے چراغ میرے اس پاس ہی کہیں کاٹھ کباڑ میں پڑا ہو۔ شاید میں اسے ڈھونڈ نکالوں۔ اسے جلا سکوں۔ مگر اس کی تلاش بے سود ہی رہی۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ سامنے والے پختہ مکان کی بالکونی پر پڑی چلمن سے روشنی چھن چھن کر، کرنوں کی صورت خارج ہو رہی تھی۔ یک دم اس اندھیرے سے روشنی کی طرف دیکھنا اسے بہت بھایا۔ تاریکی سے اچانک روشنی میں آجانے پر، یہ مدھم ترین روشنی بھی بہت تیز لگی۔ اندھیروں کی عادی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ جب اس کی آنکھیں اس روشنی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اسے بڑا سکون ملا۔ پھر تو یہ معمول ہو گیا۔ وہ روزانہ کھڑکی کھولتا اور چلمن سے چھن کر آنے والی روشنی کی کرنوں کو آنکھوں کے راستے دل میں کھوتا رہتا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ روشنی کشید کر کے اپنے اندرون تک کو منور کر لے۔

کتنے ہی ہفتے اور مہینے بیت گئے۔ اس کی آنکھیں مدھم مدھم اجالوں کی اتنی عادی ہو گئیں کہ انھیں ایک پل بین نہ ملتا۔ وہ محویت کے عالم میں تکتا رہتا، سوچتا رہتا، اپنی ہی سوچوں میں ایسا کھو جاتا کہ اپنی ہی سدھ بدھ نہ رہتی۔ بہرحال وہ کچھ بہل سا گیا تھا لیکن پھر وہ اس سے بھی اکتا گیا۔ اسے اتنی دور سے نظارہ کرتے رہنا کچھ اچھا نہ لگتا۔ دل چاہا روشنی کے سرچشمے تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس نے ان کرنوں کے سہارے راستہ متعین کر کے آگے بڑھنا چاہا، لیکن اچانک روشنی بجھ گئی۔ کرنیں معدوم ہو گئیں۔ اسے اپنے اردگرد پہلے سے بھی گھور تاریکی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ کچھ دیر میں جب وہ اندھیرے میں دیکھنے کا عادی ہو جائے تو اسے راہ سجھائی دینے لگے۔ مگر آنکھ بند کرتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا کہ کرن کرن اپنے اندر کشید کی ہوئی روشنی اتنی ضرور تھی کہ وہ اس کے سہارے آگے بڑھ سکتا تھا۔ گرتا پڑتا، ٹھوکریں کھاتا ہی سہی۔ اس نے سوچا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بات نہیں بنے گی۔ اگر ایک شے کی خواہش ہے تو اس کے حصول کے لئے ہمت کرنی ہی ہو گی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس راہ میں اسے کتنی مشکلات کا سامنا ہو گا۔ ایک نادیدہ خوف سا اسے محسوس ہوا۔ مگر اس کی طلب کی شدت کے سامنے اس خوف کی کوئی اہمیت

نہ تھی۔ اُسے مغلوب کرتا وہ چلتا گیا۔ گرتا پڑتا سنبھلتا ہوا۔ لیکن یہ گرنا، اُٹھنا اور سنبھلنا بے سود ثابت نہ ہوا بلکہ اس نے اسے احساس دلایا کہ اُس کے اندر کچھ ہے۔ کوئی طاقت۔ ایسی طاقت جسے وہ دیکھ نہیں سکتا، صرف سمجھ سکتا ہے اور محسوس کر سکتا ہے کہ وہ اُسے سہارا دیئے ہوئے ہے۔ اس کی رہنما ہے راہ کی ٹھوکریں اس طاقت میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ذرا دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اُس نے خود کو ایک کچی پگڈنڈی پر کھڑے پایا جو اس کے پیچھے رہ جانے والی اندھیری بستی کو شاہراہ سے ملاتی تھی۔ بے سروسامانی کی حالت میں وہ آگے چل پڑا۔ اپنی حماقت پر کُڑھتا ہوا کہ اُسے اس بات کا اتنی دیر سے خیال کیوں آیا؟ اُسے تأسف ہوا۔ لاعلمی میں زندگی کا کتنا بڑا حصہ یونہی اندھیروں میں بھٹکتے، ان سے نباہ کرتے گزار دیا تھا اور کبھی لمحہ بھر کو بھی اس میں روشنی کی خواہش نے سر نہیں اُبھارا تھا۔ خیر دیر ہی سے سہی اب بھی یہ خیال آگیا تھا تو غنیمت تھا۔

پگڈنڈی کے آخری سرے پر ایک شمع روشن تھی، جو غالباً شاہراہ پر چلنے والوں کی رہنمائی کے لئے روشن کی گئی تھی۔ معاً اُسے خیال گزرا، کیوں نہ اُسے چُرا کر لے جائے؟ مگر دوسرے ہی لمحے ایک اور خیال نے اُس کی امید کی شمع گُل کر دی۔ "یہ شمع آخر کتنی دیر اور جل سکے گی۔ اس کی روشنی میں واپسی کا سفر کرتے ہوئے وہ گھر تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ شاید پگڈنڈی ختم بھی نہ ہو پائے، یہ تو اس سے پہلے ہی بُجھ جائے گی۔" پھر ایک اور خیال نے اسے اور بھی سختی سے اس ارادے سے باز رکھا کہ اگر وہ یہ شمع لے گیا تو یہ راہ چلنے والے بہت سے لوگ اندھیروں میں بھٹکتے رہ جائیں گے۔ اس کے قدم رُک گئے۔ اپنی خود غرضی پر اُسے افسوس ہوا۔ اگر وہ اندھیروں کو روشنی سے بدلنا چاہتا تھا تو یہ کہاں کا انصاف تھا کہ اس کے لئے دوسروں کو تاریکی کی نذر کر دے۔ پگڈنڈی سے گاؤں اور شاہراہ تک اندھیرے پھیلا دے۔ اس روشنی میں اُسے آگے کچھ فاصلے تک راہ سجھائی دے رہی تھی۔ وہ تیز تیز بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ یہ شمع بجھ جائے وہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لینا چاہتا تھا۔ اس کے اندر کی طاقت اور بڑھ گئی۔ اسے امید تھی اگلے موڑ پر پہنچنے تک کہیں نہ کہیں روشنی ضرور دکھائی دے جائے گی اور وہ سفر جاری رکھ سکے گا۔

دُور، حدِ نظر سے بھی پرے، اسے کچھ مدھم سے اُجالوں کا شبہ گزرا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا ابہام دُور ہوتا جا رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کتنا فاصلہ طے ہو چکا ہے اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا۔ لیکن پھر سوچا یہ وقت کا زیاں ہوگا۔ کیوں نا اس وقت کو استعمال میں لا کر وہ مقصودِ نظر سے فاصلہ کم کرتا جائے۔ مدھم اُجالے، ہلکی جھلملاہٹ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس کے اندر انوکھی خوشی نے سر اُٹھایا۔ دُور کافی دُور، ایک سے زیادہ شمعیں روشن تھیں۔ تو گویا اس کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی تھی۔ اس کے اندر کی قوت نے سمت کا صحیح تعین کیا تھا۔ جب وہ ان اُجالوں کے درمیان پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ حیران و ششدر دیکھتا رہا۔ وہ ان سب کو اپنے اندر بھر لینا چاہتا تھا۔ اب اُسے کسی بات کی فکر نہ تھی۔ کوئی مسئلہ، کوئی غم، کوئی دُکھ اس کا دامن گیر نہیں تھا۔ وہ اپنے مقصود کی جانب ہمہ تن متوجہ تھا۔ اپنے ہی دامن کو وسیع اور وسیع کرتا ہوا، اُجالوں کو سمیٹتا ہوا۔ وہ بہت آسودہ تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھ گیا تاکہ آخری دم تک، ان روشنیوں کے بجھنے تک اُن سے روشنی کشید کرتا رہے، مستفید ہوتا رہے۔ اب اسے سونا بھی اچھا نہ لگتا۔ کیونکہ آنکھیں بند کرتے ہی تاریکی کا تصور اُبھرتا تھا۔ اور وہ اس سے اتنی دُور بھاگ آنے پر دوبارہ اس سمت جانے کا روح فرسا تصور تک نہ کرنا چاہتا تھا۔ اب تو اُسے اس گزری زندگی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل اذیت ناک محسوس ہوتا۔ "کاش روشنیوں کو سمیٹنے میں، میں نے اتنی دیر نہ کی ہوتی۔" اُسے دکھ صرف اس بات کا تھا کہ کائنات کی ہر شے کی مانند، ان روشنیوں کو بھی بالآخر بجھ جانا تھا اور وہ اس لمحے کے تصور ہی سے لرز اُٹھتا۔ تو کیا وہ تاریکی میں گھر جائے گا؟ وہ نہیں نہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ گُل ہو جائیں میں ان کے مخرج تک پہنچ جاؤں گا۔ معلوم سے لامعلوم کی طرف بڑھتا ہوا یہ اُجالوں کا ذائقہ چکھ کر وہ ایسا بے سُدھ ہو گیا تھا کہ اب اس لذت، اس سرمستی، اس کیف و سرور میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ چاہتا تھا۔ وہ خُمار سے خوفزدہ تھا۔ اس وقت سے جب نشہ ٹوٹنے لگتا ہے اور جوڑ جوڑ دُکھنے لگتا ہے، انگ انگ بے کیفی اور افسردگی کا شکار ہونے لگتا ہے اور طبیعت

پر مُردنی، جھنجھلاہٹ اور چڑچڑاہٹ طاری ہونے لگتی ہے۔ اس لئے وہ خمار سے پہلے نشہ کو بڑھانا، تیز سے تیز تر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اُن مدھم اُجالوں پر ہی اکتفا کر کے نہ بیٹھ رہے بلکہ اسے ان سے پرے جانا ہوگا۔ اپنی ہمت کو مہمیز کرتا وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ عجیب بات تھی وہ جیسے جیسے قریب ہوتا یہ دُور ہوتی جاتی۔ کبھی کبھی تو اس کی ہمت جواب دے جاتی کہ شاید وہ کبھی اس اسرار سے پردہ نہ اٹھا سکے گا۔ مگر پھر اسے اپنے اندر ایک عجیب سے انجانے کرب کا احساس ہوتا جو اُسے بیکل کر دیتا۔ اُسے کسی کل قرار نہ آتا۔ اندر کی طاقت اور کرب اسے مسلسل ٹہوکے دینے لگتے۔ وہ گھبرا کر پھر عازم سفر ہو جاتا۔ اب سکون صرف اسی صورت میں مل سکتا تھا کہ وہ حقیقت کو پا لے، اس کی تھاہ کو پہنچ کر اُسے بے نقاب کر دے۔

اسے ایسا لگا افق کے پار کہیں ایک دُھندلا سا ہیولیٰ تھا۔ شاید کوئی مینار یا کوئی گنبد۔ اس کی چوٹی سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اس میں پھر سے قوت عود کر آئی۔ "آخر کار میں پا کر ہی رہوں گا!" وہ مطمئن بھی تھا اور متفکر بھی "کیا زندگی اتنے عرصے وفا کی؟" دونوں ہی باتوں کا صحیح تعین و تیقن نہیں تھا۔ اس صورت میں وہ صرف اتنا ہی کر سکتا تھا کہ بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کے بجائے چلتا رہے، چلتا رہے، تاکہ منزل سے قریب تر ہو جائے۔

عرصہ بیت گیا۔ اس کے کاندھے جھک گئے تھے، کمر دوہری ہو گئی تھی۔ ہر چند اس کی عمر اتنی نہ تھی مگر وہ بوجھ، وہ کرب، وہ اذیت، وہ مصائب جو وہ اس راہ میں سہتا چلا آیا تھا انھوں نے اسے بظاہر اس حالت کو پہنچا دیا تھا۔ مگر اندر سے وہ اب بھی ویسا ہی پھرتیلا اور گرم جوش، سرگرم عمل اور حوصلوں سے بھرپور تھا۔ راہ کی سختیوں نے ان میں اور اضافہ ہی کیا تھا۔ پہلے اس کی مایوسیاں امید میں بدلیں، پھر امید یقین میں ڈھلی اور اب منزل اس کے سامنے تھی۔ ایک گنبد بے در۔ اس کی چوٹی پر وہ چراغ روشن تھا جس کی طلب اُسے کشاں کشاں یہاں تک لے آئی تھی۔ مگر اب ایک نئی اُلجھن آ پڑی تھی۔ وہ گنبد کے اِرد گرد دیوانہ وار گھوم رہا تھا، جیسے کسی مقدس مقام کا طواف کر رہا ہو۔ مگر در اصل وہ اس کی سخت، کھردری بے حس دیواروں پر دستک دے رہا تھا۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر زور سے۔ اور اب اس کی دستک میں ایک سختی اور جارحیت تھی۔ یہاں تک آ کر وہ ہرگز ناکام لوٹنا نہ چاہتا تھا۔ پلٹنے کا کیا سوال؟ جس طلب میں اُس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کا مآل ناکامی کی صورت میں اسے ہرگز قبول نہ تھا۔ پھر اس کی جارحیت، اس کے استقلال، اس کی سرکشی اور ضد کے سامنے ایک دَر وا ہو ہی گیا تھا۔ وہ خوشی سے مچلتا اندر داخل ہو گیا۔ اسے وہ چراغ چاہیئے تھا۔ وہ راستے بناتا، اوپر ہی اوپر چڑھتا چلا گیا۔ کبھی تھک کر ہانپنے لگتا، کبھی دم لینے کو ٹھہر جاتا اور پھر بچوں جیسی جلد بازی اور اشتیاق سے راہ طے کرنے لگتا۔

معاً وہ چراغ کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں، اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ بیٹھا رہا دیکھتا رہا، سرخوشی کے عالم میں، خود فراموشی کی کیفیت میں۔ اسے یوں لگا جیسے یہی وہ روشنی ہے جس کو ثبات ہے، بقا حاصل ہے اس کی کرنیں تیز اور ٹھنڈی تھیں۔ اسے اپنی جلتی جھلستی روح تک میں روشنی اور ٹھنڈک اُترتی محسوس ہوئی۔ اچانک اس کی نظر نشیب پر پڑی۔ نیچے گنبد کے ارد گرد، چراغ کے عین نیچے اندھیرا تھا، گھور اندھیرا۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں میچ لیں۔ "کیا روشنی کے تلے بھی اندھیرے جنم لے سکتے ہیں؟" وہ پریشان ہو گیا۔ پھر اپنے ہی خیال پر متعجب ہو گیا۔ "ہاں، بشرطیکہ چراغ بہت بلندی پر ہو۔ یہ عام سطح سے جتنا بلند ہوتا جائے گا، اس کے تلے اتنے ہی اندھیرے بڑھتے، پھیلتے چلے جائیں گے!" اب جیسے سب کچھ اس کی سمجھ میں آ چکا تھا۔ نشیب میں واقع اس کے گاؤں سے یہ گنبد بہت زیادہ بلندی پر تھا، اسی لئے وہاں اس قدر تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ پھر جب وہ شاہراہ سے گزر کر آگے بڑھا تھا ہر قدم بلند سے بلند مقام کی جانب، تو اندھیرے چھٹتے چلے گئے۔ وہ روشنی میں آتا چلا گیا تھا یہاں تک کہ چراغ کے عین سامنے پہنچ کر وہ خیرہ کن چمک اور روشنیوں میں نہا گیا تھا۔ اندھیروں کا تصور تک

اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا مگر اب اچانک اس پر یہ عقدہ حقیقت منکشف ہوئی تھی کہ خود چراغ تلے بھی اندھیرا تھا۔ وہ تو تہیہ کر کے نکلا تھا کہ اندھیروں کا گریبان روشنی سے چاک کر دے گا۔ چپے چپے پہ چراغ روشن کرے گا، اک نئی روایت جنم دے گا۔ سورج کی مانند ہر بلند و پست پہ اُجالے بکھیر کر۔ اس نے چراغ اٹھا لیا اور اب وہ پستیوں سے اس کا فاصلہ ختم کرنا چاہتا تھا تاکہ اوپر نیچے، دور و نزدیک یکساں منور اور پرنور ہو جائیں۔ چراغ اٹھاتے ہی گنبد غائب ہو گیا اور ایک راستہ نمایاں ہو گیا۔

وہ چراغ تھامے جیسے جیسے نیچے اترتا گیا یوں لگا جیسے چراغ کی روشنی اس کے اندر داخل ہو رہی ہو۔ جب وہ نیچے پہنچا تو چراغ کی تمام روشنی اس کے اندر منتقل ہو چکی تھی۔ اس نے بے نور چراغ پھینک دیا اور اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ روشنی دور تک پھیل رہی تھی۔ خوشی کے انجانے احساس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ بے شمار قدم اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ خوشہ چینی کے لئے، کسبِ نور کے لئے، اپنے اندر کے اندھیرے منور کرنے کو۔ اسے اپنی اس وقت کی حالت یاد آئی جب وہ بھی اسی ہیئتِ کذائی کے عالم میں اپنی سدھ بدھ گنوائے، شوق کے ہاتھوں مجبور، گرتا پڑتا، ٹھوکریں کھاتا، راستے بناتا بڑھا چلا آرہا تھا۔ امید و بیم، کامیابی و ناکامی کی درمیانی کیفیت میں۔ مگر اب وہ خود روشن مینار تھا۔ اس نے اپنے اوپر نظر کی۔ ہر موئے تن سے روشنیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ وہ مارے خوشی اور تفاخر کے آپے سے باہر ہوا جارہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ بلند ہو رہا ہو، اور بلند، پھر بلند ترین وہ ان سب سے اونچا تھا۔ پھر بھلا ان میں شامل ہو کر ان کا حصہ کیوں بن جاتا؟ اپنی انفرادیت اور یکتائی کو کیوں ختم ہونے دیتا؟ روشنی پر اس کا اپنا حق سب سے زیادہ تھا اسے اتنی آسانی سے کیونکر تقسیم کر دیتا؟ اس نے فخر سے سر بلند کیا۔ انھیں بھی جد و جہد کرنے دو۔ ہر ایک کو قدرت و استطاعت کے مطابق ہی ملنا چاہیئے۔ اگر میں نے انھیں دریا دلی سے بانٹنا شروع کر دیا تو پھر ان کی اپنی محنت کا ثمر کیا ہوا؟ انھیں بھٹکنے دو حتی کہ اس خیال سے باز آجائیں، یا جان دیدیں، یا قریب پہنچ پائیں۔ وہ فخر سے مزید بلند ہو گیا، اور خارج ہونے والی کرنوں کا ہر راستہ بند کر لیا۔ اب وہ ایک گنبدِ بے در تھا۔ جس کی بلند ترین چوٹی پہ اس کے اندرون کی تمامتر روشنی، چراغ بن کر روشن تھی۔ اس کی دیواروں پہ دستکیں سنائی دے رہی تھیں۔ طواف جاری تھا۔ مگر وہ سب سے بے نیاز، اپنے اندر کی دنیا میں محوِ سفر تھا۔ پھر اسے دیکھ کر یہ تعجب ہوا کہ اندرون میں پہلے سے کہیں زیادہ گھور اندھیرے پھیل چکے تھے۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ چراغ تو بدستور روشن تھا، اپنی ضیا پاشیوں سے خود ہی مسرور ہوا جا رہا تھا۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ اب اس کے تلے بھی اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ گہرا، کالا، گھور اندھیارا، اور، چوٹی پہ، روشنیوں کا خارج کرنے والا منور سورج، روشن چراغ، اسے احساس تھا تو صرف اس بات کا کہ لوگ طواف کر رہے ہیں، غرض مند دستکیں دے رہے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ بلند ہو کر ان کی دسترس سے پرے ہوتا جارہا ہے۔

ناشر: نسیم درانی
طابع: انجمن پریس کراچی
مقامِ اشاعت: بلاک ڈی۔ شیر شاہ کالونی، کراچی ۲۸
(اگست ۱۹۸۳ء۔ پانچواں شمارہ)

نوشابہ خاتون

آنچ

"امی بدل . . . با . . . دل . . . امی جی . . . ہائے . . ."

وہ روتے روتے ہلکان ہوگئی ہے۔ اور میلوں میل کی چلی ہوئی گل بی بی سید منزل کی دہلیز پر جیسے ڈھیر ہوگئی۔ اس کے ناتواں بازوؤں میں پھول سی بچی آسمان پر چھائے ہوئے گہرے بادلوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کیے چیخ چیخ کر رو رہی تھی . . . بالکل ایسے جیسے بعض بچے اندھیرے سے خوفزدہ ہوکر رونا شروع کر دیتے ہیں ــــ "سید منزل" پر دھرنا دینے والا کوئی آج تک خالی ہاتھ نہیں گیا۔ سید صاحب چاہے خود اتنے فراخ دل نہ ہوتے مگر اس وقت ڈیوڑھی میں "چھوٹے میاں" کھیل رہے تھے۔ اور یہ ناممکن تھا کہ چھوٹے میاں کسی کو خالی ہاتھ جانے دیں۔

"اکرم بیگ ــــ اکرم بیگ ــــ ہمیں وہاں تک لے چلو" چھوٹے میاں" اپنی مختصر سی کار سے پاؤں نکالتے ہوئے اکرم بیگ کی گود میں جا چڑھے۔ لڑکی اب بھی سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ گل بی بی بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں سیاہ بادلوں کی آپس میں سرگوشیاں جاری تھیں۔

"یہ کیوں روتی ہے؟" ننھی سی معصوم آواز میں رعب و جلال بھی تھا . . .

بچی نے ذرا ذرا سی آنکھیں کھولیں پھر موندلیں . . .

"بادل . . . امی . . . بادل آئے . . ."

"سرکار . . . یہ بچی ناسمجھ ہے . . . بارش اور بادل سے ڈرتی ہے . . . اب یہ کسی کمرے میں چھپ جانا چاہتی" چھوٹے میاں نے افسوس سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے نازک نازک گلابی پیروں کو چھوکر جانے کیا سوچنے لگے۔ اور پھر یک دم اکرم بیگ کی گود سے سرک کر اندر کی طرف بھاگے۔

"اماں جانی . . . اماں جانی . . . وہ باہر ایک لڑکی کی بہن روتی ہے۔ بادل سے ڈر لگتا ہے۔ اندر بلا لیجیے ناں . . !"

آٹھ سالہ چھوٹے میاں کی سانسیں چڑھی تھیں اور وہ بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ بیگم جانی نے پیار سے ان کو سینے سے لگا لیا اور سید صاحب نے حقے کی نے منہ سے نکال کر مسکراتے ہوئے بیگم کو کہا۔

"خدا نظرِ بد سے بچائے بیگم۔ کیا ہمدرد دل پایا ہے صاحبزادے نے"

"مان لو ــــ انہیں اس بیٹی کی خواہش ہے ــــ تم تو قائل ہی نہیں ورنہ ایک چھوڑ دس بیٹیاں پیدا ہو سکتی ہیں

"اے بیٹے، آپ کو ذرا لحاظ نہیں آتا۔ اب یہ عمر ہے ایسی باتیں کرنے کی۔" وہ بدستور مسکرا رہے تھے۔

"اماں جانی۔" چھوٹے میاں ٹھٹکنے لگے اور بیگم جانی اپنا گیارہ گز کا غرارہ سنبھالتی ہوئی چھوٹے میاں کے ساتھ ہولیں۔ مگر راہداری پار کرتے ہوئے اچانک ان کے قدم رُک گئے۔

"چھوٹے میاں آپ نے پھوا اماں سے پوچھا ہے؟"

"نہیں۔ ہر بات پھوا اماں سے کیوں پوچھیں،" وہ اکڑ گئے۔ "اور اگر انھوں نے اس لڑکی کو یہاں رکھنے پر اعتراض کیا تو۔!"

"تو میں پھوا اماں کو اپنی بندوق سے اڑا دوں گا۔"

"ہائے ——— اُف ——" بیگم جانی نے جلدی سے چھوٹے میاں کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بنیادوں تک ہل گئیں۔ اتنے صلح پسند ماحول میں چھوٹے میاں باغی طبیعت کے کیسے ہوگئے مگر چھوٹے میاں تڑپ کر اماں جانی کی گرفت سے نکلے اور بگٹٹ باہر بھاگ گئے۔

"اے لڑکی ——— چلو ——— تم کو ہماری اماں جانی بلاتی ہیں۔ ہم تم کو کمرہ دیں گے۔" اور گل بی بی کو تقریباً گھسیٹتا ہوا وہ اندر کی طرف لایا۔ بچی ابھی تک گل بی بی کے سینے سے لپٹی ہوئی تھی۔ اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چونک کر چیخ پڑتی۔ آٹھ سال کی مدت کے بعد اچانک حویلی میں جو کسی بچے کے رونے کی آواز گونجی تو پھوا اماں اپنے کمرے سے حیران و پریشان دوڑتی آئیں۔ بیگم جانی پھوا اماں کو دیکھ کر سہم گئیں۔ "آپا بی ... یہ عورت بڑی مظلوم دکھائی دیتی ہے۔"

"اوئی بی بی تو کیا ... سارے مظلوموں کو سید منزل کی انگنائی میں بھر لوں گی۔ کاہے کو رُلوا رہی ہو۔ دو تھپڑ لگا دُ تو ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔ پھوا اماں چونکہ خود بانجھ تھیں ... بے انتہا سخت فطرت کی۔ پھر اولاد کی تشنگی نے ان کو چھوڑی ہوئی ہڈی کی طرح ناکارہ بنا دیا۔ اور یوں وہ دوسروں کو زیر کر کے اپنی سسکتی ہوئی اَنا کو تسکین دیتیں۔ مگر ہمدردی اور محبت تو پھوا اماں کے قریب سے بھی نہ گزرے تھے، اس لیے وہ ممتا کے جذبے سے ناآشنا تھیں۔ جس کی آگ میں جلنے کے بعد عورت کی روح کو سکون ملتا ہے۔ مگر محبت اور ممتا کے روگ سے وہ کوسوں دور تھیں۔

"میں کہتی ہوں بیگم جانی ہٹاؤ بھی اسے، کیا شور برپا کر رکھا ہے۔" مگر بیگم جانی کے کچھ بولنے سے پیشتر چھوٹے میاں بڑی بڑی آنکھوں کو ناراضگی سے اوپر چڑھاتے ہوئے بولے "پھوا اماں ہم نے بلایا ہے اس کو۔" چھوٹے میاں کا لحاظ پھوا اماں کچھ عام افراد سے زیادہ ہی کرتی تھیں، اس لیے چھوٹے میاں اُن کے منہ لگے تھے۔ پھوا اماں نے گھور کر دیکھا، مگر سید صاحب بھی جب بیٹے کی حمایت میں بول پڑے تو پھوا اماں پیر پٹختی دندناتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

پھر ایسا ہوا کہ جب سے گل بی بی اور اس کی بچی نے سید منزل کے کمروں میں پناہ لی تھی۔ چھوٹے میاں ہر دلچسپی کو بھول بھال کر گل بی بی کی چار سالہ بچی سنبل پر نچھاور ہوتے رہے۔ انہیں سنبل کے سنبھل سنبھل کر چلنے پر حیرانگی ہوتی۔ سرخ سرخ ہتھیلیوں کو اپنے ہاتھوں سے ملاتے اس کی گہری نیلی آنکھوں کو دیر تک دیکھتے اور یوں لگتا۔ جیسے اس سے قبل چھوٹے میاں نے کسی انسان کو اتنی وارفتگی اور ایسے پیار سے نہیں دیکھا تھا۔ اور ابھی کبھی ایسا ہی ہوا۔ چھوٹے میاں کے ماسٹر صاحب گھنٹوں سے کمرے میں بیٹھے منتظر تھے۔ اور چھوٹے میاں سنبل کو گود میں سنبھالے بہلا رہے تھے۔ پھر جانے کیا جی میں آئی کہ ساتھ اپنے کمرے میں لے آئے۔ اور سیڑھیوں پر سے اُترتی ہوئی پھوا اماں نے جو یہ انداز دیکھا تو جیسے سُلگ اٹھیں۔ ان کا دل نفرت اور رنج سے بھر گیا۔ وہ کھوکھلے رسم و رواج کی اتنی پابند تھیں کہ آج تک نوکروں سے بھی سیدھے منہ بات نہ کی اور بھلا وہ یہ کب برداشت کر سکتی تھیں کہ گلیوں گلیوں، سڑکوں سڑکوں پھرنے والی عورت کی اس بچی کو سید منزل میں یہ مقام مل جائے کہ ایک سید زادہ اس پر وارے نیارے ہو تا رہے۔ ان کی آنکھیں دور تک بہت کچھ دیکھ گئیں اور

غم و غصے کی لہراُن کے سارے جسم میں دوڑ گئی۔

"تم ہمارے ماسٹر صاحب سے پڑھو گی ناں۔ چلو..." چھوٹے میاں نے بچپن کے معصوم جذبے سے متاثر ہو کر اپنے ہونٹ اس کے سرخ گالوں پر رکھ دیے۔

"چھوٹے میاں۔ رُک جاؤ—" وہ دانت پیستی ہوئی اتریں۔ "اتارو اسے گود سے — ذلیل — ناپاک کیڑے۔" چھوٹے میاں پُرسکون کھڑے تھے۔ وہ ڈرے نہ انھوں نے سنبل کو اتارا۔ "آپ دیکھتی نہیں ہیں پھوا اماں کل اس کے پیر میں شیشہ چبھ گیا تھا، زخم ہے بھلا کیسے چل سکتی ہے یہ۔"

"یہ دربدر کی ٹھوکریں کھانے والی یتیم نے اسے اتنی ہمت دے دی۔ گستاخ۔" مگر چھوٹے میاں آگے بڑھ گئے اور ڈیڑھ بالشت کے اس لڑکے کے آگے اپنی شکست وہ کسی صورت نہ مان سکتی تھیں جبکہ شروع سے وہ سید منزل پہ حکم چلاتی آئی ہیں۔ اور سید منزل کے ہر فرد نے اگر کچھ مانا ہے تو پھر یہ — یہ —

اور ان کا مضبوط ہاتھ چھوٹے میاں کے چہرے پر پانچوں انگلیاں اتار گیا۔ چھوٹے میاں نے آٹھ سال کی مدت میں پہلی مرتبہ یہ زخم سہا تھا۔ وہ نہ روئے نہ چلائے نہ چیخے... مگر کمرے میں لیٹی بیگم جانی کے دل میں ایک دم سے تکلیف کی لہر اٹھی اور وہ ننگے پیروں دوڑیں دیکھا تو سنبل سہمی ہوئی چھوٹے میاں کی گود میں تھی۔ اور چھوٹے میاں خوفناک نظروں سے پھوا اماں کو دیکھ رہے تھے۔ جن کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

"سنا تم نے بیگم جانی مجھ سے پوچھے بغیر جو بھی کام ہوا ہے وہ اس گھر کے لیے نقصان دہ ہوا ہے۔ آگ لگے میری زبان کو جو میں بولنے سے باز نہیں آتی۔" پھوا اماں تو شروع سے ہاتھوں پر سرسوں جمانے کی عادی ہیں وہ اپنی بڑائی جتائے بغیر رہ ہی نہیں سکتیں۔ ہاتھوں کو زور زور سے ہلاتی وہ پھر اپنے دبیز پردوں کے پیچھے غائب ہو گئیں — بیگم جانی نے دوڑ کر چھوٹے میاں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اس وقت وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

"بی بی.. سنبل کسی خراب خاندان کی لڑکی نہیں ہے۔ وہ احمد آباد کے ایک سید گھرانے کی ہے۔ میں اس گھر کی پرانی ملازمہ ہوں، مگر آگ فساد اور خون دیکھ کر یہ بچی ایسی خوفزدہ ہوئی، کہ آسمان پر جب بھی بادل ہوں۔ جب بھی اندھیرا چھا جائے یہ رونا شروع کر دیتی ہے۔ اس نے مکانوں سے اٹھتی آگ اور دھوئیں کو دیکھا ہے۔ بی بی، اس وقت یہ تین سال کی تھی۔ میں کسی طرح بچتی بچاتی پاکستان آ گئی۔ اور ایک سال سے بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ یہ میری اپنی بچی تو نہیں ہے مگر آپ جیسے ہی شریف گھر کی مزدور ہے۔" اور جب گل بی بی نے ڈبڈبائی آنکھوں، لرزتے ہونٹوں سے بیگم جانی کو دیکھا تو انھیں محسوس ہوا جیسے وہ خود ٹھٹھرتی جمتی سرد رات میں سید صاحب سے زندگی کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ بیس سال کے بعد تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ پھر سید صاحب کو اس جرم کی پاداش میں برادری سے خارج کر دیا گیا۔ کہ انھوں نے دل لگی کرتے کرتے ایک متوسط گھرانے کی لڑکی کو محل کی ملکہ بنا دیا تھا۔ پھوا اماں تو اس وقت بھی یہی کہتی تھیں۔

"سید کچھ عورتیں کھلونا ہوتی ہیں۔ جنھیں ہم صرف کھیل کر، توڑ پھوڑ کر پھینک دیتے ہیں۔" مگر سید صاحب نے ایک نہ مانی اور بیگم جانی اس گھر کی زینت بن گئیں۔ مگر پھوا اماں تو بیس برس بعد بھی بیگم جانی کو اس گھر کی بہو تسلیم کرنے پہ تیار نہ تھیں کہ یہ ان کی پسند کے خلاف ہوا تھا۔

لمحہ بہ لمحہ سرکتا ہوا وقت — ایک طویل فاصلہ پھلانگ گیا۔ دس سال کے لیے وقت نے چھوٹے میاں اور سنبل کی رفاقت میں جہاں اپنائیت۔ چاہت اور پیار کا رنگ بھر دیا تھا، وہاں پھوا اماں کی تیز نظروں نے پہرے بھی زیادہ کڑے کر دیے تھے۔ ان کی پیدا کردہ تلخیوں کو چھوٹے میاں اور سنبل دونوں ہی برداشت کرتے رہے تھے، اور... سنبل... سنبل" جو بیگم جانی کی شفقتوں اور چھوٹے میاں

سے لا انتہائی پیار پر بھی رہی تھی تو کچھ عرصے کے لیے اپنے آپ کو بالکل ہی تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ جبکہ گل بی بی اس کو روتا سسکتا چھوڑ کر چل دی تھی۔ مگر ڈرتے سہمتے چھوٹے میاں پچھلی کھڑکی سے اس کے کمرے میں کود آئے۔ اور اس وقت وہ اپنے آپ کو بڑت محفوظ جانتی۔ ابھی ابھی ایسا ہی ہوا۔ کلاس روم میں بیٹھے چھوٹے میاں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سیاہ بادلوں نے آسمان کو گھیر لیا تھا بجلی چمک رہی تھی۔ اور موسم تاریک سے تاریک ہوتا چلا جا رہا تھا۔ انھوں نے بے چینی سے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔ پریڈ ختم ہونے میں دس منٹ تھے اور اس کے بعد وہ ایک پریڈ بھی اٹینڈ نہ کریں گے ایکایک موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اور وہ بے چین ہو کر کلاس روم سے نکل گئے۔ بھیگتے ہوئے گاڑی میں بیٹھے۔ راستے کی پھسلن موسم کی خرابی اور بارش کی پروا کیے بغیر وہ جلد سے جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتے تھے۔ جونہی انھوں نے ڈیوڑھی پہ قدم رکھا۔ بجائے اپنے کمرے میں جانے کے وہ مردان خانے کی پچھلی دیواروں سے ہوتے ہوئے سنبل کے کمرے کے دروازے پر پہنچے۔ آہستگی سے دروازے کو دھکیلا۔ سنبل کمرے کے تمام پردوں کو برابر کیے تکیے سینے پہ ڈالے خاموش اور اداس لیٹی تھی۔

"سنبل . . ." وہ جھکے، "آنکھیں کھولو سنبل دیکھو . . . میں خرم ہوں . . سنبل ڈرتے سہمتے بڑی بڑی پلکوں کا بوجھ اوپر اٹھایا . . ، چھوٹے میاں کا دل چاہا وہ اس نازک حسین سی لڑکی کو سب کی نظر سے بچا کر کہیں لے بھاگیں۔ مگر وہ ایسا کبھی بھی نہ کر سکتے تھے۔ ایک طرف خاندانی عزت و وقار اور شان و شوکت تھی۔ دوسری طرف پھوا اماں جیسی ہستی ان پر چوبیس گھنٹے مسلط رہتی۔

"سنبل"

اور سنبل نے بڑبڑا کر آنکھیں ملیں یہ نہیں نہیں۔ چھوٹے میاں۔ چھوٹے میاں مجھے تم سے شدید نفرت ہے۔ تم۔ تم۔ ." مگر زبان لڑکھڑا گئی اور اسی لمحے بجلی اس زور سے کڑکی کہ سنبل چھوٹے میاں کے چوڑے چکلے، کشادہ سینے میں دبک گئی۔

"میں تمہارے لیے چھوٹے میاں نہیں ہوں سنبل . . . میں نے کتنی بار کہا ہے کہ خرم ہوں" وہ اس کے ریشمی بالوں کی پرکیف مہک سے مدہوش بھی نہ پائے تھے کہ اچانک دھڑسے دروازہ کھلا۔ چھوٹے میاں نے تڑپ کر سنبل کو الگ کیا۔ خونخوار نظریں چھوٹے میاں اور سنبل کو بھسم کر رہی تھیں۔ "میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ یہ بارش اور بادل کے چونچلے چھوڑ دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم اس گھر کی نوکرانی ہو۔ صرف نوکرانی . . . چھوٹے میاں حد سے زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو تم ایک سید زادے ہو" چھوٹے میاں کی زبان جانے کیوں بند ہو گئی۔ سنبل کا چہرہ سفید پڑ گیا مگر پھوا اماں کے دل میں آگ لگی تھی۔ وہ اس کی بھولی بھالی حسین صورت سے جانے کیوں جلنے لگی تھیں۔ وہ چھوٹے میاں کے والہانہ انداز پہ بھی کڑھا کرتیں شاید اس لیے کہ پھوا اماں ایک سید زادی ہونے کے باوجود بے حد معمولی شکل و صورت کی تھیں اور شادی شدہ ہونے کے باوجود کسی جاندار کو بھی جنم نہ دے سکیں۔ پھر ان کا شوہر جو (ان سے کہیں زیادہ وجیہہ و جمیل تھا) انھیں طلاق دے کر چلتا بنا۔ مگر اس میں چھوٹے میاں کا۔ یا سنبل کا کیا قصور تھا۔ کیا وہ ہر ایک کو اپنی طرح تشنہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ انھوں نے بڑھ کر سنبل کا جھکا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اور چٹاخ چٹاخ دو تین تھپڑ اس کے رخساروں پر دھر دیے۔ چھوٹے میاں کا [illegible]

[illegible] کسی کی میراث نہیں ہے۔ اگر آپ کی دولت انسان کو انسانوں سے نفرت کرنا سکھاتی ہے تو مجھے نہ ایسی [illegible] ـــــ آپ آئندہ خیال رکھیے گا" اور وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئے تو پھوا اماں پھنکارتی [illegible]

چھوٹے میاں اپنے بستر پر تمام رات کروٹیں بدلتے رہے۔ وہ دنیا کی ہر آسائش کو حاصل کرنے کی طاقت رکھتے تھے اس کے باوجود

وہ کچھ دنوں سے بڑی معمولی معمولی خواہشات کے لیے مچلا کرتے ۔ تمام رات انھوں نے سنبل کے کہے ہوئے الفاظ "مجھے تم سے نفرت ہے" پر غور کرتے رہے تھے تو کیا ۔ وہ جیسے اپنی جان ۔ اپنی آرزو بنائے ہوئے ہیں ۔ حالات کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو کر وہ بھی منہ موڑ لے گی ۔ سنبل کیا تم میری چاہتوں سے ناواقف ہو ۔ کیا تمہیں بھی بتانے کے لیے زبان کا سہارا لینا پڑے گا ۔ کیا ۔ کیا ۔ نہیں نہیں سنبل تم جو اتنی لطیف ، ایسی مہربان ہو ۔ بھلا تم بھی کسی سے نفرت کر سکتی ہو ۔ تمہیں دیکھے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا ہے ۔ میں مصروف رہا ہوں تو تم نے خود بھی منزل کا رخ نہ کیا ۔ مگر وہ ان خیالات کی یورش سے تھک گئے اور سویرے ہی سویرے اماں جانی کے کمرے میں پہنچے ۔

" اماں جانی " اماں جانی نے چونک کر اپنے شریر اور ہنس مکھ بیٹے کو دیکھا ۔ جو کچھ دنوں سے بڑا مضمحل نظر آ رہا تھا ۔

" کیا بات ہے بیٹے " سید صاحب بھی متوجہ ہو گئے ۔ یہ صبح صبح کیا ضرورت آن پڑی " اماں جانی ۔ اصل میں ابا جان کی کار باہر لے جانا چاہتا ہوں ۔ ساتھ میرے سنبل بھی جائے گی "

" تمہیں معلوم ہے خرم ۔ آپا بی نے سنبل کو سید منزل میں آنے سے منع کر دیا ہے ۔ اُسے نوکروں کے ایک کمرے میں بھیج دیا ہے ۔ اب اگر آپا بی تمہیں دیکھ لیں گی تو یقیناً ہم سب پر مصیبت آجائے گی "

" چھوا اماں ۔ چھوا اماں ۔ آخر یہ کس مصیبت کا نام ہے ۔ انسان انسانوں سے اتنا خوفزدہ ہوتا ہے کہ اماں جانی ۔ میں ان باتوں کا قائل نہیں ۔ میں جا رہا ہوں " وہ اٹھے اور سیدھے سنبل کے کمرے کی طرف بڑھے ۔ اس کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا ۔ صفحے کھلے ہوئے تھے مگر نظریں جانے کیا تلاش کر رہی تھیں ۔ اچانک ہی بھاری قدموں کی چاپ پر وہ چونک پڑی ۔

" تم ۔ ! " وحشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں ۔ مگر تم کیوں آتے ہو خرم ۔ خدارا مجھے دھکے دے کر تو نہ نکلواؤ ۔ تم محلوں میں رہنے والے ہم شکستہ دل لوگوں کی قدر کیا جانو ۔ کیا ہمارے دکھ کبھی تمہیں بھی متاثر کر سکے ہیں ؟ کیا ہمارے زخموں کی گہرائی کا تم بھی اندازہ کرتے ہو کبھی ؟ تم ان بیتے ہوئے لمحوں کی قیمت کیا جانو "

" سنبل ۔ میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے ۔ مگر تم بھی اس سید منزل میں جوان ہوئی ہو ۔ تم نے بھی یہاں کی قیود کو محسوس کیا ہے ۔ اب تو تمہیں عادی ہو جانا چاہیئے ۔ یہ شکوہ کیوں ؟ "

" چلے جاؤ ۔ مجھے کسی کی ہمدردیوں کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہاں اگر بہت مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو اتنا کرم کرو کہ ایک زہر لا دو کہیں سے "

" سنبل !

" خرم ۔ کیا انسان کفن پہن کر ہی مردہ مانا جاتا ہے ۔ کیا میں مر نہیں چکی ہوں ۔ پھر کیوں نہیں تم مجھے اپنے ہاتھوں کفن پہنا دیتے ہو ۔ میری تباہیوں اور بے عزتیوں کے ذمہ دار تم ہو ۔ تم نے نہ مجھے سید منزل کی حویلی میں پناہ دی ہوتی ۔ نہ محرومیوں اور بے چارگیوں نے مجھے زندگی سے متنفر کیا ہوتا ۔ کون جانے آج کی تلخیاں کل کیا پیغام لے کر آتی ہیں " اس کی آنکھیں برس رہی تھیں ۔ خرم کا دل ڈوب رہا تھا ، اور اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی چھوا اماں کا دل جانے کیوں بڑا مطمئن سا تھا ۔

" پاگل نہ بنو ۔ تم زندگی کو بے حد قریب سے دیکھنے والی لڑکی ہو ۔ تم جو مجھے زندگی کے درس دیا کرتی ہو تو اب ایسے کیوں بگڑ گئی ہو ۔ منہ دھوؤ ۔ ہم تمہیں سیر کرانے لے چلیں گے "

" مہربانی حضور کی "

سنبل تمہیں معلوم ہے میں تعلقات میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں ۔ مگر خلوص اور پیار پر شک نہیں "

" اور تمہیں بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ میں بھی ... چاہتی ہوں۔ دنیا اتنی وسیع ہے کہ کوئی نہ کوئی تو ہمدرد پیدا ہو ہی جاتا ہے " خرم نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔

" حیران نہ ہو چھوٹے میاں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اب تک اس لیے زندہ رہی ہوں کہ اپنے درد و غم کو تحریروں کا روپ دے لیا کرتی تھی۔ ان رسالوں میں بکھری تحریروں کو تو آپ نے بھی کئی بار پڑھا ہے۔ اور ان تحریروں کا چھاپنے والا ہی وہ عظیم انسان ہے جو اس کڑے وقت میں سایہ بن جائے گا " اور اب خرم کی قوتِ برداشت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکلا اور سنبل کا تیز قہقہہ اسے دور تک سنائی دیتا رہا۔ وہ اپنی ساری قوت جمع کر کے سیڑھیوں پر چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مسہری پر دھڑام سے گر پڑا۔

خرم دیوانوں کی طرح کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ انھیں کیا پتہ کہ سنبل کس دل سے کس زبان سے ایسی باتیں کر رہی تھی۔ وہ تو اس وقت اپنے اندر پھوا اماں کا دل اور ان کی زبان حلول کیے تھی۔ چھوٹے میاں کیا جانیں کہ پھوا اماں نے ان کی غیر موجودگی میں سنبل کو کیا کیا باتیں کہی ہیں اور کیسی کیسی پابندیوں اور شرطوں پر اُسے رہنے کی اجازت دی ہے۔

سنبل جو خیال سے زیادہ نازک اور جذبات سے زیادہ حسین تھی۔ سو اب کیسی ویران کیسی اُجڑی اُجڑی سی لگ رہی تھی۔ چھوٹے میاں کیا جانیں کہ ان کے جانے کے بعد سنبل کب تک روتی رہی ہے۔ اماں جانی ان دنوں عید کی تیاریوں میں ایسی مصروف ہو گئی تھیں کہ سنبل کا ان کو خیال ہی نہ آیا اور اس لاتعلقی اور بے نیازی سے سنبل کا جی ڈوب ڈوب گیا۔ وہ اکیلے ان بوجھل لمحوں کا غم سہارتے سہارتے تنگ آ گئی۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ بڑا جان لیوا بڑا کٹھن فیصلہ۔

اور رات جب تاریک ہو گئی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا تو سنبل نے اپنے نازک پیروں میں چپلیں پھنسا کر ایک آخری نگاہ اپنے کمرے پر ڈالی اور آہستہ سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ دبے قدموں سے وہ بڑے باغ کی طرف بڑھی۔ آہنی گیٹ پر وزنی تالہ لٹک رہا تھا۔ وہ سوچتی اور ڈرتی ہوئی بائیں طرف مڑی۔ ادھر سید منزل کی تمام کھڑکیوں کا رُخ تھا اور پردوں سے چھن چھن کر روشنی آ رہی تھی جھجکتے ہوئے اس نے چاروں طرف دیکھا اور دیوار پر ہاتھ رکھا۔ قریب تھا کہ وہ سرک کر دوسری طرف اتر جاتی۔ دو مضبوط ہاتھوں نے اُسے کمر سے پکڑ لیا، ایک زوردار آواز اُبھری مگر فوراً ہی چھوٹے میاں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

" اتنی رات گئے تم کہاں جا رہی تھیں "

" مجھے چھوڑ دو۔ جانے دو چھوٹے میاں "

" پاگل نہ بنو! "

" اوہ " وہ سسکنے لگی۔

" سنبل " چھوٹے میاں کی سانسیں اُبھرنے لگیں۔ وہ گہرائی میں ڈوبتے گئے ____

" تم چاہتی ہو میری موت پر کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ ہو۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ تمہارے جانے کے بعد میں جی سکوں گا؟ کیا میری لاش کو بغیر کندھا دیئے تم چلی جاؤ گی؟ "

" بس کرو ____ خرم۔ بس کرو۔ " سنبل تو آج اس منزل سے نکلنے کا وعدہ کر چکی تھی۔ پھوا اماں کو وہ یقین دلا چکی تھی، مگر یہ چھوٹے میاں ____ چھوٹے میاں تو ہر قدم پر اس سے اُلجھ جاتے تھے۔

" میرا دم گھٹتا ہے۔ مجھے خوف آتا ہے اس گھر سے۔ مجھے لے چلو، کہیں دور ____ کہیں ____ "

" ہاں سنبل میں خود تنگ آ چکا ہوں۔ تم گھبراؤ نہیں میں تمہارے دامن کی ساری تلخیاں خود سمیٹ لوں گا " سنبل نے بے یقینی سے

س کی طرف دیکھا۔ چھوٹے میاں نے اس کے کانپتے ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ "پگلی۔ تُو تو میری امانت ہے۔ امانت کبھی نہ کبھی اپنے
صل مالک کو مل جایا کرتی ہے۔ کوئی اپنی آنکھوں کی روشنی اور جذبے کو خود سے جدا کرسکا ہے۔ آئندہ اس گھر سے جانے کی کوشش نہ کرنا سیّد منزل
ی دیواریں جسے ایک بار قید کرلیں وہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔" وہ مسکرا پڑے اور انھوں نے آہستگی سے اس کو اس کے کمرے کی طرف دھکیلا
در خود پلٹ آئے۔

زندگی کے شب و روز بڑی سُرعت سے گزر رہے تھے۔ بیگم جانی کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ پھوا اماں کی عمر کی عورتیں لاٹھی ٹیک کر
چلا کرتیں۔ مگر پھوا اماں اب بھی ویسی ہی صحت مند تھیں اور اسی جوش و خروش سے پوری منزل کا چکر لگایا کرتیں مگر مجال ہے جو سانس بھی چڑھ جائے۔
جانے کیوں بیگم جانی اداس اور پژمردہ سی راہداری میں سے گزر رہی تھیں کہ پھوا اماں کی گرجدار آواز نے ان کے قدم روک دیئے۔
"میں نے تمہیں کتنی بار کہا ہے چھوٹے میاں۔ نوکر اور مالک کے درمیان بہت بڑی دیوار ہوتی ہے۔ آج تک سیّد منزل کے کسی
فرد نے وہ دیوار گرانے کی کوشش نہیں کی۔" وہ ایک دم سنبل کی طرف مڑیں۔ وہ تو ایک میں بھی سنبل سے یہ وعدہ لے چکی تھیں کہ
وہ حویلی کے اندر قدم نہ دھرے گی۔
"اور تم بھی کان کھول کر سُن لو"
چھچھوندر کی طرح نہ پھرا کرو۔
"پھوا اماں۔ میں اور سنبل دوست ہیں۔" چھوٹے میاں کی لرزتی ہوئی آواز بیگم جانی کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ کانپ گئیں۔ یہ دوستی
تو کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی چھوٹے شہزادے۔ تم نے حویلی کی روایات کو کیسے بھلادیا۔ اوہ۔ انھوں نے پہلی بار سنبل کو پیار اور محبت کی
گہری نظر سے دیکھا۔ فاختہ کی طرح سہمی ہوئی یہ لڑکی ان کے دل میں کھُب کر رہ گئی۔ سنبل اور چھوٹے میاں دونوں کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں
"ارے سنبل تم بھی پڑھتی ہو۔"
"ٹپ ٹپ۔ ٹپ۔" آنسو اس کے رخساروں سے پھسلنے لگے۔
"ارے تم رونے لگیں۔" بیگم جانی کا دل ہول ہوگیا شاید اس سوال سے اُسے ٹھیس پہنچی تھی مگر انھیں کیا معلوم کہ وہ تو پھوا اماں
کے اس عتاب کا سوچ کر رو رہی ہے جو تنہا کمرے میں اس پر نازل ہونے والا تھا۔
"اماں جانی۔ پروفیسر صاحب مجھے پڑھانے آتے تھے تو میں نے سنبل کو بھی اجازت دی تھی۔ یہ تو اب مجھ سے بھی تیز ہوگئی ہے۔
یں تو اردو ادب پر اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا بھئی۔"
"واہ بھئی۔" بیگم جانی نے خوشی سے اُسے سینے سے لگالیا۔ مگر فوراً ہی خاندانی رسم و رواج کی بنیادیں ہلتی نظر آئیں۔ سامنے پھوا
اماں قہر بھری نظروں سے اُسے گھور رہی تھیں۔ "بیگم جانی یہ افسوس کا مقام ہے خوشی کا نہیں۔"
"ہمارے پاؤں کی جوتی ہمارے سر چڑھے۔" ہر چیز اپنی حدود کے اندر اچھی لگتی ہے۔ سنبل غلط راستے پر چل رہی ہے۔ اور بیگم جانی
کا سر جھک گیا سیّد صاحب نے کمرے میں لیٹے لیٹے سب کچھ سُنا اور سوچ میں ڈوب گئے۔
آج سیّد صاحب کو کھانسی کا تیز دورہ تھا کیونکہ موسم ہی کچھ ایسا تھا۔ صبح ہی سے دھوپ جیسے رو رہی تھی۔ اب دن ڈھلنے پر
آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا تھا۔ مگر لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ دل و جان سے عید منا رہے تھے۔ ایک سیّد صاحب
کی منزل میں گھُپ اندھیرا تھا۔
چھوٹے میاں جانے کس دھندے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ بیگم جانی سیّد صاحب کے سرہانے بیٹھی اُن کا سر دبا رہی تھیں۔ اور سنبل

— سنبل خوف وہراس کے بوجھ تلے دبی اپنے کمرے میں سسک رہی تھی۔ جانے کب تک یونہی بادلوں سے ڈرتی رہے گی۔ قریب تھا وہ آنکھیں بند کیے کیے سو جاتی کہ چھوٹے میاں جو کہ ہمیشہ بادلوں سے ڈھکے دن میں چمکتی دھوپ بن کر اس کے قریب آجاتے تھے۔ اس کے کمرے میں گھس آئے۔ سیاہ شیروانی سفید پائجامہ، زری کی سفید سلیم شاہی — چھوٹے میاں تو واقعی شہزادہ خرم نظر آرہے تھے۔ مگر سنبل کی تو آنکھیں بند تھیں وہ جھکے —

"ڈرنے کی کیا بات ہے سنبل — میں جو تمہارے پاس ہوں۔ اپنا جی سنبھالو سنبل — یہ بادل تو ضرور آئیں گے۔ بارشیں بھی ہمیشہ ہوں گی۔ آخر تم خوف کو دل سے نکال کیوں نہیں دیتیں۔ شاباش آنکھیں کھولو، دیکھو تو سہی عید کا سارا دن گزر گیا ہے۔ کیا مجھ سے عید بھی نہ لو گی۔ رسم دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے — بھئی اب کھول بھی دو آنکھیں"۔ وہ اس کی پلکوں کو چھیڑ رہے تھے — مگر اُسے کیا معلوم کہ پھوا اماں کی خاص نوکرانی کھلن لیا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اور چند لمحوں بعد ہی پھوا اماں دندناتی ہوئی اندر گھس آئیں۔ چھوٹے میاں نے سہم کر دیکھا۔ اور سر جھکا کر باہر نکل گئے۔ وہ بھی تنہائی چاہتے تھے۔ وہ اس بااصول اور گھٹے ہوئے ماحول سے فرار چاہتے تھے۔ وہ عام انسانوں کی طرح اپنی بے بسی پر رونا چاہتے تھے۔ مگر حالات تو انھیں اجازت بھی نہ دیتے تھے۔

اس اونچ نیچ کا سنگم کبھی نہیں ہوسکتا، اس کے لیے چھوٹے میاں کو میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔ جو نیند میں چلنے کے عادی ہوں وہ اپنی منزل سے بھٹک جاتے ہیں بیگم جانی۔ چھوٹے میاں کو کہہ دو کہ وہ اب بھی واپس آجائے۔ اس گھر میں عزت اور وقار پر جانیں قربان کردی جاتی ہیں۔ کیا میں اپنی خواہشات کے لیے دوبارہ شادی نہیں کرسکتی تھی؟ کیا مجھے ارمانوں کے اظہار کے لیے کوئی نہیں مل سکتا تھا؟ مگر نہیں اگر میں ایسا کرتی تو خاندان کی عزت پر آنچ آتی۔ سن لو بیگم جانی۔ اپنے باغی شہزادے کو روک لو"۔ اور وہ دندناتی ہوئی واپس چلی گئیں تو خوف و پریشانی سے بیگم جانی کا سر جھک گیا۔ بیس سالہ زندگی میں جو دکھ تکلیفیں اور پابندی انھوں نے برداشت کی تھیں اس کی تلخی سے وہ واقف تھیں اور وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ آپا بی کی مرضی کے خلاف اس گھر میں جو کام بھی ہوا ہے وہ ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ آپا بی جس بات کو ایک بار منع کردیں وہ کسی صورت نہیں ہوسکتا۔ اور یہ تو بہت بڑی تھی بیگم جانی کا دل ڈوبنے لگا تو انھوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اس دن سے جیسے کسی نے ستاروں کی شگفتگی چھین لی۔ ہواؤں سے اندازِ خرام رخصت ہوگئی۔ ماحول میں بوجھل پن کا شدید احساس ہو گیا اور چھوٹے میاں احساس محرومی کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے۔ نہ وہ باتیں تھیں نہ وہ کام تھا نہ وہ ماحول تھا۔ بس ایک مسلسل بے کلی تھی۔ دکھ اور تکلیف کی لہریں تھیں۔ جو چھوٹے میاں کو ہر ہر لمحے پریشان کیے رہتیں۔ مگر پھوا اماں کو کیا معلوم کہ آفتاب اور ذرہ ایک ہی آگ میں جل رہے تھے۔ سنبل اور چھوٹے میاں دو بند کنوؤں میں اتار دیے گئے تھے۔ دونوں پر کڑی پابندیاں لگادی گئی تھیں (ہائے پھوا اماں جانے کیسے اتنی سنگدل ہوگئیں) اور جب بیگم جانی نے اس کی اداسی اور بیقراری کی وجہ جانی تو تڑپ اٹھیں۔

"سنبل کے ساتھ تو اس نے بچپن گزارا ہے۔ میں نے کبھی اُسے یہ احساس نہیں دلایا ہے کہ نوکروں کے بچے انسان نہیں ہوتے۔ آپا بی کی بندشیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ حضور — میں اتنی دولت مند ہوتے ہوئے بھی کتنی تہی دست ہوں۔ اپنے بیٹے کے لیے اس معمولی خوشی کا انتظام نہیں کرسکتی۔ کیا اس گھر میں آپا بی کے علاوہ کوئی بھی انسان نہیں ہے"۔ بیگم جانی نے سید صاحب کے آگے اپنا دامن پھیلا دیا۔

"سنبل کو بلاؤ"۔

پردہ ہلا اور چوڑی دار پائجامے اور سفید دوپٹے میں ملبوس سنبل سید صاحب کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ خود بھی چونک پڑے

"سنا ہے تم نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ حویلی کے اندر بھی تم نہیں آتیں۔ مگر کیوں؟"

وہ خاموش رہی۔

"تمہیں پوری اجازت ہے۔ تم اس گھر میں مجھے چھوٹے میاں کی طرح عزیز ہو۔ ہاں آپا بی کے سامنے ضرور محتاط رہو۔ دراصل وہ حالات کی ستائی ہوئی ہیں اس لیے چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ ان کی باتوں کا بُرا نہ منایا کرو بیٹی۔" سید صاحب کہنے کو تو کہہ گئے مگر ان کا دل ہی جانتا تھا کہ وہ پھوا اماں سے بغاوت کر کے بھلا جی سکیں گے باپ کی وفات کے بعد پھوا اماں ہی تو اس گھر میں کمانڈ نگ باور تھیں۔ سید صاحب کو انھوں نے گود میں پروان چڑھایا ہے بھلا وہ کیسے ان کی باتوں کا انکار کر سکتے ہیں۔ سنبل نے اُن کے چہرے پہ بکھری سوچ کو محسوس کیا اور کمرے سے نکلی تو دیکھا چھوٹے میاں کار دیے گیٹ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اُس کا دل چاہا، وہ دوڑ کر چھوٹے میاں کے قدموں میں گر پڑے۔ عظیم باپ کا عظیم بیٹا، مگر وہ جلدی سے دوسری طرف مڑ گئی۔ اور چھوٹے میاں کا دل چاہا وہ گھر سے باہر چلے آئیں۔ ہائے کیسی بے بسی تھی، کتنی تنہائی تھی۔ آج تو وہ مسلسل سوچ رہے تھے۔ جیسے انھیں اب کوئی آخری اور اٹل فیصلہ کرنا ہو۔ وہ شکستہ قدموں سے کمرے میں آئے۔

جوتے کا فیتہ کھولتے کھولتے انھیں اتنی تھکن محسوس ہوئی کہ وہ ویسے ہی بستر پر لیٹ گئے۔ اکرم بیگ نے آکر اُن کے جوتے کھولے پیشانی پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "چھوٹے میاں تمہارا دکھ میں جانتا ہوں۔" اور باہر چلا گیا۔

رات جب بھیگ گئی۔ یخ برفانی ہواؤں نے ماحول کو ڈراؤنا بنا دیا۔ چھوٹے میاں کو بستر پر شدید بے چینی محسوس ہوئی تو وہ ننگے پیروں باہر باغ میں نکل گئے۔ نہ انھیں سردی کا احساس تھا نہ خوف کا، نہ پریشانی کا۔ بس۔ ایک سنبل کا جان لیوا خیال تھا۔ اُن کا دل چاہا وہ راتوں رات گاڑی نکال کر سنبل کو لے بھاگیں، مگر وہ یکدم بزدل ہو گئے۔ پھر شریفوں اور رذیلوں میں فاصلہ رکھنے کے لیے کوئی پیمانہ نہیں رہ جائے گا۔ وہ ملگجے سے اندھیرے میں بنچ پر لیٹ گئے۔ چھوٹے میاں کیا جانیں کہ وہ جو دل میں سلگتی آگ کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے لیٹے ہیں تو ابھی یہ آگ پوری حویلی میں پھیل جائے گی۔ پھوا اماں کی خاص کنیز کھلن لوانے پھوا اماں کو بتاتے وقت بیچاری سنبل کو چھوٹے میاں کی آغوش میں لٹا دیا۔ اور پھر پھوا اماں ڈیوڑھی میں آئیں۔ کنیز نے اشارہ کیا۔ سوائے ایک دھندلے سے ڈھانچے کے پھوا اماں کو کچھ نظر نہ آیا۔ مگر وہ تو جانے کس آگ میں سلگ رہی تھیں جلدی سے بندوق پر ہاتھ دھر دیا۔

"آج اس چھنال کا میں خاتمہ کر ہی دوں۔ دن کے اجالے نہیں تو رات کی تاریکی میں یہ چھوٹے میاں کو ورغلاتی ہے۔"

"دھائیں ۔۔ دھائیں" سید منزل کے مکیں ایسے دھماکوں کے عادی نہ تھے۔ بیگم جانی شب خوابی کے لباس میں باہر دوڑیں۔ سید صاحب ننگے پاؤں دروازے تک چلے آئے۔ اور پھر پھوا اماں بڑی بہادری سے بندوق ٹیک کر قدم جماتی ہوئی بیگم جانی کے پاس آئیں "میں نے اُس حرّافہ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ وہ چھوٹے میاں کو خراب کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔" پھر اپنے کمرے میں واپس چلی گئیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

"وہ سنبل۔ سنبل۔ تم بادلوں سے ڈرا کرتی تھیں ناں ۔۔ دیکھو اب کتنے گہرے بادل چھا گئے ہیں۔ میں تو اپنے درد کو تم سے بھی چھپا رہا . . تھا . . . یہ کیا . . . ہو گیا۔"

وہ کندھے میں پھنسی ہوئی گولیاں پیٹ تک ناچتی محسوس کرتا ہوا کمرے میں جا گرا۔ خون ۔ خون ۔ ہر طرف خون بکھر گیا۔

"بڑا درد ہے سنبل ۔ بڑا ۔ بڑ . . . ا ۔"

سنبل نے تکیے میں چھپا ہوا چہرا اٹھا کر کچھ سمجھنے کی کوشش کی تو سامنے چھوٹے میاں کی لاش پڑی تھی۔ ادھ کھلی آنکھیں۔ جیسے کسی کی منتظر ہوں۔ وہ دیکھتی رہی۔ گھورتی رہی اور چند منٹوں بعد ہی جیسے وہ پھر سے نئی سالہ بچی بن گئی ہو۔ وہ ایک بار پھر آگ اور خون

کے درمیان الجھ گئی ہو۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں بادلوں کا غبار سمیرنے لگا۔ ناک میں بارود کی بدبو تیز تر محسوس ہوئی اور درد بھیا رگی چیخ پڑی ــــ وہ سرشام کر پلنگ پر گر پڑی۔ مرنے کے لیے نہیں۔ حواس کھونے کے لئے ــــ امی ــــ با ــــ دل ــــ بادل ــــ بادل ــــ آ گئے ــــ"

اس کی چیخیں دل کو چیرتی ہوئی گزر رہی تھیں ــــ

ــــ اور بیگم جانی اپنے نوجوان خوبرو بیٹے کا ماتم کر رہی تھیں۔

"ہائے میری گود کو اجاڑ دیا۔ مجھے کیوں لوٹ لیا میرے مولا ــــ کون سے جرم کی خطا میں اسے گولی کا نشانہ بنا لیا۔ میرے رب ــــ ہائے میرے دل کو . . . کون . . . کھیل رہا ــــ ہے۔ ہائے آپا ــــ بی ــــ آپ نے کیا کیا۔" بیگم جانی کے بین سے سید منزل کے در و دیوار کانپ رہے تھے۔ ابھی کچھ اور بولنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ پھوا اماں وندناتی پہنچیں ــــ

"ہائے آپ نے تو ــــ آپ نے تو ــــ آپ نے بھلے ہی کو مارا ہوگا آپا بی۔"

یہ زبان تو آپا بی کا احترام کرنے کی عادی تھی۔

آہ کتنی مجبور تھیں بیگم جانی۔

جیسے سنبل !!

جیسے چھوٹے میاں۔ !!!
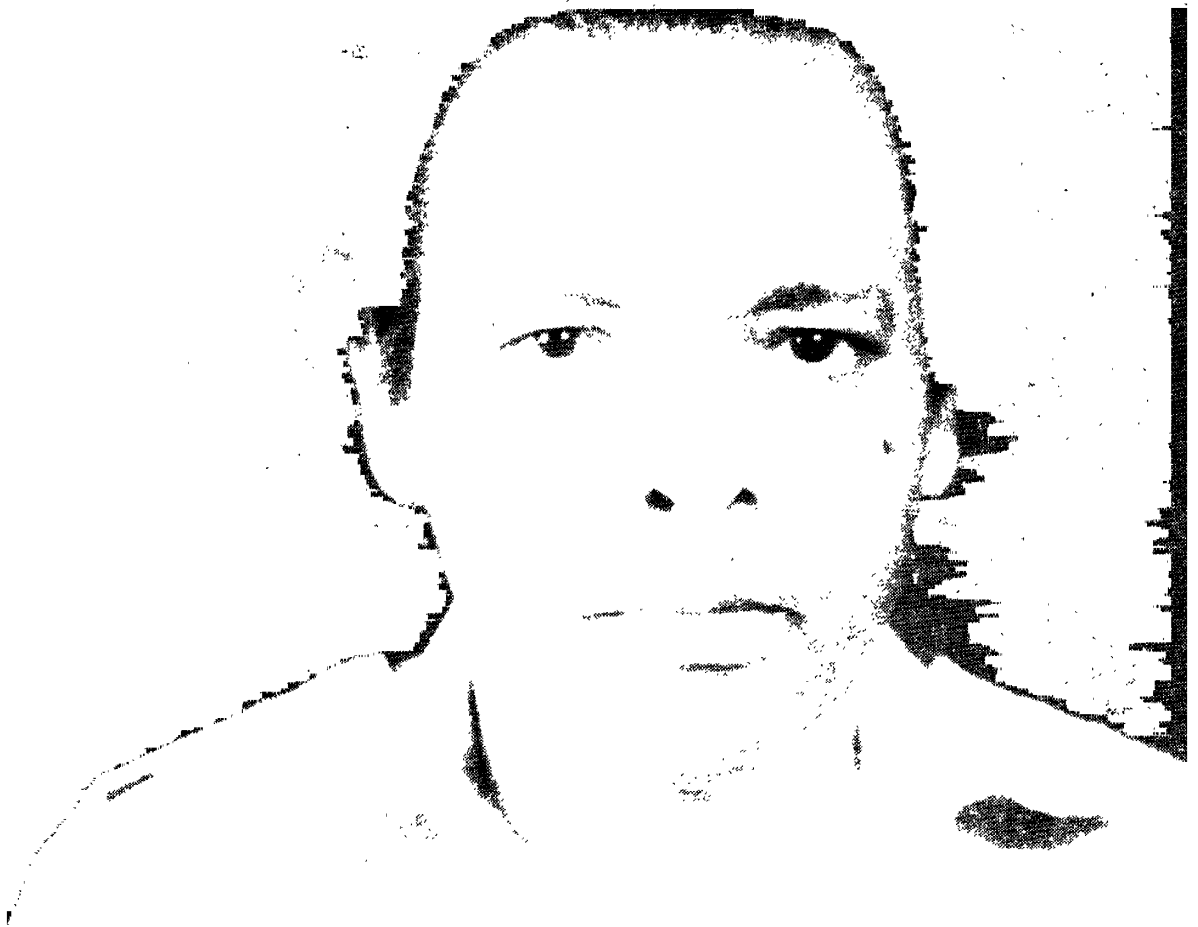
Play a refreshing game with PEPSI

HAVE A **PEPSI** DAY

Make the most of life this summer. Refresh yourself with Pepsi Cola — the drink with a bouncy taste that keeps you on the go.

PAKISTAN BEVERAGE LIMITED. Karachi

(Bottled under the authority of PEPSICO INC. N.Y. U.S.A.)

الفاظ کراچی ۵

EAGLE
EAGLE IRIDIUM
وہ قلم جس کی کارکردگی
سے ہر کوئی مطمئن
ایگل
ایک عالمگیر قلم
A PRODUCT OF
AZAD FRIENDS & CO. LTD.
AFC-2/74
Crescent

جدید ادب کا نمائندہ

ماہنامہ

الفاظ

شمارہ: نومبر ۱۹۸۲ء

مدیر

نسیم درّانی

قیمت فی پرچہ ———— تین روپے

ایک سال کے لئے ———— تیس روپے

پوسٹ بکس نمبر ۷۵۹۶ صدر کراچی ۳

فون: ۲۹۰۸۳۷ ۔ ۶۸۰۱۰۶ —— [illegible]

ترتیب

سرورق کی تصویر : احمد ہمدانی

سلیم احمد

تلاشِ حقیقت کا سچا مسافر

قصہ نئی شاعری کا، صرف نئی شاعری کا قصہ نہیں ہے یہ قصہ نئی تہذیب کا بھی ہے اور قصہ نئے انسانوں کا بھی۔ ہمدانی نے انسانی تہذیب اور شاعری کو مختلف ہی وحدت کے مختلف حصول کی حیثیت سے دیکھا ہے اور ان کے ربطِ باہمی پر نظر ڈالی ہے وہ ان لوگوں میں نہیں ہے جو مظاہر کو الگ الگ دیکھتے ہیں اور ہر مذہب کو قائم بالذات سمجھتے ہیں۔ ہمدانی کے نزدیک حیثیت ایک کُل ہے اور اس کے اجزا کی تقسیم کل کو سمجھے بغیر نہیں ہو سکتی یہی کلیت ہمدانی کی تحریروں کی جان ہے ہمدانی کُل کو دیکھتا ہے اور کُل سے رشتہ جوڑنا اس کے نزدیک عقل و وجدان کا پہلا فریضہ ہے لیکن اسی کلیت پرستی سے ہمدانی کا بنیادی دکھ پیدا ہوتا ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ لوگ اشیا کے ربطِ باہمی کو دیکھ نہیں سکتے اور ان کو دیکھنے کے سبب غلط جذباتی ردلیوں کا شکار ہو گئے ہیں تو اسے افسوس ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے جذبات کی حقیقت کو سمجھیں اپنی ذات کے خول سے نکل کر حقیقت کو دیکھیں اور دکھ میں مبتلا ہو کر دکھ کے سرچشمے کو جانیں یہ خواہش ہمدانی کی بنیادی خواہش ہے اور اس کی تحریریں اس خواہش کی تکمیل کا ذریعہ۔ انسان حقیقت سے کٹ گیا ہے اور حقیقت سے کٹ کر جذباتی ردلیوں کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ ہمدانی کی تحریروں کا بنیادی موضوع ہے اور اس کا ایک ایک لفظ اسی موضوع کی تشریح کرتا نظر آتا ہے

کل کا تصور حقیقت کے تصور کے بغیر ممکن نہیں اور حقیقت کیا ہے یہ ایک الجھا ہوا سوال ہے ہمدانی نے اس کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ایک مخصوص مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہے اس مکتبِ فکر کے نزدیک حقیقت مادہ ہے اور مادہ کوئی ساکت و جامد چیز نہیں ہے بلکہ ہر لحظہ بدل رہا ہے نہ صرف بدل رہا ہے بلکہ ارتقا کر رہا ہے اور مادہ کی اسی حرکت کے نتیجے کے طور پر کائنات وجود میں آئی ہے اور انسان کی تخلیق بھی عملِ ارتقا کا نتیجہ ہے۔ انسان ہر وقت فطرت سے متصادم ہے اور فطرت اور انسان کے تصادم کا نتیجہ سماج اور تہذیب ہے فنونِ لطیفہ تہذیب کی پیداوار ہیں اور تہذیب کے بغیر ان کا وجود ممکن نہیں یہ اس مکتبِ فکر کے بنیادی مقدمات ہیں ہمدانی نے ان مقدمات کو جوں کا توں قبول کر لیا ہے یہ ہمدانی کی ترقی پسندی ہے ہر ترقی پسند نقاد کی طرح وہ ان مقدمات کو بار بار دہراتا ہے ان میں کوئی چیز ہمدانی کی ذاتی اور شخصی نہیں ہے اس کے باوجود میں ہمدانی کو دوسرے ترقی پسند نقادوں سے مختلف سمجھتا ہوں ہمدانی کی انفرادیت بنیادی مقدمات میں نہیں بنیادی مقدمات کی تفہیم اور شعر پر ان کے اطلاق میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ممتاز حسین کو چھوڑ کر کوئی اور ترقی پسند نقاد نہیں ہے جو ان مقدمات کو ہمدانی سے بہتر سمجھتا ہے اور شعر و ادب کے

حوالے سے ان کی معنویت کو پسند کرسکتا ہو۔

ہمدانی کے نزدیک عصر حاضر کا بنیادی المیہ یہ ہے کہ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور خوف و دہشت کے سایوں میں کھڑا ہے ہمدانی کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کے کلی تصور سے کٹ گیا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کائنات میں کیوں ہے اور کن منزلوں سے گذر کر اپنی موجودہ منزل تک پہنچا ہے ہمدانی کے نزدیک اس کا علاج کلی تصور کی بازیافت ہے ہمدانی کا کلی تصور ہم بیان کرچکے ہیں ہمدانی کو اس پر پورا یقین ہے لیکن اس کے باوجود ہمدانی اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ حقیقت کا کلی تصور صرف مادی نہیں ہے حقیقت کا کلی تصور غیر مادی بھی ہو سکتا ہے اور مذاہب نے علمیت کا غیر مادی تصور بھی پیش کیا ہے ہمدانی دوسرے ترقی پسندوں کی طرح اسے رد نہیں کرتا اور اس ہی تصور کے تحت جو شعر و ادب میں پیدا ہوا ہے اس کو سراہتا ہے یہاں سے روایت کے بارے میں ہمدانی کا مخصوص رویہ پیدا ہوتا ہے اس کے نزدیک روایت حقیقت کے غیر مادی تصور پر قائم ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسان، سماج اور فطرت کی وحدت کا تصور پیش کرتی ہے۔

ہمدانی اس وحدت کا پرستار ہے اور اسے جہاں دیکھتا ہے اپنا سر جھکا دیتا ہے اس کے نزدیک قدیم روایات اور جدید معقول رویہ میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں وحدت کو پیش کرتے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ قدیم روایات وحدت کی تلاش روح یا خدا کے ذریعے کرتی ہے جبکہ جدید معقول رویہ اس کی وحدت مادہ کی وحدت میں کرتی ہے نتیجہ دونوں کا ایک ہے دونوں سالم انسان پیدا کرتے ہیں ایک ایسا انسان جو فطرت، سماج اور تہذیب سے مربوط ہے یہ انسان ہمدانی کا آئیڈیل ہے چاہے وہ میر و غالب کی شکل میں ظاہر ہو یا فیض و فراق کی صورت میں۔

ہمدانی کے بنیادی مقدمات ہم نے بیان کر دیئے یہ مقدمات دوسرے ترقی پسند نقادوں کے یہاں بھی کسی نہ کسی شکل میں مل جائیں گے لیکن خیال یا نظریات کا دماغ میں اتارنا ایک بات ہے اور اس کا رگ و ریشے میں اتر کر خون میں سرایت کر جانا دوسری بات ہمدانی کے خیالات ہمدانی کے پورے وجود میں حل ہو گئے ہیں اس لئے جب معقول سے محسوس کی طرف آتا ہے تو صحیح فیصلے کرتا ہے اس کی تبدیلی کی بنیادی خوبی شعر کی تفہیم ہے۔ جو بہت کم ترقی پسند ذہنوں کے حصے میں آتی ہے وہ شعر کو نہ صرف سمجھتا ہے بلکہ محسوس بھی کرتا ہے اور احساسات کے اندر اتر کر اسے دیکھ سکتا ہے کہ کون سا شعر کس رویہ کی پیداوار ہے ترقی پسند نقادوں کی ایک بنیادی خامی یہ تھی کہ وہ شاعروں کی ترقی پسندی یا غیر ترقی پسندی کا فیصلہ خارجی معیارات سے کرتے تھے بیشتر ان کے فیصلے سیاسی وابستگیوں کو دیکھ کر کئے جاتے تھے ہمدانی اس معیار کو قبول نہیں کرتا اس کے نزدیک ترقی پسندی کا معیار یہ ہے کہ شعر میں حقیقت کی طرف کیا رویہ اختیار کیا گیا ہے انسان فطرت اور سماج کے بارے میں شاعر کے محسوسات کیا ہیں ترقی پسند تنقید میں ہمدانی کا یہ ایسا اضافہ ہے جس کا وجود اس سے پہلے نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھا چنانچہ ہمدانی کی ترقی پسندی اطہر نفیس کو بھی قبول کرتی ہے اور عبید اللہ علیم کو بھی امید فاضلی میں بھی ترقی پسند عناصر تلاش کر لیتا ہے۔ اور محبوب خزاں کے بارے میں اس کا فیصلہ ہے کہ میں ترقی پسند ہوں

یہ بات کہ عصر حاضر کا انسان ٹکڑے ٹکڑے انسان ہے اب ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے اس لئے اگر کوئی نقاد صرف اسے بیان کرتا ہے تو کوئی کھری بات نہیں سمجھنا۔ جدیدیوں کے یہاں اس خیال کی تکرار بیشتر ملتی ہے اور جتنی زیادہ تکرار پائی جاتی ہے سطحیت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے لیکن ہمدانی کے یہاں یہ خیال سطحیت سے دور اور گہرائی سے قریب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے منصوبے کو سمجھتا ہے بلکہ اس کی توجیہ بھی کر سکتا ہے وہ جانتا ہے کہ انسان ٹکڑے ٹکڑے اس لئے ہوا ہے کہ وہ اپنی سماجی حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے وہ اپنے فرد واحد ہی کے لئے التباس میں مبتلا ہو گیا

اور فرد واحد سے کم یا زیادہ کسی چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے سماجی حقیقت کو رد کرنے کی وجہ سے وہ جہاں تنہا رہ گیا ہے وہاں تاریخ کی حیثیت سے بھی منکر ہے یوں تاریخ فطرت اور سماجی حقیقت کا انکار اسے ایک ایسی دلدل میں پھنسا رہا ہے جس سے نکلنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ اس میں اور زیادہ دھنستا چلا جاتا ہے اس لئے ہمدانی نے عہد حاضر کی بنیادی تشخیص فرد پرستی کے حوالے سے کی ہے جو ایک صحیح تشخیص ہے ہمدانی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ اس فرد پرستی کو خود ایسی چیز نہیں سمجھتا جو اچانک خلا سے ٹپک پڑی ہو اس کے نزدیک یہ مخصوص معاشی اور معاشرتی عوامل کا نتیجہ ہے اور جب تک اس کی معاشی اور معاشرتی بنیادوں کو نہ سمجھ لیا جائے اس کا علاج ناممکن ہے ۔

انسانی خیال کی دنیا میں منزل کوئی چیز نہیں ہے سفر ہی اصل چیز ہے ہمدانی کے خیالات کی منزل ہمیں معلوم ہے لیکن جو چیز ہمدانی کے خیالات میں وزن اور معنویت پیدا کرتی ہے وہ ہمدانی کی منزل نہیں ہمدانی کا سفر ہے ہمدانی اس سفر کی تکمیل کے لئے مغربی افکار کی دنیا میں دور تک سفر کرتا ہے اور سترھویں صدی سے اب تک کے افکار اور رویوں کا جائزہ لیتا ہے وہ جہاں دونوں طرف فلسفیانہ افکار کا جائزہ لیتا ہے وہاں دوسری طرف نفسیاتی نظریوں کی بھی چھان بین کرتا ہے ۔ یہ کام گہرے مطالعے اور معاملے کی خواہی کی کے بغیر ممکن نہیں ہمدانی نے عہد حاضر کے مختلف نظریات کو جس صحت صفائی اور وضاحت سے بیان کیا ہے وہ یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہمدانی صحیح علم رکھتا ہے اور صحیح علم کو صحیح طور پر پیش کرتا ہے ہمدانی نے جن افکار کی تنقید کی ہے انہیں ان کی گہرائی میں سمجھا ہے اور اس میں اتنی ایمانداری موجود ہے کہ وہ انہیں مسخ کئے بغیر اس طرح پیش کر سکے جس طرح وہ ہیں یہ علمی دیانت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک انسان صحیح معنوں میں حقیقت کا متلاشی نہ ہو ہمدانی تلاش حقیقت کا ایک سچا مسافر ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ہم میں سے یہ بات کتنوں کے بارے میں وثوق سے کہی جا سکتی ہے مجھے ہمدانی سے بے شمار اختلافات ہیں لیکن یہ اختلافات حقیقت کے دو تصورات کے اختلافات ہیں دو افراد سے نہیں اس لئے میں نے اس معنوں میں ہمدانی کی تنقید کرنے سے گریز کیا ہے وہ تنقید صرف اس صورت میں ممکن ہے جب میں ہمدانی کی بنیادی فکر کو چیلنج کروں دوسرے لفظوں میں جو اختلافات مجھے مارکس سے ہیں میں نہیں چاہتا کہ انہیں ہمدانی کے حوالے سے بیان کروں ہمدانی کے بارے میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اسکی تنقید اردو کے ترقی پسند تنقید کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہے ہمدانی ترقی پسند نقاد ہیں لیکن وہ ترقی پسندی کو بیان کرتے ہوئے ترقی پسندی کی مشہور بلکہ بدنام اصطلاحات کا سہارا نہیں لیتے اس سے ان کی نثر میں ایک ایسی خوبی پیدا ہو گئی ہے جو دوسرے ترقی پسند نقادوں میں نہیں ملتی وہ اپنے اسلوب کے لحاظ سے ترقی پسند مکتب تنقید کے آدمی ہی نہیں معلوم ہوتے ان کی نثر میں ایسی سادگی شگفتگی اور وضاحت ہے جو ان کے علاوہ کسی اور ترقی پسند نقاد میں نظر نہیں آتی آخر میں صرف ایک بات اور پوری کتاب میں ہمدانی نے مجھ سے جا بجا اختلاف کیا ہے لیکن یہ اختلاف اتنا دوستانہ ہمدردانہ اور بعض اوقات دلسوزی کی حد تک پہنچا ہوا ہے کہ میں اسے ہمدانی کی دوستی ہی کا نتیجہ سمجھتا ہوں اور اس کے لئے ان کا شکر گذار ہوں۔

ڈاکٹر محمد حسن

ایک معقول اور مدلل آواز

پاکستان میں اردو تنقید کی مدتوں بعد ایک ایسی کتاب آئی ہے جس سے میں نے خود کو نظریاتی طور پر ہم آہنگ پایا ہے۔ پاکستان کے فکری رجحان اور فن کے میرے نزدیک، غلط اور گمراہ کن تصورات نے ایک طرف آدمی کو انسان سے جدا کیا اور فرد اور معاشرے جذبے اور تعقل کو ایک دوسرے سے جدا کرایا تو دوسری طرف اجنبیت اور ہیئت پرستی کے میلانات کو فروغ دے کر آخر کار ادب پر مذہبی ماورائیت اور مابعد الطبیعاتی فکر کا جادو چلایا۔ ادب انسان کو بلوغت اور آزادی دینے والا نغمہ بننے کے بجائے کرب میں مبتلا انسان کی پکار بن گیا۔ جس کی توجیہہ مابعد الطبیعاتی سطحوں پر کی جانے لگی چنانچہ جو کچھ تنقید کے نام سے پاکستانی ادب میں چھپتا رہا وہ زیادہ تر مرعوب کرنے کا سامان تھا۔ دل کو چھوتے اور ذہن کو قائل معقول کرنے کا وسیلہ نہ تھا۔

سید احمد ہمدانی[1] سالہا سال میں پہلی بار پاکستان کی ادبی تنقید میں ایک متوازن لہجے اور ایک معقول اور مدلل آواز لے کر ابھرے ہیں انہوں نے جرأت اور خیال انگیزی کے ساتھ ادب حاضر کے تقریباً سبھی اہم موضوعات سے بحث کی ہے اور ذمہ داری سنجیدگی اور وقار سے بحث کی ہے یہ قصہ دراصل نئی شاعری ہی کا نہیں ہے پوری شاعری بلکہ پوری بصیرت کا ہے محمد حسن عسکری اور سلیم احمد یہاں کے مضامین نرم اور مروت پسندانہ ہیں گویہ دونوں مصنف اس غلط رجحان کے امام ہیں جس پر ہمدانی نے بجا طور پر سخت تنقید کی ہے۔ میراجی ہیں راشد سے زیادہ شعریت ہونے کے بارے میں بھی ان کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے لیکن اپنے چند فروعی معاملات کے علاوہ احمد ہمدانی کی یہ کتاب واقعتہً جدید پاکستانی تنقید میں نئی معقولات کا صحیفہ قرار دی جا سکتی ہے۔

بجا طور پر ہمدانی نے مسائل کا ذکر" انسان کے دو جدید تصور" سے شروع کیا ہے اور مدلل طور پر دکھایا ہے کہ انسان اور آدمی میں تضاد کی تلاش ہی غلط ہے آدمی کی مہذب صورت اس کے سماجی ہونے کا نتیجہ ہے (ص ۱۱) اور سماجی ہونے یا تہذیب یافتہ ہونے کا صرف ایک ہی مفہوم ہے جو یہ ہے" فطرت سے مسلسل پیکار کے ذریعے قوانین فطرت کے وقوف سے حاصل ہوتا ہے"۔ (ص ۱۲) گویا کلچر اور علم دونوں اس انسانی محنت کا ثمر ہیں۔ جو تسخیر فطرت کے سلسلے میں ظہور میں آتی ہے اور انسان کو کائنات کی اور خود اس کی اپنی معرفت بخشتی ہے جو آدمی کو انسان سے اور فرد کو سماج سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ

---

[1] " قصہ نئی شاعری کا " از احمد ہمدانی ، ناشر سیپ پبلیکیشنز کراچی ۲۸۔

اپنے کو ان دونوں معرفتوں ہی سے جدا نہیں کرتے بلکہ تہذیب اور ادب دونوں کی پہچان سے محروم کرتے ہیں (اور ان میں حسن عسکری مرحوم سب سے آگے تھے)

"عمل تخلیق اور انفرادیت پرستی" میں اس بحث کو آگے لے جاتے ہیں اور مقالے کا آغاز نہایت بلیغ جملے سے کرتے ہیں۔ "تخلیق وظیفۂ حیات نہیں سلیقہ حیات ہے۔" وہ سلیقہ جو فطرت اور جبلت (یعنی انسان اور آدمی، م۔ ح) دونوں پر قابو پاکر زندگی کو مجموعی حیثیت سے حسین تر بناتا ہے" (ص ۱۴) اس مقالے میں انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے تصور تخلیق کو "معقولیت کی روشنی میں پہچاننے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ فرد کے اجتماعی وجود کو اس کی تخلیق سے غیر متعلق قرار دینا عامیانہ اور غلط ہے۔ یہاں ایلیٹ کا نظریہ غیر ذات اور IMPERSONAL ART کا تصور رد ہوا ہے۔

"انسان اور اجنبیت کا احساس" میں ALIENATION کے مسئلے پر غور کیا گیا ہے کہ وہ احساس اجنبیت سے منکر نہیں لیکن وہ اسے نفسی (یا ناگزیر) کیفیت ماننے کے بجائے اسے سماجی اور معاشی اسباب کا نتیجہ قرار دیتے ہیں (ص ۳۴) اور اس مقدمے تک پہنچتے ہیں۔

"پوری انسانی تہذیب کی تاریخ دراصل انسان کی محنت کی تاریخ ہے۔ انسان اپنی محنت سے صرف دولت پیدا نہیں کرتا بلکہ ان قوتوں کا اظہار بھی کرتا ہے (اور ان قوتوں کو حاصل بھی کرتا ہے۔ م ح) اور اپنی ذات کی تکمیل بھی" (ص ۳۰)

"نئی نسل کے تصورات" اس مجموعے کا شاید سب سے اچھا مقالہ ہے جس میں "جدیدیوں" کے فکری موقف کا نہایت مدلل جائزہ لیا گیا ہے۔ احمد ہمدانی کے تجزیئے کے مطابق یہ لوگ تسلسل تاریخ کو مسترد کر کے ماضی کے تمام رشتوں کو توڑ کر پھینکنے کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ مقصد ہر طرح کی ثقافت سے آزادی حاصل کرنا ہے"۔ "وہ کہتے ہیں کہ فطرت اور قوانین فطرت انسان سے الگ اپنا وجود رکھتے ہیں لہٰذا جب وہ اپنی منشا کے خلاف قوانین فطرت کو اپنے اوپر اثر انداز ہوتے دیکھتے ہیں۔ تو سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک انسان سماجی نہیں بلکہ نفسیاتی حقیقت ہے" (ص ۳۸) انسانی رشتے ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں چنانچہ عدم استحکام ان کی ماہیت اور اعتبار سے عاری ہونا ان کی حقیقت ہے"

ان تصورات کا رشتہ مصنف نے خیال مطلق، استدلال اور تغیر پذیر شعور انسانی کے عہد بعہد ارتقا پذیر نظریات سے جوڑا ہے اور پھر حقیقت کو ثنویت میں بٹا ہوا دکھایا ہے اور اس کے بعد بڑی ہنرمندی سے یہ واضح کیا ہے کہ جس معاشرے کو اوپر سے مسلط کیا ہوا جبر یا بوجھ قرار دیا جاتا ہے وہ دراصل انسان کے جبلی تقاضوں اور ضرورتوں کی پیداوار ہے اور پیداواری رشتوں کے ساتھ ساتھ معاشرت میں بھی مناسب تبدیلیاں آتی ہیں ان تبدیلیوں میں انسان اور فطرت برابر کے شریک ہیں وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں ہیں بلکہ ایک ازلی اور ابدی رشتہ ہمدمی میں منسلک ہیں وجودی مفکرین صرف جذباتی اور کیفیاتی کیفیت میں بند رہنے کی وجہ سے اس رشتہ ہمدمی کو دیکھنے سے محروم رہ جاتے ہیں اور یہی ان کا المیہ ہے" (ص ۴۷)

ایسا صاف اور واضح تجزیہ پچھلے بیس برس سے نہیں کیا گیا اور مصنف یقیناً اپنی بصیرت اور صراحت اظہار کے لئے مبارکباد کا مستحق ہے۔

"نئی انسانی صورت حال اور ادب، نئی تہذیب کا مسئلہ، قصہ نئی شاعری کا۔ اور باتیں نئے شاعروں کی" مقالوں میں یہی نقطۂ نظر زیادہ وضاحت سے بیان ہوا ہے۔ سائنس اور سائنسی فکر کے بارے میں ایسے روشن بیانات ان مضامین میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

غیر سائنسی فکر ہمیں بتاتی ہے کہ سائنس نے انسان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ انسان مشینوں کے عہد میں مشین کا ایک پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ وہ تنہا ہو گیا ہے اور بے اہمیتی کا شکار ہے .... حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے سائنس نے انسان کو اس کی بے پایاں قوتوں سے آگاہ کیا ہے اس نے کائنات کی حقیقت اور انسان و کائنات کے رشتوں کو اجاگر کر کے بظاہر غیر مربوط دنیا میں ایک ربط تلاش کیا ہے اس نے اسے بتایا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کی تشکیل قوانین فطرت کی مطابقت میں کرے اور بدلتے ہوئے حالات کی صورت میں معاشری رشتوں میں بھی تبدیلیاں لائے۔" (ص ۲)

لاشعور بے بسی اور انسانی جبلت کے جو نظریات، فرائڈ، اڈلر اور میکڈوگل نے رائج کئے ان کا نہایت دل نشیں تجزیہ "نئی انسانی صورت حال اور ادب" میں سامنے آیا ہے۔ اس اعتبار سے تہذیب کے ادراک و عرفان کی بدولت نایاب یہاں جا بجا بکھری ہوئی ہے ادب بالخصوص شاعری پر ان تصورات کا اطلاق ہمدانی صاحب نے بڑی دیانت داری اور معروضیت سے کیا ہے شعراور شاعر کے انتخاب اور پرکھ میں ان کے ذوقِ سلیم اور اصابت رائے کا اظہار ہوا ہے میراجی کو انہوں نے شاعر مانا اور ان میں راشد سے زیادہ شعریت پائی ہے جو البتہ محل نظر ہے اسی طرح محمد حسن عسکری اور سلیم احمد سے بھی ان کا رویہ ذرا زیادہ مروت پسندانہ ہے۔ شعرا کی فہرست میں انہوں نے متعدد غیر شاعروں اور متشاعروں کو بھی کہیں کہیں شامل کر لیا ہے مگر اس کے باوجود یہ کتاب پچھلے بیس برس میں شائع ہونے والی تنقیدی کتابوں میں فضیلت اور اہمیت رکھتی ہے اور ادب کے ہر سنجیدہ قاری کو اس کا غور اور توجہ سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔

(بشکریہ عصری ادب، دہلی)

احمد ہمدانی

انسان، شاعری اور تہذیب

انسان، تہذیب اور شاعری، سب کا سرچشمہ خود زندگی ہے۔ زندگی جو بیکراں پُراسراریت کی چادروں میں لپٹی رہ کر بھی کچھ ایسے
لو سے بکھیرتی رہتی ہے کہ کائنات میں ہر طرف کشش اور دل آویزی کے ساتھ ساتھ خوف و حیرت، اور بعض اوقات الجھن اور مایوسیوں
کے بادل چھا جاتے ہیں ـــ سراسر حسن و دلکشی اور سراسر مجبوریت و بے ثباتی کے تانے بانے سے بنی ہوئی یہ زندگی ایک ایسا معمہ ہے جسے
سمجھنے کیلئے انسان نے کیسے کیسے کنویں نہیں جھانکے لیکن بیک وقت دلکشی و بے ثباتی کی یہ گتھی اس کے لئے آج بھی ایک چیلنج ہے۔ اس بڑھیا
کی طرح جو سوت کی اٹیاں لے کر یوسف کی خریداری کو چل نکلی تھی انسان اپنے شعور اور ارادہ کے بل بوتے پر زندگی کو سمجھنے کے سفر پر جالنے
ب سے گامزن ہے لیکن آج تک نہ وہ اس کی دلکشی کو کم کر سکا اور نہ اس کی مجبوریت و بے ثباتی پر غلبہ پا سکا ـــ انسانی سفر کی یہی
داستان اس کی شاعری بھی ہے اور اس کی پوری تہذیب بھی۔

آئیے انسان کے اس سفرنامہ کو ورق ورق پڑھ کر دیکھیں۔ شاید کوئی بات سمجھ میں آجائے۔ یوں بھی کوشش میں کیا مضائقہ
ہے۔ سب سے پہلے تہذیب کا باب دیکھا جائے۔ انسانی تہذیب سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے اگر مفکرین اور فلسفیوں
سے رجوع کریں تو بات بننے کی بجائے بات بگڑنے کے امکانات زیادہ ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنا اپنا راگ الاپتا نظر آئے گا اور
یک کے سُر دوسرے سے شاذ ہی ملیں گے۔ ایسی صورت میں ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ عمومی بات کی جائے ـــ ہاں تو
سوال تھا کہ انسانی تہذیب سے کیا مراد ہے؟ انسان جب اس دنیا میں آیا تو اس نے اپنے اطراف ایک وسیع کائنات کو پایا جس میں فطرت
کے قوانین جاری و ساری تھے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ سورج دن میں کہاں سے آجاتا ہے اور رات کو کہاں چلا جاتا ہے ـ بارش
کیسے ہوتی ہے۔ تارے کس طرح چمکتے ہیں اور آدمی کیوں مر جاتا ہے۔ اور ایسے ہی بے شمار سوالات۔ اب کیونکہ انسان کائنات کی دوسری اشیاء
کے برخلاف ذہن کا بھی مالک تھا چنانچہ اس نے غور کرنا شروع کیا کہ میں کیا ہوں اور میرے اردگرد یہ خارجی دنیا کیا ہے ـ چنانچہ اس نے
اپنے حوالے سے کائنات کو اور کائنات کے حوالے سے خود کو سمجھنے کی شعوری یا غیر شعوری کوششیں شروع کر دیں۔ اس طرح خود کو اور کائنات
کو سمجھنے کی انسانی کوششیں کل انسانی تہذیب ہیں۔ اب کچھ لوگوں نے خود پر زیادہ زور دے دیا اور کچھ نے کائنات پر جس سے مختلف مکاتب
فکر پیدا ہو گئے۔ ان میں سے ہر مکتبہ فکر اپنے اندر کچھ نہ کچھ صداقت ضرور رکھتا ہے لیکن صندم ضد کے جذبہ میں ہر ایک مکتبہ فکر اپنی "کچھ نہ
کچھ" صداقت کو کل صداقت ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے، جس سے نہ صرف یہ مکاتیب فکر ایک دوسرے سے دور ہو گئے بلکہ ان میں سے

ہر مکتبۂ فکر خود صداقت سے بھی دور ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ مختلف تہذیبوں اور معاشروں کے درمیان معاندانہ فضا کی موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انسان تہذیب کے جزوی تصور کی بنا پر صداقت سے دور ہونے کے ساتھ ساتھ خود اپنے اور کائنات دونوں کے لیے اجنبی بنتا جا رہا ہے۔ اجنبی بھی اور شاید حریف اور مخالف بھی ــ یہ انسانی تہذیب کا المیہ ہے۔ لیکن انسانی تہذیب صرف المیہ نہیں کچھ اور بھی ہے "وکچھ اور بھی"، کے خیال سے فراق کے کچھ شعر یاد آ گئے۔

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی | یہ حسن و عشق کا دھوکا ہے سب مگر پھر بھی
جھپک رہی ہیں زمان و مکاں کی بھی آنکھیں | مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی

خیر یہ اشعار تو یونہی درمیان میں آ گئے تھے۔ بات ہو رہی تھی انسانی تہذیب کے المیہ کی ــ یعنی انسانی تہذیب میں ایک پہلو المیہ کا نکلتا ہے لیکن پوری انسانی تہذیب کو المیہ کہنا درست نہیں۔ یہ بات کہتے وقت ہمارے ذہن میں وہ سب بڑے بڑے نام موجود ہیں جو پوری انسانی تہذیب کو مسترد کرتے ہیں اور تاریخ انسانی کو انسان سے الگ اور اس سے غیر متعلق چیز سمجھتے ہیں کیونکہ ہمارے لیے تو انسان کو سمجھنے کے لیے اس کی تاریخ ایک ناگزیر حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم تو خود تاریخ سے انکار کو بھی تاریخ ہی کے آئینہ میں دیکھتے ہیں ممکن ہے یہ ہماری کمزوری یا نقص ہو چنانچہ ہمیں اس پر اصرار نہیں کہ ہمارے اس رویہ کو درست سمجھا جائے لیکن بات جو ہم کہنا چاہتے ہیں وہ صرف اتنی سی ہے کہ انسان نے اپنے تہذیبی سفر میں صرف کھویا ہی نہیں کچھ پایا بھی ہے اور کسی حتمی بات سے قطع نظر ہمیں محسوس یہ ہوتا ہے کہ کھویا کم اور پایا زیادہ ہے۔

ہم نے تہذیب کی تعریف کرتے وقت کہا تھا کہ انسان نے خود کو اور خارجی دنیا کو جاننے کی جو کوششیں کیں وہ سب تہذیب کہلاتی ہیں۔ ادب و فلسفہ، نفسیات، جمالیات، اخلاقیات و معاشرتی علوم کا تعلق نمایاں طور پر خود کو جاننے سے ہے جبکہ خالص سائنسی انکشافات کا نمایاں تعلق کائنات سے ہے۔ اب کیونکہ ذہن انسانی ہر دو شعبوں کا مشترک وسیلہ علم ہے چنانچہ ان دونوں شعبوں کو بالکل ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فکر کا مرکز ایک طرف انسان ہے تو دوسری طرف کائنات ایک طرف انسان خود سے آگہی حاصل کر کے اپنی جبلتوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے، تو دوسری طرف قوانین فطرت سے آگاہ ہو کر کائنات پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ جب خود پر اور کائنات پر غالب آنے کے بعد دونوں عمل ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو انسانی معاشرہ تہذیب کی برکتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے اور جس درجہ تک یہ ہم آہنگی میسر آ جاتی ہے اسی قدر معاشرہ انتشار اور افراتفری سے محفوظ ہو جاتا۔

ہمارے عہد کو لوگ سائنس کا عہد کہتے ہیں اس طرح ہمارا عہد نمایاں طور پر تسخیر کائنات کا عہد ہے تسخیر کائنات کے ذریعہ انسان مادی طور پر ترقی کرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سائنسی انکشافات نے ہماری زندگی میں ہزار طرح کی آسائشیں مہیا کر دی ہیں لیکن ان آسائشوں سے انسان خوش نہیں۔ خوش ہونا تو درکنار کچھ زیادہ ہی رنجیدہ ہو گیا ہے۔ آخر کیوں؟ آسائشیں طمانیت اور مسرت کی جگہ خوف اور بے چینی کا باعث کیوں بنی ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تسخیر فطرت سے حاصل کردہ مادی ترقی کے نشہ میں انسان نے اپنی حقیقت کو صرف مادی سمجھ لیا ہے حالانکہ انسان کی حقیقت صرف مادی نہیں۔ انسان مادی ضرور ہے مگر اس کی حقیقت مادی نہیں اور اس امر کا احساس زندگی میں قدم قدم پر ہوتا ہے ــ مثلاً زندگی کا ہر منظر عبوری اور گزر جانے والا ہے مگر انسان کو ہر لحظہ ثبات کی تلاش رہتی ہے۔ وہ فنا پذیری کے عمل میں بقائے دوام کا جویا ہے۔ وہ قوانین فطرت میں جکڑا ہوا ہے لیکن ہر لحظہ وہ ارادہ کی آزادی کے گیت الاپتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہر شے اضافی اور زمان و مکاں میں قید ہے مگر وہ زمان و مکاں سے ماورا ہو جانے کے خواب دیکھنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ یہ سب کچھ مادی حقائق سے ٹکراتے ہیں

سفر نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا یہ سارا سفر انسان کی حقیقت سے الگ کوئی شے ہے۔ ایسا نہیں ہے دراصل وہ اپنے ذہن اور شعور کی وجہ سے باقی مادی کائنات سے ممتاز و ممیز ہے اور یہی امتیاز و تمیز اس کی حقیقت ہے یعنی مادی ہونے کے باوجود اور اپنی حقیقت میں روحانی ہے۔ وہ اپنے جسم سے جانا اور اپنی آرزوؤں اور خوابوں سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ آرزوئیں اور یہ خواب اس کی تہذیب ہیں اس کی تاریخ ہیں۔

عہد قدیم سے آج تک انسانی تہذیب دو طرح کے رویوں سے تشکیل پا رہی ہے۔ ان رویوں کو ہم مادی یا مابعد الطبیعیاتی کے نام بھی دے سکتے ہیں۔ کسی عہد میں مادی رویہ غالب آجاتا ہے اور کسی عہد میں مابعد الطبیعیاتی۔ کہیں تھیلز، ہرکلیش اور ہندوستان کے چارواکا اسکول کا زور ہو جاتا ہے تو کہیں افلاطون ارسطو اور دوسرے اسی قبیل کے مفکروں کا غلبہ۔ انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ان دونوں رویوں میں اعتدال پیدا کرے۔ دونوں میں سے کسی ایک طرف زیادہ جھکنا فساد اور انتشار کا سبب ہے۔ ہمارے عہد میں مادیت کا غلبہ ہے انسان نے فطرت کو تو ایک بڑی حد تک مسخر کر لیا ہے مگر اپنی جبلتوں کی تہذیب سے غافل ہو گیا ہے۔ جبلتوں کی تہذیب سے غفلت ہی عہد حاضر کے فساد کا سبب بن گئی ہے۔ جب تک تسخیر فطرت اور تسخیر جبلت میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوگی انتشار سے چھٹکارا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔

اب تک کی پوری گفتگو تہذیب کے حوالہ سے تھی۔ شاعری بھی تہذیب ہی کا ایک عمل ہے۔ سلیم احمد نے تو شاعری کی موت کا اعلان کر دیا ہے لیکن ہمیں یہ بات ماننے میں تامل ہے

کیونکہ شاعری کی موت دراصل انسان کی موت ہے اور ہمارے خیال میں شاید انسان ابھی زندہ ہے۔ سائنس سے اس کا انہماک کوئی غیر انسانی عمل نہیں اور نہ یہ عمل صرف عہد جدید سے مخصوص ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ انسان خود کو اور کائنات کو دریافت کرنے کی کوشش ہمیشہ سے کرتا رہا ہے ہمارے عہد کی خرابی صرف یہ ہے کہ اس زمانہ میں انسان کا سائنس سے انہماک یک رخا ہو گیا ہے۔ اگر انسان سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ تہذیب نفس سے بھی غافل نہ ہو۔ اور یہ سمجھ لے کہ وہ ثمرات جو سائنسی ترقی کے ذریعہ اسے حاصل ہوئے ہیں وہ کل نوع انسانی کی بہتری کے لئے استعمال ہونے چاہئیں تو پھر ایٹم سے بم بنانے کی جگہ ہزار طرح کے تعمیراتی کام بھی انجام پا سکتے ہیں لیکن افسوس کہ صحیح طور پر تربیت نفس نہ ہونے کی وجہ سے انسان نے یہ بات بھلا رکھی ہے۔ زبانی دعوے تو بہت کچھ کئے جاتے ہیں لیکن حقیقتاً ہوس اقتدار اور ہوس زر کے حلقہ سے باہر آنے کے لئے کوئی تیار نہیں یہ قصور سائنس کا نہیں بلکہ ہمارے اس رویہ کا ہے جس نے سائنس کی برکتوں کو زحمتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں شاعری انسان کے بڑے کام آسکتی ہے۔ لیکن لوگ اس سے کام لینے کی بجائے اس کی موت کا اعلان کر رہے ہیں۔ شاید اس کے اسباب عہد حاضر کی شاعری میں بھی مضمر ہوں تو آئیے اک سرسری سا جائزہ نئی شاعری کا لے لیا جائے۔

ہمارے یہاں نئی شاعری کا آغاز سرسید تحریک سے ہوتا ہے اردو میں یہ پہلی ادبی تحریک ہے جس نے شاعری کی افادیت کا کھل کر اعلان کیا۔ اس اعلان کا یہ مقصد بالکل نہیں کہ ہم اپنی پچھلی شاعری کو غیر مفید یا مضر سمجھ کر یک قلم مسترد کر دیں۔ فرق صرف افادیت کے اعلان اور بغیر کسی اعلان کے افادیت کے عمل کا ہے۔ ہماری روایتی شاعری بغیر کسی اعلان کے ایک ارفع اور مفید انسانی عمل تھی جبکہ انگریزوں کی آمد کے بعد مسلمانوں کی بدحالی کے پیش نظر سرسید اور ان کے رفقاء نے شاعری سے قومی ترقی کی مہم میں واضح مدد کی توقع کی۔ یہ توقع نیک نیتی اور قوم دوستی کے اعلیٰ جذبات کی پیداوار تھی۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہمارے ہاں نہ قوم کا تصور تھا اور نہ قومی ترقی کا۔ یہ دونوں تصورات اپنی اصل میں بدیسی ہیں۔ چنانچہ جب سرسید

نے قومی ترقی کی مہم کا آغاز کیا تو ہمارے روایتی معاشرہ نے اسے قبول کرنے میں خاصے تامل سے کام لیا۔ روایتی معاشرہ کے لئے ایک طرف تو قوم کا تصور بالکل اجنبی تھا دوسری طرف ترقی کا مفہوم بالکل نیا تھا اور نہ صرف نیا تھا بلکہ اب تک کے ترقی کے تصور کی بالکل ضد تھا قومی ترقی کا وہ تصور جس کی تبلیغ سرسید کا مقصد حیات تھا اس میں مادی ترقی کو فوقیت حاصل تھی جبکہ ہمارے معاشرہ میں مادی ترقی کی حقیقت ثانوی تھی۔ اصل ترقی روحانی ترقی تھی۔ روحانی اپنے وسیع تر معنی میں۔ انگریزی شاعری کے زیر اثر قومی شاعری کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت کی عکاسی کا رجحان بھی ہماری شاعری میں باقاعدہ تحریک کے طور پر شامل کیا گیا۔ ابتداً یہ دونوں رجحان ایک ہی تحریک کا حصہ تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ الگ ہو گئے اور ہماری شاعری مقصدی اور رومانی شاعری کے دو دبستانوں میں بٹ گئی اور پھر ان دونوں دبستانوں کی باہمی چشمکوں اور محاذ آرائیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جسے یہاں دہرانا بالکل غیر ضروری ہے البتہ اتنی بات کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ مقصدیت اپنی انتہا پسندی میں نعرہ بازی اور رومانیت یا جمال پرستی مندم مند ایس ہیت پرستی بن گئی جس کی وجہ سے شاعری ان دونوں رویوں کے ہاتھوں نڈھال ہو گئی اس نڈھال شاعری کو دیکھ کر لوگوں کو گمان گذرنے لگا کہ شاعری مر گئی۔ گمان کرنے والے شاید یہ بھول گئے کہ انتہا پسندوں کی شاعری ہماری کل شاعری نہیں ہے ہمارے یہاں ایسی شاعری بھی کچھ کم نہیں جہاں ان دونوں رویوں کے مابین توازن برقرار رکھا گیا ہے۔

شاعری کی موت کے اعلان میں یہ وسوسہ بھی شامل ہے کہ ہمارا عہد سائنس کا عہد ہے چنانچہ اس عہد میں شاعری ممکن نہیں۔ یہ بھی صرف ایک وسوسہ ہی ہے کیونکہ اگر سائنس اور شاعری ایک دوسرے کی ضد ہیں تو فلسفہ اور مذہب بھی شاعری کے ہم تبدیل نہیں ہیں۔ جب شاعری فلسفہ اور مذہب کے زیر سایہ پروان چڑھ سکتی ہے تو سائنس کے دوش بدوش اس کا سفر کیوں ناممکن ہے؟ مذہب، فلسفہ اور سائنس دراصل تین بنیادی رجحانات ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایک رجحان کسی بھی عہد کا غالب رجحان بن کر اس عہد کی پوری زندگی کو متاثر کرتا ہے جس سے اس عہد کی اجتماعی فکر پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ اجتماعی فکر فنکاروں کے وجود کا حصہ بن جاتی ہے تو فن کی تخلیق ہوتی ہے۔ مزید وضاحت کے لئے یہ عرض کرتا چلوں اجتماعی فکر فنکاروں کے وجود کا حصہ بن کر اپنے اندر تبدیلیاں بھی لاتی ہے۔ اور یہ تبدیلیاں ہر فنکار کی افتاد اور مزاج کی مطابقت میں ہوتی ہیں اس طرح فنکاروں کی تخلیقی آگہی اجتماعی فکر کے دائرہ میں رہکر اس سے مختلف چیز ہے۔ آج کا غالب رجحان سائنس ہے جس کا تعلق اجتماعی فکر سے ہو سکتا ہے لیکن شعراء کی تخلیقی آگہی ——— (Imaginative awareness) سے اس کا براہ راست تعلق نہیں چنانچہ یہ خدشہ بالکل بے بنیاد ہے کہ سائنس کے دور میں شاعری کا زندہ رہنا ممکن نہیں۔ ان تمام مباحث سے قطع نظر جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو یہاں تو ابھی سائنس کو اس قدر فروغ بھی نہیں ہوا ہے کہ ہماری اجتماعی فکر پر اس طرح اثر انداز ہو سکے جس طرح ہم مغربی ممالک میں اس کا اثر دیکھتے ہیں۔ تو پھر مایوسی کے اسباب کیا ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ مقصدیت اور جمال پرستی کے انتہا پسند رویوں کے تحت جو شاعری کی گئی اس سے گمان گذرتا ہے کہ شاعری کی موت واقع ہو گئی ہے مثال کے طور پر کچھ اشعار

رابطہ لاکھ سہی قافلہ سالار کے ساتھ
ہم کو چلنا ہے مگر وقت کی رفتار کے ساتھ
لفظ چنتا ہوں تو مفہوم بدل جاتا ہے
اک نہ اک خوف بھی ہے جرأت اظہار کے ساتھ

بخش دے مجھ کو بھی اعزاز مسیح و منصور
میں نے بھی پیار کیا ہے رسن و دار کے ساتھ (قتیل شفائی)

یہ اور اس سے بھی بڑھ کر بہت سے اشعار جن پر براہ راست، پند و نصیحت کا نعرہ بازی یا واقعیت نگاری کا گمان گزرتا ہے ہماری مقصدی شاعری کا جزو بن گئے، تو لوگوں میں شاعری سے مایوسی کا احساس پیدا ہو جانا دبستان کچھ بعید از قیاس نہیں تھا۔ اسی طرح جمال پرستی کے دبستان میں صرف ہیئت کے بے جان تجربوں کے ساتھ واقعیت نگاری نے زور پکڑا تو شاعری کی موت کا اعلان کیا جانے لگا مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے۔

سحر کا نکلا ہوا رات کو میں آتا تھا — مکان سے دور بہت دور میرا دفتر تھا
سڑک پہ چلتے پھرتے دوڑتے لوگوں سے گھبرا کر — کسی چھت پر مزے میں بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں
جستجو اس پیڑ کی کیوں ہو کہ جو سایہ نہ دے — ہاتھ اس ڈالی پہ کیا ہو کیجے کہ جس پر پھل نہ ہو
سادہ کاغذ رکھ کر آیا ہوں نمائش گاہ میں — دیکھ کر ہوتی تھی ہر تصویر کو الجھن مجھے

اس مختصر سے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح شاعری انتہا پسندوں کے ہاتھوں نڈھال ہو کر رہ گئی ہے اسی طرح یہ اعلان بھی ایک طرح انتہا پسندی پر مبنی ہے یہاں بھی اعلان کرنے والے ایک طرف انسان کی پوری حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں تو دوسری طرف ان کی توجہ صرف ایسے شعرا پر جم کر رہ جاتی ہے جو توازن اور ہم آہنگی سے محروم ہیں مثلاً مقصدی ادب کے ترجمان فراق، فیض اختر الایمان، مجاز، عزیز حامد مدنی، احمد فراز، حبیب جالب وغیرہ وغیرہ اور جمال پرستوں میں میراجی، ن م راشد کے بجائے امجد، مختار صدیقی، ناصر کاظمی، شکیب جلالی، منیر نیازی، شہزاد احمد، رئیس فروغ وغیرہ جیسے شعراء کے نام واضح ایسے نام ہیں جو ہمیں مایوس ہونے سے بچاتے ہیں۔ لیکن شاید کسی وجہ سے شاعری سے مایوس حضرات صرف انتہا پسندوں ہی کو جدید عہد کا شاعر سمجھتے ہیں جو حقیقت کا پورا ادراک نہیں ہے۔

انسان اپنے شعور کی وجہ سے بیک وقت دو دنیاؤں میں رہتا ہے۔ ایک عالم فطرت اور ایک عالم شعور۔ اس کی دنیا جسے ہم عالم شعور کہتے ہیں وہ اسے کشاں کشاں دوسرے فنون لطیفہ کے علاوہ شاعری کی طرف بھی لے جاتی ہے جب تک انسان اور شعور ساتھ ساتھ ہیں یہ بات شاید ممکن نہیں کہ انسانیت سے شاعری الگ ہو جائے ـــــ شاعری کا اعلان دراصل انسان کی نامکمل تفہیم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

احمد ہمدانی

فرد اور معاشرہ

اطالوی شاعر پلاٹس کا خیال ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کے لئے ایک بھیڑیا ہے۔ اگر ہم پلاٹس کے اس خیال کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ پلاٹس کے نزدیک شاید انسان کے عمل کے محرک لالچ، خود غرضی اور اس کی انا کے جبلی تقاضے ہیں۔ اگر ہم انسان کے تمام اعمال کا محرک اُس کے انہی عناصر کو تسلیم کریں تو پھر یہ نتیجہ بہ آسانی نکالا جاسکتا ہے کہ نوعِ انسانی ایک ابدی معاندانہ صورتِ حال سے دوچار ہے۔ اس صورتِ حال میں اس کی اجنبیت، بیگانگی اور تنہائی اس کا مقدر ہیں۔ اس کے برعکس شیخ سعدیؒ انسانوں کو اعضائے یک دیگر اند کہتے ہیں۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ تمام انسان محبت، ہمدردی اور تعاون کے رشتوں میں منسلک ہیں۔ اور انسانی سماج میں بیگانگی اور تنہائی کے مہیب اندھیروں کا دُور دُور گزر نہیں ہے۔ لیکن جب ہم حقیقی حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سچائی اِن دونوں نظریوں میں نہیں ہے۔ تاریخ عالم میں نہ تو کبھی ایسا زمانہ آیا جب مکمل عناد کا دَور دَورہ اور نہ کبھی ایسا وقت آیا جب مکمل ہم آہنگی اور محبت کی برکتیں پھیلی ہوں۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ جب دنیا میں انسانوں کے درمیان مکمل حقیقت نہ مکمل عناد رہا اور نہ مکمل ہم آہنگی، تو پھر یہ عناد و ہم آہنگی کے متضاد نظریات کس طرح وجود میں آئے اور نہ صرف وجود میں آئے بلکہ بڑی حد تک معقول و مؤثر بھی ہوئے۔

دراصل فرد اور معاشرہ ایک حقیقت ہیں کوئی تصور نہیں۔ اور مذکورہ بالا دونوں نظریات کی بنیاد فرد اور معاشرے کے مجرّد تصوّرات ہیں۔ اِن دونوں نظریات میں جزوی صداقت موجود ہے لیکن دونوں نظریات میں جزوی صداقت کو کلّی صداقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کلّی صداقت تو خیر بڑی بات ہے اسے گرفت میں لانے کا دعویٰ تو کون کرسکتا ہے البتہ یہ ممکن ہے کہ ہم مجرّد تصوّرات کو بنیاد بنانے کی بجائے حقیقی حالات کو بنیاد بنا کر حالات کا مکمل تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ فرد اور معاشرے کے درمیان ربط اور رشتے کی نوعیت کیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی کی بنیاد کیا ہے اور [illegible] کے اسباب کیا ہیں۔ لیکن ہم آہنگی اور اسباب کی تفہیم سے پہلے ضروری ہے کہ ہم فرد اور معاشرے کی حقیقت کے بارے میں اپنا ذہن صاف کرلیں کہ فرد کیا ہے۔

تمام انواع کی طرح نوعِ انسانی میں بھی ہر انسان ایک عضویاتی وحدت ہے اور اس حقیقت میں وہ کچھ خصوصی اور کچھ عمومی جزوں کا مجموعہ ہے۔ عمومی جزوں میں اس کی جبلتیں اور اس کا جسمانی اور اعصابی نظام ہے۔ اور خصوصی جزوں میں اس کی شکل و صورت کا فرق اور اعصابی فعلیت کا اختلاف ہے۔ ایک مخصوص اعصابی فعلیت ایک مخصوص کردار یا شخصیت پیدا کرتی ہے۔ جب کہ عمومی جبلتیں

جسمانی اور اعصابی نظام سب انسانوں میں یکساں ہیں مخصوص اعصابی فعلیت کے محرکات انسان کے اندر نہیں بلکہ اس کے ماحول میں ہوتے ہیں
ان کے اندر کچھ کرنے اور کچھ نہ کرنے کے امکانات ہوتے ہیں لیکن وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے اس کا فیصلہ حالات کے تقاضوں کے تحت کرتا ہے۔ وہ
حالات سے ہم آہنگ بھی ہوتا ہے اور حالات کو بدلتا بھی ہے۔ حالات کو بدلنے کی صلاحیت اس کے تخلیقی اور فعال ہونے کی نشاندہی کرتی ہے اور بتاتی
ہے کہ انسان کی حیثیت ماحول کے غلام کے نہیں بلکہ وہ ایک فعال کردار اور حیثیت کا مالک ہے — انسان کی اس حیثیت کو نظر میں رکھے بغیر ہم
انسان کی آزادی کا کوئی قابل قدر تصور وضع نہیں کر سکتے۔ مثلاً جب روسو نے یہ کہا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور وہ ہر جگہ زنجیروں سے جکڑا ہوا
ہے تو اس نے انسان کو صرف اس کی جبلتوں تک محدود کر کے ہر معاشرتی قدر کو ایک زنجیر سے تعبیر کر دیا۔ وہ یہ بھول گیا کہ جبلتوں کی اسیری
بھی آخر کار ایک اسیری ہے۔ اور ایسی اسیری ہے جہاں انسان کا فعال کردار بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ کائنات میں انسان کا فعال
کردار اور اس کی تخلیقی صلاحیت ہی اسے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اور اس کا یہ فعال کردار اور تخلیقی صلاحیت ماحول سے تصادم
میں اُجاگر ہوتی ہے۔ جبلتوں کا اسیر ہو جانے کی بجائے جبلتوں پر قابو پالینا اصل انسانیت بھی ہے اور یہ اصلی آزادی بھی۔ میر تقی میر
کا ایک شعر ہے۔ ؎

جو اس زور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

ہمسایہ کی نیند کے خیال سے آہستہ رونے کا احساس حقیقی آزادی بھی ہے، انسانیت بھی ہے اور معاشرے کی بنیاد بھی — یوں بھی یہ
کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے ایک ناقص دعویٰ ہے۔ انسان ایک سماجی اور روحانی وجود ہے۔ اس کی سماجیت اور روحانیت اُس کے
اعمال کی سمتیں متعین کرتی رہتی ہیں۔ ہمیں انسانی تاریخ میں کسی ایسے انسان کا سُراغ نہیں ملتا جو اپنی سماجیت اور روحانیت سے آزاد ہو۔
ہم نے اپنی گفتگو کے آغاز میں دو معاشرتی نظریوں کی نشاندہی کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ دونوں نظریے آزادی کے مجرّد تصورات
پر قائم ہیں۔ جب کہ ہمیں فرد اور معاشرے کے رشتوں کی تلاش میں حالات کو بنیاد بنانا چاہیئے۔ انسان ایک سماجی وجود کی حیثیت
سے مل جل کر رہنے پر مجبور ہے اور اسی مجبوری ہی میں اس کی آزادی کا راز پنہاں ہے۔ آزادی کے اس راز کو پانے کے لئے انسان کو
بڑے نازک مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ بقول میر صاحب ؎

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری کا

آفاق کی اِس کارگہِ شیشہ گری میں نازک کام انسانی رشتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اپنی جبلتوں اور خواہشوں پر قابو پا کر
اس معاندانہ فضا سے آزاد ہونا ہے جو انسانوں کو بھیڑیا بنا دے۔ اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی حقیقت سے
واقف ہو اور یہ سمجھ سکے کہ انسان کی آزادی سلامتی کے حصول میں ہے یا خواہشات کو بے لگام چھوڑ کر ایک معاندانہ فضا میں۔
فرائڈ کے ہمنوا کہتے ہیں کہ معاشرہ خواہ کسی قسم کا بھی ہو وہ انسانی جبلتوں کو دباتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسان معاشرے سے
ایک مسلسل کشمکش میں رہتا ہے۔ گویا معاشرہ کوئی غیر فطری جزو ہے' یا روسو کے الفاظ میں ایک زنجیر ہے جس نے انسانوں کو جکڑ رکھا
ہے۔ حالانکہ حالات کا تجزیہ بتاتا ہے کہ معاشرہ انسانی ضرورت ہے اور اس کے سماجی حیوان ہونے کے تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ فرائڈ اور
اُس کے ہمنواؤں کا یہ خیال بھی دراصل انسان اور اُس کی آزادی کے مجرّد تصورات پر قائم ہے اور کسی طرح بھی انسانی تاریخ سے اپنا رشتہ
قائم نہیں کرتا۔ فرائڈ سے قطع نظر نشاۃ الثانیہ کے دوران معاشرے کا ایک نظریہ تاریخ سے الگ فرد کو بنیاد بنا کر پیش کیا گیا اور
بتایا گیا کہ یہ بات فطرتِ انسانی میں موجود ہے کہ وہ فرد کے مفاد کی خاطر معاشرے سے ہم آہنگی پیدا کرے اور اُس کے لئے فرد کو اپنے
مفاد کی صحیح تفہیم درکار ہے۔ جب کہ تاریخ کا مطالعہ اور اصل حالات کا تجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ فرد کا مفاد ہر مختلف سماجی و معاشی

(SOCIO-ECONOMIC) ڈھانچوں میں مختلف ہوتا ہے۔ اور نہ صرف فرد کا مفاد مختلف ہوتا ہے بلکہ فرد خواب، امنگیں آرزوئیں حتیٰ کہ اُس کی شناخت بھی مختلف ہوتی ہے۔ بقول علامہ اقبالؔ سے

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

مثال کے طور پر پاکستان کے معاشرے کو لیجئے۔ یہاں زرعی اور نیم سرمایہ دارانہ معاشرہ قائم ہے۔ ایسے معاشرے میں انسانی رشتوں کی مخصوص صورت ہوتی ہے۔ مزدور اور سرمایہ کی کشمکش اور کسان اور زمیندار کے تصادم اِس معاشرے کے لازمی عملی مظاہر ہیں۔ کیونکہ اس معاشرے کی پیداواری صورت میں اس معاندانہ فضا کا پیدا ہونا فطری ہے۔ اِس کے برعکس ہماری کوشش ہے کہ ہم یہاں اسلامی نظام قائم کریں لیکن اسلامی نظام موجودہ سماجی و معاشی ڈھانچے (SOCIO - ECONOMIC FORMATION) میں قائم ہونا اس لئے مشکل ہے کہ اسلامی نظام میں نہ اُس جاگیرداری کی گنجائش ہے جو یہاں رائج ہے۔ اور نہ ہی اُس نیم سرمایہ دارانہ نظام کی جو سود پر قائم ہے۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے باہمی انسانی رشتے ہمارے مخصوص سماجی و معاشی ڈھانچے (SOCIO-ECONOMIC FORMATION) کی مطابقت میں قائم ہیں۔ جب کہ اسلامی نظام کی بنیاد مخصوص عقائد، عبادات اور اخلاقیات پر قائم ہوتی ہے۔ یہ اخلاقیات اسی پیداواری صورت حال کی متقاضی ہے۔ جس میں معاندانہ (ANTAGONISTIC) ماحول کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ نظامِ اسلام کا قیام موجودہ سماجی و معاشی ڈھانچے کو ختم کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسلامی نظام میں پیداوار کا مقصد نفع سے زیادہ اجتماعی ضروریات کی تسکین ہے۔ یہاں تجارت کے . . . . . اصول کچھ اِس طرح کے ہیں کہ جب قحط پڑے تو ضرورت مندوں میں غلہ مفت تقسیم کر دیا جائے اور غلہ تقسیم کرتے وقت تاجر یہ سمجھے کہ اُس نے آج سب سے زیادہ نفع کمایا ہے۔ اس کے برعکس ہم جس سماجی و معاشی ڈھانچے (SOCIO-ECONOMIC FORMATION) میں رہ رہے ہیں وہاں غلہ چھپا کر مصنوعی قلت پیدا کی جاتی ہے۔ اور اِس طرح ضرورت مندوں سے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی جاتی ہے۔ جس سے معاشرے میں ایک کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اِس پورے تجزیے سے ہماری مراد صرف اس قدر تھی کہ یہ واضح کر سکیں کہ معاشرے میں کشمکش اور معاندانہ ماحول کا سبب انسان کی فطرت نہیں بلکہ پیداواری پالیسی ہے۔ اور انسانی رشتوں کی بنیاد کوئی مجرد تصورات نہیں بلکہ طریقۂ پیداوار کی ضروریات ہیں۔

موجودہ صنعتی معاشرے میں فرد پرستی اور معاشرہ بے زاری کے رُجحانات بہت عام ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ انسان اور معاشرہ دو متضاد چیزیں ہیں بلکہ صنعتی معاشرہ کی پیداواری پالیسی اس منفی رجحان کا اصل سبب ہے۔ جب ہم اصل سبب سے نظریں چرا کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو صرف مجرد تصورات کے سہارے نتائج اخذ کرتے ہیں اور اس قسم کی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ فرد ہی سب کچھ ہے۔ معاشرہ اس پر ایک جبر ہے۔ فرد کی جبلتوں کو دبا کر اس کی شخصیت کو مجروح کیا جاتا ہے۔ جب یہ خیال راسخ ہو جائے تو انسان انا پرستی سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کی زندگی میں خوف، دہشت اور بیگانگی کے اندھیروں کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ اس کے برعکس بھرپور زندگی اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی انفرادی یا جزوی خودی کو قربان کر کے انسانوں اور کائنات سے اپنا رشتہ جوڑ لے۔ محمد حسن عسکری نے میر تقی میرؔ پر مضمون لکھا تو اس بات کی قدرے وسیع تر حوالے کے ساتھ ان الفاظ میں وضاحت کی۔ ”بھرپور زندگی اسی وقت مل سکتی ہے جب آدمی اپنی خودی کو کائنات، زندگی اور عام انسانوں کے سامنے نذر کر دے لیکن ساتھ ہی اپنی خودی سے مایوس اور بیزار بھی نہ ہو — یہ رائے کوئی قنوطیت پسند اور یاس پرست آدمی نہیں دے سکتا۔“

اپنی خودی کو کائنات، زندگی اور عام انسانوں کے سامنے نذر کر دینے سے کیا مراد ہے۔ ہمارے خیال میں اس کا مطلب یہ تو ہرگز نہیں ہے کہ انسان اپنی فردیت کو خیرباد کہہ دے بلکہ اس کے برعکس اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اُسے اپنی فردیت کی صحیح تفہیم ہو۔ اور وہ اپنی فردیت کو زندگی، کائنات اور عام انسانوں کی بڑی اِکائی سے ہم رشتہ اور ہم آہنگ کر کے اپنی صلاحیتوں اور امکانات کا شعور حاصل کرے ۔ یہ شعور ہی اُسے بتاتا ہے کہ معاشرہ انسانوں کے باہمی عمل کی پیداوار ہے اور یہ باہمی عمل مخصوص زمانہ، مخصوص حالات اور مخصوص جغرافیائی حدود میں مخصوص سماجی و معاشی تنظیم کو جنم دیتا ہے ۔یہ تنظیم معاشرہ ہے ۔ معاشرہ جس کا بیج خود فرد کے اندر موجود ہے۔ اپنے ہی عمل کو اپنا غیر یا اپنا حریف سمجھنا دراصل خود اپنی حقیقت سے بے خبری کے مترادف ہے ۔

احمد ہمدانی

جمالیات اور معاشرہ

جمالیات اور تحقیق کا رشتہ ماں جائی بہنوں کا رشتہ ہے اور کیونکہ ان دونوں کے ظہور و ارتقاء کا مدار کسی معاشرہ پر ہوتا ہے چنانچہ معاشرہ کی حیثیت ماں جیسی ہے لیکن جب ہم ان رشتوں کو بھلا دیتے ہیں تو پھر نہ ختم ہونے والی دشوار[یوں] کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور جمالیات پر گفتگو کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہو جاتا ہے۔ ہر طرف سے بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دینے لگتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ حسن اشیا میں ہوتا ہے۔ اور اشیا کا وجود انسان اور اس کے ذہن سے آزاد ہے۔ اس کے برعکس دوسری طرف سے آواز آتی ہے کہ حسن اشیاء میں نہیں بلکہ انسان کے ذہن میں ہوتا ہے۔ ان دونوں سے بالکل الگ کوئی یہ کہتا ہوا سنا جاتا ہے کہ حسن نہ تو اشیاء میں ہے اور نہ انسانی ذہن میں بلکہ اس کا تعلق انسان کے احساس اور اس کی اعصابی فعلیت ______ سے ہے کچھ لوگ آپ کو بتائیں گے کہ حسن کا احساس انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ العرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس اس موضوع کی تفہیم کے لئے ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہم ہر آواز پر کان دھریں اور دیکھیں کون سی بات کس حد تک قابلِ قبول ہے تو آیئے گفتگو کا آغاز ڈارون سے کریں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ جمالیات کا حیاتیا دبستان اس سلسلے میں ہمیں کیا بتاتا ہے۔

ڈارون کا خیال ہے کہ جمالیات صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ بہت سے کمتر درجہ کے جانور بھی رنگوں اور آوازوں سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس نے چڑیوں کی مثال دی ہے اور بتایا ہے کہ بہت سی چڑیوں کو تیز رنگ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ علاوہ ازیں چڑیاں چڑوں کے حسن کو بھی محسوس کرتی ہیں اپنی تاریخ کتاب آغاز انواع میں (ORIGEON OF THE SPECICS) ڈارون نے بڑی وضاحت سے یہ بات بتلانے کی کوشش [کی] ہے کہ حسین اشیاء کا وجود سراسر فطرت کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے وجود سے ہزاروں سال پہلے فطرت میں حسین اشیاء موجود تھیں۔ اس کے نزدیک حسین اشیاء کا وجود انسان کی طمانیت اور انبساط

ے لئے نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ان کے وجود کے مقاصد حیاتیاتی ہیں۔ اس ضمن میں اس نے پھولوں کی مثال
دی ہے اور بتایا ہے کہ پھولوں کا حسن کچھ کیڑوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے جن کی مدد سے پھولوں کی پیداوار کا سلسلہ جاری رہتا
ہے۔ یوں بھی خوبصورت اشیاء جو انسانی وجود سے پہلے موجود تھیں اب بھی موجود ہیں یعنی خوبصورت اشیاء کا وجود انسانی
وجود سے مقدم ہے اور کسی طرح بھی انسان کا محتاج نہیں۔

ڈارون کے خیالات تمام عینیت پسند اور موضوعی تصورات جمال کی نفی کرتے ہیں اور حسن کو خالص معروضی، حیاتیاتی اور سراسر
فطرت سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ لیکن ڈارون کی بعد کی سائنسی معلومات نے اس نظریہ کی مکمل نفی کر دی۔ اور بتایا کہ ڈارون کا
یہ خیال درست نہیں ہے کہ کمتر درجہ کے جانور میں بھی حسن کا احساس بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ انسانوں کا احساس جمال ڈارون
نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں چڑیوں کی مثال دی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عہدِ قدیم میں انسانوں کے بھونڈے
زیورات وغیرہ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ انسانوں کا احساسِ جمال جانوروں سے زیادہ نہیں ہے۔
اول تو اس کا یہ نظریہ خود اس کے پیش کردہ نظریہ ارتقاء سے متصادم ہے۔ کیونکہ خود اس کے نظریئے کے
مطابق انسان دوسرے جانوروں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ نوع ہے۔

چنانچہ اپنے احساس میں کم ترقی یافتہ انواع کے مساوی یا ان سے کمتر کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈارون کے تجزیہ میں
یہ نقص اس لئے پیدا ہوا کہ اس نے .... احساسِ جمال کو انسان کی تخلیقی قوتوں اور معاشرتی کوائف سے
الگ رکھ کر دیکھا اور اس طرح احساسِ جمال کو سراسر وابستہ فطرت کر دیا۔ اور جانوروں کے حیاتیاتی عمل کو انکے
احساس جمال کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس نے اپنے تجزیہ میں یہ بات بالکل فراموش کر دی کہ جمالیات کا تعلق حسن سے
کہیں زیادہ حسن کاری سے ہے۔ اور حسن کاری کا شرف صرف انسان کو حاصل ہے اور یہ بات اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے
جب انسانی حیثیت کے سفرِ ارتقاء کا مطالعہ انسانی تاریخ کے آئینہ میں کیا جائے۔ اور یہ دیکھا جائے کہ عہدِ قدیم کے بھونڈے
زیورات آج کے نازک اور دلکش زیورات میں کیسے تبدیل ہو گئے۔ اور ان زیورات کی اس تبدیلی کے پس پشت انسانی احساس کن
ارتقائی منزلوں سے گزر کر وہاں پہنچا جہاں آج کے نازک اور دلکش زیورات کی تخلیق ممکن ہو سکی۔ جبکہ چڑیوں کا جو چلن
عہدِ قدیم میں تھا آج بھی ویسا ہی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چڑیوں کا رنگوں اور آوازوں سے متاثر ہونا خالص
حیاتیاتی عمل ہے جسے احساس جمال کہنا درست نہیں۔ جبکہ انسانوں کا احساس ماحول کے ساتھ تبدیل ہوتا ہے۔
اور اس تبدیلی کے ساتھ حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ شاعری، موسیقی، مصوری، بت تراشی اور فنِ تعمیر وغیرہ کا ارتقاء
انسان کی تخلیقی صلاحیتوں اور اس کے احساس جمال کا آئینہ دار ہے۔

ڈارون کے حیاتیاتی نظریہ جمال کے متضاد عینیت پرستوں کا دبستان ہے اس دبستان کے اہم ترین مفکروں میں
کانٹ کا نام بہت نمایاں ہے اس کا خیال ہے کہ احساسِ جمال ہمارے خیال کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ کوئی حسن ہمارے
خیال سے آزاد اپنا وجود نہیں رکھتا۔ کانٹ کے خیال میں کسی ایسی حسین شے کا کوئی وجود نہیں ہے جو ہمیں مسرت کا انبساط
فراہم کر سکے۔ اس کے نزدیک جو کچھ ہے وہ ذہنِ انسانی میں ہے۔ مختصراً اس کے تصور کے مطابق کسی چیز کا حسن صرف
ہمارے جمالیاتی خیال کا عطیہ ہے لیکن تعجب ہے کہ اس دوٹوک فیصلے کے باوجود وہ بحث کو جاری رکھتے ہوئے آگے چل

کر یہ بھی کہنا ہے کہ احساسِ جمال ہمارے خیال میں شامل نہیں بلکہ جب ہم کسی حسین شے کو دیکھتے ہیں تو ہم یا تو اپنے خیال میں اضافہ کرتے ہیں یا پھر وہ خوبصورت شے خیال سے منسلک ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کانٹ نے خود اپنے مجرد یا مطلق خیال کی نفی کر کے کسی حسین شے کے وجود کو تسلیم کر لیا۔ اور یہ بھی مان لیا کہ بغیر کسی حسین شے کے مجرد خیال میں جمالیاتی عنصر ممکن نہیں اپنے آخری تجزیہ میں کانٹ بھی ڈارون کی طرح اپنے نظریہ کے تصادم میں کھڑا نظر آتا ہے اور اس کا سبب بھی یہی ہے کہ اس نے بھی جمالیات کا مطالعہ معاشرہ سے الگ رہ کر کیا ہے اور حسن اور حسن کاری کے فرق کو پوری طرح پیش نظر نہیں رکھا۔ کچھ اسی طرح کی صورت اس نظریہ کی بھی ہے۔ جہاں حسن کو نہ سراسر معروضی بتایا جاتا ہے اور نہ سراسر موضوعی یعنی نہ یہ اشیاء و مناظر تک محدود ہے۔ اور نہ صرف ذہنِ انسانی کی پیداوار ہے بلکہ شے اور ذہن انسانی کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہے لیکن جب ہم حسن کاری کے عملی مظاہر یعنی فنونِ لطیفہ کے مسلسل ارتقاء پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے کیونکہ حسن اگر کسی شے اور فرد کے عمل اور ردِ عمل کی پیداوار ہوتا تو مظاہر حسن بالخصوص شعر و ادب اور موسیقی و مصوری وغیرہ میں مسلسل ارتقاء کا عمل جاری نہیں رہتا کسی شے کسی منظر یا کسی واقعہ سے متاثر ہو کر کوئی ایک شعر لکھ دینا یا کوئی ایک تصویر بنا دینا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی ہوتا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمام فنون بدلتے ہوئے معاشرتی حالات کے ساتھ مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں۔ اور آخر میں یہ دعویٰ کہ احساسِ حسن انسان کی جبلت میں شامل ہے۔ سرسری نظر ہی میں باطل ٹھہر جاتا ہے کیونکہ حسن کا کوئی بھی احساس غیر انسانی ماحول میں ممکن ہی نہیں چنانچہ اگر ہم کسی بچے کو جنگل میں ایسی جگہ چھوڑ دیں جہاں کوئی انسان نہ رہتا ہو اور وہ جانوروں کی طرح پرورش پائے تو اس میں کسی طرح کا احساسِ حسن پیدا نہیں ہو گا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ احساسِ حسن انسان کی جبلت میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ یکسر اکتسابی چیز ہے جو صرف انسانی معاشرہ میں ممکن ہے مختلف قسم کے معاشروں میں مختلف انداز کا احساسِ جمال اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ احساسِ حسن شاملِ جبلت نہیں ہے۔

اب تک کی بحث میں ہم اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ حسن نہ صرف معروضی حقیقت ہے اور نہ صرف ذہنِ انسانی کی پیداوار۔ دوسرے احساسات کی طرح یہ صرف معروض و موضوع کا عمل و ردِ عمل بھی نہیں ہے اور اسے انسان کی جبلت میں شامل حقیقت بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا، تو پھر حسن کیا ہے اور جمالیات کی حقیقت کیا ہے؟ ہم نے بالکل شروع میں عرض کیا تھا کہ تخلیق اور جمالیات کا رشتہ ماں جائی بہنوں کا رشتہ ہے اور اس ضمن میں معاشرہ کی حقیقت ماں جیسی ہے۔ تمام انواع میں صرف نوعِ انسانی ہی ایک ایسی نوع ہے جو تخلیقی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے اور تخلیق کی ایک عام تعریف کے تحت فطرت پر وہ تمام اضافے تخلیق کہلاتے ہیں۔ جو انسان اپنی ذہنی اور جسمانی محنت سے کرتا ہے۔

تاریخ انسانی اس بات کی گواہ ہے کہ انسان ہمیشہ سے یہ اضافے کر رہا ہے اور ان اضافوں کے ساتھ معاشرتی حالات بھی برابر بدل رہے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے دوش بدوش انسان کا طرزِ احساس اور معیارات بھی بدلتے ہیں۔ جمالیات کے معیارات بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ شاید ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں کہ جمالیاتی احساس معروض، موضوع اور معاشرتی حالات کے مثلث میں پیدا ہوتا، اور پروان چڑھتا ہے جس کی

شہادت ہماری شاعری میں آسانی سے مل سکتی ہے۔
ہماری روایتی شاعری پر تصوف کی گہری چھاپ ہے چنانچہ کائنات کی تمام حسین اشیاء حُسنِ مطلق کا مظہر بن کر ہمیں ایک عجیب انداز سے سرشار و بیدار کرتی ہیں۔ اور ان تمام اشیاء و مناظر کا حُسن ان کے وجود سے بلند ہو جاتا ہے مثلاً "اے گل تبو خورسندم تو بوئے کسے داری"، میں گل صرف ایک محرک ہے ورنہ بات دراصل " بوئے کسے داری "، کی ہے۔ گل سے "بوئے کسے داری" تک پہنچنا اور پھر "بوئے کسے داری"، کی رمزیت کو اس قدر وسعت دے دینا کہ اس کے ڈانڈے حُسنِ مطلق سے جا ملیں۔ صرف عمل اور ردِّ عمل کی بات ... نہیں ہے بلکہ اس کے پس پشت وہ اجتماعی سوچ بھی شامل ہے جو شاعر کے رویّے کا تعین کر رہی ہے جس کے تحت وہ کبھی حُسنِ مطلق کی بات کرتا ہے کبھی محبوبِ مجازی تک ہی رہنے پر اکتفا کرتا ہے اور کبھی موت و حیات کے رموز کھولنے لگتا ہے۔ مثلاً

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
یہ سُن کر کلی نے تبسّم کیا
کھلنا کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ان سب اشعار کا حسن صرف اشیاء و مناظر کا حسن نہیں ہے بلکہ اشیاء و مناظر کے حوالے سے کسی اور حقیقت کے اظہار کو حسین بنایا گیا ہے اور حسین بنانے کے اسی عمل کو حُسن کاری کہتے ہیں۔ اور اس حُسن کاری کے پسِ پشت اجتماعی سوچ اور معاشرتی کوائف پوری طرح برسرِ عمل نظر آتے ہیں۔ عہدِ جدید میں جب روایتی فکر اور اخلاقیات کی جگہ نئے سماجی شعور نے لی تو یہی حسین اشیاء و مناظر ہماری شاعری میں ایک نئے انداز سے حُسن بکھیرتے نظر آتے ہیں مثلاً فیض کے یہ اشعار

صبا کی مست خرامی تہہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم
روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم
نصیب صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقص سایہ سرو و چنار کا موسم
صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے
فکرِ دلداری گلزار کروں یا نہ کروں
"ذکر مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں"
یوں بہار آئی ہے امسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں
گویا اس سوچ میں ہے دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جیب کو گلنار کروں یا نہ کروں
پھر لوٹتا ہے خورشید جہاں تاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

یا پھر ہمارے عہد کے دوسرے شعراء کے یہ اشعار

شب بھر گھر گھر ٹھہرا چاند
صبح ہوئی تو کس کا چاند، (جمیل ملک)
اپنی خوشبو کیلئے تڑپے گا موسم کا گلاب
ہنستا چاہے گا مگر اسکو رلایا جائے گا (افضل منہاس)

لوگ یہ سمجھے صبا پیغام اس کا لائی ہے ہو کے جب خوشبوئے گل بے پیرہن رونے لگی (نسیم سحر)

اب کیسے عشرتِ پرویز میسر ہے یہاں چلتے سورج کو بھی فرہاد کا تیشہ کہیئے، (احمد ظفر)

یہ پیڑ ہے کچھ دن وہ شجر ہے کوئی دن اور اب چھاؤں سرِ راہ گزر ہے کوئی دن اور (رضی اختر شوق)

جو ابر جھوم کے اٹھا ہے جم کے برسے گا بھری بھری سی کسی شاخ کا اشارہ ہے (رئیس فروغ)

اوپر بادل نیچے پربت بیچ میں خواب غزالوں کا آنکھیں ہیں تو دیکھ بھی آؤ نگر عجیب ہے جاناں کا (رئیس فروغ)

کبھی تم لہر، کبھی روشنی، کبھی دستک عجیب سایہ سا اک میرے گھر میں رہتا ہے

برکھا رت کی لاج رکھوں گوری کا ایمان سہی (رئیس فروغ)

بادل گھرے شام سے ہیں آخر شب طوفان سہی

ابر برسا برس کے کھل بھی گیا رہ گئی پھر زمین پیاسی کیوں (سحر انصاری)

صبا نے فاش کیا رمز بوئے گیسوئے دوست یہ جرم اہل تمنا کے سر نہیں آیا (سحر انصاری)

نیم شب میں صبح کے آثار کا میں ہوں اسیر ٹوٹتے تاروں سے لیکن بے خبر کیسے رہوں (سحر انصاری)

یہ اور ایسے بہت سے اشعار آپ کو عہد معاصر کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں ملیں گے جن سے عہد حاضر کے سماجی شعور اور اسی سے پھوٹتے ہوئے غم حیات کی جھلکیوں کو دیکھ کر یہ اندازہ کر لینا کچھ دشوار نہیں کہ حسن کاری میں معاملات کوائف اور انسان کی تخلیقی صلاحیت کس طرح بروئے کار آتی ہیں۔ چنانچہ ہماری ایسی تمام تر کوششیں جمالیات کو موضوع معروض اور معاشرتی حالات سے منقطع کر کے دیکھتی ہیں۔ دراصل ایک نہ ختم ہونے والے انتشار کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔

احمد ہمدانی

جدیدیت، خوف زدگی کی علامت

تازگی خاصۂ حیات ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی شان کے ساتھ ظہور کرتا ہے اور گزشتہ لمحے سے مختلف ہوتا ہے۔ لمحات کے اس مسلسل تغیر کے ساتھ انسان بھی متواتر ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کے مراحل سے گذرتا ہے۔ لمحوں اور انسانوں میں مشترک تبدیلیاں کا عمل تہذیبوں کو جنم دیتا ہے۔ گویا ہر لمحہ جدید سے جدید تر ہونا زندگی کا بھی تقاضہ ہے اور فطرتِ انسانی کا بھی۔ سو ہمیں ادب میں جدیدیت سے کوئی شکایت نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے یہاں ادب میں جدیدیت کی تحریک کسی فطری عمل کا نتیجہ ہے یا کسی ردِ عمل کی پیداوار ہے۔ ہم اس سلسلے میں اپنا کوئی فیصلہ صادر کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ان دو طرح کے رویوں کا فرق کا اپنے طور پر واضح کر دیں اور فیصلہ خود قارئین کی صوابدید پر چھوڑ دیں۔

ہمارے یہاں جدیدیت کا رجحان ہماری زندگی میں بنیادی تبدیلیوں کا مرہونِ منت ہے۔ ان تبدیلیوں کی نشان دہی سب سے پہلے شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد محسوس طور پر ان کو تحریک بنا دینے کا کام سر سید اور ان کے ساتھیوں نے انجام دیا درمیان میں غالب کا نام بھی آتا ہے جس نے تخلیقی سطح پر جدید کو اپنے احساس کا حصّہ بنایا۔ یہاں تک جو کچھ ہوا وہ ایک فطری عمل تھا لیکن جب فطری عمل نے تحریک کی صورت اختیار کی تو عمل کے ساتھ ردِ عمل کی لہریں بھی حرکت میں آئیں۔ ایک طرف ماضی سے چمٹنے اور روایت کے زنداں میں بند رہنے کا نعرہ اور دوسری طرف روایت کو یکسر مسترد کر دینے کا تہیہ۔ یہ دونوں صورتیں خوف کی پیداوار ہیں۔ انتہائی روایت پرست جدیدیت سے خوفزدہ ہیں اور حد درجہ جدیدیت پرست روایت سے سہمے ہوئے ہیں۔ یوں تو خوفزدگی کا یہ عمل تمام دنیا میں مشترک ہے لیکن ہمارا مسئلہ صرف پاکستانی ادب تک محدود ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے یہاں کیا صورت حال ہے۔

تبدیلیوں کے فطری عمل سے قطع نظر خوفزدگی کی روایت کا قصّہ کچھ یوں ہے کہ عسکری صاحب نے جدید مغربی ادب کے مسائل کو مسلسل طور پر کچھ اس طرح چھیڑا کہ نیم پختہ ذہن غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ ادب صرف وہ ہے جو مغرب میں لکھا جا رہا ہے۔ ان کی اس کم فہمی نے رفتہ رفتہ انھیں اپنی روایت سے نہ صرف منحرف کر دیا بلکہ وہ اس سے اپنا رشتہ برقرار رکھنے پر کچھ شرمندگی اور ندامت محسوس کرنے لگے۔ شرمندگی اور ندامت کا یہ منفی احساس اردو ادب میں خوفزدگی سے پیدا ہونے والے ادیب کی اساس ہے۔ اس کا اندازہ ایک بہت جدیدیت پرست ادیب کے رویوں سے کر

لوگ یہ سمجھے صبا پیغام اس کا لائی ہے — ہو کے جب خوشبوئے گل بے پیرہن رونے لگی (نسیم سحر)
اب کیسے عشرت پرویز میسر ہے یہاں — چلتے سورج کو بھی فرہاد کا تیشہ کہیے (احمد ظفر)
یہ پیڑ ہے کچھ دن وہ شجر ہے کوئی دن اور — اب چھاؤں سر راہ گزر ہے کوئی دن اور (رضی اختر شوق)
جو ابر جھوم کے اٹھا ہے جم کے برسے گا — بھری بھری سی کسی شاخ کا اشارہ ہے (رئیس فروغ)
اوپر بادل نیچے پربت بیچ میں خواب غزالوں کا — آنکھیں ہیں تو دیکھ بھی آؤ نگر عجیب ہے جاناں کا (رئیس فروغ)
کبھی ہوا ہے، کبھی روشنی، کبھی دستک — عجیب سایہ سا اک میرے گھر میں رہتا ہے
برکھا رت کی لاج رکھوں — گوری کا ایمان سہی (رئیس فروغ)
بادل گھرے شام سے جیسے — آخر شب طوفان سہی
ابر برسا برس کے کھل بھی گیا — رہ گئی پھر زمیں پیاسی کیوں (سحر انصاری)
صبا نے فاش کیا رمز بوئے گیسوئے دوست — یہ جرم اہل تمنا کے سر نہیں آیا (سحر انصاری)
نیم شب میں صبح کے آثار کا میں ہوں اسیر — ٹوٹتے تاروں سے لیکن بے خبر کیسے رہوں (سحر انصاری)

یہ اور ایسے بہت سے اشعار آپ کو عہد معاصر کے تقریباً ہر شاعر کے یہاں ملیں گے جن سے عہد حاضر کے سماجی شعور اور اسی سے پھوٹتے ہوئے عمِ حیات کی جھلکیوں کو دیکھ کر یہ اندازہ کر لینا کچھ دشوار نہیں کہ حسن کاری میں معاشی کوائف اور انسان کی تخلیقی صلاحیت کس طرح بروئے کار آتی ہیں۔ چنانچہ ہماری ایسی تمام کوششیں جمالیات کو موضوع معروض اور معاشرتی حالات سے منقطع کر کے دیکھتی ہیں۔ دراصل ایک نہ ختم ہونے والے انتشار کا دروازہ کھول دیتی ہیں۔

احمد ہمدانی

جدیدیت، خوف زدگی کی علامت

تازگی خاصۂ حیات ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی شان کے ساتھ ظہور کرتا ہے اور گذشتہ لمحے سے مختلف ہوتا ہے۔ لمحات کے اس مسلسل تغیر کے ساتھ انسان بھی متواتر ذہنی اور جسمانی تبدیلیوں کے مراحل سے گذرتا ہے۔ لمحوں اور انسانوں میں مشترک تبدیلیاں کا عمل تہذیبوں کو جنم دیتا ہے۔ گویا ہر لمحہ جدید سے جدید تر ہونا زندگی کا بھی تقاضہ ہے اور فطرتِ انسانی کا بھی۔ سو ہمیں ادب میں جدیدیت سے کوئی شکایت نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے یہاں ادب میں جدیدیت کی تحریک کسی فطری عمل کا نتیجہ ہے یا کسی ردِ عمل کی پیداوار ہے۔ ہم اس سلسلے میں اپنا کوئی فیصلہ صادر کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ان دو طرح کے رویوں کا فرق کالیے طور پر واضح کر دیں اور فیصلہ خود قارئین کی صوابدید پر چھوڑ دیں۔

ہمارے یہاں جدیدیت کا رجحان ہماری زندگی میں بنیادی تبدیلیوں کا مرہونِ منت ہے۔ ان تبدیلیوں کی نشان دہی سب سے پہلے شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد محسوس طور پر ان کو تحریک بنا دینے کا کام سرسید اور ان کے ساتھیوں نے انجام دیا درمیان میں غالب کا نام بھی آتا ہے جس نے تخلیقی سطح پر جدید کو اپنے احساس کا حصّہ بنایا۔ یہاں تک جو کچھ ہوا وہ ایک فطری عمل تھا لیکن جب فطری عمل نے تحریک کی صورت اختیار کی تو عمل کے ساتھ ردِ عمل کی لہریں بھی حرکت میں آئیں۔ ایک طرف ماضی سے چمٹنے اور روایت کے زنداں میں بند رہنے کا نعرہ اور دوسری طرف روایت کو یکسر مسترد کر دینے کا تہیہ۔ یہ دونوں صورتیں خوف کی پیداوار ہیں۔ انتہائی روایت پرست، جدید سے خوفزدہ ہیں اور حد درجہ جدیدیت پرست روایت سے سہمے ہوئے ہیں۔ یوں تو خوفزدگی کا یہ عمل تمام دنیا میں مشترک ہے لیکن ہمارا مسئلہ صرف پاکستانی ادب تک محدود ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے یہاں کیا صورت حال ہے۔

تبدیلیوں کے فطری عمل سے قطع نظر خوفزدگی کی روایت کا قصّہ کچھ یوں ہے کہ عسکری صاحب نے جدید مغربی ادب کے مسائل کو مسلسل طور پر کچھ اس طرح چھیڑا کہ نیم پختہ ذہن غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ ادب صرف وہ ہے جو مغرب میں لکھا جا رہا ہے۔ ان کی اس کم فہمی نے رفتہ رفتہ انھیں اپنی روایت سے نہ صرف منحرف کر دیا بلکہ وہ اس سے اپنا رشتہ برقرار رکھنے پر کچھ شرمندگی اور ندامت محسوس کرنے لگے۔ شرمندگی اور ندامت کا یہ منفی احساس اردو ادب میں خوفزدگی سے پیدا ہونے والے ادیب کی اساس ہے۔ اس کا اندازہ ایک بہت جدیدیت پرست ادیب کے رویوں سے کر

سکتے ہیں۔ مثلاً ایک بہت اچھی شاعرہ نے ایک مرتبہ کہا کہ میں لفظوں کے ان مناسبات سے شعوری طور پر آزاد رہنے کی کوشش کرتی ہوں جو ہماری روایتی شاعری میں خوبی تصور ہوتے تھے یعنی اگر چمن کا لفظ آتا ہے تو اسکے متعلقات کو استعمال کرنا — شعوری طور پر کسی چیز سے دامن بچانا دراصل کسی پوشیدہ خوف کی علامت ہے۔ یہ پوشیدہ خوف افتخار جالب، جیلانی کامران، انیس ناگی اور اسی طرح کے بیشتر شعراء میں بڑی آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ شاعری سے قطع نظر جدید افسانوں میں بھی خوفزدگی کے مہیب سائے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ عجیب بات ہے مگر جب عسکری صاحب نے جدید ادیبوں کے اس رویہ کو دیکھ کر روایت کی اہمیت پر زور دیا تو یہی لوگ ان کو برا بھلا کہنے لگے — اسی طرح روایت پرستوں کا حال ہے — وہ جدید سے خوفزدہ ہیں اور لکیر کو سانپ سمجھ کر پیٹ رہے ہیں۔

اس طویل بحث سے قطع نظر شاید اس بات پر سب اتفاق کریں گے کہ باطنی دباؤ سے جدیدیت کی راہ نکالنا فطری عمل ہے اور کسی خوف کے تحت جدید بننے پر زور دینا ردِ عمل ہے جو منفی رویہ سے پیدا ہوتا ہے — ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ادب میں جدیدیت کے نام سے پیدا ہونے والا بیشتر ادب صرف خوفزدگی کی علامت ہے کیا ایسا نہیں ہے؟

احمد ہمدانی

دل نہ اتنا کبھی دُکھا ہوگا
وقت اب کتنا رات کا ہوگا

دُکھ کی چھاؤں میں ہم جیئے کیسے
وہ بھلا کب یہ سوچتا ہوگا

رنج کی ہے زبان اپنی ہی
کون ہم کو سمجھ سکا ہوگا

وہ جو بچھڑا تو یہ خبر کب تھی
عمر بھر کا یہ سانحہ ہوگا

ہانپ کر چلتے چلتے کہتے ہیں
کتنا اُس گھر کا فاصلہ ہوگا

گرد کہتی ہے چاہتوں کی وہ
ہم کو کب کا بھلا چکا ہوگا

آنکھیں بھی دشت ہیں دل بھی دُکھا ہُوا
گزرا تھا آج وہ بھی ہمیں دیکھتا ہُوا

پوچھو تو اس کو ہم سے شکایت تو کچھ نہیں
دیکھو تو کوئی جاتا ہے ہم سے مُڑا ہُوا

تری محبتوں پہ تو شک کبھی نہ تھا مگر
دیکھا تھا بےنم خواب میں اک گھر جلا ہُوا

اِک عمر کے گلے جو تھے ان سے بُھلا دیئے
مُدّت کے بعد خُود سے جواب سامنا ہُوا

کیا کیا حَسین خواب دکھائے تھے دل نے بھی
آتا ہے ان کا دھیان بھی اب کانپتا ہُوا

احمد ہمدانی

وہ مہرباں ہیں بہت پھر بھی ہم یہ کہتے ہیں
تماشے آنکھوں نے ایسے بہت سے دیکھے ہیں

یہ وصل و ہجر کے موسم یہ دھوپ چھاؤں مگر
یہ لمحہ لمحہ بدلتے زمانے کس کے ہیں

تری گلی کے وہ پھیرے تو بے سبب تھے مگر
اکیلی راتوں میں کیوں آ کے ہم کو ڈستے ہیں

یہ زندگی ہے یہاں رنج سے بھی کیا حاصل
ہمیں تو دیکھو کہ ہم زخم زخم ہنستے ہیں

دلوں سے محو تو کب کے ہوئے حسیں منظر
مگر وہ لوگ جو بیٹھے خلا کو تکتے ہیں

کسی کے دھیان میں بے کل رہے تو اتنا ہوا
کہ تارے ٹوٹ کے اب کہکشاں سے آتے ہیں

تجھے شوق کب سفر کا
مجھے دکھ نگر نگر کا

یہ دھواں دھواں سا عالم
کسی رنجِ بے اثر کا

مجھے رنج کیوں ہے اتنا
کسی نخلِ بے ثمر کا

مرا دکھ مرا یہ ساتھی
ترے در نہ اپنے گھر کا

مرا غم بھی سو گیا کیا
دیا بجھ گیا ہے گھر کا

نہ تو کام دل ہی آیا
نہ کرشمہ اس نظر کا

نہ رہا کبھی تو رہے گا
مرا درد عمر بھر کا

سحر صدیقی

ایک نئی سمت کے سفر کا عذاب

پھر ہم دونوں میں سے ایک آگے بڑھا اور اس نے کشتی کا بادبان کھول دیا۔ اس وقت گہرا آسمان کسی نیلم آنکھ کی طرح ڈبڈبا رہا تھا ہوا میں ایک عجیب سی خوشبو رچی ہوئی تھی اور اس کا زہریلا زہریلا سا اثر نتھنوں کے راستے حلق میں اتر کر اب جمنا شروع ہو گیا تھا۔ ساحل کے بارے میں ہم صرف اندازہ کر سکتے تھے اور اندازہ بھی ایسا کہ جس میں سمت کا شمار نہیں تھا ــــ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی سمت میں تھے ــ آمنے سامنے کی سمت ــــ کیونکہ دائیں بائیں اور اوپر نیچے کی سمتیں تو ہم نے خود گنوا دی تھیں۔

اس نے بادبان کھول کر اس سے کھیلنا شروع کر دیا جیسے وقت ضائع کرنے کے لئے کوئی بہانہ اور جواز تلاش کر رہا ہو۔ حالانکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "مجھے اپنی زندگی کا سب سے عجیب سفر سناؤ"

"تم کیا کرو گے سن کر؟"

"کروں گا تو کچھ نہیں۔"

"پھر ــــ؟"

"پھر ــــ پھر بس کچھ نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے نیند آ رہی ہے۔ میری آنکھوں میں سورج نے گھونسلہ بنا لیا ہے جہاں روشنی کے انڈے کچھ دیر میں پھوٹ پڑیں گے۔ اور میری پلکوں پہ ــــ!! اُف تو بہ میں کیا کروں وہ برانڈی کی بوتل ــ؟"

وہ برانڈی کی بوتل ــــ؟

میں نے اس کو یاد دلایا: برانڈی تو اب نہیں مل سکتی۔ تم نے خود ہی اس کی خالی بوتل کو اپنی آنکھوں اور گالوں پر رگڑ رگڑ کر پونچھ کر سمندر میں یہ کہکر گرا دیا تھا: لے سمندر اپنی پیاس بجھا لے ــ"

اس نے میری بات سنکر بگڑ کر کہا "اگر یہ بات ہے تو پھر تم سگریٹ نہیں پی سکو گے اور نہ میں تمہیں کوئی گیت گنگنانے دوں گا ــــــ میں تم پر آرام کی ساری صورتیں ــــ بد شکل کر دوں گا۔"

وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے جسم پر پسینہ چمک رہا تھا اور قمیض بدن پر جگہ جگہ سے چپکی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنے کاندھے پر اچانک دانت کاٹ لیا اور جھنجھلا کر جیب میں ہاتھ ڈالا، ہاتھ باہر نکلا تو وہ انگلیوں میں ایک ... رہا

اس نے یہ سکّہ میری طرف اچھال دیا۔ جب میں نے اس کو ہاتھوں میں پکڑا تو وہ سکّہ نہیں تھا ــــ دراصل سرخ کلغی والا گولڈن سانپ تھا فضا میں ہلکے گلابی رنگ کے پرندے اڑتے ہوئے نظر آئے ــــ یہ تعداد میں زیادہ سے زیادہ نو یا دس ہونگے شاید مجھے خوش ہونا چاہئے تھا لہٰذا میں خوش ہوگیا۔ میں خوش یوں بھی ہوا کہ اب خشکی نزدیک آرہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آبادی، بندرگاہ یا کسی شہر کے نشان واضح ہونا شروع ہوجائیں گے۔ پھر ساحل نظر آجائے گا۔ وہ ساحل ؟ جس پر ہم اتریں گے۔ میں نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا تو میرے سارے حواس جیسے چیخ بنکر میرے اندر سے نکل گئے۔

میرے پاؤں گوشت پوست کی بجائے ریت کے بنے ہوئے لگ رہے تھے۔ میں نے خوف اور دہشت کے مارے ان کو آہستہ سے چھوا تو میرے دائیں پاؤں کا انگوٹھا بھر بھرا کر جھڑ گیا۔ میں تاسف اور ملال کے مارے اس کے ذرات بھی جی بھر کر نہ دیکھ سکا۔

میں رونا چاہتا تھا۔ مگر میں ہنس پڑا ــــ!

میرے کانوں میں جنگلی اور وحشی قبائل کے ڈھول بجنے لگے۔ میرے بدن کے سارے بال تن کر الف ہوگئے۔ میں نے سوچا میں اسے جگا دوں، میں نے دیکھا۔ وہ میرے سامنے تختے پر یوں لیٹا ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں خود بخود مڑ کر اس کے پیٹ سے جا لگی تھیں ــ جیسے وہ روح کا منتظر ہو اور کچھ دنوں کے بعد ناف کٹوا کر زندوں میں شامل ہوجائے۔

میرے ہونٹوں سے اس کا نام ادا ہوا۔

اس وقت آسمان پر سورج غروب ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی یہ تیاری حسبِ معمول تھی مگر اس بار مجھے اس میں نہ جانے کیوں تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ مثلاً دھوپ جب سمندر کی لہروں پر پڑتی تھی تو اس میں اندر تک اتر جاتی تھی حتیٰ کہ میں کئی کئی فٹ نیچے کی مچھلیوں کو انڈے دینے کی کوشش میں تکلیف میں مبتلا دیکھ سکتا تھا۔ کئی مگرمچھ خودرو پودوں میں لیٹے آرام کر رہے تھے۔ ایک بار تو مجھے سبز رنگ کے ایک پتھر کو چاٹتی ہوئی ایک جل پری نظر آئی۔

میں نے ہاتھ پانی میں ڈالا تو وہ پانی نہیں شیشہ تھا۔

ہائے، ہائے ــــ ہم پانی کی بجائے، شیشے کے اندر، بہتے ہوئے شیشے کے اندر سفر کر رہے تھے۔ یہ شیشہ کا سمندر ہے مگر ہم تو پانی میں تھے۔ پانی کدھر گیا ؟ یہ شیشے میں کیسے تبدیل ہوگیا ؟

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ جاگ رہا تھا اور میں سو رہا ہوں۔ اس نے بڑی آہستگی، بڑی چالاکی اور کسی قدر استادی کے ساتھ میرے بوٹ پہن لئے۔ میں سہما ہوا تھا کہ اگر اس نے میرے پیروں کو چھو لیا تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپاہج ہو کر اس کا محتاج ہوجاؤں گا ــ اب تو وہ میرا محتاج ہے۔ میرے بوٹوں کا محتاج ــ!

وہ بوٹ پہن کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیسے اب اس پر سے کبھی نہیں اٹھے گا۔ اس نے جیب سے سگریٹ اور لائیٹر نکالا۔ لائیٹر سے شعلہ برآمد ہوا تو اس نے سگریٹ جیب میں رکھ لیا اور شعلہ کو دیکھنے لگا۔ شعلہ ہوا میں ہاتھ سا ہلاتا رہا جیسے روشنی کو رخصت کر رہا ہو پھر اس نے آہستہ آہستہ شعلہ کو رسی سے ملا دیا۔ جو بادبان سے ملی ہوئی تھی۔ رسی اور شعلہ دونوں مل کر جلنا شروع ہوگئے۔

اس نے لائیٹر جیب میں رکھ لیا اور میلے ناخنوں کو دانتوں سے کاٹنے لگا۔ اس کے بالوں میں زرد رنگ کی مٹی کی ایک تہہ سی جمی ہوئی تھی۔ اس کے دانتوں پر بھی اسی رنگ کا اثر تھا۔ البتہ آنکھوں میں وحشت مری لگتی تھی۔ شاید اس لئے کہ آنکھوں میں نیند سو گئی تھی۔ وہ اپنے بالوں میں ایک ہاتھ کی انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اور اس کے پیروں پر سر سے گرنے والی زرد مٹی کا ڈھیر سا ابھر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا

.اگر اس نے اپنے ہاتھ نہ روکے تو اس کا سر تھوڑی دیر میں ـــ میرے پاؤں کے انگوٹھے کی طرح بھُر بھُرا کر نیچے آ رہے گا۔
یں نے سوچا: روکوں یا نہ روکوں ـــ!
جب تک میں کوئی فیصلہ کرتا؟ اس کا سر آنکھوں پر جھڑ چکا تھا۔

ہم دونوں ایکدوسرے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ اس کو اپنے سر کے جھڑ جانے کا فکر تھا اور مجھے اپنے پاؤں کے باقی رہ جانے ی خوشی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے خستہ سر اور چہرے کے ساتھ وہ نہیں رہ سکے گا، اور میں بھی جانتا تھا کہ ریتیلے پاؤں اور ٹانگیں ـ میرے سفر میں میری رفیق نہ ہو سکیں گی۔ اس کے باوجود ہم خوش تھے۔ اور نئے سفر کی باتیں کر رہے تھے۔ خوشی خوشی میں ہم نے کشتی کے ایک کمزور چوبی پہلو کو بجانا شروع کر دیا اور گانے بھی لگے۔
اچانک لہروں نے کشتی سے 6×1 فٹ کی تختی کو طلاق دلوادی۔ چنانچہ وہ علیحدہ ہوگئی۔ اس تختی پر ہمارے ہاتھوں کی دھمک اور ٹھمک ابھی تک موجود تھی۔ ہمارے ہونٹوں پر راگ اور بول دونوں دھرے کے دھرے رہ گئے۔ پانی کو تیزی سے کشتی کے اندر آنا چاہئیے تھا مگر کچھ بھی تو نہیں ہو رہا تھا۔
تھوڑی دیر کے بعد جب ہم پانی کے خوف سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ تیزی سے مڑا اور میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میری رضا کے بغیر اس نے مجھے بھی اٹھا کر کھڑا کر لیا تھا۔ اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر ایک ہیبت ناک چیخ مار کر مجھ سے لپٹ گیا۔
بادبان کے شعلوں نے آگ بنکر آسمان کی ایئر ٹائیٹڈ گلاس شیٹ (Air tied glass sheet) کو توڑ دیا تھا۔ اور اب وہ کرچی کرچی ہو کر ہم پر گرنے ہی والی تھی۔
ہم ایک دوسرے سے پیوست ہوئے کھڑے تھے۔
وہ اپنے دھڑ کے اوپر تک سلامت نہیں رہا تھا۔
میں اپنے دھڑ کے نیچے سے پورا نہیں رہا تھا۔

رخشندہ غیاث

وہ

وہ میرا حصہ تھا، یا وہ میں ہی تھی۔ وہ ہمیشہ متوازی چلتا رہتا۔ کبھی وہ کچھ دیر کو نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور میں کوشش کرتی کہ اُسے بھول جاؤں۔ مگر عین اُس وقت جب میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں گرم لحاف میں پرسکون لیٹے لیٹے کوئی دلچسپ چیز پڑھ رہی ہوتی اور باہر سے یخ ہوائیں ٹھٹھرتی ہوئی کھڑکی کے ساتھ لگی بیل ٹہنیوں سے ٹکراتیں تو وہ آموجود ہوتا۔ یکایک آندھیاں چلتیں، بجلیاں چمکنے لگتیں، زرد دھبے سسکتے، بڑے ہنگامے بپا کرتے اور میں بے چین ہو جاتی۔ خدا جانے اسے مجھے اذیت دے کر کیا حاصل ہوتا ہے۔ پھر وہ پلک جھپکنے میں غائب ہو جاتا۔ اور سدا لہلہاتے ہوئے کھیتوں پر سے۔ ہوتا ہوا گھنے جنگلوں میں کھو جاتا۔ جہاں وہ برسوں مارا مارا پھرتا۔ درخت، ندیاں اور پہاڑ گھومتا ہوا کبھی کبھار کسی بستی میں جا نکلتا۔ اور میں اس کے پیچھے پیچھے اس کی تلاش میں رہتی کہ اس کے بغیر مجھے اپنے ادھورے پن کا احساس شدت سے ہوتا۔ جن جن جگہوں سے وہ ہو کر گیا تھا، میں بھی اس کے نقش قدم دیکھتی ہوئی جا پہنچی اور ہر جگہ مجھ کو اپنا ہی ایک حصہ لگتی۔ یوں جیسے میں مدتوں یہاں رہی ہوں اور بسا اوقات تو میں بغیر دیکھے ہی بتا سکتی کہ اس پہاڑ کی اوٹ میں کیا ہوگا۔ اور پھر وہ سدا کی بے چینی مجھ پر غلبہ پا لیتی تو میں اور آگے نکل جاتی۔ جانے اسے بستی بستی اور نگر نگر پھرنے کا یہ کیا شوق تھا۔

کبھی کبھی وہ بالکل اچانک ہی سامنے آموجود ہوتا۔ جب کبھی کسی محفل میں سکون محسوس کرنے لگتی۔ اور سوچتی کہ اس SET میں میں خوب ADJUST ہو گئی ہوں اور میرے ساتھی قہقہے لگاتے ہوئے کہتے "HOW INTLLIGENT ! YOU CUT SUCH FINE JOKES!" تو وہ دھپ دھپ کرتا میرے سامنے آ کھڑا ہوتا۔ اس کی نگاہوں کا تمسخر اس کی وہ مسکراہٹ! اُدھ خدا میں گھبرا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی اور مجھے سب کچھ اجنبی لگتا۔ چہرے ڈراؤنے اور قہقہے گھناؤنے لگتے ...... میں خود کو تنہا پاتی شدید بے چینی اور میں وہاں سے بھاگ نکلتی۔ اور وہ میرے متوازی چلتا رہتا۔ ایک دفعہ میں نے اسے شاہراہ کے کنارے برگد کے بڑے سارے درخت کے نیچے بیٹھا دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں اس کا زرد چہرہ جھکا ہوا تھا۔ اس کی چہرے کی جھریوں نے مجھے بتایا کہ ہمیں اس کائنات میں پھیلے ہوئے صدیاں بیت گئی ہیں۔ وہ اس قدر تھکا ماندہ تھا کہ میرا دل دکھ گیا۔ میں اسکے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی پلکیں اٹھائیں۔ اُف وہ آنکھیں اس قدر یاس، یوں جیسے سب کچھ لٹ پھوٹ گیا ہو۔ بے نیل و مرام دبے درماں! ..... وہ دکھ میں نے قطرہ قطرہ اپنے اندر سمو لیا۔ وہ منتشر تھا۔ تو میں منتشر تھی۔ وہ اس قدر لاچار تھا سسک رہا تھا کہ دو قدم بھی نہ چل سکتا تھا۔ میں نے ہمت باندھی۔ اور اسے اٹھا کر اپنے کندھوں پر بٹھا لیا۔ وہ دکھ اور اس کا بوجھ ..... وہ میری صلیب ..... اس کے بوجھ تلے میرے کمزور کندھے جھکتے گئے۔ اس کے استخوانی ہاتھوں کی گرفت میرے گلے کے گرد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ بسا اوقات راستے کے نشیب فراز سے جھنجھلا کر وہ میرا گلا دبا دیتا۔ میں کبھی خاموشی سے سسک پڑتی اور کبھی چیخ کر خود کو نوچ ڈالتی۔ یہ کیسا ظلم تھا کہ وہ یوں ستاتا تھا۔ اگر تم اتنی ہی دکھی ہوتی ہو تو مجھے پٹخ ڈالو، ہاں ہاں مجھے پٹخ ڈالو۔ وہ چیختا مگر میں اسے پٹخ نہیں سکتی تھی۔ اپنے ہی ایک حصے کو کیسے کاٹ کر کیسے دور پھینک دیتی۔ میں اس قدر

بہادر نہ تھی۔ لمبے راستے اور کالی راتیں مجھے ڈستے چلے گئے۔ میں تھکن سے چُور چُور تھی مگر سستانا؟ محال تھا۔ وہ بیرِ تسمہ پا مجھے لمحہ بھر کو بھی کہیں ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ میلوں کی اونچائی ابھی باقی تھی۔ مگر ے قدموں میں سکت نہ تھی۔ اس کے بوجھ تلے میری کمر دوہری ہو گئی۔ بال سفید ہو گئے اور آنکھیں دھندلا گئیں۔ سانس لینا بھی دشوار تھا۔ جانے کیسے ہوا کہ ایک پتھر سے ٹکرا کر میں منہ کے بل گر پڑی۔ مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوتی۔ اور تیز تر کارواں میرے اٹھنے کا انتظار کیوں کرتے! وہ میرے اوپر سے گزرتے چلے گئے۔ بھاری بوجھ اور جوتوں کی نوکیلی ایڑیاں مجھے چھلنی کرتی گئیں۔ مگر میں پتھروں میں منہ دیئے پڑی رہی کہ مجھ میں اٹھنے کی خواہش ہی باقی نہ رہی تھی۔ مدتیں گزر گئیں۔ میں بے شمار لوگوں کے لاتعداد زخموں سے پُر تھی کہ پھر تیز آندھیاں چلنے لگیں۔ طوفان آئے۔ اولے برسے۔ بہت برفیں پڑیں۔ میں ان کے نیچے دبتی گئی۔ کارواں نے نئے راستے تلاش کر لئے۔ وہ پرانی گزرگاہیں بھول گئے اور میں منوں برف تلے پڑی رہی۔ پھر موسم بدلے۔ برفیں پگھلیں اور یکایک ایک دن میں نے خود کو پانی کے بیکراں سمندر میں ایک گلیشئر پر کھڑے پایا۔ میں بہے جا رہی تھی اور وہ میرے اندر موجود تھا۔ ..... یہ بہت حیران کن بات تھی۔ وہ جو ہمیشہ متواتر چلتا اور بوجھ بنتا تھا۔ اب میرے اندر تھا۔ اب اس کا تمسخر میری نگاہوں میں تھا اور اس کا طنز میری مسکراہٹ میں تھا۔ میں نے دونوں بازو اپنے سینے پر لپیٹے (اب وہ میرے اندر جو تھا)۔ ... اور اپنے آس پاس ڈوبتے لوگوں کو دیکھا۔ اپنی اپنی صلیب کے بوجھ تلے دبے کراہتے اور سسکتے ہوئے لوگ مجھے اب کسی سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ میں جو ہر دکھ سے بے چین ہو جاتی۔ اب ہر چیز کو حقیر جاننے لگی۔ یہ سب کچھ وقتی تھا۔ محض عارضی! گزرتی تخلیق کے بکھرے بکھرے نقوش۔ ... یہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ اب وہ میرے اندر تھا۔ اور میں ہر چیز سے IMMUNE تھی۔

شہناز پروین

تنہائی کا سرطان

کامن روم سے شور کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بمشکل اُن سے پیچھا چھڑا کر آگے آگے بھاگی جارہی تھی، لیکن کلاس روم کی طرف نہیں۔ یونیورسٹی کیمپس میں اُس لان کی طرف جہاں ہمیشہ کی طرح آج بھی لڑکے اور لڑکیوں کا ایک گروپ مست بیٹھا تھا۔ "ہرّا۔۔۔ لو اپنی سیما بھی آگئی" ایک شور بلند ہوا اور سب ایک ساتھ اسکے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے، "آؤ آؤ جان، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ اب یہ آخری پیکٹ رہ گیا ہے، لو تم بھی دم لگالو۔۔۔" اس نے سگرٹ سلگا لیا اور پھر سب مست ہوکر گانے لگے "دم مارو دم"

دور سے پروفیسر مترا جاتی نظر آئیں "ارے دیکھو۔۔۔ وہ کمبخت مترا جارہی ہے"

"جاتی ہے تو جائے ہماری بلا سے۔۔۔ ہم کون سے اسکے پیچھے جارہے ہیں۔۔۔"

"ارے نہیں ہم تو اس کے آگے جارہے ہیں آگے ہی آگے" سب نے کورس کے انداز میں کہا۔ سگرٹ بجھ کر راکھ ہوچکی تھی۔ ان کی بے معنی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا "ہم جارہے ہیں، آگے کی طرف بھاگ رہے ہیں، لیکن ہماری منزل کہاں ہے؟"

"منزل۔۔۔؟" سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے "منزل کیا ہوتی ہے، کہاں ہو تم چلی آؤ محبت کا تقاضہ ہے۔" وہ کورس گانے لگے، اب وہ نشے میں مست تھے، جب ہوش میں آئے تو خالی خالی سے لگ رہے تھے، اونگھتے ہوئے بھوکے کتّے کی طرح ایک دوسرے پر جملوں سے حملے کرنے لگے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ سب آپس میں گہرے دوست تھے، دوستی کی بنیادی وجہ سگرٹ تھی جو محض منوّر کے پاس ہوتی اور وہ اپنی لمبی سی کار میں سب کو خوب سیریں کراتا۔ سیما ان میں نئی دریافت تھی۔ جب وہ یونیورسٹی میں آئی تھی ہر لڑکے اور لڑکی کی نظریں اُسکی طرف اٹھی ہی رہ گئی تھیں۔ مکمل حسن لیکن اُداس اُداس سی، سیما میں جانے کیا بات تھی کہ جو اُسے دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ پہلے پہل تو اس نے سب سے ملنے سے اجتناب کیا لیکن آہستہ آہستہ وہ بھی ان کی محفلوں کا ایک لازمی جزو بن گئی۔ وہ سب ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے بغیر کسی تعارف کے، اُن کے گروہ میں جو بھی آکر شامل ہوتا آہستہ آہستہ اسی کا ہوکر رہ جاتا۔

"منور یار یونیورسٹی تو بند ہونے والی ہے۔"

"ہونے دو"

"ارے تم کہتے ہو ہونے دو پھر ہمارا اڈہ کہاں ہوگا؟ کیا تمہارے باپ اسکی اجازت دینگے کہ ہم سب تمہارے گھر پر combined study کریں۔"

"کیوں نہیں — مگر اسکی ضرورت بھی کیا ہے، یونیورسٹی کیمپس میں ہمیں داخل ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ ہم آئینگے، لائبریری میں پڑھنے کے بہانے آئینگے —"

"وہ مارا — لائبریری کا تو خیال ہی نہیں آیا تھا" انھوں نے ہم آواز ہو کر کہا اور ایک دوسرے کو آنکھیں ماریں امتحانوں کے دن قریب آگئے تھے، سب پڑھائی میں لگ گئے لیکن یہ مخصوص گروپ بہت پریشان تھا۔ خصوصاً سیما کی پریشانی ان سب کے لئے زیادہ تکلیف دہ تھی،

"یار یہ سیما کی بچی کچھ سمجھ میں نہیں آتی —!" منصور نے بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔

"ضرورت بھی کیا ہے کہ اسے سمجھا جائے،"

"ضرورت تو کسی بات کی نہیں ہے سوائے اس سگریٹ کے۔ کیوں؟" جعفر نے آدھی آنکھیں کھول کر کہا "ارے نہیں یار ساری مشکل تو یہی ہے کہ وہ ہمیں اچھی بھی تو لگتی ہے، سیما یار ذرا بولا کر فضول ہی، ہماری طرح بے تکی سہی لیکن یوں تنہا تنہا خاموشی سے زندگی کیسے گزرے گی۔" سیما نے ان کی طرف دیکھا اور حسب عادت خاموش رہی،

"یار اسکا کروڑپتی باپ بھی اسے خوشیاں نہیں دے سکتا — یار سیما خدا کی قسم اگر تیرے باپ جتنی دولت ہم سب کے باپوں کے پاس مل ملا کر بھی ہو جائے نا تو سارے دلدر دور ہو جائیں اور ایک تو ہے کہ ہر وقت منہ لسورے رہتی ہے —"

"تمہیں نہیں معلوم کروڑپتی کیا ہوتا ہے —" سیما نے بمشکل جان چھڑائی،

"ہاں بھئی۔ تمہیں جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے، معلوم تو ہم غریبوں کو ہے جو ایک سگریٹ کے لئے کتوں کی طرح تمہارے جیسوں کو تلاش کرتے ہیں،" سیما کی آنکھوں میں دنیا جہان کی اداسیاں سمٹ آئیں — "لانا بھئی ایک سگریٹ میرے لئے بھی —"

"ارے سیما ڈارلنگ، یو آر گریٹ، آج تم پہلی بار ہمارے ساتھ کش لگاؤ گی، پتہ ہے اسکے بعد تم ہمیشہ کے لئے اپنے دکھوں کو بھول جاؤ گی"

"دکھ —" سیما نے آہستہ سے کہا "میرا کروڑپتی باپ سال میں دس مہینے یورپ اور امریکہ میں رہتا ہے — دو مہینوں کے لئے پاکستان آتا ہے تو میری ماں بھی ساتھ آجاتی ہے، جیسے اسکا میرے ساتھ کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ پھر وہ دونوں بڑی بڑی پارٹیاں کرتے ہیں، میرے بینک بیلنس میں بہت سے پیسے رکھ کر چلے جاتے ہیں —"

"سیما ان دو مہینوں میں تم بہت خوش ہوتی ہوگی نا —؟" بندیا اسکے قریب کھسک آئی —

"نہیں بندی ڈارلنگ، شروع شروع میں میں بہت خوش ہوا کرتی تھی، جب مجھے یہ احساس ہوتا تھا کہ دونوں مہینے میرے ... لیکن جلد ہی مجھے پتہ چل گیا کہ میرے والدین کا یہ دورہ بہت زیادہ کاروباری قسم کا ہے، بس تم یہ سمجھو کہ بارش ہوتی ہے تو زمین بیچاری بادل کے سارے آنسو تو جذب کرلیتی ہے لیکن خود پیاسی رہتی ہے ......" ... آنکھوں ... گئے۔

"سیما مجھے بھی اپنے باپ سے سخت نفرت ہے" بندیا نے ہاتھ میں لی ہوئی اسٹک کو توڑتے ہوئے کہا۔ "وہ میری ماں کو بہت مارتا ہے، طرح طرح کے ظلم کرتا ہے اس پر لیکن مجھے تو اپنی ماں سے بھی نفرت ہے۔ آخر وہ میرے باپ سے بدلہ کیوں نہیں لیتی، مظلوم بن کر کیوں جینا چاہتی ہے، اپنا حق چھین کر تو لے سکتی ہے نا۔"

"سیما، بندیا فی الحال تم دونوں اپنے اپنے ناخلف والدین کو بھول جاؤ اور آؤ ہمارے ساتھ دم لگاؤ۔ ہم تو بھول کر بھی گھر کا تصوّر نہیں کرتے۔"

"گھر کیا ہوتا ہے دوستو؟" جعفر رونے والا ہو گیا

"Home Sweet Home"

"واہ بھئی، واہ کیسا گھر اور کیسی Sweetness ، یار سیما تو اپنے سارے گھر کو سویٹ بنالے، دنیا کی ہر قسم کی مٹھائیوں سے بھر لے نا جب بھی ہمارے ہومز سویٹ نہیں ہو سکتے، ہاں صرف یہ کش سویٹ ہو سکتا ہے اور کچھ بھی سویٹ نہیں ہو سکتا۔" وہ سب ڈوب گئے، یونیورسٹی لان میں بے معنی قہقہے لگ رہے تھے اور ان میں سے کچھ رو بھی رہے تھے۔

اکبر ان کا ایک کلاس فیلو تھا، بہت زیادہ پڑھاکو قسم کا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اکبر کو مار کر پھینک دیں۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ اسے دیکھ کر ان کے ارادے ختم ہو جاتے، لائبریری میں پڑھائی کی غرض سے بڑے سے لان کو طے کرتا ہوا اکبر جانے لگا تو بے معنی قہقہوں نے اسے چونکا دیا۔ ان قہقہوں کے درمیان سورج غروب ہو چکا تھا اور مغرب کی اذان کی آواز نے ساری فضا کو پُر جلال بنا دیا تھا۔ سامنے یونیورسٹی کی لائبریری تھی لیکن اکبر رک گیا اور اس نے مغرب کی نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ لڑکے اور لڑکیاں اسے دیکھ کر بری طرح ہنسنے لگے۔ "پاگل کا بچہ۔"

"ارے یار یہ نماز میں کیا ملتا ہے؟"

"اسی سے پوچھو"۔ ان کا ایک گروپ اس کے پاس پہنچا۔ سیما کو تو اکبر کے پاس جانے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ بندیا نے ڈرتے ڈرتے اکبر کو شانوں سے ہلا دیا، سلام پھیرنے کے بعد اکبر نے انہیں مسکرا کر دیکھا "تم کیا کر رہے تھے؟"

"میں نماز پڑھ رہا تھا۔"

"کیوں۔ کیا ملتا ہے تمہیں نماز میں۔"

"میں نہیں جانتا لیکن جب بھی دونوں وقت ملنے لگتے ہیں میرا جی چاہتا ہے میں کسی کے حضور سجدہ کروں۔"

اب سیما بھی اکبر کے قریب آ گئی تھی۔

"اکبر تم رکوع و سجدہ میں کیا ڈھونڈتے ہو؟"

"وہی جس کی تمہیں بھی تلاش ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"سکون!" اکبر نے پر سکون لہجے میں جواب دیا۔

"تو کیا مل جاتا ہے ...؟" سیما نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں اکثر۔ سیما میری نماز باقی ہے، باتیں ہم پھر کریں گے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ پڑھوں۔"

"ضرور ــــ"

"اگر تم زور سے پڑھتے جانا۔ میں نے آج تک کسی کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ میں تمہارے ساتھ پڑھوں گی ــــ"

"ٹھیک ہے پہلے ذرا یہ سگریٹ تو بجھالو ــــ"

نہیں بھئی سگریٹ کے بغیر میں کروں گی کیا ــــ؟"

"سیما بجھاؤ سگریٹ" پھر میں جس طرح کہوں اسی طرح کرو ــــ" سیما نے سگریٹ دور پھینک دی، جعفر نے لپک کر اٹھالی۔

"کیوں سیما سگریٹ کیوں پھینکی ــــ"

"مجھے نہیں ملا سکون تمہاری اس سگریٹ میں، اب میں ذرا اکبر کے ساتھ نماز پڑھ کر دیکھ لوں" جعفر دور دور ہٹ گیا انیتا، ریٹا، اور نرمل اور قریب کھسک آئے۔" اچھا تو اکبر ہمیں پیسے کے بغیر سکون دے گا۔ چلو ہم بھی یہ تجربہ کر کے دیکھ لیں" پھر یکایک سگریٹیں بجھ گئیں، ساری فضا میں دھواں سا پھیل گیا اور وہ سب اکبر کے ساتھ نماز پڑھتے رہے۔ نماز ختم ہوئی تو اکبر نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے "یا خدا، ہم بہت اداس ہیں، ہماری ساری نسل اداس ہے، ہمیں سکون دے، ہمیں صحیح راستہ دکھا، ہمارے ذہنوں پر سے گرد و غبار ہٹادے اور نور کا تیغ روشن کر دے ــــ" اکبر کی آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے باقی ساری سگریٹیں بھی بجھ گئیں اور سب نے دعاؤں کے لئے ہاتھ اٹھادیئے۔ ان کے چہرے چمک اٹھے۔ سیما چیخی ــــ"

"ہاں اس Excercise سے واقعی بہت سکون ملتا ہے Specially اسکے اس آخری پارٹ سے"

"لیکن کیوں ــــ؟"

"شاید اس لئے کہ اس آخری پارٹ میں ہم کسی سے باتیں تو کرتے ہیں ــــ کسی کو سامنے موجود پاتے ہیں یا کم از کم محسوس کرتے ہیں ــــ" اکبر نے جواب دیا۔

"اکبر ــــ" سیما اسکے شانوں سے آکر لگ گئی ــــ"تمہیں پتہ ہے میں نے اپنے باپ اور ماں کو بہت عرصے تک اپنے سامنے محسوس کر کے باتیں کی ہیں لیکن جب تصور کے خمار سے آگے بڑھی ہوں نا تو شیشۂ دل ٹوٹ ٹوٹ گیا ہے، تنہائی کا احساس ایسے میں اور بھی شدت اختیار کر گیا ہے۔ اس لمحے تنہائی سرطان کی طرح خون میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی ہے اور جب دو مہینوں کے لئے میرے والدین وطن واپس آتے ہیں نا تو یہ احساس جان لیوا ہو جاتا ہے ــــ"

"Exactly، یہی حال میرا ہے" بندیا قریب آگئی، میرے والدین تو میرے ساتھ ہی رہتے ہیں لیکن وہ مجھے بالکل نہیں سمجھتے، ان کا خیال ہے میں نالائق ہوں نافرمان ہوں حالانکہ میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے سمجھیں ــــ"

"دراصل تم لوگوں نے اپنے آپ کو بہت زیادہ الجھالیا ہے۔ جب بھی شدت سے تنہائی رگ و ریشے میں اترنے لگے اس لمحے کو غنیمت جانو اور پورے طور سے اسے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کرو، لمحوں کے پیچھے بھاگو، وقت کے اس تسلسل میں تعطل نہ پیدا ہونے دو، دراصل تعطل ہی تنہائی کا احساس بیدار کرتا ہے، میں دن میں پانچ بار اسکے حضور اپنے اوقات کا حساب دیتا ہوں، کبھی حضوری حاصل ہوتی ہے، کبھی نہیں ہوتی، دونوں صورتوں میں اسکا قرب محسوس کرتا ہوں"

"نہیں یار ہم تھک گئے ہیں، ہمیں اب کسی شئے سے سکون نہیں مل سکتا" بندیا نے قطعی فیصلہ کر دیا لیکن سیما خاموش ہوگئی پھر اس نے پر عزم ہوکر کہا اب میں اپنے والدین کو تلاش نہیں کروں گی، دراصل وہ بھی گم کردہ راہ ہیں اور میں بھی،

اب میں ان راہوں کو تلاش کروں گی جہاں سے ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑا تھا، شاید اسی طرح کسی ایک موڑ پر ہم مل جائیں۔"

"یار سیما تو گئی ہاتھ سے"

"اسے جانے نہ دو، بھٹکنے، ہماری طرح سے، یہ چلی گئی تو ہمارا خرچ کیسے چلے گا"

"یار چھوڑ جانے والوں کو کوئی نہیں روک سکتا، یہ سب تنہائی کا رونا روتے ہیں اور دوسروں کو تنہا اور بے سہارا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔"

"ہم کتنے تنہا ہیں — ہم اس اکبر کے بچے کو قتل کر دینگے"

"لیکن ہم کس کس اکبر کو قتل کریں گے، ہمارے ہاتھ دُکھ جائیں گے اور اکبر جیسی چیزیں باقی رہیں گی، ہم تو تنہائی کے اس دوزخ میں جلنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، ہماری تخلیق کا مقصد یہی ہے —"

"تخلیق کو برا نہ کہو، سنا ہے میری ماں نے میری پیدائش سے پہلے میرے لئے بہت سی دعائیں مانگی تھیں"
جعفر خلا میں تکتے ہوئے بولا۔

"چھوڑو دوستو اس سارے قصے کو، اس وقت ہم میں سے کسی کی ماں نہیں ہے، ہم سب تنہا ہیں، بالکل تنہا، تنہائی ان کے جسم و جاں میں سرایت کر رہی تھی اور پھر وہ سب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

آرٹس انٹرنیشنل

اُردو زبان میں فنونِ لطیفہ پر شائع ہونے والا واحد رسالہ ،

پکاسو نمبر کی تیاری کر رہا ہے

عظیم پکاسو جدید مصوّری کا ہیرو ہے ،
پکاسو اپنے فن کی طرح شخصیت میں بھی پیچیدہ اور پر کار ہے
پکاسو اپنے زمانے کی ہر تحریک میں پیش پیش ہے ،
پکاسو مر گیا
مگر پکاسو کا فن زندہ ہے ،
عظیم مصوّر کے خراجِ عقیدت میں

آرٹس انٹرنیشنل

پکاسو نمبر عظیم پکاسو کے

شایانِ شان ترتیب دے رہا ہے ،

نسیم نیشوفوز

فن اور تخیل

انسانی تخیل روح کا وجدانی مرکز ہے پہلے تخیل ایک ازلی ہیولا تھا اور خلائے بیکراں کے سیاروں کی طرح اپنی خام شکل لئے اس گھراوٴ سے ٹکراتا رہتا تھا جس سے کائنات کی تخلیق ہونا مقصود تھی۔

تخیل عقل فعال کا ایک خاصہ تھا جس کی حکمت و حرکت سے تمام عالم کو پیدا کیا گیا اور جب یہ تخیل "الہامی راستوں" کو طے کر چکا تو آدم کا عقلی جزو بن گیا اسی تخیل کل نے آدم کو تقدس کے طور پر کھڑا کیا ہر مذہب کے پاکیزہ عصر میں تخیل کا مرتبہ درس اخلاق و ادب تھا، پیغمبری کا اعلےٰ ترین منصب تھا، تصوف کا داخلی پہلو تھا تخیل کی معراج کا دوسرا نام "انسانیت" تھا تخیل کی یہ سخن سازی جب مذہبی و اخلاقی رفعتوں کے مدارج طے کرتی ہوئی ارضی پیرہن میں ملبوس ہوئی تو اسے فن کے نام سے منسوب کیا گیا ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہیئے کہ فن ——— فنکار سے پہلے موجود تھا اس کی آسان سی مثال کچھ یوں ہو سکتی ہے کہ آئینہ تو محض ایک صیقل شدہ سطح کا نام ہے جب تک کہ وہ ہمارے چہروں کا عکس نہیں اتار لیتا یعنی ہمارے بنیادی جذبوں کے لئے صیقل شدہ سطح تو موجود ہے۔ مگر ان جذبوں کا انعکاس ہی منبع حقیقت ہے جو ایک آئینے کے طفیل ہی ممکن ہے۔

علم کی جمالیاتی کیفیات کے عملی پہلوؤں کا نام "فن" ہے حضرت امام غزالیؒ نے سچ کہا ہے کہ "انسان علم کے لئے پیدا ہوا ہے علم جان کا مونس ہے" انسان اس علم کے اظہار کے لئے مختلف ذرائع استعمال کرتا ہے یہیں سے اُن قدیم آفاقی علامات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ فن کی پیدائش کا باقاعدہ اظہار بنتا ہے انسان ان آفاقی علامات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب و ثقافت کو ارضیت و روحانیت کے بلند مراتب و مدارج عطا کرنے کے لئے علم کے بہترین نقش ثانی "فن" کا سہارا لیتا ہے۔ یوں آفاقی علامات فن کی روح میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ تمثیلاً یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ علم "عقل اول" کا تجریدی و تقریدی تقدس ہے اسے غیر تجریدی بنانے کے لئے فن کا ہونا لازمی ہے بالکل اسی طرح جیسے روح کے لئے ایک ھیئت، ایک جسم کا ہونا لازمی ہے۔

تخیل انسانی شعوریت کی ایک لامحدود شکل ہے جو پہلے علم کی حد اور پھر فن کی محدودیت میں نمودار ہوتی ہے تخیل فن کے احاطے میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اسے دوبارہ غیر محدود کرنے کے لئے فن کا شہکار کے مرتبے پر پہنچنا ضروری ہے ایک شہکار کی جمالیاتی معنویت اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب کہ فن کار اپنی ثقافتی و عمومی ارضی حدود سے کہیں ماورا ہو کر اپنے ذہن کی مخصوص وجدانی تنظیم اور

موضوعاتی مشاہدہ بینی کو اپنی آتشِ نمارورح کے اضطراب کے سپرد کر دیے ہیں۔ درد و غم کے فلک قامت ہونے فنی تجسیم میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور درد و غم کے مختلف النوع رنج کشیدہ غیبی چہرے فن کی قدر و قیمت بڑھانے میں بڑی مدد کرتے ہیں یا یہ الفاظ دیگر اسے شہکار تک بنا دیتے ہیں۔

فنی تخیل کے باب میں درد و غم کا فلسفیانہ تصور انسان کے چند آنسوؤں تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کے ڈانڈے ہماری مختصر سی کائنات کے گرد پھیلے ہوئے لاتعداد جہانوں میں بھی مضمر ہیں۔ ان انجانے عوالم تک ایک فنکار کے بجائے ہمارا اہم عصر سائنس دان پہلے پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے کہ ہم استاذِ ازل کے ہر لحظہ متحرک و بے شکل شہکار نیچر (NATURE) کے بے جہت و بے ساحل کینوس کے ادنٰے دھبے ہیں اور فن کے تخلیقی دعویدار ہونے کے باوجود متذکرہ شہکار کے افسانے کو بار بار دہرائے جاتے ہیں اور اپنی ہزار ہا نازک خیالیوں کے باوجود اپنے فن کو شہکار نہیں بنا پاتے البتہ صرف چند پیٹرن PATTERN بنا پاتے ہیں جسے کم فہم ناقدین فن "شہکار"، تعبیر کرنے سے گریز نہیں کرتے اسکی عام وجہ غالباً یہ ہے۔ کہ ناقد —— اپنی ذاتی خود پرست شعوریت۔ ذاتی تجربات کے سہارے ایک فن پارے کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی قوت فیصلہ کو خود ہی حرف آخر بنا کر مذکورہ فن پارے پر مسلط کر دیتا ہے ایسا ناقد آخر زماں و مکاں کے بہترین باشندے " فنکار" کو ابدیت کا شہریار کیسے اور کیونکر بنا دیتا ہے؟؟ یہ بات اب تک سمجھ سے باہر ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ [illegible] ہمارے قدماء یا ہم عصر ناقدین نے شہکار گردانا اُن میں فنی کاوشوں کے علاوہ مذہبی عقیدت مندی ضرور شامل رہی ہے۔ میتھالوجی MYTHOLOGY کا شکوہ و جبروت —— یہاں اس بات کا یہ واضح اشارہ ملتا ہے کہ فنی تخیل نے مذہب اور آفاقی علامات کی اصنام پرستی سے رشتہ جوڑ کر شہکار کا مرتبہ حاصل کیا اس ضمن میں سب سے عمدہ مثال گندھارا آرٹ کی دی جا سکتی ہے ادھر ہمارا آج کا فنکار اگر صداقت پسندی اور تقدیس جیسی آفاقی قدروں سے اپنے فنکارانہ جذبات و مہارت کی رنگ آمیزی کرتا ہے اور ازلی درد و غم کی مقناطیسی لہروں سے مذکورہ اقدار سے نئی حقیقتوں کو کشید کرنے کا اہل بن جاتا ہے تو یقیناً اس کا فن پارہ بھی شہکار کہلا سکتا ہے جہاں تخیل خود بخود دریچہ ممتا بنا اس کی راہ نمائی کرے گا اور آب حیات کی طرح اسے غیر فانی زندگی بھی دے گا۔

تخیل ذہنی تابوت کی لاش اس لئے بن جاتا ہے کہ فنکار تخیل کو اس کی مکمل زندگی عطا نہیں کرتا ورنہ ہر تخیل کی" اک جہانِ دگر"، کی طرح اپنی ایک پوری داستان ہے جس سے فن کی باطنی بساط وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے اور اس کی جمالیاتی و خماری و نشاط آفرینی فزوں تر ہونے لگتی ہے۔

فن —— ایک فنکار یا فرد کی شخصی و علامتی کاوش نہیں جس سے وہ اپنی خود پرست انا کا اشتہار بن کر اپنے معاشرے میں ایک خاص مقام حاصل کرتا ہے۔ بلکہ فن —— تہذیب و ثقافت کی آفاقی سانس ہے۔ ایک جاری و ساری علامتی تنفس ہے جس سے وہ (فن) دوسری تہذیب و ثقافت سے ممیز کیا جاتا ہے۔ اس فن کی واضح پہچان یہ ہے۔ کہ اس میں پیش کردہ علامات کے خد و خال دوسری تہذیب و ثقافت کے فنکار سے یقیناً مختلف ہوں گے مثلاً پال گوگین (GAUGAIN) کا نقش کردہ کرائسٹ YELLOW CHRIST ہسپانوی مصور ایل گریکو (ELGRECO) کے کرائسٹ (BLUE CHRIST) سے قطعی مختلف ہوگا اول الذکر مصور نے اپنے "مسیحا"، کو شمالی جزائر کی آفتابی فضاؤں میں نقش کیا جب کہ ایل گریکو نے اپنے "مسیحا"، کو ہسپانوی فضاؤں کے گہرے نیلے پس منظر میں پیش کیا تاہم اس فرق (فنی یا ثقافتی) کے باوجود یہ فن نہیں بلکہ تخیل کا وہ پُراسرار سفر ہے جو ازلیت کے سارے راستے طے کر کے اور اپنی تجریدی ذات

کو فنی حصار کے سپرد کر کے نوع انسانی کو مسرت و نشاط کے درجے پر فائز کرتا ہے تخیل کی یہ بے لوث قربانی نہ صرف فن کو حیات بخشتی ہے
بلکہ ہر چھوٹی بڑی تہذیب و ثقافت کو بھی عظمت و احترام سے ہمکنار کرتی ہے یہ زمانہ حال کی بدقسمتی ہے کہ تخیل کی قدیم آفاقی علامات
کی جگہ "اسراریت"، "ناقابل فہم معنویت" اپنا جادو کھو چکی اور اسکی جگہ مبہم اور لایعنی علامات نے لے لی ہیں جن سے فن کی سچی دلاویزیاں
مفقود ہو گئیں اور جنہیں اب کلاسیک محض کا نام دے کر عجائب خانوں کے طاق نسیاں پر رکھ دیا جاتا ہے مگر یہاں یہ عرض کر دینا
نام نہاد قسم کی پیشین گوئی نہیں ہو گی کہ تخیل کا منصب ایک مرتبہ پھر مابعد الطبیعاتی و روحانی درجے پر فائز ہو کر نئے نئے شہکار جنم دے
گا اور جنہیں ہمارے عہد قدیم کے کلاسیکی فن پاروں کے ہم شانہ کھڑا کیا جا سکے گا۔

نئی نسل کا ترجمان
اپنے عہد کی بہترین اور نمائندہ تحریروں کے ساتھ شائع ہو کر
ایشیا کے کسی بھی بک اسٹال پر دستیاب ہے
سیپ

طاہر نقوی

چوتھا آدمی

ادب میں تخلیق کار کے بعد قاری اہمیت رکھتا ہے کہ ہر لکھا ہوا لفظ پڑھے جانے کا طلب گار ہوتا ہے۔ نقّاد کی بھی کسی نہ کسی طرح ٹھُس ٹھُسا کر گنجائش نکل آتی ہے۔ مگر میرے خیال میں ادب میں ایک ایسا چوتھا آدمی بھی گھُسا بیٹھا ہے جو اپنے آپ کو دانشور کہلوا کر زیادہ خوش ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اسے کوئی بات یاد نہیں رہتی بس یہ اور تو کچھ نہیں کر پاتا بال بڑھا لیتا ہے۔ سگریٹ لبوں سے لگی رہتی ہے۔ کتاب ہمیشہ ہاتھ میں رکھتا ہے۔ یہی حلیہ آج کل اچھے خاصے ایک آرٹسٹ نے اپنا لیا ہے۔ اصل میں یہ حضرت دو چار بار ریڈیو کے چند نام نہاد دانشوروں کے نزدیک سے بے خبری کے عالم میں گذرے پھر کیا تھا دانشوری ان کو بھی اڑ کر لگ گئی کیونکہ یہ متعدی مرض ہے۔ اب یہ سمجھتے ہیں کہ دانشوری کا راستہ فنکاری سے ہو کر جاتا ہے۔ ریڈیو ٹی وی کے متعلقہ حکام انھیں پروگرام دینے سے بھی ڈرنے لگے ہیں۔ بے چارے فن سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ یہ چال ان کے مخالفین کی معلوم ہوتی ہے۔ جبھی تو انھیں دانشوری کا جھانسہ دے کر فن کی دنیا سے ہٹا دیا۔ سامنے کی ایسی مثالوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ اپنے علاوہ دانشور ارد گرد کی ہر شے سے بے خبر رہتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دراصل یہ خود اپنے آپ سے بے خبر رہتا ہے۔

دانشور بننے کے لیے دانش وری کا ہونا قطعی ضروری نہیں اصل میں دانشور اور ذہنی مریض میں ایسا کوئی زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ نفسیاتی مریض ہی اپنے کو دانشور کہلواتا ہے۔ یہ بالکل اس مکھی کی طرح ہوتا ہے جو بیل گاڑی کے پہیے پر بیٹھی خود ہی خود خوش ہوتی رہتی ہے کہ میں بہت گرد اڑا رہی ہوں۔ اس مکھی کی اسی خوش فہمی کے نتیجے میں اپنے ہی شہر کے ایک دانشور کے دماغ پر اثر ہو گیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی دانشور ہو گئے اور پہلے سے بھی زیادہ خوفناک حرکتیں کرنے لگے۔ ان کے ارد گرد اٹھنے بیٹھنے والے پہلے تو ان کی حرکتوں کو دانشوری ہی سمجھتے رہے مگر ان کے عزیزوں میں سے کسی دانا کو شک گذرا تو انھیں دماغی ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ علاج کے بعد باہر آئے تو پہلے سے کہیں زیادہ خوش تھے، دوستوں میں بیٹھے کہنے لگے "میری دماغی حالت تم سب سے بہتر ہے کہ میرے پاس اس کا سرٹیفیکٹ بھی موجود ہے"

یہ کبھی تو ترقی پسندی اور کبھی وقت کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مذہب کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ فی الوقت اکثر دانشور

مذہب کی ڈگڈگی بجاتے پھرتے ہیں، ایسی ہی دوہری شخصیت کی لاش اپنے قدموں پر لادے یہ سب اضطرابی کیفیت میں مارے مارے پھرتے نظر آتے ہیں۔

خاص طور سے ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور رسائل کے دفاتر میں اور عام طور سے کافی ہاؤسز میں ہر قسم اور ہر درجے کا دانشور دستیاب ہوتا ہے، رسالوں کے دفتروں میں ہاں میں ہاں ملانے والوں کے درمیان بیٹھا دانشوری کرتا ہے اور دوسری صورت میں مدیر پر اپنی دانشوری کا سکہ جمانے کے لئے دن بھر وہاں براجمان رہتا ہے۔ متعلقہ پرچے میں اپنے بارے میں مضامین لکھوانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ پرچے تو ظاہر ہے کبھی کبھی ہی نکلتے ہیں۔ درمیانی عرصے میں ان کے اور دیگر پرچوں کے گروپوں کے درمیان یک طرفہ رسہ کشی جاری رہتی ہے۔ دوسرے دفتروں کے ملازمین کی نسبت ریڈیو، ٹی وی کے پروڈیوسر اس سلسلے میں زیادہ مزے میں ہیں یہ لوگ اور کچھ نہیں کرتے صرف دانشوری کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان عہدوں کے لئے کسی اور قابلیت کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی محض دانشوری سے کام چل جاتا ہے۔ پروڈیوسر ریڈیو کا ہو یا ٹی وی کا اس ادارے میں داخل ہوتے ہی اپنے کو دانشور سمجھنے لگتا ہے چاہے پہلے وہ کسی سرکاری دفتر میں کلرک رہا ہو یا ٹائپسٹ۔ پتہ چلا ہے کہ اب تو وہاں دانشوری کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ ان لوگوں سے کبھی ہوش و حواس کی باتوں کی امید نہیں رکھنی چاہئے جو معقول اور ہوش مندی کی باتیں کرے وہ دانشور کبھی نہیں بن سکتا۔ اسی لئے جب یہ کوئی تخلیق نہیں کر پاتا تو آسانی سے دانشور بن بیٹھتا ہے۔ دانشوری میں جلدی لگتی ہے نا پھٹکری رنگ چوکھا ہی آتا ہے۔ یہیں سے دانشوروں کی کچھ صفات سامنے آتی ہیں۔ ان کی دوسری نشانیوں میں یہ بھی ہیں کہ وعدہ ضرور کرے مگر ایفا کرنے کی غلطی کبھی نہ کرے۔ جھوٹ بولے اور دوسرے کو دھوکے میں رکھے، اپنی ہاں میں ہاں ملوانا پسند کرے کیونکہ یہ اس کی انا کا مسئلہ ہوتا ہے حالانکہ انا جیسی شے اس سے چھو کر بھی نہیں جاتی۔ ایک دوسرے پر اعتراض کرے۔ اختلافات جمع کرکے دائیں بائیں کی گروپ بندی تو خیر اس کی پرانی فطرت ہے ان تمام خصلتوں کے باوجود جو اسے دانشور نہیں مانتا اس سے ناراض ہی رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اس خالی ڈبے کی مانند ہوتی ہے جس میں چند کنکر ڈال کر ہلایا جاتا ہے تو آواز پیدا کرتا ہے۔ حقیقت سے بچنے کی خاطر کبوتر کی طرح اپنی طوطے کی سی آنکھیں ہمیشہ بند رکھتا ہے۔

فی زمانہ ایسے دانشور زیادہ پائے جاتے ہیں جو ادب کے کسی شعبے میں کوئی تخلیق کبھی کرتے نہیں پائے گئے۔ مگر ادب اور آرٹ کے ٹھیکیدار سمجھے جاتے ہیں اور خالی خولی صرف دانشوری کرتے پھرتے ہیں۔ ہاں ان میں سے ایک آدھ نے ایک آدھ چیز کسی زمانے میں جیسی تیسی لکھ تو دی مگر اب باقی عمر اس کی تعریف میں خود ہی قلابے ملانے میں بتا رہے ہیں۔ یہ موصوف اسی مکھی کی طرح ہیں جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ان کی ناک پر کسی زمانے میں وہی مکھی آ بیٹھی تھی۔ انہوں نے اس مکھی کو پہلے تو بیٹھنے دیا اور اب اسے ہٹانے کی بجائے اپنی ناک کو ہی کٹواتے پھرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہی سمجھ رہے ہیں کہ مذکورہ مکھی ابھی تک بیٹھی ہے حالانکہ یہ مکھی کبھی کی اڑ کر وہیں چلی گئی، جہاں سے آئی تھی۔ ایک آدھ نے ادھر ادھر سے کچھ کر کرا کے تگ بندی کر تو لی اب ان سے یہی کہتے سنا گیا ہے کہ "ہمیں پڑھنے سے پہلے مغربی شعراء ورڈز ورتھ، لانگ فیلو اور کیٹس کو پڑھئے"۔ بتائیے جب مغربی شعراء کو پڑھنا ہی ہے تو پھر بھلا ان تگ بندوں کو خواہ مخواہ پڑھیں، اصل چیز کیوں نہ پڑھیں۔ یہ اپنی ہی خوشبو کے خول میں بیٹھی فیشن میگزینوں

ہیں مختلف انداز سے تصویریں چھپواتی نظر آتی ہیں۔ ان ہی جیسی ایک اور اپنے ماضی کے حسن کی بدولت اسٹیج اور ٹی وی کے پروگراموں میں شریک ہوکر نہ صرف دانشوری کرتی پھرتی ہیں بلکہ فنکشنوں میں دانشور کی حیثیت سے شرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ جس معاشرے میں دانشور کا یہ معیار بن جائے وہاں "دانش" تو بالکل ختم ہوکر رہ جاتی ہے بس "ور" باقی رہتا ہے۔

چند دانشور نما ادیب ایسے بھی ہیں جو اپنے عہدوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہتات سے لکھے چلے جاتے ہیں اس کے باوجود ان کا کوئی معیار نہیں بنتا اور ہمیشہ نا لکھنے والے کی طرح ہی رہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک افسر کا ابھی حال ہی میں سفر نامہ شائع ہوا ہے جس میں ایک جگہ ایک مغربی ملک کی لائبریری کے بارے میں لکھا ہے کہ وہاں اردو کا معیاری ادب موجود نہ تھا اس لئے موصوف نے اپنے زرد افسانوں کا مجموعہ وہاں رکھدیا۔ موصوف کو اپنی کتاب مذکورہ لائبریری میں رکھتے ہوئے یہ احساس نامعلوم کیوں نہیں ہوا کہ دراصل انہوں نے وہاں اردو ادب کے معیار کو اور گرادیا چند سکے بند ایسے بھی ہیں جو محض رونمائیوں کی تقریبوں میں پیشہ ورانہ مقرر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کسی زمانے میں ایسے موقع کے لئے ایک تقریر یاد کرلی تھی یا لکھ لی تھی، اس کے بعد اب تک الفاظ اور ناموں کی الٹ پھیر کرکے مختلف عنوانات کے تحت وہی تقریر کرتے آرہے ہیں۔ ان میں سے کئی کی تقریریں تو ایسے اجلاسوں میں شرکت کرنے والے شوقینوں کو اب زبانی یاد ہوگئی ہیں اسی لئے جب ان کے تقریر کرنے کی باری آتی ہے۔ تو حاضرین اٹھ اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے باہر جانے لگتے ہیں یا پاس بیٹھے ہوؤں سے حال احوال پوچھنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل کے زیادہ تر دانشور اندر سے خالی ہوتے ہیں ایک چیز لکھنے کے بعد اندر سے چھچھے نکل آتے ہیں۔ ظاہر ہے ادیبوں کی صف میں تو انھیں جگہ نہیں ملتی، تنقید کے فن سے واقف نہیں ہوتے اور قاری کہلوانا خود یہ پسند نہیں کرتے۔ اب وہ دانشوری ہی میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ وہاں انھیں ان جیسے اور بھی بہتیرے مل جاتے ہیں۔ جو آسمان کی طرف منہ اٹھائے آوازیں نکالتے رہتے ہیں۔ انہی میں دن بھر باقاعدہ بے قاعدگی کے ساتھ چند تو فکرِ کسب معاش کرتے ہیں مگر باقی سب ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ شام ہوتے ہی بڑے خلوص کے ساتھ شہر کے مختلف کافی ہاؤسز میں گپ لڑاتے ہیں۔ ایک چائے پر گھنٹوں گذار دیتے ہیں سگریٹ پھونکتے رہتے ہیں۔ چاہے گھر میں بچے روٹی کے لئے ترس رہے ہوں اور بیوی پڑوس میں ادھار کے لئے خوشامد درآمد کررہی ہو لیکن یہ ادھر بیٹھے محض بحثیں کرتے ہیں جن کا آج تک کوئی نتیجہ نہیں نکل پایا۔ بحث کرتے کرتے اکثر خود اپنے سے الجھ جاتے ہیں کہ آخر کس موضوع پر بول رہے تھے، رات گئے واپس جاتے ہیں وہ بھی اس وقت جب جماہیاں لیتے لیتے اپنا اور دوسروں کا برا حال کرڈالتے ہیں اور جبڑے تھک جاتے ہیں۔ صبح ہی صبح پھر نکل پڑتے ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چند گھنٹے گھر میں گذارتے ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا اور نہ یہ کسی کی سمجھ میں آج تک آیا ہے کہ آخر یہ تخلیق کس وقت کرتے ہیں۔ یہ سوال ایسا ہے جو ننگی حقیقت بنکر ان کے چہروں پر کالک کی طرح جم گیا ہے۔ اسی لئے یہ لوگ گھروں سے چلتے وقت کبھی آئینہ نہیں دیکھتے۔ یہ فن کو حقیقی زندگی سے اتنا مقدم سمجھتے ہیں کہ خود زندگی ان کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے اور شاید اسی بنا پر مجبوراً اپنی دانشوری پر اتر آتے ہیں ——— !!!

مشکور جاوید

پوشاک

وہ کون تھی؟ کوئی نہیں جانتا کہاں سے آئی تھی؛ یہ بھی معلوم نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ پچیس چھبیس سال کی سانولے رنگ کی عورت تھی۔ اس نے ایک خوبصورت سا بچہ اپنی گود میں لے رکھا تھا۔

کوئی ساڑھے بارہ بجے رات کا وقت تھا۔ ایک عجیب بات تھی۔ اپنے سفر کے دوران جو کہ میں نے صبح آٹھ بجے سے شروع کیا تھا۔ کوئی بھی لڑکی یا عورت اس کمپارٹمنٹ میں نہیں آئی تھی۔ ہیں کمپارٹمنٹ کی اوپری برتھ پر سویا ہوا تھا۔ شاید کوئی چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ اس وقت نہ معلوم کیسے میری نیند اچٹ گئی تھی۔ اس درمیان جب میری نظر اپنے برتھ کے ساتھ نیچے والی سیٹ پر پڑی تو وہ عورت اس سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اسی وقت میں نے اسے غور سے دیکھا۔ سانولا رنگ، معصوم چہرا اور گالوں پر ہلکی سی پاؤڈر کی پرت۔

اس کے گلے میں سنہرے رنگ کا لاکٹ تھا جو چھاتی پر لٹک رہا تھا اور جو اس کے اٹھے ہوئے سینے کا احساس دلا رہا تھا۔ ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑی میں وہ عورت کافی خوبصورت لگ رہی تھی۔ کپڑے لتّے سے وہ عورت اچھی حیثیت والی معلوم ہو رہی تھی۔

وہ اپنی گود میں لیٹے ہوئے بچے کو کھلا رہی تھی۔ میں نے سوچا اس بچے کی ماں ہوگی۔

شاید اس عورت کی نظریں مجھ پر نہیں پڑی تھیں۔ وہ بچے کو کھلانے میں مگن تھیں۔ رہ رہ کر اس بچے کو چومے جا رہی تھیں۔

ہاں ایک بات ضرور تھی جو مجھے حیرت میں ڈال رہی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔ اور اتنی رات کو کسی عورت کا اکیلے سفر کرنا میرے نزدیک واقعی حیرت کی بات تھی۔ ویسے اس کے اعتماد سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سفر کرنے کی عادی ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس سے کچھ بات کروں۔ لیکن نہ جانے کیوں میں اجنبی عورت سے بات کرنے میں اپنے آپ کو ناکام سا پا رہا تھا۔

شاید کوئی خوف تھا یا کسی بات کا اندیشہ۔

ٹرین اپنی پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی۔ میرے اور اس عورت کے علاوہ کمپارٹمنٹ میں صرف دو آدمی اور تھے۔ شکل سے گجراتی نظر آ رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھی بہت دور سے سفر کرتے ہوئے آ رہے ہوں اور شاید اسی وجہ سے ان دونوں پر نیند حاوی تھی۔

نیند تو مجھے بھی آرہی تھی لیکن سامنے ایک اکیلی عورت کو دیکھ کر نہ جانے کیوں نیند مجھ سے دور بھاگتی چلی گئی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ نیند آ جائے۔ لیکن نیند تھی کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی تھک ہار کے میں نے اس عورت کی گود میں لیٹے ہوئے بچے پر نظریں جما دیں۔

بچہ واقعی بڑا پیارا تھا۔ وہ رہ رہ کر مسکرائے جا رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا اس عورت کی نظریں بچے پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کا ساگر لہریں لے رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنی ماں کی یاد آگئی جو بچپن میں ہی چھوڑ کر سدھار گئی تھیں۔ مجھے تو اب اپنی ماں کی شکل بھی یاد نہ تھی۔

میں نے آنکھیں بند کیں اور ذہن میں ماں کا خیالی روپ سنوارنے لگا۔ کافی دیر تک میں اسی طرح آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ اس درمیان اس عورت نے میری طرف دیکھا یا نہیں معلوم۔ میں نے آنکھیں کھول کر ایک بار پھر نیچے کی برتھ پر دیکھا وہ عورت اس بچے کے کپڑے بدل رہی تھی شاید اس بچے نے پیشاب کیا ہو گا! میں نے سوچا۔

بچے کو نئے کپڑے پہنا کر وہ اسے دیکھنے لگی۔ میں نے دیکھا اب اس کے چہرے سے وہ مسکان غائب ہو چکی تھی جو کچھ دیر پہلے بچے کو دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر موجود تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی اُداسی پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

اچانک وہ اُٹھی اس نے ایک لمحے کے لئے نیچے دوسری برتھ پر سوئے ہوئے ان دو مسافروں کو دیکھا۔ میں نے سوچا شاید اب میری طرف دیکھنے ہی والی ہے۔ لیکن اس نے میری طرف ذرا بھی نہ دیکھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کمپارٹمنٹ میں میرے ہونے کا احساس شاید اسے نہیں ہوا ہے۔ صرف کچھ ہی لمحوں کے لئے اس نے ان مسافروں کو دیکھا اور بچے کو اپنے سینے سے لگا کمپارٹمنٹ کے دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی

میں سوچنے لگا شاید کوئی اسٹیشن آنے والا ہے جہاں وہ اترنا چاہتی ہو۔ سیدھے لیٹے لیٹے کمر میں کچھ درد ہونے لگا تھا۔ میں نے ایک کروٹ لی اور اس عورت کی طرف پیٹھ کر کے لیٹ گیا۔

یکایک بہت ہی عجیب اور مدھم سی آواز مجھے سنائی دی۔ میں واپس چت ہو کر اس آواز کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا وہ عورت تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنی جگہ پر آ چکی تھی۔

لیکن اس کے دونوں ہاتھ اب خالی تھے۔ وہ بچہ اب مجھے اس کے پاس نظر نہیں آیا میں نے لیٹے لیٹے ہی گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا وہ بچہ وہاں بھی نہیں تھا۔ اور پھر میرے پورے جسم میں خون کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے اس عورت پر نظریں جما دیں وہ عورت اس بچے کی اُتری ہوئی پہلے والی پوشاک کو ہاتھوں میں لئے ایک ٹک گھور جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہے جا رہے تھے۔

نسیم درّانی (ایڈیٹر، پبلشر) نے انجمن پریس (پرنٹر) سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ الفاظ، بلاک ڈی، شیر شاہ کالونی، کراچی ۸ سے شائع کیا

(اشاعت: نومبر ۱۹۸۲ء)

شاہدہ تبسم

اعراف

یہاں جو کتبہ گڑا ہوا ہے
یہ جانے کس وہم کا یقیں ہے
کہ مرنے والا تو آگہی کے
قریب کُن کا نقیب ٹھہرا

فضا میں اِک تھر جو بہہ رہا ہے
وہیں کہیں پر
ازل اَبد کی بقا کے امکاں کے سارے لمحے کھلے ہوئے ہیں
انہی میں سے کوئی ایک لمحہ
جو اُس کی خاطر بُنا گیا تھا
مَرنے وَالے کے نام کا بوجھ اُٹھا کے اَب تک
اَبد کی خواہش میں تیرتا ہے
وقت کی چشم بے بصر میں

مرنے والے کی چشم بے دید کو اَب تک
چاندنی کی فسوں گری میں
ڈسیں گے سب شیش ناگ
پاتال کے عدم کے
لحد کے کتبے کے سائے میں اک
لطیف ڈنٹھل پہ اک شگوفہ
فنا کی تنہا گواہ مٹی پہ سر جھکائے پڑا ہوا ہے
فضا میں سناٹا تیرتا ہے
خامشی کی اُداس چڑیاں
لحد کی مٹی کو چاٹتی ہیں
صبح کتبے پہ وقت کے گدھ اُتر رہے ہیں
فنا بقا متصل ہیں یکسر
ہیں سب وجود و عدم برابر ۔

تنویر انجم

میں ہری رہی

سوچ کی پری
آنکھ کے مزار
ناچتی رہی
ڈولتی رہی
بچپنوں کی باس
دل کے آس پاس
جاگتی رہی
لوریوں کی پیاس
وحشتوں کی گھاس
ڈھونڈتی رہی
تن کے جھونپڑے
شام کے قریب
شوق میں لیے
کچھ برآمدے
بازوؤں کے ساتھ
آہٹوں کی رات
بھاگتی رہی
گھومتی رہی
ایک جسم کی
حدتوں کے ساتھ
حیرتوں کی بات
ہونٹ میں لیے
بادلوں کے ساتھ
کہکشاں کی آس
موسمِ شکست
چاٹتی رہی
میں ہری رہی

زندگی

زندگی دریاؤں میں پھیلی ہوئی
وقت رنگیں آئینوں میں منعکس
رابطوں کے جھوٹ میں
آخری خواہش کا لامحدود پرتو زندگی

میں رتوں اور پانیوں سے دور ہوں
اور تم
اک دفعہ بے جان پیشانی پہ گیلے ہونٹ رکھ کر
آنسوؤں میں
وقت کی اور فاصلوں کی سرحدوں کو
بھول جاؤ۔

رضیہ انوار رضی

بند ہونٹ

خواہشیں
زینہ بہ زینہ
تہہ بہ تہہ
تیری خوشبو کے سنہرے ساحلوں پر
جو کبھی جلوہ فگن تھیں
دل کی دھڑکن میں خموشی کی صلیبیں تان کر
زنگ آلود ہوئیں
میں جو تیرے قرب کے احساس کو
چپکے چپکے بھول جانے کی ذرا کوشش میں ہوں
(حالانکہ یہ تو خیالِ خام ہے
بھولنا ہوتا تو تم کو
یاد کے نازک جھروکوں سے تمہیں
پہچان کر آواز دیتی)
تیری یادیں، میری خواہش کی طرح ہی زرد ہیں!
میری راہیں!
میری سوچیں!
تیرے ہونٹوں کی طرح سے بند ہیں!

حرفِ تمنّا

چار جانب
خامشی کے اونچے اونچے دیو پیکر
سائے
اپنے ہاتھوں کو اٹھائے
نوحہ خواں ہیں!
ان کے آنسو بادلوں کی گرد راہ ہیں
رات کے پچھلے پہر میں
ایک لڑکی
چاند کی کرنوں میں گم ہے
منجمد خوابوں کی کرنیں
سبز آنکھوں سے اتر کر
چاند تک جانے کی ہر کوشش میں ہیں
خامشی، خوشبو، کرن اور چاندنی
(جو اُس کی ہر خواہش کی طرح ہی سرد ہیں)
محوِ دعا ہیں!
"اے خدائے عظیم تر!
بحر و بر!
تو چاند کو
رات کے اِن آخری لمحوں میں
ترسیدہ سی
اس لڑکی کو دے دے
جس کو پا کر بھول جائے زندگی کا ہر ستم!!

جیانتا مہاپترا

ظہیر پراچہ

شام جو ابھی نہیں آئی

اگر اچانک کسی روز تم پر منکشف ہو
کہ وہ دریچہ جس میں تم کھڑے ہو، ایک واہمہ ہے اور
آسمان کے رنگوں میں اداسی ہے، پھیکا پن ہے
تب تمھیں یوں محسوس ہوگا جیسے سانس تھمی ہوئی ہوا ہے
جو تمھارے جسم میں چلتی ہے تو وقت تمھارے گرداگرد خشک پتوں کی طرح کھڑکھڑاتا ہے
تمھیں جس کے لمس کی خواہش ہے
اس کے بارے میں تمھیں یقین ہے کہ کرب بھرے انتظار کے باوجود تم اسے نہ پا سکو گے
اسے پانے کی خوشی تمھیں حاصل نہ ہوگی

یہ چاند جو تمھارے کرب کا باعث ہے
دھیرے دھیرے درختوں میں چھپتا جا رہا ہے
سورج کی پرچھائیں سے بوجھل چاند تمھارا تمسخر اڑاتا ہے
یہ ایک ہیبت ہے جو تمھارے جسم میں رواں بے مقصد سانسوں میں سے
کچھ تلاش کر رہا ہے

آؤ
مل کر کوئی ایسی ترکیب نکالیں کہ آسمان اپنا نیلگوں تقدس علم کردے

شاید تمھیں ابھی بہت طویل سفر طے کرنا ہے
(بے فکر گھڑیوں کی سی جوانمردی اور بے خوفی کے ساتھ)
سڑک کے اس پار [illegible] کی موہوم روشنی کی ایک چھوٹی ضمانت ہے

اور شاید تم اس سمت کے سفر کو ٹال نہیں سکتے
(آوازیں تمھیں چونکاتی ہیں تاکہ تم میں ٹھہراؤ کی خواہش سر نہ اٹھائے)
جہاں زمین کی کپکپاہٹ تمھارا تعین تمھارے کرب کی شدت سے کرتی ہے
یہ سب بلا وجہ تو نہیں ہے
ہوا چوک کے پار کھڑے مجسمے کو چھو کر گزرتی ہے تو
دریچے میں تمھیں یوں لگتا ہے جیسے تمھارے مختصر سے بدن میں آگ جھونکی جارہی ہو
تمھیں اپنا کمرہ خبطی گھڑیاں کی طرح گھومتا محسوس ہوتا ہے
شاخ سے بچھڑے ہوئے پتے کی طرح
اس دلکش اجنبی کا چہرہ تمھیں اپنے نامکمل ہونے کا، ادھورے پن کا احساس دلاتا ہے
اس احساس سے نجات کے لئے تم چاند کے چھپنے کی خواہش کرو گے
جو خون کی بے قراری کو فزوں کرتا ہے

کاوش بٹ

میں جس کے لیے شہر میں بدنام ہوا تھا
دیکھا تو وہ انبوہ رقیباں میں کھڑا تھا

اک عمر سے ہم اپنے موقف پہ ڈٹے ہیں
تسلیم تجھے ہم نے کیا ہے نہ کیا تھا

اب وہ مجھے بے نام و نشاں دیکھ کے خوش ہیں
میں خاک بسر جن کے اشاروں پہ ہوا تھا

فطرت کا تقاضا ہے بہار آنے سے پہلے
گلشن کے ہر اک پھول کا منھ زرد پڑا تھا

ہمت تھی کہ میں بچ کے نکل آیا ہوں ورنہ
سیلاب کے پانی کا تو قد مجھ سے بڑا تھا

وہ شوخ جب بھی نظر سے صدائیں دیتا تھا
اُداسیوں کو خوشی کی ردائیں دیتا تھا

وہ مہربان تھا مگر اعتماد کی حد تک
ہمیشہ وہم و گماں کی سزائیں دیتا تھا

خبر نہیں کہ کسے منزل مراد ملی
وہ اپنے قرب کی سب کو ہوائیں دیتا تھا

بلا کا حسن تھا اس خوبرو کی باتوں میں
وہ لفظ لفظ کو رنگین قبائیں دیتا تھا

یقیں مان لو دن ایک سے نہیں رہتے
کبھی مجھے بھی زمانہ صدائیں دیتا تھا

سلطان سُبحانی

اُس موڑ پہ چھوڑے گی، یہ عمرِ رواں شاید
مِٹ جائے گا آنکھوں سے، تیرا بھی نشاں شاید

مذہب کی یہ دیواریں یہ تیرا مرا رشتہ
بارُود کے گھیروں میں پھولوں کا مکاں شاید

وہ بات جو کرتا ہے کیا تیر چلاتا ہے
ہر لفظ کے پہلو میں رکھتا ہے کماں شاید

اس دَور کی ویرانی کیا اس کو اُجاڑے گی
بس درد ہی وہ گھر ہے رونق ہے جہاں شاید

اس کھیل سے اُکتا کر بے چہرگی اپنا لی؟
اب روز نیا چہرہ ملتا بھی کہاں شاید

اِک شخص کے جانے سے دُھندلا گیا ہر شیشہ
یا اُس کے نہ ہونے کا خود پر ہے گُماں شاید

بدلا جو لب و لہجہ ہم نے، تو اسی دن سے
ناراض سے رہتے ہیں سب ماہ رُخاں شاید

اُداس شام، فضا چُپ، گلی میں سنّاٹا
یہاں وہ شخص جو ہوتا تو خوب ہی ہنستا

نہ جانے کتنوں کو دھوکے سے قتل کر دے گا
بہت لہو کا ہے پیاسا یہ نام کا رَستا

یقیں ہے مجھ کو کہ خود سے کبھی میں بچھڑ جاتا
اَنا کا دائرہ اچھّا ہوا کہ ٹوٹ گیا

وہ مل گیا تو ہر اک شاخ ہو گئی دھانی
اگرچہ پاس ہی موسم کھڑا تھا پت جھڑ کا

جہاں بھی آئینہ دیکھے وہیں سنورنے لگے
وہ جب تلک تھا جواں ہر سمے تماشا تھا

قریب جتنا ہے اُتنا ہی بے نیاز بھی ہے
جو شخص ملتا ہے لگتا ہے اب خدا جیسا

"سفر ہے شرط"، تو ذرّوں میں بٹ کے مرنا کیوں
تلاش خود کی بہت ہے تو بکھرنا کیا؟

جاوید

رات میں بے سبب نکلتی ہیں
آہٹیں پاؤں پاؤں چلتی ہیں

اٹھ رہا ہے دھواں چراغوں سے
کتنی پیشانیاں مچلتی ہیں

گھیر لیتی ہیں جس طرف جائیں
کس کی آنکھیں ہوا میں ڈھلتی ہیں

برف پر سو رہی ہیں آوازیں
کب کی خاموشیاں پگھلتی ہیں

یہ دریچے بھی بڑبڑاتے ہیں
دستکیں نیند میں بھی چلتی ہیں

چھاؤں سورج کے ساتھ ہے بھائی
ورنہ شاخیں کہیں ٹہلتی ہیں

واہمہ سر ہوا تو کیا ہو گا
خواب پتھر ہوا تو کیا ہو گا

زیر سایہ گذر رہی ہے دوست
راستہ گھر ہوا تو کیا ہو گا

ہم بھی حیران ہو کے دیکھیں گے
وہ بھی ششدر ہوا تو کیا ہو گا

ہم سویرا گمان کرتے ہیں
روزِ محشر ہوا تو کیا ہو گا

شاذ ہے اس لئے مناسب ہے
اور اکثر ہوا تو کیا ہو گا

کل کا سورج ہوا کے ہاتھوں میں
ریت کا گھر ہوا تو کیا ہو گا

لبینہ راجہ

دل سے بہت قریب وہ چہرا دکھائی دے
صحرا میں آسمان کشادہ دکھائی دے

کوئی تو اب کسی کا شناسا دکھائی دے
یہ کیا کہ ہر وجود اکیلا دکھائی دے

یہ رنگ یہ خیال یہ اُلفت یہ آئینہ
ہر چیز اُس کی ذات کا حِصّہ دکھائی دے

خوشبو تو کب سے وقفِ ہوائے چمن ہوئی
ہر اک وجود رنگ میں بھیگا دکھائی دے

جگنو چمک چمک کے اُجالا نہ کر سکے
جنگل میں اک چراغ ہی جلتا دکھائی دے

کتنے عجیب دُکھ ہیں محبّت کے دوستو
یہ زندگی کی موج کنارا دکھائی دے

ذراسی ٹھیس لگی اور ریزہ ریزہ تھا
کہ اعتبار نہیں کانچ کا پیالہ تھا

تمام زہر ہی مجھ کو ڈس کے کیا لینا
کہ کب سے میرے لبوں کا بھی رنگ نیلا تھا

میں شاخ شاخ نہ کھِلتی تو اور کیا کرتی
میں جانتی ہوں کہ وہ شخص ایک بھنورا تھا

میں اُس کو بھُول کے زندہ ہوں یہ ستم دیکھو
کہ جس سے رُوٹھ کے جینا گناہ لگتا تھا

شجر کو سبز قباؤں پہ پیار کیوں آتا
کہ کل تو اُس برہنہ تنی پہ رونا تھا

وہ شخص تھا کہ تمنّا تھی میں سمجھ نہ سکی
کہ رنگ ڈھنگ تو دونوں کا ایک جیسا تھا

پیڑ پتّوں سے ہو گئے خالی
چھپ گئی بادلوں میں ہریالی

شوخ گیتوں میں چھپ کے بیٹھی ہے
سُرخ ہونٹوں سے پھوٹتی لالی

جذب کر لو تراوٹیں ساری
یہ ندی بھی ہے سوکھنے والی

اُڑ گئے پھر کبوتروں کے غول
ہو گیا پھر یہ سائباں خالی

سرد راتوں میں خود ہی اُٹھ اُٹھ کر
کر رہا ہوں بدن کی رکھوالی

کچھ تو وہ آج یاد آئی بہت
کچھ ہوا بھی ہے آج متوالی

جسم میں شور بن کے اُتری ہیں
کالی راتوں کی خواہشیں کالی

تیز ہوا میں بہنے والی ریت سے رشتہ کوئی نہ
پیچھے مُڑ کر دیکھنے والے، پیچھے تیرا کوئی نہ

خوابوں کا یہ موسم یارو، اب کے بھی ویران ر
زینہ بہ زینہ آہٹ اُبھری، لیکن اُترا کوئی نہ

ویسے تو اُس شہر میں ہر اک اپنا جاننے والا
در در جا کر دستک دی تھی، لیکن نکلا کوئی نہ

تیز ہوائیں چلنے اِن کو کون نگر لے جائیں گ
کٹی پتنگیں ڈول رہی ہیں، لوٹنے والا کوئی نہ

جلتے منظر جھلس گئے ہیں آنکھوں کی ہریالی
جسم کو کچھ تو ٹھنڈک بخشے، سایہ ایسا کوئی نہ

خواہش کا وہ کومل پودا، جب دل ہی میں سوکھ گ
آنکھوں میں اب لہریں لینے والا دریا کوئی نہ

The Monthly ALFAZ, **Regd. No. S. 2808**
P.O. Box 7596
Saddar, KARACHI-3.